
دل گداز تحریریں • زندگی کی تصویریں
کراچی
ماہنامہ
سچی کہانیاں
December
2013
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
نیا تہلکہ خیز سلسلہ "ناگن"
اس شمارے میں
☆ سلیم فاروقی کا "آتشِ جنوں" ارشد علی ارشد کا "مکھنی"
☆ اس ماہ سے ایک اور نیا دلچسپ سلسلہ، تین مردوں تین کہانیاں
☆ سچ بیانیاں، شعلہ ساماں تحریریں، سرحد پار اور سات سمندر پار سے زندگی کی تصویریں
www.paksociety.com

فون: 34930470 - 021-34939823 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی ، سٹی پریس ، OB-7 تالپور روڈ ۔ کراچی
زر سالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 600 روپے، افریقہ 85 ڈالر، کینیڈا، آسٹریلیا 65 ڈالر، ایشیا، یورپ 55 ڈالر / قانونی مشیر جی ایم بھٹو ایڈووکیٹ ہائی کورٹ ۔ رابطہ نمبر: 34939823

کوہِ گراں

کل تک عوام زرداری اور اس سے پہلے مشرف کو بُرا بھلا کہتے تھے۔ آج وہی لوگ موجودہ حکمرانوں کو بُرا کہہ رہے ہیں۔ نواز شریف نے اپنے گزشتہ دورِ حکومت میں "کشکول" توڑنے کا نعرہ لگایا تھا۔ وہی کشکول ایک مرتبہ پھر جوڑ لیا گیا ہے اور وہ اسے لیے ملکوں ملکوں خاک چھان رہے ہیں۔

عوام روٹی کے لیے مر رہے ہیں اور ہماری حکومت انہیں "بلٹ ٹرین" کے تحفے سے بہلا رہی ہے۔ لوگوں کو پینے کو صاف پانی میسر نہیں ہے لیکن شریف برادران کے محلات کے لان اور باغات کے لیے صاف، میٹھا پانی بے دریغ استعمال کیا جاتا ہے۔

جاپان جیسے ملک نے گزشتہ دنوں امریکا سے کیا ہوا وہ معاہدہ توڑ دیا جس کے تحت کوئی جاپانی اہل کار کسی امریکی کے خلاف کسی بھی کیس میں کوئی کارروائی کرنے کا اہل نہیں تھا، ملزمان کو سزا دینے کا اختیار امریکا کو تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جاپان کے پاس تو کوئی فوج بھی نہیں ہے، کوئی ایٹم بم، کوئی میزائل نہیں ہے۔

ہم ایک جری اور بہادر فوج رکھتے ہوئے اور ایٹمی طاقت ہونے کے باوجود اب تک ڈرون نہیں رُکوا سکے۔ ہم دنیا کی نظروں میں اپنی فوج کی تذلیل خود ہی کر رہے ہیں۔ ہماری فوج کا شمار دنیا کی بہترین افواج میں ہوتا ہے، آئی ایس آئی سے "را" اور "موساد" خوف زدہ ہیں۔ پھر ہم ریت میں سر دیے کیوں بیٹھے ہیں۔ ہم کب تک اسی طرح تذلیل سہتے رہیں گے۔ عوام کب تک مسائل کے کوہِ گراں تلے پستے رہیں گے؟ ہر اس چیز کے دام دُگنے ہو گئے ہیں جن کے بغیر زندہ رہنا ممکن نہیں ہے۔ آٹا، دالیں، سبزیاں، گھی، تیل، پیٹرول! یہ تمام اشیاء براہ راست عوام کے لیے لازمی ہیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ دو وقت کھانا کھاتے تھے، اب وہ ایک ہی وقت کھاتے ہیں، جو لوگ ایک وقت کھاتے تھے، وہ اس دن کچھ بھی نہیں کھاتے۔ یہ صورتِ حال کب تک چلتی رہے گی۔ حکمرانوں کو تو اس سے کوئی غرض ہے نہیں۔

عوام کو اب خود ہی اپنے حقوق کی جنگ کے لیے سڑکوں پر نکلنا ہوگا، خود ہی کچھ کرنا ہوگا ورنہ حکمرانوں کو تو اپنے بینک بیلنس بڑھانے کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں ہے، ہمیں مسائل کے اس کوہِ گراں کو خود ہی پاش پاش کرنا ہوگا۔

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

سلیم فاروقی



کچھ اپنی باتیں ......

کل کی بات لگتی ہے جب دوشیزہ اور سچی کہانیاں کی سیڑھیاں چڑھا تھا۔ وہ بھی کیا وقت تھا جب چکر پہ چکر لگاتا تھا دوشیزہ کے کہ بس ایک بار میری کہانی دوشیزہ میں شائع ہو جائے۔ ہر مرتبہ جب سیڑھیاں چڑھتا تھا، میرا دل بھی اچھل کر میرے حلق کی جانب چڑھ جاتا کہ شاید آج میری کہانی پڑھ کر ایڈیٹر صاحبہ کہیں گی۔ ”کاشی، واہ، بہت اچھی کہانی لکھی ہے۔ ہم اسے دوشیزہ میں چھاپ رہے ہیں۔“ مگر جب سیڑھیاں اترتا تو حلق کی جانب چڑھا ہوا دل میرے اپنے قدموں تلے روندا جاتا اور یہ بازگشت کسی قاتل کے خنجر کی طرح میرے ہزار ٹکڑے کر رہی ہوتی کہ نہیں ابھی اسے مزید بہتر کر کے لائیں۔

کوئی اور ہوتا تو شاید لعنت بھیجتا مگر کیا کروں، یہ لفظ گری کا نشہ ہی ایسا ہے کہ یہ چڑھتا ہی درماندگی میں ہے۔ کوئی سال بھر دوشیزہ کی سیڑھیاں چڑھتا اترتا رہا، کرچی کرچی ہوتا رہا۔ سال بھر کی مشقت نے جہاں آبلہ پا کر دیا تھا، وہاں قلم کو لفظوں کے دروبست بھی کچھ کچھ سکھا دیے تھے۔ ”سفید دوپٹا“ دیکھ کر فریدہ مسرور نے جب کہا۔ ”ویل ڈن کاشی، اسے ہم چھاپ رہے ہیں۔“ سکتہ ہو گیا تھا۔ سامنے بیٹھی ہوئی فریدہ مسرور اور اردگرد کی میزیں یک لخت میرے گرد ایسی گھومیں کہ مجھے لگا کہ یہ سب خوشی سے میرا طواف کر رہے ہیں۔

وہ رات...... ہاں، وہ رات جب ”سفید دوپٹا“ میری آنکھوں کے سامنے دوشیزہ کے صفحات میں جھلملا رہی تھی، قسم سے، میں پل بھر نہ سویا۔ کبھی اس کروٹ تو کبھی اس کروٹ، کبھی اٹھ بیٹھوں تو کبھی پانی کے گلاس پر گلاس خالی کر دوں، خوشی سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ جب وقتِ تہجد آیا تو مالک کے سامنے جی بھر کے رویا، یہ شکرانے کے آنسو تھے۔ اور پھر ”بیری کے اوپر کیا ہے“ یکدم ہی میرے محترم استاد نے چھاپ ڈالی اور یوں سچی کہانیاں بھی اپنا اپنا ہو گیا۔ اور پھر تو بس میری تحریریں چھپنے لگیں۔ کہانیوں کی تعداد بڑھ رہی تھی تو تحریر میں روانی بھی آتی جا رہی تھی۔

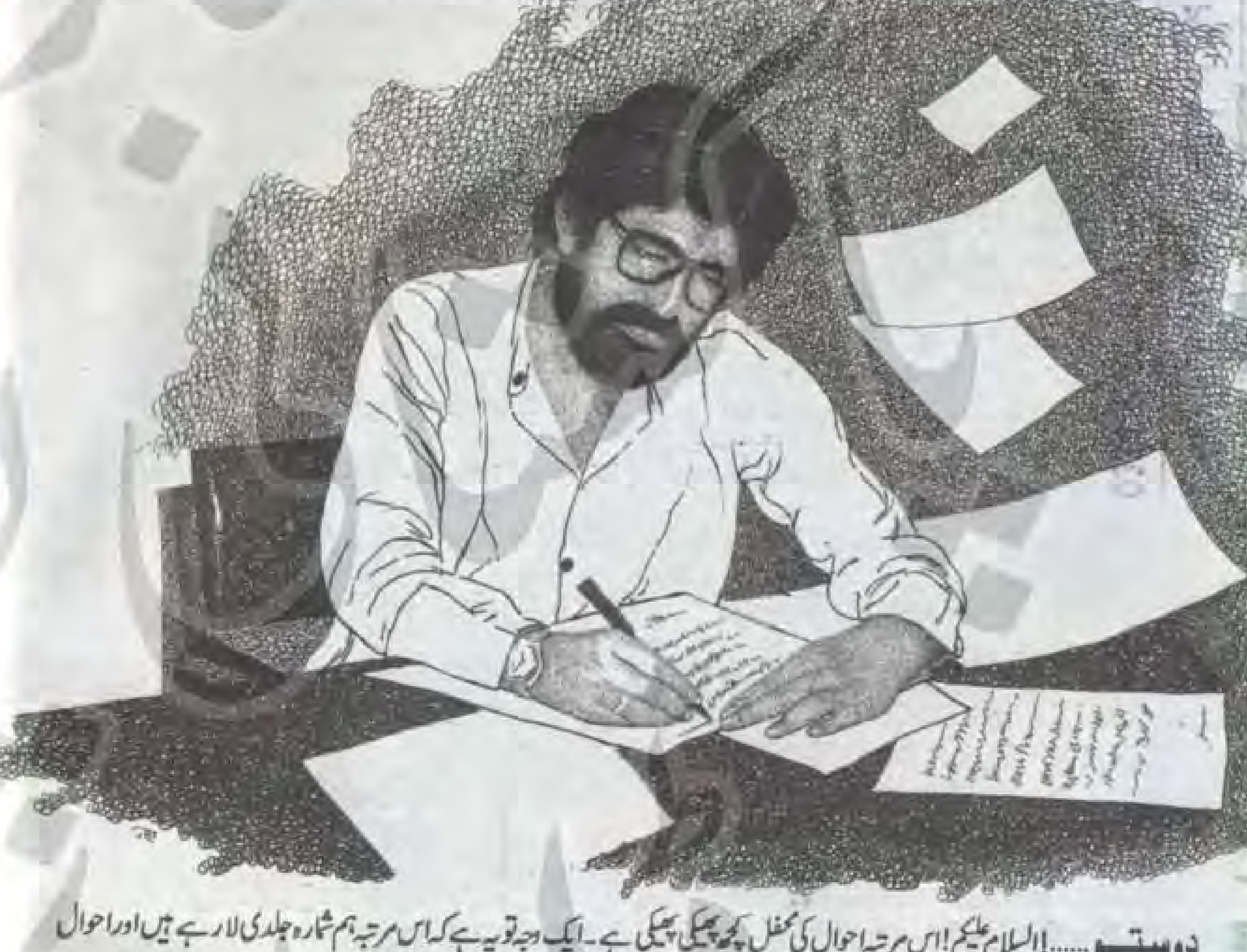
آج مجھے لگتا ہے، میری لگن سچی تھی۔ ایک جنون تھا، ایک سودا تھا جو میرے سر میں سمایا تھا۔ میں نے پھر مڑ کر نہیں دیکھا۔ اب میں دوشیزہ کی سیڑھیاں جلدی جلدی چڑھنے لگا تھا۔ میرا کام جو کل ردی کی ٹوکری کی نذر ہوتا تھا اب سراہا جانے لگا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ میرے ساتھ دوشیزہ والے زیادتی کر رہے ہیں مگر اب سمجھ آنے لگا کہ پہلے مجھے لکھنا نہیں آتا تھا، اب جب کہانی اپنے اسرار و رموز مجھے سمجھانے لگی تو سخن وری کا نشہ دوآتشہ ہی تو ہو گیا تھا۔ علی زبیر بھائی مجھے کہتے۔ ”کاشی، تمہیں پر لگ گئے ہیں، اتنا اونچا نہ اڑو۔“ میں جملہ مکمل کرتا کہ ورنہ دھڑام سے زمین پر آن گرو گے۔“ وہ کہتے۔ ”نہیں، کہیں ہماری نظروں سے اوجھل نہ ہو جاؤ۔“ پھر میں نے اپنے قدم کبھی زمین سے اٹھنے نہیں دیے۔ نہ رات دیکھی نہ دن، بس کام، کام اور کام...... آج جب یہ صفحہ لکھ رہا ہوں، قسم لے لیجیے، اشک بار ہوں۔ مالک! تیرا شکر کیسے ادا کروں؟ کل جس پرچے میں کہانی چھپوانے کے لیے چکر پہ چکر کاٹا کرتا تھا، آج اُسی پرچے کا مدیر ہوں، چاہوں، جس کی کہانی ردی کی ٹوکری میں پھینک دوں، چاہوں جس کی کہانی شائع کر دوں مگر ایسا نہیں ہے۔ جب کوئی کہانی مجھے ناقابلِ اشاعت لگتی ہے، میرے سامنے وہی ”سفید دوپٹا“ والا کاشی چوہان گھوم جاتا ہے۔ میرے دل میں وہی درد اٹھنے لگتا ہے جو دوشیزہ کی سیڑھیاں اترتے وقت میرے سینے میں چیختا، چلاتا تھا۔ میرا قلم کانپ سا جاتا ہے۔ میں سوچتا رہتا ہوں کہ میں اس ناقابلِ اشاعت کہانی کے ساتھ کیا کروں؟ میرے سامنے وہ منظر تصویر ہو جاتا ہے کہ جب اس کہانی کا لکھاری روز بک اسٹال سے پوچھتا ہوگا کہ دوشیزہ آ گیا؟ جناب، سچی کہانیاں آ گیا؟ اور جب دوشیزہ اور سچی کہانیاں آ جائے گا تو وہ کانپتے، لرزتے ہاتھوں سے فہرست میں اپنا نام تلاش کرے گا اور جب اپنا نام نہ پائے گا تو......

آپ کا اپنا

کاشی چوہان

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب



دوستو......!السلام علیکم !اس مرتبہ احوال کی محفل کچھ پھیکی پھیکی ہے۔ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس مرتبہ ہم شمارہ جلدی لا رہے ہیں اور احوال کے خطوط ابھی تک آئے نہیں ہیں، یوں بھی ہماری طبیعت خاصی بوجھل بوجھل ہے لہٰذا بہتر ہے کہ بزمِ احوال سجالی جائے۔

✉ لاہور سے مہک رقم طراز ہیں۔السلام علیکم !میں سچی کہانیاں کی خاموش قاری ہوں۔(خاموش کیا مطلب مہک، کیا آپ کبھی بولتی ہی نہیں ہیں؟) زندگی میں پہلا خط لکھ رہی ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ حامد میر نے چکوال کے عبدالعزیز جی آ کی نظم "نون میاں" پڑھی تو ہم سب گھر والوں کو بہت پسند آئی۔میں بھائی عبدالعزیز جی آ کو مبارک باد پیش کرتی ہوں۔میرا اسپیشل سلام!"سچی کہانیاں" میں سب کہانی بہت اچھی ہوتی ہیں۔دعا ہے یہ رسالہ دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرے۔آمین !میرا دل چاہتا ہے کہ میں کہانی لکھوں مگر میری اردو اچھی نہیں ہے۔کیا کروں (آپ زیادہ سے زیادہ مطالعہ کریں آپ کی اردو اچھی ہو جائے گی)

✉ ڈیری غازی خان سے ارم خان کا اظہاریہ!انکل سلیم فاروقی، السلام علیکم !پہلی بار میں خط لکھ رہی ہوں جب کہ اسے پڑھتے ہوئے دو سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔پہلی بار پڑھتے ہی یہ دل میں اُتر گیا تھا۔اب ہر ماہ بڑی شدت سے اس کا انتظار کرتی ہوں (تو پھر خط کیوں نہیں لکھتی ہو ارم!امید ہے اب تم پابندی سے "احوال" میں حاضری لگاؤ گی ورنہ ہم اکثر بندے کا چالان بھی کر دیتے ہیں) امید ہے کہ احوال میں جگہ ضرور ملے گی (نئی جگہ لینے کے لیے خط تو لکھنا ہی پڑتا ہے نا دیکھو تمہیں جگہ ملی یا نہیں؟) انکل جی فی الحال آتشِ جنوں کے سوا کوئی کہانی نہیں پڑھی سو تبصرہ نہیں کر پاؤں گی اس کے لیے معذرت!انشاء اللہ اگلے ماہ تبصرے کے ساتھ حاضری دیں گے۔(دیکھتے ہیں) انکل جی میں کئی سالوں سے غزلیں لکھتی آئی ہوں انہیں۔ڈائری میں محفوظ کرتی آئی ہوں لیکن اس بار ایک کہانی لکھنے کی ہمت کی کیوں کہ زندگی کے کچھ سچ میرے پاس بھی ہیں۔لیکن میں اپنی کہانی بھیجنے سے پہلے آپ سے اجازت لینا چاہتی ہوں (مہک بی بی!سچی کہانیاں ہمارا نہیں، تمہارا ہے، ہر قاری اس میں کہانی لکھ سکتا ہے اور اپنے گھر میں آنے کے لیے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی)

✉ عبدالعزیز جی آ چکوال سے رقم طراز ہیں۔سلیم فاروقی صاحب، آداب و تسلیمات، نومبر کا شمارہ نظر نواز ہوا، سرورق پسند نہیں آیا اس لیے تعریف و توصیف نشتہ۔اداریے پہ آپ سے نظریں چار ہوئیں، سلیم بھائی یہ حقیقت ہے کہ آپ کے ہر اداریے کا تنوع میرے لیے بے حد کشش کا باعث ہوتا ہے۔میں نے بھی ایک ایسی نظم تخلیق کی ہے جسے حامد میر صاحب نے اپنے شو میں پڑھ کر مجھ ناچیز کو دنیا کے 48 ملکوں میں متعارف کرا کے باعث توقیر بنا دیا۔احوال میں اس مرتبہ کچھ پرانے چہرے بڑی سج دھج کے ساتھ جلوہ افروز ہوئے ہیں۔اور میرا ذکرِ خیر بھی زیرِ قلم کیا ہے۔جی ہاں زرینہ/تحسین جو نجوان کی ایک تیسری بہن شائستہ جو نجو عرصہ ہوا منظر سے غائب ہیں۔جب یہ تینوں احوال میں اکٹھی ہو جاتیں تو ساتھیوں کے ساتھ مل کر خوب دھما چوکڑی مچاتیں۔رابیل، عینی، صفیہ تجل شاہ، مہناز عبدالرشید، عکاشہ، مہک، سید مستقیم نوشاہی، عبدالرؤف، ساجد اور قابلِ احترام وہ دوست جن کے نام یاد نہیں آ رہے، کیا خوب نوک جھونک کرتے کہ مزا آ جاتا۔احوال میں شامل افشاں، عینی، سدرہ، اُم عادل، فہیم انکل، مجید بھائی، اسماعیل، زرینہ/تحسین آپ سب کی رائے اور تائید کا شکر گزار ہوں کہ ایوارڈ کے حصول کی خاطر جو جنگ پچھلے تین سال سے میں اکیلا لڑ رہا تھا، میرے کندھے سے کندھا ملا کر آپ لوگوں نے میرا احساسِ تنہائی مٹا ڈالا۔سلیم بھائی حالات کو دیکھتے رہے تو ایوارڈ تقریب کبھی نہیں ہوگی۔کیا آپ حضور نبی کریم ﷺ کا فرمانِ مبارک بھول گئے ہیں کہ ہر بعد کا زمانہ پہلے سے بُرا ہوگا پچھلے 12 سال سے آپ زمینی حالات دیکھ رہے ہیں۔کیا سے کیا ہو چکا ہے پلیز آپ جلدی سے ڈیٹ رکھ دیجیے اور کال کیجئے۔(زمینی حالات کے ساتھ ساتھ اپنے حالات بھی تو دیکھنا ہوتے ہیں جی آ صاحب!ادارے کے حالات، زمینی حالات سے منسلک ہیں۔امید ہے، آپ میری بات کا مطلب سمجھ گئے ہوں گے) پہلی کہانی "خیام کی رباعی" بہت دلکش تحریر تھی جو دل میں گھر کر گئی کہانی کی بنت غضب کی تھی۔نیک تمناؤں کے ساتھ اجازت!ہر یاد کرنے والے کو سلام (جی آ صاحب!آپ کے پڑھنے کی رفتار تو بہت طوفانی ہے۔پرچہ ملتے ہی آپ نے نہ صرف پوری کہانی پڑھ ڈالی بلکہ اس پر تبصرہ بھی کر دیا۔خوش رہیے اور خوش رکھیے)

✉ راولپنڈی سے بھائی سلیم اختر کا اظہاریہ!"عزیز محترمہ بہن" آداب!نومبر کا "سچی کہانیاں" دلکش سرورق کے ساتھ جلوہ گر ہے جبکہ دسمبر کا شمارہ خاص شمارہ ہوگا۔اس لحاظ سے بھی کہ سچی کہانیاں اپنی اشاعت کے تیس سال مکمل کر لے گا۔30 سال گزر گئے احساس ہی نہ ہوا۔میں اس کے دوسرے شمارے سے اس کا ہم سفر بنا تھا۔اس وقت شمیم نوید (مرحوم) اس کے ایڈیٹر تھے۔انہوں نے سچی کہانیاں کو عوامی ڈائجسٹ کا روپ دیا تھا۔یہی روایت بعد میں بھائی سلیم فاروقی اور پرویز بلگرامی نے بھی قائم رکھی۔امید ہے بھائی سلیم فاروقی پھر سے سچی کہانیاں کو عوامی پرچا بنا کر دم لیں گے۔اس میں ابھی کافی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔خاص طور پر نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی۔ان کی کہانیاں "ری رائٹ" کر کے شائع کی جائیں تاکہ انہیں لکھنے کا سلیقہ آئے۔مجھے یاد ہے اور میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ شروع میں شمیم نوید اور سلیم فاروقی نے میری کئی کہانیاں ری رائٹ کیں اور مجھے لکھنے کا سلیقہ سکھایا۔(بھائی جی، شمیم نوید صاحب تو صرف کہانیاں ہمارے حوالے کیا کرتے تھے۔انہیں ری رائٹ کرنا تو ہمارا اور سیما غزل ہی کا کام تھا) فاروقی بھائی کا اداریہ......بہت سے سوالوں کا جواب مانگتا ہے، قوم سے اور اس کے لیڈروں سے!اب احوال میں چلتے ہیں۔افشاں، بہن صدارت کی کرسی مبارک ہو۔بہن قرۃ العین زینب کی آمد بھلی لگی......سعید انور اور کوثر سعید آپ دونوں کیسے ہیں۔آپ کی آمد اچھی لگتی ہے۔رانا محمد شاہد صاحب ہمیشہ ہی جاندار اور بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضری دیتے ہیں کہ پڑھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ام عادل کیسی ہیں۔آپ کی کہانی دُعا بد دُعا اچھی لگی۔بھائی محمد فہیم کا نام ایک عرصہ بعد پڑھنے کو ملا، بہت اچھا لگا۔محمد اسماعیل بروہی، "تقدیر کے کھیل نرالے" بہت ہی خوب صورت تحریر ہے، آپ یقیناً بڑے رائٹر بنیں گے۔میری دعائیں آپ کے نام!جو نیجو سسٹرز!جیتی رہو۔احوال میں تمہاری شرکت سے "سچی کہانیاں" سج جاتا ہے۔بہت ساری دعائیں تم دونوں کے لیے۔

امین مراد انصاری کا خط اور باتیں سچی کہانیاں کے احوال کا "حاصلِ مطالعہ" خط کہلاتا ہے۔نور محمد نور بھٹو!خوش آمدید، عزیز جی آ، آپ کیسے ہیں؟اس بار پرچے کا انداز کچھ بدلا بدلا سا ہے۔کہانیوں کے انتخاب میں بھی خاصی محنت کی گئی ہے۔بھائی سلیم فاروقی!آتشِ جنوں کی بیس قسطیں آ چکی ہیں۔کہانی کا ٹیمپو ویسا ہی ہے جیسا پہلی قسط سے تھا اور یہ ملکہ آپ ہی کو حاصل ہے کہ آپ کی تحریر رگوں میں خون کی گردش تیز کر دیتی ہے۔"آوارہ حسینہ" موبائل کہانی ہے۔اور یہ اسی جدید ایجاد کا شاخسانہ ہے کہ کئی قسم کے فوائد کے ساتھ ساتھ یہ ایجاد کئی گھرانے اجاڑنے کا سبب بھی بن رہی ہے۔عبدالمجید بھائی اچھی تحریر لے کر آئے ہیں۔خوش آمدید، روبینہ شاہین کی "عادتِ بد" رشتوں کی اہمیت اور ان کی حدود کے تعین کا

تقاضا کرتی کہانی ہے۔ فرزانہ نگہت نے ہوس کے موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور وہ اس حقیقت کو سمجھانے میں کامیاب رہی ہیں کہ ہوس میں انسان سنگدلی کی انتہا کو چھولیتا ہے۔ بٹی مریم شاہ! تمہاری تحریر ''مجرم کون؟'' نے تو رونگٹے کھڑے کردیے۔ اتنی سفاک سچائی لائی ہو کہ تمہیں داد دیتا ہوں۔ ''جرم کی کوکھ'' ثنا کنول اللہ دتہ۔ کی کہانی بھی بنت حوا کی رسوائی اور بربادی کی کہانی ہے۔ نسیم سحر کی ''رکھیل'' بھی عورت کے استحصال کی کہانی ہے۔ متاثر کن تحریر ہے۔ اس کے علاوہ تسنیم منیر علوی، محمد آصف عاطر، انور فرہاد، بشریٰ سعید، رضوان قیوم کی تحریریں بھی اچھی ہیں۔ ان سب کو آداب اور مبارک باد۔ امید ہے بھائی سلیم فاروقی اپنا تجربہ اور صلاحیتیں بروئے کار لائیں گے۔ تمام اسٹاف اور کارکنان کو بہت ساری دعائیں اور سلام عرض ہے (بھائی سلیم اختر! آپ نے ہر کہانی کی تعریف کی ہے، کسی پر تنقید نہیں کی، لکھنے والوں کے لیے صحت مند تنقید بھی ضروری ہے)

✉ سدرہ انور علی جھنگ سے لکھتی ہیں، سلیم انکل! دلہن سا سجا نومبر کا پرچہ خوب صورت، رنگین، دلنشین، حسین، ٹائٹل پہلے سے زیادہ چمکتا، دمکتا ہوا ملا۔ ہر لحاظ سے پرفیکٹ لگا۔ لیکن احوال میں خطوط کی تعداد بہت کم تھی (خط لکھنے کا وقت نہیں ملا ہوگا اس مرتبہ ہم پرچہ جلدی لانے کی کوشش میں ہیں) سلیم انکل کیا آپ کو نہیں لگتا کہ تحسین جی ملکہ احوال ہیں؟ (سوال ہمارے لگنے کا نہیں بلکہ احوالیوں کی رائے کا ہے سدرہ!) وہ ملکہ کا درجہ رکھتی ہیں، ان کے خطوط بہت پسند آتے ہیں۔ تسنیم منیر کی، خیام کی رباعی، ہمارے معاشرے میں تو یہ بات عام ہوتی جارہی ہے کہ اپنے گھر میں بیوی کے باوجود شوہر کتوں کی طرح اِدھر اُدھر ضرور منہ مارتا ہے۔ لعنت ہو ایسے مردوں پر۔ آتش جنوں، بہت دلچسپ جارہی ہے۔ آنٹی منزہ سہام کی شہید کی ڈائری کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ عظیم الدین انصاری کی موبائل کہانی، آوارہ حسینہ، بہت سبق آموز کہانی ہے۔ عبدالمجید بھائی کی ''جسے چاہا تھا'' سچی بات تو یہ ہے کہ بظاہر معصوم اور خوب صورت نظر آنے والی لڑکیاں دوسروں کے ارادے نہیں جان پاتیں، سیدھی سادی لڑکیاں یہ کہانی ضرور پڑھیں۔ روبینہ شاہین کی ''عادت بد'' اور مریم شاہ کی ''مجرم کون'' دنیا میں کسی بھی قوم کسی بھی مذہب میں بچی کے ساتھ اس سلوک کی اجازت نہیں دیتا۔ آصف عاطر کی ''میں بہت برا ہوں'' یقیناً جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ رضوان قیوم کی ''ایک لمحے کی بھول'' کبھی کبھی انسان اتنی سنگین غلطیاں کرتا ہے کہ اس کا کیا دھرا اس کے سامنے آجاتا ہے۔ پڑھ کر بہت شاک لگا۔ ''موت کا عمل'' بشریٰ سعید بہت ہی سبق آموز تحریر لے کر آئیں۔ دوسروں کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ تکبر اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ فعل ہے اور جو کرتا ہے وہ بھرتا ضرور ہے آپ کی ڈائری کے لیے تمام لوگوں کے انتخابات پسند آئے۔ خیال آرائی میں حافظ مون کا خیال پسند آیا۔ پسند اپنی اپنی میں نادیہ کراچی کا شعر پسند آیا۔ بازگشت جس کی تکمیل پہ آنکھیں بھی گئیں دل بھی گیا، عمر گزری اسی خواب کے پیچھے پیچھے۔ انکل سہام کی سوچ مستقبل کی بھی عکاس ہوگی۔ زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی تب تک کے لیے اللہ نگہبان۔

✉ کراچی سے جاوید کا اظہاریہ! جناب ایڈیٹر، انچارج، سچی کہانیاں میں تقریباً تین سال بعد اپنے خط اور کلام کے ساتھ حاضر ہوا ہوں۔ میری نظر سچی کہانیاں کے میگزین پر پڑی تو میرا دل چاہا پھر سے اس میں اپنا کلام بھیجوں۔ پہلے میں آپ کو یہ بتاتا چلوں کہ پہلے میں ڈاکٹر جاوید پنجابی کے نام سے کلام کی محفل میں اپنے خطوط کے ساتھ حاضر ہوتا رہا ہوں۔ بہت سے لوگوں کے اعتراضات کے بعد اپنے نام کے آگے سے پنجابی ہٹا دیا ہے۔ (بہت اچھا کیا۔ اگر آپ جاوید پاکستانی کے نام سے لکھتے تو بہتر ہوتا) اتنے عرصے بعد دوبارہ حاضر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اب مصروفیات بڑھ گئی ہیں پرنٹ میڈیا کے علاوہ اب میں الیکٹرونک میڈیا میں بھی اپنی تحریریں لکھ کر دے رہا ہوں۔

✉ لڈن ضلع وہاڑی سے محمد عزیز مے لکھتے ہیں۔ محترم سلیم فاروقی صاحب! بعد از سلام عرض ہے کہ عرصہ دراز بعد حاضر ہوں۔ کل یکم نومبر کو رسالہ خریدا اور آج دو نومبر تک جو کچھ پڑھ سکا، پڑھ کر خط لکھنے بیٹھ گیا۔ سلیم صاحب! باتیں تو بہت سی کرنی ہیں آپ سے اور منزہ آپی سے بھی اور سمجھ میں نہیں آرہا کہ بات کہاں سے شروع کروں۔ بہت سی باتیں ہیں جو ذہن میں گڈمڈ ہو رہی ہیں، (جب آپ مناسب سمجھیں بتادیں) غالباً جاوید اختر صاحب کی ایک ہائیکو ہے کہ بے خوابی بڑھتی جاتی ہے، ایک بیٹے کی خواہش میں، آبادی بڑھتی جاتی ہے! خیر یہ تو اپنا احوال تھا۔ اب بات ہوجائے موجودہ شمارے کی۔ پرانے ساتھیوں میں رانا محمد شاہد، قرۃ العین زینب، ارشد علی ارشد، آصف عاطر، محمد فہیم کراچی کے نام جانے پہچانے لگے۔ عبدالرؤف غلام، صفیہ سلطانہ مغل، حیدر کاشری، کرنل رفیق ایس ایم، نوشین خامان عرف شانی خامان، پلیز آجاؤ لوٹ کے کہ یہ دل اُداس بہت ہے، اب تازہ شمارے کی طرف چلتے ہیں۔ (آپ کو شاید علم نہیں کہ حیدر کاشری، کرنل رفیق ایس ایم اور ہوا خامان اب مرحوم ہو چکے ہیں) سرورق کچھ خاص نہ تھا۔ اشتہارات کو نظر انداز کرتے ہوئے احوال تک جا پہنچے، سوری اداریہ کو بھول گئے۔ سلیم صاحب! حکومت تو سارا سال عوام کی قربانی کرتی رہتی ہے۔ احوال کے صفحات کم ہیں۔ قرۃ العین زینب، رانا محمد شاہد، مجید احمد جائی، زرینہ جونیجو، تحسین جونیجو کے خطوط تبصرے سے بھرپور تھے۔ مجید احمد جائی صاحب! اللہ آپ کے والد محترم کو غریق رحمت کرے اور آپ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین، (ادارے کی طرف سے بھی بہت تعزیت!) ''آپ کی ڈائری کے لیے'' بہت ہی اچھا سلسلہ ہے اور ''مسئلہ یہ ہے'' کا تو کیا ہی کہنا۔ اس کا اجر تو آپ کو اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے۔ (اس کا اجر تو باجی کو ملے گا، ہم تو صرف مسئلہ شائع کرتے ہیں اور بس!) ''دعا بددعا'' ام عادل کی حیرت انگیز

عزیز دوستو! ناسازیٔ طبع کے باعث آپ حضرات سے کچھ عرصہ احوال میں ملاقات نہ ہوسکے گی، جس کا مجھے افسوس رہے گا۔ بہرحال انشاء اللہ بہت جلد آپ مجھے اپنے درمیان پائیں گے۔

سلیم فاروقی

کہانی تھی۔ ''ایک لمحے کی بھول'' مکافات عمل کا ایک اور ثبوت تھی۔ واقعی گناہ کا انجام کسی بھی صورت میں کبھی بھی ظاہر ہوسکتا ہے۔ ''موت کا عمل''، بشریٰ سعید کی یہ کہانی مجھے بہت ہی پسند آئی لیکن پانی والی ٹینکی میں چودہ سال گزارنے والی بات کچھ ہضم نہیں ہوتی۔ (بہت سی باتیں ہضم نہیں ہوتی ہیں لیکن روزانہ ہی آپ ایسے انوکھے واقعات پڑھتے یا دیکھتے ہوں گے) ''عید کا جوڑا'' کسی نئے رائٹر کی کہانی لگی۔ (اس کہانی میں کہاں ناپختگی تھی؟ انور فرہاد صاحب تو ہم سے بھی سینئر ہیں) حالاں کہ انور فرہاد صاحب خاصے پختہ لکھاری ہیں۔ مختصر سی کہانی ''رکھیل'' ایک تلخ حقیقت تھی جو کہ نام نہاد دانشوروں اور پروفیسروں کے منہ پر طمانچہ تھی۔ پسند اپنی اپنی میں فرح شاہین، محمد علی، گل زمان اور رضوانہ خان کا انتخاب پسند آیا۔

✉ کراچی سے عائشہ خورشید انور کا خلوص نامہ! فاروقی بھائی آداب! تمام لکھنے والوں اور تمام احوالیوں کو عائشہ خورشید انور سلام پیش کرتی ہے۔ (کیا کسی ٹی وی چینل کی ''اینکر'' ہوگئی ہو؟) خصوصی طور پر ابن مراد انصاری بھائی کو جنہوں نے احوال میں میرے خط کو سراہا اور میرا سر فخر سے اونچا کردیا۔ شکریہ پاجی (یہ ''پاجی'' پنجابی والا ہی ہے نا؟) بھائی سلیم فاروقی صاحب! یہ میری عزت کا سوال ہے جو کہانی اب تک میں ارسال کرچکی ہوں بہت تسلی دلاسے کے بعد بھی صفحہ قرطاس پر مجھے نظر نہیں آئی سوائے خط اور خیال آرائی کے۔ گھر پر اب کوئی بھی دلچسپی سے میری تحریر نہیں پڑھتا۔ بچے مجھ سے کہتے ہیں آپ نے جو بھی کہانی یا تحریر بھیجی ہیں وہ سب آپ لوگوں نے ردی کی ٹوکری کے حوالے کردی ہیں۔ وہ آپ کو یونہی تسلی دیتے ہیں کہ آپ کی تحریر شائع ہوجائے گی۔ پلیز بچوں کے سامنے میرا بھرم رکھ لیں اب اک عدد بالکل سچی کہانی ''دن ہیں کہ تپتے صحرا'' ارسال کررہی ہوں پسند آئے تو شامل اشاعت کردیجیے گا۔ (عائشہ! آپ کی کہانیاں اتنی مختصر ہوتی ہیں کہ وہ رسالے کے ایک صفحے سے بھی کم ہوتی ہیں۔ آپ کم سے کم تین چار صفحات کی کہانی بھیجیں۔ اس کے لیے آپ کو اپنے لکھے ہوئے پندرہ سولہ صفحات لکھنا ہوں گے) جو بھی کہانی یا تحریر میں نے پہلے بھیجی تھی آپ نے بھی خوب آس ولائی تھی کہ وقت آنے پر شائع ہوجائے گی وہ وقت آتے آتے کہیں میرے ہی جانے کا ٹائم نہ آجائے۔ (اس وقت تک ہم نے کہانی پڑھی نہیں تھی، رہی جانے کی بات تو کون جانے کہ آپ سے پہلے ہمارا ہی وقت آجائے۔ غیب کا علم تو صرف اللہ کو ہے عائشہ بی بی!) پلیز کرم کیجیے مجھے اپنی فیملی کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچالیجیے۔ (اب یہی ہوسکتا ہے کہ آپ کی کہانی کو ری رائٹ کر کے ایک صفحے سے پانچ صفحات میں پھیلایا جائے، چلیے ہم یہ بھی کردیں گے) دیکھتے ہیں یہ والی تحریر آپ لوگوں کو بھاتی ہے کہ نہیں اس کہانی کے اشاعت کے انتظار تک آپ سب کو اللہ حافظ کہہ رہی ہوں، رسالے کا پڑھنا جاری رکھوں گی یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کیوں کہ اس کے بغیر میں رہ نہیں سکتی۔ (ارے عائشہ بہن! ایسی بھی کیا مایوسی، آپ کی کہانی اگر ذرا بھی جان دار ہوئی تو ہم اسے طویل کردیں گے، اب تو خوش ہوجائیں۔ آپ کی عزت میں انشاء اللہ اضافہ ہی ہوگا) اچھا اب اجازت دیں اپنا خیال رکھیے گا۔

✉ کراچی سے ام عادل کا خلوص نامہ! محترم بھیا سلیم فاروقی صاحب، السلام علیکم! خلاف توقع رسالہ 30 کو مل گیا ٹائٹل گرل پر نظر پڑی تو بے اختیار لبوں سے نکلا۔ واہ! کیا یہ کسی اور سیارے کی مخلوق ہے، (کیوں کیا اس کے سر پہ سینگ تھے یا آنکھوں کی جگہ کان تھے؟) یا بیوٹی پارلر کی صناعی؟ آج کے اتنے آلودہ پُرشور ہنگامہ خیز ماحول میں ایسا بے داغ مطمئن چہرہ نظر آنا حقیقت میں ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، آگے بڑھے، فہرست میں اپنی کہانی دیکھ کر چونک گئے۔ بھیا ردی کے انبار سے نکل کر یہ کیسے آپ کے ہاتھوں میں آگئی، ہم تو اسے بھول کر اس کی فاتحہ پڑھ چکے تھے۔ پھر آپ نے جو عوام کی قربانی کی دل گرفتہ منظر کشی کی ہے اُسے کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ (کوئی جھٹلائے یا مانے ہمارے حکمران تو اسے مسلسل جھٹلا رہے ہیں) احوال میں پہنچے جلدی جلدی اپنا خط تلاش کیا، واہ کیا بات ہے؟ کئی ماہ کی خواری اور غیر حاضری کے بعد آخر مسافر منزل پر پہنچ ہی گیا۔ آپ کے جوابات سے بھی دل خوش ہوا۔ اس کے علاوہ بھی مختلف نگارشات میں آپ نے جگہ دی۔ اس ماہ رسالے میں اتنی جگہ دینے پر ہم تہ دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اب کچھ کہانیوں پر تبصرہ ہوجائے، خیام کی رُباعی، تسنیم منیر علوی نے خوب صورت شاعرانہ انداز میں بے

وفاؤں کا پردہ چاک کیا ہے۔ ''آتشِ جنوں'' کی آتش تو پھیلتی ہی جا رہی ہے، آتش کہانی کا نہیں کہہ رہے۔ (ہم واقعی اس جملے کا مطلب نہیں سمجھے، اگر اس سے مراد شہر کی آتش ہے تو وہ واقعی پھیل رہی ہے) 20 ماہ سے اپنا سحر برقرار رکھے ہوئے ہے۔ ''آوارہ حسینہ'' بھی آوارہ خواتین کے منہ پر طمانچہ تھی مریم شاہ نے ''مجرم کون'' میں معاشرے کی گھن زدہ بدصورتی کو نپے تلے الفاظ میں ہم تک پہنچایا ہے۔ ''جرم کی کوکھ'' پولیس کی سیاہ کاریوں کا آئینہ ہے۔ ''تقدیر کے کھیل'' کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ (سمجھ میں نہیں آئی تو اسے دوبارہ پڑھیں اور غور سے پڑھیں) ''مکھنی'' اور باقی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں، مگر جس کہانی نے میری رات کی نیند اڑا دی وہ بشریٰ سعید کی ''موت کا عمل'' تھی اس کہانی سے بہت سبق ملے قدرت کی بے آواز لاٹھی کا مفہوم سمجھ میں آیا۔ سب سے آخر میں میری کہانی تھی یہ تو احوالی ہی بتائیں گے کہ انہیں دُعا یا بددعا کیسی لگی۔ اس مرتبہ آپ کی ڈائری بہت بہت خوب تھی۔ خطوط سب کے بہترین تھے مگر عائشہ خورشید کا خط بہت اچھا لگا۔

✉ ملتان سے مجید احمد بھائی کی آمد! محترم سلیم فاروقی، سلام ومحبت اینڈ مزاج گرامی! (یہ بدلتے ہوئے موسم کا اثر تو نہیں ہے مجیدہ! اردو میں انگریزی کی ملاوٹ کر رہے ہو؟ مزاجِ گرامی اور مزاجِ گرمی دونوں بہتر ہیں) اللہ تعالیٰ آپ اور آپ کی فیملی، سچی کہانیاں کے تمام اسٹاف اور قارئین کو اپنی حفظ وامان میں رکھے آمین، ثم آمین۔ ملکی حالات آپ کے سامنے ہیں، خودکش حملوں اور مہنگائی کے ایٹم بم نے ہر شہر سے خوشیاں چھین لی ہیں، ہر شخص ڈرا، ڈرا، سہما سہما سا ہے، ستیاناس ہو دہشت گردوں کا جنہوں نے میرے وطن کی فضا میں دہشت کی آلودگی پھیلا دی ہے، مہنگائی کے اس دور میں سانس لینا بھی دشوار ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ پاکستان اور پاکستانیوں کو اپنی حفظ وامان میں رکھے (آمین) او ہو جی آپ کا حال تو پوچھا نہیں، سنائیے کیسے ہیں، اب گرمی رہی نہیں، ہاں سردی کے بچاؤ کے لیے بندوبست ضرور کیجیے گا۔ (کراچی میں اتنی سردی نہیں ہوتی کہ بچاؤ کا بندوبست کیا جائے) تبصرے کی طرف آتے ہیں، نومبر 2013 ''سچی کہانیاں'' ادارے کی طرف بطور اعزازی ملا۔ ارے واہ بھائی ہماری کہانی شامل اشاعت ہے۔ مبارکاں تو دے دو، ورنہ مٹھائی نہیں ملے گی (پہلے مٹھائی، پھر مبارکاں) ''سچی کہانیاں'' میں میری کہانی ''جسے چاہا تھا'' لگنے کی خبر ملک صفدر حیدری، تعریفوں کے پھولوں کی مالا کے ساتھ دے چکے تھے اور میں خوشی سے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ بے چینی، بے قراری تھی کہ کب سچی کہانیاں مل پائے گا۔ گھر سے دور 25 کلومیٹر مارکیٹ کا وزٹ کر آیا۔ مگر کہاں؟ سن رکھا تھا، ادارہ اعزازی کاپی بھیجتا ہے، مگر میرا ایڈریس نجانے ہے بھی کہ نہیں، اتنے میں چکوال سے عزیز جی آ کی کال آئی، احوال میں شامل ہونے پر مبارکباد دی اور تعریفوں کے گل دستے میری نذر کیے۔ ابھی ان کی کال ختم ہوئی ہی تھی کہ ملک عاشق حسین ساجد کی کال آ گئی۔ جناب پھولے نہیں سما رہے تھے، کہنے لگے میرے پاس ہوتے تو آپ کو فل ''جپھی'' ڈالتے۔ آپ کو مٹھائی کھلاتے، کولڈ ڈرنک پلاتے، مگر ہماری طرف سے مبارکباد قبول کریں، اتنی محبت میری آنکھیں چھلک پڑیں کاش! میرے ابوحیات ہوتے تو کہتا، دیکھو پاپا۔ سچی کہانیاں میں میری کہانی لگی ہے، بہرحال اتنی محبتیں پا کر میرے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے، صرف سچی کہانیاں کا دیدار باقی تھا، سو جلد ہی وہ بھی ہو گیا۔ زبردست ویلڈن، بڑی خوش کن بات ہے کہ ادارہ اعزازی کاپی ارسال کر کے محبتوں کا ثبوت دیتا ہے۔ ایک چھوٹی سی بات اگر مان لی جائے کہ اعزازی کاپی روانہ کرتے ہوئے ادارے کی طرف سے ڈائجسٹ پر چند الفاظ لکھ دیے جائیں تو دل باغ باغ ہو جائے۔ کیوں کہ انعام ہوتا ہے چاہے کاغذ کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو۔ کم از کم اپنے پاس محفوظ رکھیں اور یادگار بن جائے۔ بہرحال بہت شکریہ مہربانی۔ سرورق پر بجی سنوری دلہن دیکھی جو زیورات سے پھندی تھی، بہت خوب صورت! اکمرشل سے جان چھڑواتے جھلکیاں میں پہنچے، ماشاء اللہ دوستوں کے ساتھ ساتھ ہمارا نام بھی چمکتا دمکتا تھا۔ میری تو عید ہی اب ہوئی ہے۔ عید کی بات ہوئی تو ''عید قرباں'' میں سلیم فاروقی صاحب سے ملے۔ واقعی ان جیسے جذبات میرے بھی ہیں، یہ بات بہت پسند آئی، میں کاغذ کے سپاہی کاٹ کر لشکر بناتا ہوں! حکومت کا کیا رونا روئیں، پیٹرول آسمان سے باتیں کرنے لگا ہے، گیس کے چولہے بند پڑے ہیں، سبزیاں ہاتھ تک نہیں لگانے دیتیں، اب تو یقین ہو گیا ہے کہ حکومت کا نعرہ سچ ہی ہے۔ غریب مکاؤ، ملک بچاؤ۔ احوال میں پہنچے تو افشاں، ناصر سلیم خانیوال سے جا ملے، ناصر صاحب کیسے ہیں آپ؟ امید ہے ہماری یاد آپ کو کال کرنے پر مجبور کرے گی۔ کافی عرصہ ہو چلا ہے، اپنی خیریت تو دیجیے۔ میرے ہی شہر سے قرۃ العین زینب، خوب تبصرہ تھا۔ ایم سعید انور، کوثر سعید، رانا محمد شاہد، سدرہ انور، ام عادل شکایات کر رہی تھیں، کنول عمران، محمد فہیم، ڈاکٹر صغیر احمد ننھا سا خط، عائشہ خورشید انور! ارے واہ، ہمارا بھی احوال شامل ہے، بہت شکریہ جی، سنبل کا اظہار بھی خوب رہا، ملک صفدر عباس، یہ چچا، بھتیجے والے کا کیا سین ہے بھائی بتائیے گا۔ (یہ سین نہیں ہے بھائی زمینی حقیقت ہے، صفدر عباس ہمارے بھتیجے بن گئے ہیں اور بس!) محمد اسماعیل بروہی، زرینہ، تحسین جونیجو، آخر میں امین مراد انصاری صاحب بہت خوب جناب۔ سلیم اختر کا بہت شکریہ اور عزیز جی آپ کہاں غائب ہو گئے۔ ساتھ ساتھ جو لوگ سچی کہانیاں سے دور ہیں، پلیز جلدی لوٹ آئیں۔ لو جی احوال کی محفل اختتام پذیر ہوئی، ہم کہانیوں کی وادیوں میں غوطہ زن ہونے لگے ہیں، کمال کرتے ہو۔ سب سے پہلے اپنی ہی لکھی ''مجھے چاہا تھا'' پڑھی۔ بہت مزہ آیا سچی کہانیاں میں لگنے سے ایک ایک لفظ معطر معطر ہو گیا۔ بھینی بھینی خوشبو، مجھے تر و تازہ کر رہی ہے۔ اب فیصلہ قارئین کریں گے کہ

سانحۂ ارتحال

ہماری دوست لکھاری نزہت جبیں ضیاء کی ساس صاحبہ گزشتہ ماہ رضائے الٰہی سے انتقال فرما گئیں، ادارہ ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ قارئین سے التماس ہے کہ ان کے حق میں دعائے خیر کریں اور ایک مرتبہ الحمد شریف ضرور پڑھ لیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

کیسی رہی داستان میری۔ ''شمع جلتی رہے گی'' نسیم اختر صاحب ویلڈن، اچھی کہانی تھی۔ ''آوارہ حسینہ'' عظیم الدین انصاری کی موبائل کہانی پڑھی۔ بور بور سی لگی، بار بار باتیں دہرائی گئی ہیں۔ روبینہ شاہین کی ''عادت بد'' خوب صورت تحریر تھی۔ واقعی جب ہوس کی پٹی آنکھوں پر بندھ جائے تو رشتوں کی پہچان نہیں رہتی۔ ایسے درندہ صفت انسان پر بے شمار لعنت ہو۔ باقی کہانیاں ابھی پڑھنا باقی ہیں، ورنہ سیر حاصل تبصرہ بھی کرتا۔ چھوٹے کالم، آپ کی ڈائری، بازگشت، خوب رہے۔ اس دفعہ شہید کی ڈائری سے محروم رہے ہیں آخر کیا وجہ ہے۔ ہر ماہ دیا کریں۔ (حمزہ صاحب اس ماہ بہت زیادہ مصروف تھیں) ایک چھوٹا سا مشورہ قبول کیجیے، ہر کہانی کے ساتھ رائٹر کی ننھی سی تصویر لگا دی جائے تو کیا حرج ہے۔ بندہ دیدار تو کر لیتا ہے۔ ایک التجا سلیم فاروقی صاحب میرا نام ''مجید احمد جائی ملتانی ہے'' (یہ غلطی ہماری ہے، ہاں مجید احمد تو ٹھیک ہے مگر ''جائی'' کیا ہے؟ اور ملتانی کیوں پاکستانی کیوں نہیں؟) ملتان میرا شہر ہے، امید ہے توجہ کریں گے۔ اس کے علاوہ میری کہانیاں ''تیرے پیار میں'' ''خواہشوں کی منزل قربانی'' موجود ہیں۔ بتائیے گا شامل اشاعت ہوں گی یا...... (ابھی کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ابھی تک پڑھی ہی نہیں ہیں) اجازت چاہنے سے پہلے ''سچی کہانیاں'' کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ترقی کی تمام منزلیں طے کروائے، دشمن کے شر سے محفوظ رکھے، نظر بد سے بچائے۔ آپ کو اور تمام سچی کہانیاں اسٹاف، قارئین کو چمکتا دمکتا، مسکراتا رکھے زندگی نے وفا کی تو اگلے ماہ ملاقات ضرور ہو گی۔

✉ کراچی سے ثمینہ ناز کی آمد! محترم سلیم فاروقی بھائی، السلام علیکم! اُمید ہے آپ اور آپ کا تمام اسٹاف خیر وعافیت سے ہو گا۔ آپ سے فون پر بات کر کے بہت خوشی ہوئی یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں دنیائے ادب کی بلند چوٹیوں کو چھونے والے فنکار سے گفتگو کر رہی ہوں۔ (اب ہمارا قد اتنا بڑا بھی نہیں ہے کہ کھڑے کھڑے بلند چوٹیوں کو چھو لیں) اللہ پاک سے دعا ہے کہ آپ کا ہر دن خوشبو سے بھرا رہے۔ آپ کا اداریہ بہت شاندار، آپ نے صحیح کہا ہے کہ عیدِ قرباں سے پہلے ہی حکومت عوام کو قربان کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے مگر حکومت ہر مرتبہ عوام کو ہی قربانی کا بکرا کیوں بناتی ہے؟ اُسے کالی بھیڑیں اور بڑے بڑے اونٹ نظر کیوں نہیں آتے جو کھلے عام دندناتے پھرتے ہیں (سب نظر آتا ہے، بس دیکھنا نہیں چاہتے) ارے یہ کیا آپ کی ظالم، ردّی کی ٹوکری بغیر ڈکار لیے ہمارا محنت ومحبت سے لکھا پورا کا پورا تبصرہ نگل گئی، اسے کہیں کچھ روزے بھی رکھ لیا کرے ثواب کے ساتھ صحت بھی اچھی رہتی ہے۔ (تم بھی اگر ہر ماہ خط بھیج دو تو تمہاری صحت بھی اچھی رہے) سرورق والی حسینہ کا حسن قابلِ دید تھا۔ ''احوال'' میں تمام اہلِ قلم نے بہت خوب لکھا مگر سچی کہانیاں کی کہانیوں پر سیر حاصل تبصرے کا رنگ بہت پھیکا رہا۔ من پسند ''مکھنی'' کا چارم اپنے عروج پر ہے یہ پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ 666، 322، 13 اور 33 کا ہندسہ وہ ہندسے ہیں جنہیں مختلف مقامات پر جادوگر اور شیطان کے پجاری قسم کے عامل غلط اور بُرے کاموں کے لیے استعمال کرتے ہیں اور ہزاروں ملٹی نیشنل کمپنیوں کی ہزاروں مصنوعات پر 666 کسی نہ کسی حالت میں نظر آتا ہے (وہ بھی دولت کے پجاری ہیں) ''آتش جنوں'' لہو رنگ داستان بہت زبردست جا رہی ہے۔ مجید احمد جائی صاحب: اللہ پاک آپ کے والد کے درجات بلند فرمائے اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے میں آپ کی تجاویز سے بالکل متفق ہوں جہاں اتنا مواد شامل ہے وہاں اسلامی صفحہ حمد ونعت کیوں نہیں؟ کنول عمران! دعا ہے اللہ پاک جلد از جلد آپ کو شفاء کاملہ نصیب فرمائے۔ رانا محمد شاہد صاحب! آپ نے صحیح لکھا ''غریب مکاؤ'' پروگرام کے بارے میں جب غربت بڑھے گی تو غریب خود ہی فاقوں سے بے موت مر جائیں گے۔ ''سفرنامہ، بارشوں کے شہر میں'' انڈونیشیا میں میڈیا کافی آزاد ہے اور خاص طور پر شراب کے اشتہار میں عریانی پر کوئی پابندی نہیں۔ خاتون الیکٹرانک سگریٹ لے کر کش لگاتی نظر آتی ہیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف ''خیام کی رباعی'' اور ''رکھیل'' تقریباً ملتی جلتی ہیں جس اس میں عورت کو مرد اپنی چکنی چپڑی باتوں سے بے وقوف بنا کر خوب عیاشی کرتے ہیں۔ ''جرم کی کوکھ'' بہت سبق آموز، اس کہانی میں جیل کی چار دیواری میں ہونے والے جرم کی نشاندہی کی گئی ہے ''جسے چاہا تھا'' بگڑتے ہوئے معاشرے کی عکاس تحریر ہے دوسری بہترین کہانی کچھ کچھ موبائل کہانی معلوم ہوتی ہے۔ شکر ہے

عندلیب کی آنکھیں کھل گئیں اور زندگی کی بہاریں پھر سے لوٹ آئیں۔ ''عادتِ بد'' اُف...... مالک یہ کیسا اندھیرا ہے قیامت سے پہلے قیامت کی نشانیاں ہیں۔ ''مجرم کون'' ہر رشتے میں حدود کا تعین بہت ضروری ہے باپ کا گھناؤنے اور مکروہ کردار نے انسانیت کے منہ پر طمانچہ مارا ہے پڑھ کر دل خون کے آنسو رونے لگا۔ تحسین جی! آپ کی بھینس تو چنگیز خان کی اولاد معلوم ہوتی ہے تب ہی تو سینگ چمکا رہی ہے۔ شہزادی تحسین جو تیجو اور افشاں جی! ذرا سنبھل کر کہیں آپ کی یہ سٹیس کوئی شہزادہ یا شہزادی نہ لے اُڑے۔ قرۃ العین زینب! کتاب کی اشاعت پر ڈھیروں مبارک باد آپ کا منورہ نوری خلیق والا خیال بالکل درست ہے تاریخی کہانیوں والا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہونا چاہیے دیکھیے ہم آپ کے حمایتی بن گئے ''شمع جلتی رہے گی'' اس ماہ کی ٹاپ کلاس کہانی، خونی رشتوں کی بے حسی اور بے قدری وقت کے ساتھ بڑھتی جارہی ہے مگر ہما کا انسان دوستی کا جلایا ہوا چراغ ساجد نے کبھی بجھنے نہیں دیا۔ ''ایک لمحے کی بھول'' تیسری بہترین کہانی سعید الدین کی جوانی میں ایک لمحے کی تسکین کے بدلے اللہ نے بھیانک سزا دے دی۔ ''آوارہ حسینہ'' میں لڑکی کا شوہر دبئی میں رہتا تھا اور وہ محض وقت گزاری کے لیے فلرٹ کررہی تھی۔ کیا لڑکیاں بھی اتنی ظالم ہوتی ہیں؟ (لڑکیاں ہی تو ظالم ہوتی ہیں ثمینہ!) آپ کی ڈائری سے ام عادل، عبدالعزیز جی آ، عمران گل سمیع کے انتخابات دلچسپ تھے۔ ٹوٹکوں کا سلسلہ بہت شاندار ہے شمارے کو چار چاند لگادیے۔ سیدہ حافظہ مون کے خیالات بہت عمدہ دل کو چھو جانے والے! ''پسند اپنی اپنی'' میں شائستہ احمد اور نادیہ کا شعر لاجواب تھا۔ آخر میں پروردگار سے دعا ہے کہ ہمیں اور آپ کو سچ کہنے، سچ پڑھنے اور سچ لکھنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین ثم آمین!

☒ روبینہ شاہین کراچی سے لکھتی ہیں۔ ایڈیٹر انچارج صاحب، السلام علیکم! نیک خواہشات اور بہت ساری دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں ایک طویل عرصے کے بعد سچی کہانیاں پڑھا اس شمارے کے ٹائٹل کا انتخاب بھی بہت ہی عمدہ تھا۔ سچی کہانیاں میں بہت ہی دلچسپ اور منفرد کہانیاں تھیں جس میں خطرناک حد تک سچائیاں بکھری ہوئی تھیں۔ اس سچائی کے لیے ادارہ اور تمام معاونین تحسین کے مستحق ہیں۔ اب کہانیوں کی جانب آتے ہیں۔ ''خیام کی رباعی'' مردوں کی بے اعتنائی سے پُر ایک تخلیق ہے جو ایک عمدہ کاوش ہے ''آوارہ حسینہ'' بہت بُرا ہوں، ہوس نے دن یہ دکھائے، دعا بددعا، جسے چاہا تھا، مجرم کون'' یہ سب کہانیاں اچھی تھیں اور شمارے میں باعث توجہ رہیں لیکن اس شمارے میں جو کہانیاں بہت زیادہ چھائی رہیں وہ ''عید کا جوڑا، کھیل، جرم کی کوکھ اور سربستہ راز'' ہیں عید کا جوڑا انسانی خواہشات کی تشنگی کی تصویر ہے۔ رکھیل ایک ایسی سچائی ہے جو ہمارے اردگرد کچھ معمولی سی تبدیلیوں کے ساتھ موجود ہے۔ ''جرم کی کوکھ'' میں اصلاح کرنے والوں کی ہی اصل تصویر پیش کی گئی ہے جو کہ ایک تلخ حقیقت ہے۔ اسی طرح اک سربستہ راز مصنف کی بہت ہی حساس اور اثر انگیز تحریر ہے جو کہ قیام پاکستان کے پس منظر میں لکھی گئی ہے اس کا ہر حرف دل و ذہن کو بیدار کر گیا۔ ''اختر شہاب'' صاحب کی تخلیق ''بارشوں کے شہر میں'' بہت ہی خوب صورت اور کومل سی تحریر تھی جو کہ اچھی لگی۔ اس شمارے میں تمام سلسلے بہت عمدہ ہیں ایک بات جو مجھے محسوس ہوئی وہ یہ کہ اس شمارے میں کہانیوں کے موضوعات میں کسی حد تک یکسانیت سی رہی بس ایک چھوٹی سی عرض تھی۔ (معاشرے میں اسی طرح کی برائیاں بکھری ہوئی ہیں روبینہ!) باقی تمام شمارہ بہت ہی اچھا ہے۔ اُمید ہے آئندہ شمارے قارئین کے لیے، بہت ہی دلچسپ اور منفرد ہوں گے۔ آپ سب کے لیے بے شمار دعائیں، اب اجازت!

☒ مریم شاہ بخاری بھی آخر آ ہی گئیں، لکھتی ہیں۔ محترم سلیم فاروقی انکل، السلام علیکم! اللہ تعالیٰ سے دُعا گو ہوں کہ وہ ذاتِ کریم آپ کی زندگی میں لازوال خوشیاں برسادے۔ اور آپ کے غم کے چھائے بادلوں کو کہیں دُور چھپادے۔ آمین ثم آمین۔ سلیم انکل ''احوال'' کی محفل سے غیر حاضر ہونے کو بالکل بھی جی نہیں چاہتا مگر کوئی نہ کوئی مجبوری آڑے آ ہی جاتی ہے۔ خیر اس بار تو پکا ارادہ کرلیا کہ چاہے کچھ بھی ہو ''سجناں دی محفل وچ حاضری ضرور لوانی اے'' (جے سجنانے بوئے اگے چک تان لئی تو فیر کی ہووے گا مریم؟) سو کاغذ قلم اُٹھایا اور اپنی سوچ کو لفظوں کی زبان دے ڈالی...... سب سے پہلے انکل جی یہ بتایئے کہ ہمارے پُرانے ساتھی کہاں گئے؟ پلیز ان کی گم شدگی کا اشتہار دیجیے، انہیں واپس بلوایئے...... خلیل جبار، اشعر جواد، مور شاہد حسین، ثانیہ بھٹی، شفق شکی، صدام حسین غازی، مستقیم نوشاہی، صفیان عثمانی، رابیل محفوظ عطاری، انکل انور فرہاد، نزہت جبیں ضیاء اور دیگر ہمارے رائٹرز پلیز پلیز آجائیں...... ہم آپ کی تحریروں کی منتظر ہیں (سب لوگ اللہ کے فضل و کرم سے بہ خیریت ہیں لیکن بس تمہاری طرح سست اور کاہل ہوگئے ہیں) اب ذرا ''سچی کہانیاں'' کی زینت بننے والی تحاریر کی طرف آتے ہیں...... ''خیام کی رباعی'' تسنیم منیر علوی کی اچھی کاوش تھی۔ ''موت کا عمل'' بشریٰ سعید صاحبہ کی ایک روایتی سی کہانی تھی مگر اس میں موجود سبق بہت جاندار اور شاندار تھا۔ بے شک وہ خالق کُل ہر شے پہ قادر ہے۔ ''شمع جلتی رہے گی'' انکل محمد سلیم اختر کی کہانی بہت زبردست رہی اسے پڑھتے ہی میرے ہونٹوں پہ گیت مچل اُٹھا'' یہ دنیا رہے نہ رہے میرے ہمدم، کہانی محبت کی زندہ رہے گی۔'''' جسے چاہا تھا'' مجید احمد جائی صاحب کی تحریر بھی اچھی رہی۔ بیسٹ اسٹوری ''دُعا بددعا'' رہی۔ حقیقت سے قریب تر اور احساسات کو جھنجوڑتی ہوئی کہانی...... زبردست اُمِّ عادل جی! باقی کہانیاں خاص متاثر نہیں کرسکیں۔ سلسلے وار کہانیاں تو ہیں ہی سچی کہانیاں کی آن بان شان...... شہید کی ڈائری کی بہت کمی محسوس ہوئی۔ آپی مزہ جی کیا ہوا؟ (مزہ صاحبہ اخبارات کے کالمز

سانحۂ ارتحال

ہمارے ادارے کے ساتھی ساجد علی خان کی بھابی گزشتہ دنوں رضائے الٰہی سے انتقال فرما گئیں، ادارہ ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ قارئین سے التماس ہے کہ ان کے حق میں دعائے خیر کریں اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور درجات بلند فرمائے۔

اور دفتری مصروفیات میں شدید مصروف ہیں) سلیم انکل! اس خط کے ساتھ ایک عدد کہانی بھی ہے۔ اُمید ہے کہ آپ کے معیار پر پوری اُترے گی۔ کمی بیشی دور کرنا اور اس کی نوک پلک سنوارنا آپ کا کام ہے (نوک پلک سنوارتے سنوارتے ہم ماہر بیوٹیشن تو ہو ہی چکے ہیں) آخر میں تمام قارئین اکرام اور سچی کہانیاں کے تمام اسٹاف کو سلام اور ڈھیروں دعائیں۔ خوش رہیں اور خوشیاں بانٹیں، فی امان اللہ!

☒ حافظہ مون شاہ بخاری، سرگودھا سے رقم طراز ہیں۔ تمام حمد و ستائش اللہ تعالیٰ کے لیے اور ہزاروں درود و سلام آنحضور ﷺ پر اور آپ ﷺ کے آل و اصحابؓ پر! محترم انکل سلیم فاروقی! السلام علیکم! عید قرباں کے متعلق آپ نے جو بھی فرمایا بالکل درست فرمایا۔ حرف حرف سچائی کے پیرہن میں ملبوس تھا۔ ماہ نومبر کی اکثر کہانیاں یکسانیت کا شکار تھیں البتہ رائٹرز نے محنت میں کمی نہیں کی۔ محترم انکل! میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ سال 2011ء کے آخر میں، میں نے ایک تحریر بعنوان ''دل دریا سمندر ڈونگے'' ارسال کی تھی تب محترم انکل ناصر مدیر خصوصی تھے۔ کیا وہ کہانی آپ کے پاس محفوظ ہے؟ اگر محفوظ ہے تو کب تک شائع کرنے کا ارادہ ہے؟ (ہمارے پاس تو غالباً محفوظ نہیں ہوگی۔ تم ہر کہانی کی فوٹو کاپی رکھا کرو) اور ایک گزارش ہے کہ میری تحریر ''آئینہ خانے میں'' جو کہ چند ماہ پہلے ارسال کی ہے اسے قریبی اشاعت میں شامل فرما کر ثواب دارین حاصل کریں، ہاہاہا۔ کیوں کہ اپنے نام و کام کے بغیر ''سچی کہانیاں'' ادھورا لگتا ہے۔ آپ میری بات سے متفق ہیں نا۔ (ایڈیٹر بلکہ ایڈیٹر انچارج کا مصنفین کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے) ویسے ''سچی کہانیاں'' میں جتنی دیر میں کہانی شائع ہوتی ہے اتنی دیر میں تو قارئین رائٹر کا نام بھی بھول جاتے ہیں اب دیکھیں نا! نئے قارئین اکرام مجھے تو آموز سمجھیں گے حالاں کہ ہم پورے دو سال پرانے رائٹرز میں شمار ہوتے ہیں اور ایک دو کہانی شائع ہونے کا اعزاز بھی رکھتے ہیں۔ (اس کے باوجود تم سچی کہانیاں میں اس طرح مشہور ہو جو لاحول پڑھتے ہی بھاگ جاتے ہیں) سابقہ ایڈیٹرز کے بارے میں دی گئی ''اطلاع'' پڑھ کر ساکت رہ گئی، بصارتوں کو یقین نہیں آرہا تھا مگر خیر، وہ جیسے بھی تھے مجھ سمیت کئی لکھاریوں کے محسن اور رہنما ہیں، اور ہمیں یہ بات بھولنی نہیں چاہیے، بہر حال اللہ تعالیٰ ہم سب کو محنت و دیانت سے کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ''سچی کہانیاں'' کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا کرے۔ آمین ثم آمین! آخر میں تمام پڑھنے والوں کو سلام و دعائیں! آنٹی رخسانہ اور آپی مزہ کو بھی سلام اور ڈھیروں دعائیں۔ (ان سطور کے ذریعے تمہارا سلام اور دعائیں ان تک پہنچ گئیں)

☒ حیدرآباد سے آصفہ ضیا احمد کا مختصر خط، انہوں نے سچی کہانیاں کی مدیرۂ اعلیٰ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے، محترم مدیرۂ اعلیٰ مزہ صاحبہ، السلام علیکم! ''ہم رقص'' کے بعد ''سچی کہانیاں'' کی بزم میں ''جھولا'' لے کر حاضر ہوئی ہوں، کافی طویل عرصے کے بعد آئی ہوں۔ اگر میری یہ تحریر ''سچی کہانیاں'' کے معیار پر پوری اُترتی ہے تو کسی قریبی شمارے میں جگہ دے کر ممنون فرمایئے گا۔ بہن نوازش ہوگی۔ کہانی کی اشاعت یا عدم اشاعت، دونوں صورتوں میں مجھے مطلع فرمایئے گا۔ اگر کسی وجہ سے آپ کے یہاں ناقابل اشاعت قرار پاتی ہے تو کہیں اور دستک دینی ہوگی اور پھر یہ خدشہ رہتا ہے کہ کہانی دو جگہ نہ چھپ جائے۔ اس لیے مجھے جواب ضرور دیجیے گا۔ ''سچی کہانیاں'' کے تمام اسٹاف کے لیے سلام خلوص اور دعائے فراواں! (آپ کو ہر دو صورت میں جواب ضرور دیا جائے گا)

☒ راولپنڈی سے عرصۂ دراز بعد ہمارے بہت پرانے قلم کار عبدالرؤف ''عبدالرؤف عدم'' تشریف لائے ہیں، لکھتے ہیں۔ محترم بھیا سلیم فاروقی السلام علیکم! ہماری واپسی یقیناً ''ٹارزن کی واپسی'' ہرگز نہیں کہ جس کا شہرہ ہر سمت ہوجائے، نہ ہی ہماری واپسی کسی وزیر، مشیر یا ''بڑے آدمی کے بینک سے لیے گئے'' ''قرض کی واپسی'' ہے جو عملی طور پر کبھی وقوع پذیر نہیں ہوتی لیکن جس کی شہرت چار دانگ عالم ہوتی ہے...... ہماری واپسی تو بس ایک سیدھی سادی سی واپسی ہے، ایک ایسی واپسی جس پر نہ تو کوئی اپنا سر کھجاتا ہے نہ کسی کے سر پر جوں رینگتی ہے۔ (جوں کا نام لیا تو تمام خواتین رائٹرز، برا مان جائیں گی) اور بہت سے لوگ تو ایسی واپسی کو سر آنکھوں پر لینے کو بھی تیار نہیں ہوتے لیکن اب چاہے کوئی اپنا سر دیوار

سے ٹکرائے یا آنکھیں ماتھے پر رکھ کر سامنے آئے، ہماری واپسی تو ہو چکی (آپ جم جم آئیں) ہم نے سنا ہے کہ جو خوشیوں کو تقسیم کرتے ہیں وہ ناقابل تقسیم لوگ ہوتے ہیں، اس لیے کوشش یہی ہوگی کہ ہماری واپسی ان لوگوں کی آنکھوں کو بھی خوشیوں کے رنگوں سے بھر دے، جنہوں نے ہماری واپسی کو دیکھ کر اپنی آنکھیں پھیر لی ہیں۔ ہماری واپسی صرف دو لوگوں کی مرہون منت ہے، ان میں سے ایک ہیں ہماری پیاری سی بہنا تحسین جونیجو، جن کی محبت بھری خواہش نے ہمیں قائل کر دیا کہ ہم اس محفل میں چار، چھ، آٹھ، دس جتنے ممکن ہو سکیں، چاند لگانے کے لیے واپسی کا سفر اختیار کریں۔ ہماری واپسی کی دوسری وجہ سلیم فاروقی بھیا ہیں، جن کی اپنی واپسی دھواں دھار طریقے سے احوال میں ہوئی، ان کی شاندار واپسی نے ہماری عام سی بیچاری سیدھی سادی واپسی کا سفر آسان کر دیا۔ نومبر کے شمارے کی سرورق کی حسینہ غالباً آنکھوں میں کسی کی واپسی کے خواب سجائے منتظر بیٹھی تھی۔ ''احوال'' میں فاروقی بھیا کا مختصر احوال زبردست رہا۔ افشاں نے تابڑ توڑ سوالات سے محفل کا آغاز کیا، غالباً وہ بھی احوال میں ''واپسی'' کا رنگ دکھا رہی تھیں، ملکۂ احوال بننے کے خاصے جراثیم نظر آئے ان میں قرۃ العین زینب بہنا، ہمیشہ کی طرح Decent تبصرے کے ساتھ موجود تھیں۔ رانا محمد شاہد کا رنگ بھی خوب صورت اور جدا نظر آیا۔ (کیا ان کے چہرے پر سرخی اور غازہ تھا؟) سدرہ انور علی! آپ کے انداز تحریر میں چاشنی بھی ہے اور دلکشی بھی (سدرہ! اب تم اچار بنانا شروع کر دو) ام عادل! آپ بھی محکمہ ڈاک والوں کی اعلیٰ معیاری سروس کا ''شکار'' نظر آئیں۔ کنول عمران! اللہ تعالیٰ آپ کو مکمل شفا عطا فرمائے۔ مجید جائی! آپ کے والد صاحب کا پڑھ کر افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ سنبل! مانگ کر پڑھنے سے خرید کر پڑھنا کئی درجہ بہتر ہے۔ یہ ہمارا تازہ قول ہے جو ابھی ابھی نازل ہوا ہے، تحسین بہنا، آپ کا حکم ہوا اور ہم پہنچ گئے، اب ہماری یہ واپسی کیا گل کھلاتی ہے، یہ تو کوئی باغبان ہی بتا سکتا ہے۔ ویسے ہماری نظر میں ''ملکہ'' کا لفظ آپ کے لیے تھوڑا بھاری ہے، ''شہزادیٔ احوال'' زیادہ مناسب ہے اور آپ پر سُوٹ بھی کرتا ہے، ناصر رضا صاحب کی مجرمانہ غفلت کے باعث ادارے سے برخاست ہونے کی خبر نے حیران بھی کیا اور پریشان بھی۔ کہانیوں میں ''خیام کی رباعی'' میں شاعرانہ رنگ ضرورت سے زیادہ ہی غالب تھا۔ (وہ خیام کی رباعی جو تھی) مشاہر کی بے وفائی اور کمینگی پر بے حد غصہ آیا۔ ''آوارہ حسینہ'' کے انجام نے حیران کر دیا۔ اب معلوم نہیں عاصم سچا تھا یا عائشہ، یا پھر دونوں ہی وقت گزاری کر رہے تھے۔ ''عادت بد'' اور ''مجرم کون'' دونوں کہانیوں میں باپ کے روپ میں درندے کو دکھایا گیا، ایسے باپ معاشرے کے منہ پر طمانچہ اور بڑی لعنت کے مستحق ہیں۔ افسوس ہمارا معاشرہ نہ جانے کس سمت جا رہا ہے۔ اب واصف علی واصف کے اس قول کے ساتھ اجازت ''جس کو احساس نہ جگائے، اسے کون جگا سکتا ہے۔'' زندگی رہی تو پھر واپسی ہوگی اس محفل میں۔ فی امان اللہ!

⊠ سہیل خان کراچی سے لکھتے ہیں، سلیم فاروقی صاحب السلام علیکم! اللہ آپ سب لوگوں کو خوش رکھے۔ آپ اور آپ کی پوری ٹیم بڑی محنت سے ہم سب لوگوں کے احوال بہت خوش اسلوبی سے ''سچی کہانیاں'' کی زینت بناتے ہیں اور جو سچ ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں اس لیے میں جب بھی لکھتا ہوں سچ لکھتا ہوں اور زیادہ تر کوشش کرتا ہوں اُن موضوعات پر لکھوں جو ہماری زندگی کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔ میں اپنی تحریر کے ذریعے اپنے غم کو ہلکا کرتا ہوں اور سچی کہانیاں میں بھیج دیتا ہوں۔ میں نے جب لکھا آپ نے سچی کہانیاں کی زینت بنایا۔ (کہانی اچھی اور سچی ہو تو وہ خود اپنے آپ کو منوا لیتی ہے سہیل!) جس سے میرا غم سمٹ کر خوشیوں میں تبدیل ہو جاتا ہے اور میرے دل سے آپ لوگوں کے لیے دعا نکلتی ہے کہ اللہ آپ سب لوگوں کو خوش رکھے اور مجھے اللہ کی ذات سے اُمید ہے کہ آپ اس حسرت کو بھی اپنی ڈائجسٹ کی زینت بنائیں گے۔

⊠ حیدرآباد سے خلیل جبار کی آمد! سلیم فاروقی صاحب، السلام علیکم! امید ہے کہ مزاج گرامی بہ خیر ہوں گے۔ ایک عدد موبائل کہانی ارسال کر رہا ہوں امید ہے کہ پسند آئے گی۔ اکتوبر کے شمارے میں آپ نے یہ اچھا کیا کہ پہلے ہی لکھ دیا کہ کس ماہ میں کون سا نمبر آئے گا اس طرح لکھنے والوں کو کہانی بھیجنے میں آسانی رہے گی۔ خطوط بھیجنے کی تاریخ میں اضافہ کیجیے۔ کیوں کہ 6 تاریخ تک تبصرہ بھیجنا بہت مشکل ہوتا ہے پورا پرچہ پڑھنا اور پھر اس پر تبصرہ کرنے میں وقت لگتا ہے پھر ہماری ڈاک کا حال بھی آپ کو پتا ہی ہے۔ (ہماری کوشش ہے کہ پرچہ آپ تک ہر ماہ کی بیس، بائیس تاریخ تک پہنچ جائے، پھر تو چھ تاریخ تک خط بھیجنا مشکل نہیں ہوگا نا؟) محمد فہیم صاحب کی تجویز اچھی ہے کہ سینئر رائٹرز کی نمائندگی ہونی چاہیے تاکہ توازن برقرار رہے۔ لیکن ایسا ممکن نہیں ہے، کیوں کہ انعامات کی تعداد کم ہے۔ اس میں بھی ہر ماہ کبھی 5 کبھی 6 انعامات خواتین رائٹرز کو دے دیئے جاتے ہیں ایسی صورت میں توازن کیسے برقرار رہ سکتا ہے۔ توازن برقرار رکھنے کے لیے اچھی کہانیوں کو انعامات دیے جائیں۔ انعامات کی فہرست دیکھ کر مرد رائٹر حضرات کو حوصلہ شکنی کی بجائے حوصلہ افزائی محسوس ہو۔ (مرد رائٹرز یا تو ستّ الوجود ہو گئے ہیں یا پھر کہانی بھیجنا ضروری نہیں سمجھتے۔ اب اس خلا سے خواتین رائٹرز ہی فائدہ اٹھائیں گی۔ خواہش کے باوجود ہم توازن برقرار نہیں رکھ سکتے کہ معدودے چند کے تمام اچھی کہانیاں خواتین ہی لکھ رہی ہیں۔ اس کے لیے مردوں کو میدان میں آنا ہی پڑے گا) سینئر اور جونیئر رائٹرز میں توازن برقرار رکھنے اور سینئر رائٹرز کا تعلق ادارے سے برقرار رہنے کے سلسلے میں میرے ذہن میں کچھ تجاویز ہیں جو آئندہ خط میں تفصیل سے لکھوں گا۔ ان تجاویز پر عمل کرنے سے

آپ کی سرکولیشن پر بھی اچھا فرق پڑے گا (بھائی خلیل جبار! ہم آپ کی ان تجاویز کے منتظر رہیں گے)

⊠ کراچی سے امین مراد انصاری کا خلوص نامہ! سلیم فاروقی صاحب، السلام علیکم! نومبر 2013 کا شمارہ سچی کہانیاں (4) نومبر کو مقامی بک اسٹال سے حاصل کیا۔ نومبر کے اس شمارے میں آپ کا اداریہ کوئی خاص نہیں تھا اداریہ لکھنے کے لیے شاید آپ کو کوئی موضوع نہیں ملا۔ ہاں البتہ بازگشت میں سہام مرزا مرحوم کے پرانے لکھے ہوئے اداریہ تبصرے اور تجرباتی رپورٹ آج کے حالات اور واقعات کی عکاسی کرتی ہیں، علامہ اقبال کا خواب پر لکھا گیا اداریہ بے حد پسند آیا۔ آپ کی ڈائری اور خیال آرائی بہت اچھا سلسلہ ہے، اسے جاری رکھا جائے، خطوط کے اس کالم میں اس مرتبہ بھی مجھے عائشہ خورشید انور کا دل چسپ خط بہت پسند آیا وہ لکھتی ہیں کہ میں ایک ہی سانس میں سارا رسالہ تو نہیں پڑھ سکی لیکن چاٹ ضرور لیا۔ عائشہ بہن کے خط بہت دل چسپ ہوتے ہیں میری دعا ہے کہ اسی طرح ہنستی ہنساتی رہو۔ اور ہاں انکل یہ تو بتایئے کہ کیا احوال میں شرکت کے لیے کوپن کاٹ کر بھیجنا ضروری ہے (کوپن چھاپا ہی اس لیے جاتا ہے کہ اسے خط کے ساتھ بھیجا جائے) سچی کہانی میں سچ لکھنے والوں کو میرا سلام!

⊠ بورڑی، ضلع دادو سے زرینہ جونیجو کی آمد! محترم عزیزم سلیم فاروقی صاحب، سلام عرض کرتی ہوں۔ السلام علیکم! براہ راست آتی ہوں شمارے کی جانب۔ فرنٹ پیج قطیب پسند نہیں آ رہا پڑھنے میں دشواری کرتا ہے پلیز اس کو بند کر دیجیے۔ اور آپ جو نیا سلسلہ شروع کر رہے تھے روحانی نمبر اس کو بند کر کے اچھا نہیں کیا۔ (روحانی نمبر اور پراسرار نمبر میں زیادہ فرق نہیں ہے زرینہ! اس لیے ادارے نے اسے شائع نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے) ایک نظم بھیجی ہے امید ہے جلد شائع کریں گے۔ (امید پہ تو دنیا قائم ہے) ہم سندھی جیجل پھپھو کو کہتے ہیں (ہمیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے زرینہ بی بی!) سدرہ انور یہ تیسرا مہینہ ہے میں مسلسل حاضری لگوا رہی ہوں، آئندہ بھی کوشش کروں گی (کیا سدرہ حاضری بھی لیتی ہیں؟) سلیم فاروقی صاحب! میرا اقتباس شائع کرنے کا شکریہ۔ آپی رضوانہ کوثر، کوثر سعید، افشاں لاہور، سعید انور سعید کو سلام اور دعائیں۔ (ان سطور کے ذریعے تمہارا سلام اور دعائیں ان تک پہنچ گئیں) اس بار کوئی کہانی نہیں پڑھ پائی اس لیے تبصرے سے معذرت! (یہ کیسی حاضری ہے زرینہ؟ یہ تو کسی سرکاری دفتر کی حاضری لگ رہی ہے جہاں نکتے ملازمین حاضری لگا کر غائب ہو جاتے ہیں)

⊠ بورڑی شریف سے یہ خط تحسین جونیجو کا ہے، لکھتی ہیں محترم سلیم فاروقی انکل، السلام علیکم! امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ پر خلوص دعائیں آپ کے نام! خیر سے ماہ اکتوبر شادیوں کے فنکشنز اٹینڈ کرنے میں ہی گزر گیا اور پھر شمارہ بھی لیٹ یعنی 2 نومبر کو موصول ہوا تو ایک

اطلاعِ عام

ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' اور ماہنامہ ''دوشیزہ'' کے قارئین، مصنفین اور تمام ایجنٹس کو مطلع کیا جاتا ہے کہ ناصر رضا (سابق مدیرِ خصوصی ''سچی کہانیاں'') اور راجا محمود (سابق مدیر ''سچی کہانیاں'') کو کام سے کوتاہی اور مجرمانہ غفلت کے باعث ادارے نے ملازمت سے برخاست کر دیا ہے۔

اب ان دونوں حضرات کا ادارے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان دونوں حضرات سے کسی بھی قسم کے لین دین یا کسی بھی معاملے کا ذمے دار ادارہ نہ ہوگا۔

(ادارہ)

بھی تحریر پڑھنے کا وقت نہیں ملا۔ معذرت خواہ ہوں مس رائٹرز خاص طور پر اپنے اچھے بھیا ارشد علی ارشد، سلیم اختر انکل، اسماعیل بروہی بھائی، کاشی چوہان بھائی اور بیشتر سے کہ بنا پڑھے میں تبصرے کی قائل نہیں۔ اداریہ میں انکل کی ''عید قرباں'' پسند آئی، آغاز احوال میں ساجد صاحب کا احوال بھی پر لطف رہا۔ ان کی دی ہوئی خبروں سے بیٹھے بٹھائے نیا موضوع ملے گا۔ پھر اس سے کہانی بھی تیار ہو جائے گی۔ یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ افشاں ہمارا ریکارڈ توڑ پاتی ہیں یا...... الحمد اللہ ہم بھی پر عزم ہیں، خالی دعویٰ نہیں، ثابت کرنا پڑتا ہے۔ یہاں کئی آئے، چھائے اور چلے گئے۔ (افشاں نے کب یہ دعویٰ کر دیا کہ وہ تمہارا ریکارڈ توڑیں گی؟) ناصر سلیم صاحب! ہمارے پیر سائیں سید مستقیم نوشاہی بھائی ہیں۔ اور ان سے ملاقات کا شرف بھی ما بدولت کو حاصل رہا ہے (بھئی کبھی ہماری ملاقات بھی ان سے کراؤ تحسین!) کوثر سعید آپی وعلیکم السلام! بہت دن بیت گئے آپ نے اپنی خوبصورت آواز کا جادو نہیں جگایا؟ کیا کروں مجھے بھی وقت مل نہیں سکا، اب کوشش کروں گی۔ سدرہ انور وعلیکم السلام، صدقے جاؤں ملکہ احوال بنانے کے۔ الحمد اللہ میں اچھی ہوں، آپ کیسی ہیں؟ آپی کو بھی ساتھ لائی ہوں، حساب کتاب پورا کر لو، خوش رہو۔ اوا اسماعیل بروہی! ہم کسی کو نہیں بھولتے، شاید آپ ہی نے فراموش کر دیا تھا، آخر بہن کا خیال آ ہی گیا، میں بھی یہی سوچ رہی تھی کہ آپ کو یاد ہوں یا نہیں، خوش رہیے۔ فہیم انکل آپ کو سالگرہ کی ایڈوانس مبارک! آپ کی سالگرہ 8 دسمبر کو ہوتی ہے نا! آپ کی ڈائری میں شعبان کھوسہ بھائی کا انتخاب بہت پسند آیا۔ انکل، آریان عربی زبان کا لفظ ہے اور معنی خوشبو ہے اور اب خیر سے 29 اکتوبر کو ہمارے بھتیجے یعنی آریان کے بھائی محمد روبیش کی اس دنیا میں آمد ہوئی ہے، اب انکل کہیں گے روبیش کے معنی کیا ہیں تو یہ جنت کے درخت روبشہ سے روبیش نکلا ہے۔ (ہم نے کب پوچھا کہ روبیش کے معنی کیا ہیں؟ ویسے روبیش کی آمد بہت بہت مبارک ہو تحسین!) اب اجازت، اللہ حافظ

✉ بالکل آخری لمحات میں لاہور سے افشاں بھی آ ہی گئیں، لکھتی ہیں محترم انکل سلیم فاروقی، السلام علیکم! امید ہے کہ مزاج گرامی بہ خیر ہوں گے۔ مجھے البتہ آج کل شدید نزلے اور زکام کی شکایت ہے، موسم بدلتا ہے تو ہمیشہ میرے ساتھ یہ ہی ہوتا ہے۔ (اس کا ایک فائدہ بھی ہے افشاں! باہر کے ساتھ انسان کے اندر کے موسم میں بھی خوش گوار تبدیلیاں ہوتی ہیں) انکل! ویسے، کیا ہوتا ہے خزاں بہار کے آنے جانے سے، سب موسم ہیں دل کھلنے اور دل مرجھانے سے! (افشاں! تم نے تو فوراً ہی ہماری بات کی نفی کر دی) اور مجھے ملکہ، شہزادی یا پرنسس بننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ احوالی اپنے طور پر ہی کبھی ملکہ بناتے ہیں، کبھی اس سنگھاسن سے گھسیٹ کر نیچے اتار دیتے ہیں۔ تحسین جونیجو صاحبہ! مجھے آپ ہی ملکۂ احوال لگتی ہیں۔ آپ ''سچی کہانیاں'' میں مجھ سے سینئر بھی ہیں اور احوالیوں میں مقبول بھی ہیں۔ میں تو سیلانی طبیعت کی ہوں۔ آج کل کچھ فراغت تھی تو سوچا کہ ''احوال'' میں خط ہی لکھ دوں۔ مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ وہ چھپ بھی جائے گا۔ ممکن ہے میرا موجودہ خط شائع نہ ہو۔ (کیوں بھئی، تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟) اب ذرا نومبر کے شمارے پر بات ہو جائے۔ سرورق پر چھپاں ماڈل یوں بیٹھی تھی جیسے اسے زبردستی بٹھایا گیا ہو۔ معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ اب یہ دلہنوں والے ٹائٹل نہ ہی دیں تو اچھا ہے۔ فہرست البتہ پہلے کے مقابلے میں بہت اچھی تھی۔ اداریہ بھی کوئی ایسا خاص نہیں تھا۔ عوام تو گزشتہ آدھی صدی سے قربانیاں دیتے آئے ہیں اور یہ قصائی حکمراں کبھی جمہوریت کے پردے میں اور کبھی مارشل کی چھتری تلے انہیں ذبح کرتے رہے ہیں اور یہ سلسلہ رکنے کے کوئی آثار بھی نہیں ہیں۔ میں نے ابھی صرف چند کہانیاں پڑھی ہیں۔ آوارہ حسینہ، عادت بد، مجرم کون اور آتشِ جنوں۔ ''عادت بد'' اور ''مجرم کون'' ''آوارہ حسینہ'' واقعی معاشرے کی عکاس ہے۔ شوہر تو بچوں کے مستقبل اور اچھے معیار زندگی کی تلاش میں صحرا کی خاک چاٹ رہے ہوتے ہیں اور بیویاں کبھی محلے کے کسی آوارہ نوجوان سے، کبھی بچوں کے ٹیوٹر سے دل لگی فرما رہی ہوتی ہیں۔ لعنت ہے ایسی عورتوں پر۔ انکل، آتشِ جنوں کا ٹیمپو ذرا سست رکھیں، اسے پڑھتے ہوئے ہم جیسوں کا سانس اُکھڑنے لگتا ہے۔ فی الحال اتنا ہی۔ ملکۂ احوال کو پسند آ گیا تو سمجھوں گی میری محنت وصول ہو گئی لیکن پہلے تو خط کی شمولیت ہی ضروری ہے۔ اب اجازت دیں۔

اب تک ہمیں جو خطوط موصول ہوئے ہیں وہ سب ''احوال'' میں شامل کر دیے گئے ہیں۔ اب جو خطوط موصول ہوں گے، ان کی صرف رسید ہی دے سکیں گے۔

بعد از وقت موصول ہونے والے خطوط

رانا محمد شاہد، بورے والا، رممتاز احمد، سرگودھا، رساحل ابڑو، ڈیرہ اللہ یار خان

اس کے ساتھ ہی اجازت دیں، پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔

آپ کی دُعاؤں کا طالب
سلیم فاروقی

نمایاں شخصیات
سچے واقعات

اِس عنوان کے تحت، اِس ماہ تاریخ کے اُس زندہ جاوید کردار کی کہانی، جس کی مثالیں آج بھی دی جاتی ہیں

راجہ پورس

احمد سجاد بابر

وہ شاہکار کردار جسے صفحۂ قرطاس پر احمد سجاد بابر کے قلم نے منتقل کیا



دھرتی کے اس سپوت کی داستان جو مغربی اور یونانی مؤرخین کے تعصب کے باعث تاریخ کی گرد میں دب کر دھندلا گیا۔ وہ شیر دل جری جنگجو جس نے مقدونیہ سے اُڑ کر آتے اس بگولے کا راستہ روکا جو راستے کی ہر رکاوٹ کو تنکوں کی طرح بکھیرتا چلا آرہا تھا۔ اس کی ہیبت سے یونانی سپاہی دہل گئے اور اس کی جوان مردی سکندر کو

پریشان کر گئی، اس نے آخری سانس تک دھرتی کی حفاظت کا عہد کیا ہوا تھا، دھڑکنیں منتشر کر دینے والی داستانِ شجاعت!!

ڈھائی ہزار سال قبل، دریائے جہلم کے کنارے ٹلہ جوگیاں کے بے آب و گیاہ میدانِ جنگ میں خوں ریز لڑائی جاری تھی۔ صفیں الٹ رہی تھیں۔ ہاتھی چنگھاڑ رہے تھے۔ وہ اپنی سونڈ میں دشمن سپاہی کو لپیٹتے اور چشم زدن میں زمین پر دے مارتے۔ یہی حشر وہ ہتھیاروں کے ساتھ کر رہے تھے۔ گھوڑے ہنہنا رہے تھے۔ گھڑ سوار بجلی کی طرح لپک رہے تھے۔ ہتھیاروں کے ٹکرانے کی آوازیں ہیبت اور طبل و نقاروں کی گونج وحشت طاری کر رہی تھی، توپوں کا بے دریغ استعمال جاری تھا۔ تلواروں کی جھنکار اور تیروں کی سنسناہٹ حوصلوں کو مہمیز دے رہی تھی۔ ایک دیوہیکل ہاتھی پر ایک قوی اور طویل قامت شہ زور جوانمردی سے دشمن پر ہیبت طاری کر رہا تھا۔ اس کی چھاتی عام سپاہیوں سے دُوگنی تھی۔ وہ جو نیزہ پھینکتا، دشمن کو چیرتا چلا جاتا۔ دشمن اس بہادر سپہ سالار کو حیرت اور ستائش بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے، اس کا جسم زخموں سے چُور تھا، کندھے پر کاری زخم تھا مگر حوصلے ہمالیہ سے بلند تھے۔ وہ اپنی دھرتی کی حفاظت کا عزم لئے میدان میں اترا تھا۔ دشمن ایران، وسط ایشیا اور افغانستان کو روندتا ہوا یہاں تک آن پہنچا تھا مگر وہ ایک آہنی چٹان کی صورت سامنے کھڑا تھا!!

☆☆☆☆

پورس کے خاندان اور بچپن کے حالات تاریخ کی گرد میں دفن ہیں۔ مشہور دیو مالائی داستان مہا بھارت اور رگ وید کی رو سے ''پوروا/پاؤروا قبیلے'' کے سردار کا نام پورس تھا جسے مہا بھارت میں پاؤرس کے نام سے جانا جاتا تھا۔ پورس چناب اور جہلم کے درمیانی علاقے پر حکمران تھا۔ مشہور مؤرخ کرنل جیمز ٹاڈ کے مطابق پورس مہاراجہ شوراسینا کی نسل سے تھا۔ یہ وہ دور تھا جب پنجاب جنگوں کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ یہاں اقتدار کا کھیل جاری تھا، بیرونی حملہ آور یہاں آرہے تھے۔ ایرانیوں اور یونانیوں کی چپقلش جاری تھی۔ پورس کے پڑوس میں ہی ٹیکسلا کے علاقے پر امبھی خاندان کا سردار امبھی حکمران تھا جو پورس کا دشمن تھا۔ راجہ امبھی کی سلطنت میں پوٹھوہار، ہزارہ، راولپنڈی، اٹک، جہلم، میانوالی، خوشاب، بھکر اور مظفر گڑھ کا علاقہ شامل تھا۔ اسی طرح راجا پورس کا ہم نام، پورس جونیئر، جو اس کا بھتیجا بھی تھا، چناب اور راوی کے درمیانی علاقے پر حکومت کرتا تھا، پورس جونیئر بھی اپنے معاملات میں چچا کی مداخلت پسند نہ کرتا تھا اور اندرونِ خانہ راجا پورس کا مخالف تھا۔

اس زمانے میں یونان اور ایران روایتی دشمنی کا شکار تھے۔ ایران پر دارا ثالث تخت نشین ہوا تو اس نے جہلم کے نواحی علاقے ''دارا پور'' کو فتح کیا اور یہاں اپنا جھنڈا گاڑا، اس جگہ کا نام ''جائے علم'' رکھا جو بگڑ کر جہلم بن گیا۔ اس نے یونانیوں سے تین جنگیں لڑیں اور عبرتناک شکست کھائی۔ یونان پر ارسطو کا شاگرد سکندر اعظم حکومت کر رہا تھا جو مقدونیہ میں پیدا ہوا، یونان میں مقدونیہ کو پس ماندہ علاقے کے طور پر جانا جاتا تھا اور ایتھنز کے مقابلے میں اس کو کوئی اہمیت نہ تھی۔ سکندر کا باپ فلپ مقدونیہ کا بادشاہ تھا۔ فلپ کو ایک دعوت میں جاتے وقت ایک امیر نے چھرا گھونپ کر ہلاک کیا جس کی وجہ سے سکندر کو کم عمری میں تخت سنبھالنا پڑا، اس نے اپنی حکومت پورے یونان پر پھیلائی۔ دارا کی سکندر سے دشمنی کی وجہ یہ تھی کہ دارا یونان کے ساحلوں پر لوٹ مار کرتا رہتا تھا اور اس نے سکندر کو قتل کروانے کی کوشش بھی کی تھی، سکندر نے دارا کو سبق سکھانے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆☆

دربار کا جاہ و حشم دیکھنے کے لائق تھا، پورس ایک اونچے تخت پر براجمان تھا۔ اس کے جسم پر اس وقت بھی جنگی لباس تھا۔ چہرے پر چھائی گمبھیرتا کی وجہ سے دربار میں خاموشی طاری تھی۔ پورس کے اہم کمانڈر دربار میں موجود تھے۔ تھوڑے توقف کے بعد راجا پورس نے خامشی کا قفل توڑا۔

''ایرانی بادشاہ دارا نے ہم سے سکندر کے متوقع حملے کے خلاف مدد طلب کی ہے۔ آپ سب کیا کہتے ہیں اس بارے میں۔''

راجا پورس نے سوالیہ نظروں سے درباریوں کی طرف دیکھا۔

"مہاراج! اے راجاؤں کے راجہ، آپ کی راجدھانی پھلے پھولے! میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔"
ایک وزیر نے کھڑے ہوکر ادب سے کہا۔
"ہاں ہاں، کیوں نہیں، تمہیں اجازت ہے۔"
"مہاراج، یہ حقیقت ہے کہ راجا امبھی ہمارا دشمن ہے، اس کا سکندر سے رابطہ ہے پھر آپ کا بھتیجا بھی دل میں عناد رکھتا ہے۔ آج سکندر دارا کو شکست دے گا تو اس کا اگلا پڑاؤ جہلم کے اس پار آپ کی سلطنت ہوگی۔ ہمیں دارا کے ہاتھ مضبوط کرنے چاہئیں، باقی جو مہاراج کی مرضی ہو۔"
"ہونہہ۔"
پورس نے ہنکارا ابھرا، تھوڑی سوچ و بچار کے بعد اس نے کہا۔
"ہمیں تمہاری تجویز پسند آئی مانکے رام۔ ٹھیک ہے، دارا کو اطلاع کردی جائے کہ ہم اس کی مدد کو آرہے ہیں۔"
پورس نے دربار برخواست کرنے کا اعلان کیا۔
مشہور شاعر فردوسی نے دارا کی مدد کی درخواست کو شاعری کا رنگ اس طرح دیا۔
اے سرزمینِ ہند کے حکمراں
تم دانا، تم بے مثل اور محسوس کرنے والی
روح کے مالک!!
میری بدقسمتی کی داستان سنو
سکندر روم سے فوجوں کے ساتھ
ہماری سرزمین پر گھس آیا ہے
کوئی فوج، کوئی آبادی، رشتہ دار اور بچے
تاج یا تخت شاہی یا شاہی دبدبہ، خزانہ یا مال
ہمارے لیے باقی نہیں چھوڑا!!!
اب اگر تم میری مدد کروگے
اور پرے رکھوگے مجھ سے تباہی
تو میں ضرور روانہ کروں گا
قیمتی جواہرات اپنے خزانے سے
تاریخ میں زندہ رہوگے تم
دنیا سلام کرے گی تمہیں!!!
پورس نے دارا کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا اور ہاتھیوں کا دستہ بھیجا۔ دارا نے اپنی بچی کھچی فوج جمع کی اور دریائے فرات کے کنارے سکندر کا مقابلہ کیا مگر اس کی فوج میں بددلی اور مایوسی پھیل چکی تھی۔ صرف 300 سپاہیوں نے اس کا ساتھ دیا اور سکندر کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ سکندر کی یلغار نہ سہہ سکا، بعد میں ایرانی سرداروں نے دارا کو قتل کر کے سکندر کی اطاعت قبول کر لی۔ پورس کا ہاتھیوں کا دستہ جس وقت پہنچا تو دارا قتل کیا جا چکا تھا۔
سکندر نے دارا پر تو فتح حاصل کرلی مگر اسے تشویش ہوئی کہ ابھی ایک ایسا جری انسان موجود ہے جو اس کے مقابلے پر کھڑا ہوسکتا ہے لہٰذا اس نے دیوتاؤں سے پورس کے خلاف لڑنے کا وعدہ کیا اور افغانستان کے راستے پنجاب پر چڑھائی کا مصمم ارادہ کرلیا!!

☆☆☆☆

مئی 327 قبل مسیح میں سکندر اعظم نے ہندوستان کی طرف پیش قدمی شروع کی۔ اس کی اس مہم کے پیچھے پوری دنیا کو فتح کرنے کا خواب تھا۔ ٹیکسلا کے راجہ امبھی نے سکندر کو ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔ راستے میں جتنے پہاڑی قبائل آتے گئے، سکندر ان سب کو روندتا چلا گیا۔
آفریدی قبیلے کے ایک سردار افریکس نے سکندر سے مقابلہ کرنا چاہا تو اس کی اپنی ہی فوج نے بغاوت کردی اور اس کا سر کاٹ کر سکندر کو پیش کر دیا۔ سکندر کی میزبانی کے لیے راجہ امبھی تیار تھا جس نے سکندر کے لشکر کی ایک ماہ تک میزبانی کی۔ سکندر نے پورس کو ایلچی کے ذریعے اطاعت قبول کرنے کا پیغام بھیجا۔
"پورس اطاعت قبول کر کے اپنی سرحدوں پر آ کر مجھ سے ملو۔"
پورس نے جواب دیا۔
"ہاں، میں ضرور ملوں گا لیکن یہ ملاقات میدانِ جنگ میں ہتھیاروں کے سائے میں ہوگی۔"
راجہ امبھی نے سکندر کو چھپن ہاتھی تحفے کے طور پر پیش کئے۔ اس کے علاوہ ایک بادشاہ سے سکندر نے تیس ہاتھی مزید چھینے، اس طرح اس کے لشکر میں چھیاسی ہاتھی جمع ہو چکے تھے۔ راجہ امبھی نے پانچ ہزار سپاہیوں کا لشکر بھی سکندر کے حوالے کیا۔
راجہ پورس کے پاس ایک مضبوط سپاہ موجود تھی۔ سپاہیوں کا اوسط قد 6 فٹ تھا، ساز و سامان میں منجنیق، رتھ، بگھیاں، گھوڑے، ہاتھی، بحری جہاز، اونٹوں کے قافلے، زخمیوں کی منتقلی کے لیے رتھ اور بگھیاں شامل تھیں۔ کمانیں، ہڈی اور لوہے کے بنے 3 گز لمبے تیر، ڈھال، سر کی حفاظت کے لیے خود، کلہاڑے، خنجر، چھریاں، جسم کی حفاظت کے لیے زرہ، میدانِ جنگ میں دشمن کی صفوں میں گھسنے کے لیے بگھیاں اور گھڑ سوار۔ اس دور میں ہندوستان میں گھوڑوں کے منہ میں لگام نہیں ڈالی جاتی تھی بلکہ ان کے منہ پر بیلوں کی طرح کے کھوپے چڑھا کر ان کی سمت کنٹرول کی جاتی تھی۔ پورس کی فوج کی اہم طاقت ہاتھی تھے، ہاتھیوں کی ایک قطار فوج کے آگے آگے چلتی تھی، دیو ہیکل جانور اونچی نیچی زمین کو ہموار بناتے، جھاڑیاں جھنکار روندتے، دشمن کی صفوں کو درہم برہم کرتے، ان کے پڑاؤ میں آگ لگاتے اور اپنے خیمے میں لگی آگ سونڈ میں پانی بھر کر بجھاتے۔ ہاتھیوں کو قلعوں کے دروازے، ستون، حصار توڑنے اور حریف فوج کو دہشت زدہ کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ ہاتھی پر مہاوت کے علاوہ تین تیر انداز سوار ہوتے تھے، دو دائیں بائیں اور ایک پیچھے کی جانب تیر پھینکتا تھا۔ ہاتھی کے منہ کو تانبے یا فولادی پتیوں سے ڈھکا جاتا اور باہر کے دانتوں پر تیز دھار تلواریں باندھی جاتیں، مشہور مؤرخ ڈایوڈورس بیان کرتا ہے کہ پورس کی فوج میں 50 ہزار پیادے، تین ہزار شہسوار، ایک ہزار بگھیاں اور 130 ہاتھی موجود تھے۔ بلاشبہ راجہ پورس کی فوج ایک مضبوط اور منظم فوج تھی۔
سکندر کے پاس بھی جدید ساز و سامان سے مزین فوج تھی۔ آہنی زرہ پہنے پیادہ دستے جن میں پانچ ہزار سپاہی تھے۔ تلوار، منجنیق، کھانڈے، ہلکے نیزے اور تلواریں، خود، چھاتی اور کولہوں کی حفاظت کے لیے پلیٹیں، لمبی ڈھال، 24 فٹ لمبائی اور 16 فٹ پھل والے نیزے، 5300 شہسواروں کے لشکر، ایسے تیر جو فولادی ڈھال کو بھی پھاڑ دیں، 86 ہاتھی اور راجہ امبھی کے پانچ ہزار سپاہی اس کی سپاہ کو مضبوطی بخش رہے تھے

☆☆☆☆

پورس کی طرف سے شرائط مسترد ہونے کے بعد سکندر نے جہلم کی طرف چڑھائی کا پختہ ارادہ کرلیا۔ پورس کی فوج موجودہ "کھوہار" کے مقام پر سکندر کی منتظر تھیں۔ چنگھاڑتا دریائے جہلم اس کی راہ میں رکاوٹ بن رہا تھا۔ پورس بھی اپنی بھاری فوج کے ساتھ جہلم کے دائیں کنارے آباد ہوگیا تاکہ سکندر دریا عبور نہ کرسکے۔ سکندر نے دریائے سندھ کو عبور کرنے کے لیے جو کشتیاں استعمال کی تھیں ان کو دریائے جہلم کے کنارے لاکر پل بنانے کا حکم دیا، سکندر کے ہمراہ اس کی اپنی اور راجہ امبھی کی فوج تھی۔ بارشوں کی وجہ سے دریا عبور کرنا مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ سکندر ٹلہ اور روہتاس کے علاقوں سے ہوتا ہوا جلال پور شریف (موجودہ جہلم میں پنڈ دادن خان کی ایک یونین کونسل) کے پاس دریائے جہلم کے کنارے آن پہنچا اور وہیں خیمے لگانے کا حکم دے دیا۔

☆☆☆☆

وہ ایک طوفانی بارش والا دن تھا۔ سکندر دریائے جہلم کے کنارے ٹہل رہا تھا۔ چہرے پر پریشانی مکڑی کے جالوں کی طرح ثبت تھی۔ دریا کے دوسری جانب پورس کی فوج خیمہ زن تھی۔ یہاں سے دریا کا پاٹ 809 گز وسیع تھا، اتنی وسعت کے باوجود دریا کی سرکشی میں ذرّا برابر بھی کمی نہیں آئی تھی۔
"کیسے عبور کیا جائے یہ طوفانی دریا۔ وقت نہیں ہے میرے پاس۔ سپاہ گھروں کی دوری سے بددل ہے، جو بھی کرنا ہے جلد کرنا ہے۔"
سکندر نے اپنے آپ سے سرگوشی کی۔
سکندر نے اپنے قابل جرنیلوں کا اہم اجلاس طلب کرلیا۔ کلی توس، اینی جینونس، ملیاگر، اٹیلس، گارجیا، پولی پارکان، الکتاس، ساکوس، نکانور اور سب سے اہم جرنیل کوئنوس موجود تھے۔
"ڈلفی مندر کے پیروکارو، تمام حالات آپ کے سامنے ہیں، دریا اور بارش پہاڑ بن کر راستے میں حائل ہیں۔ ہمیں کیا کرنا ہے، کب کرنا ہے، یہی آپ لوگوں کو بلانے کا مقصد ہے۔"
سکندر نے مقصد بیان کیا۔
"شاہِ زماں، آرس دیوتا ہم پر اپنا ہاتھ رکھے۔ ہمیں پہلے تو دریائے سندھ پر پل بنانے والی کشتیاں یہاں منگوا

لینی چاہیے، ہمیں ان کی ضرورت پڑے گی۔ اس کے علاوہ ہمیں اپنا لشکر مختلف دستوں میں تقسیم کر کے دریا کے ساتھ ساتھ پھیلا دینا چاہیے تاکہ دشمن کو اندازہ نہ ہو سکے کہ ہماری توجہ کس مقام پر زیادہ ہے۔"

یہ الکٹاس تھا جسے جنگی چالوں میں مہارت حاصل تھی۔

سکندر نے جنرل کوئنوس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"دیوی ایتھینا ہم پر اپنا سایہ قائم رکھے۔ میرا خیال ہے ہمیں پورس کی فوج کو یہ تاثر دینا چاہیے کہ ابھی ہم دریا عبور کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تاکہ وہ سست پڑ جائیں۔ اس کے لیے ہمیں آپ کی شکل وصورت سے مشابہ شخص کو تاج اور لباسِ فاخرہ پہنا کر سامنے رکھنا چاہیے اور خود کو عیش وعشرت میں مشغول دکھانا چاہیے، تاکہ وہ بھی عیاشی کی طلب کرنے لگیں۔ اس دوران ہم دریا کے کنارے کنارے کمزور مقام ڈھونڈ سکتے ہیں۔"

جنرل کوئنوس کی رائے پر سکندر کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"اب ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔ دیوتا ہرمیس ہمیں راستہ دکھائے گا اب، ہمیں تمہاری تجاویز پسند آئیں۔ کوئنوس! ان پر عمل کا انتظام کرو۔"

جنرل کوئنوس نے جھک کر سکندر کو تعظیم دی۔ اجلاس برخواست کر دیا گیا۔

آج سکندر مطمئن تھا۔

☆☆☆☆

مئی سے جون تک کا وقت اسی بے چینی، کشمکش اور موقع کے انتظار میں بیت گیا۔ جہلم بدستور ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ سکندر کی فوج کسی مناسب جگہ کے انتظار میں تھی جہاں سے دریا عبور کیا جا سکتا۔ سکندر نے فوج کئی حصوں میں تقسیم کر کے بکھیر دی تاکہ پورس اس کے عزائم کا اندازہ نہ لگا سکے۔ انتظار تھا کہ کب برسات کا موسم ختم ہو اور دریا کا پانی اترے۔ پورس کے سپاہی چوکنا اور دریا پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ سکندر کی فوج پر جھپٹنے کے لیے تیار تھے، مگر سکندر کی فوج پلاننگ کے تحت بے فکری ظاہر کر رہی تھی۔ وہ ہمہ وقت کھیل تماشوں میں مشغول رہتے جبکہ سکندر کے دستے دریا کے کنارے کنارے میلوں دور نکل جاتے تاکہ کوئی مناسب جگہ مل سکے جہاں سے دریا عبور کیا جا سکے۔

سکندر نے اپنے ایک ہم شکل افسر کو تاج اور شاہی لباس پہنا کر لشکر میں رکھا تاکہ دوسرے کنارے سے پورس کی فوج سکندر کو لشکر کے درمیان پا کر مطمئن رہے۔ سکندر کو آخر کار 17 کلومیٹر دور ایک مناسب جگہ مل گئی جہاں سے دریا عبور کیا جا سکتا تھا۔ یہ جگہ موجودہ منگلا کے جنوب مشرق میں واقع تھی۔ سکندر نے پانچ ہزار سپاہیوں کے ایک دستے کو کمک کے طور پر پیچھے رکھا۔ کشتیوں کے حصے الگ الگ کر کے درختوں میں چھپائے ہوئے تھے۔ ان کو نکال کر جوڑ لیا گیا۔ سپاہیوں کے جسم پر حفاظتی کھالیں چڑھا کر سی دیا گیا۔ سکندر ایک 30 چپوؤں والی کشتی پر سوار تھا۔ یہ ایک طوفانی، موسلا دھار بارش والی رات تھی جب بجلی کی کڑک دل دہلا رہی تھی۔ راستے میں اس کی فوج نے ہمت ہار دی۔ بپھرتا دریا ان کے قدم اکھاڑ رہا تھا۔ سپاہیوں کے حوصلے جہلم کی تندی نے اکھاڑ دیے مگر سکندر نے اپنی سپاہ سے خطاب کیا۔

"اے اہلِ ایتھنز! کیا تم یقین کرو گے کہ تمہاری وفاداری اور خوشی کے لیے مجھے کتنے خطرات سے گزرنا پڑا۔"

اس جذباتی خطاب پر مقدونوی سپاہی حوصلے میں آ گئے اور آخر کار جانی اور مالی نقصان اٹھانے کے بعد یونانی دریا پار اتر گئے۔ جس میدان میں سکندر کی فوج اتری اسے "کڑی کا میدان" کہتے ہیں، اسی جگہ پر آج کل سروال، بکڑال، سکھ چین پورہ کے دیہات آباد ہیں۔ سکھ چین پورہ کے قریب "نکایا" گاؤں ہے جسے سکندر نے آباد کیا۔

☆☆☆☆

دوسری طرف پورس کے جرنیل بھی پورس کے ہمراہ سر جوڑ کے بیٹھے تھے۔ بے شمار خیموں کا شہر آباد تھا، جس کے وسط میں ایک اونچا خیمہ اور اس پر لگا جھنڈا اسے شاہی خیمے کا درجہ دے رہا تھا۔ اسی خیمے میں اجلاس جاری تھا۔ پورس حسبِ معمول جنگی لباس زیب تن کیے ہوئے تھا۔ دائیں طرف اس کا بھائی ہگاس اجمان تھا۔

"مانگے رام۔۔۔۔ دشمن اس طرح مطمئن بیٹھا ہے جیسے اسے کوئی جلدی نہیں ہے۔ کھیل تماشے، عیش وطرب کی محفلیں جاری ہیں۔ مگر مری چھٹی حس کہتی ہے کہ اصل معاملہ کچھ اور ہے۔"

پورس نے اپنے سب سے تجربہ کار جرنیل سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"مہاراج! آپ کا اندازہ ٹھیک ہے۔ ایک طرف تو سکندر کی سپاہ مطمئن بیٹھی ہے، جبکہ دوسری طرف ہمارے دستوں سے ان کی ہلکی پھلکی جھڑپیں بھی ہو رہی ہیں اور کشتیاں بھی لائی گئی ہیں۔ اس کا مطلب ہے ہمیں بالکل بھی مطمئن نہیں بیٹھنا چاہیے۔ ہمارا واسطہ ایک تجربہ کار سپاہ سے ہے۔"

مانگے رام کی باتوں میں طویل تجربہ جھلک رہا تھا۔

"ٹھیک اندازہ لگایا تم نے مانگے رام۔ کوئی اور رائے؟"

پورس نے باقی جرنیلوں کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔

"مہاراج، میرا خیال ہے کہ ہم کچھ دستوں کو دریا کے ساتھ ساتھ دور تک گشت پر بھی متعین کر دیں، ضروری نہیں کہ دشمن سامنے سے آئے، وہ کمزور جگہ پر ضرب لگائے گا اور اسی وجہ سے وہ وقت لے رہا ہے۔"

یہ پورس کا بھائی ہگاس تھا جو پورس کے پیادہ دستے کا سالار تھا۔

"بہت خوب ہگاس! ہم آج سے ہی ایسا کریں گے۔ ہم نے وہ کرنا جو ہماری بدھی کہتی ہے، دشمن چاہے جو بھی نوٹنکی کرتا رہے!!"

پورس نے اجلاس کے اختتام کا اعلان کیا۔

☆☆☆☆

سکندر کی فوج جہلم کے کنارے اتر کر آگے بڑھی، توپ خانہ ساتھ تھا۔ اچانک پورس کے بیٹے کی قیادت میں ایک دستے نے ان پر حملہ کر دیا۔ اس دستے میں 60 بگھیاں اور 2 ہزار سپاہی شامل تھے۔ سکندر اس جھڑپ میں زخمی ہوا، اس کا پسندیدہ وفادار گھوڑا "بوسیفالس" اس حملے میں مارا گیا۔ پورس کے بیٹے کا حملہ اس وجہ سے ناکام رہا کہ اس کی بگھیاں کیچڑ میں پھنس گئیں مگر پھر بھی اس حملے میں سکندر کا کافی جانی نقصان ہوا۔ پورس کا بیٹا اس معرکے میں کام آ گیا۔

پورس نے اپنی بھائی ہگاس کی قیادت میں چار ہزار گھڑ سوار اور ایک سو بگھیاں بھیجیں۔ بگھی سواروں نے پوری شدت سے حملہ کیا۔ یونانی پیادے بگھیوں کے حملے کا مقابلہ نہ کر سکے، جب بگھیاں کیچڑ میں پھنس کر ٹوٹ گئیں تو پورس کے سپاہی نیچے اتر کر یونانی سپاہیوں پر ٹوٹ پڑے۔ اس معرکے میں یونانیوں کا کافی نقصان ہوا۔

☆☆☆☆

پورس کی فوج نے ایک کھلے میدان میں صفیں سنبھال لی تھیں۔ کچھ مؤرخین کے مطابق پورس کی فوج میں 4 ہزار گھڑ سوار، تین سو بگھیاں، دو سو ہاتھی اور تیس ہزار پیادے تھے جبکہ بعض مؤرخ ایک ہزار بگھیاں، پچاس ہزار پیادے اور 130 ہاتھی لکھتے ہیں۔

سب سے اگلی صف میں عظیم الشان ہاتھی ستونوں کی طرح کھڑے تھے جنہیں دیکھ کر یونانی فوج کے گھوڑے بدک رہے تھے۔ ہاتھیوں کے پیچھے آتشیں توپ خانے کے سپاہی تعینات تھے، ایک عظیم الشان لشکر دور تک پھیلا تھا۔ سکندر کی فوج صرف ہاتھیوں کو نہیں بلکہ پورس کا ڈیل ڈول دیکھ کر بھی ششدر رہ گئی۔ اس کی شخصیت میں ایک وجاہت، ہیبت اور دبدبہ تھا۔ پورس کے لشکر کے دائیں سے بائیں جانب سکندر کی فوج موجود تھی۔ سکندر نے پہلے پہل پورس کی حوالگی کا مطالبہ کیا کیونکہ سکندر اسے ذاتی دشمن کے طور پر لے رہا تھا جسے پورس نے ٹھکرا دیا۔ ایک ہزار تیر اندازوں نے پورس کی فوج پر بائیں جانب سے دھاوا بول دیا۔ پورس کے لشکر پر دائیں بائیں اور عقب سے شدید دھاوا بول دیا گیا، پورس کے سپاہی دفاعی پوزیشن اختیار کرتے ہوئے بگھیوں اور ہاتھیوں کے پیچھے چلے گئے۔ اس وقت پورس نے اپنے سب سے اہم ہتھیار ہاتھیوں کو حملے کا حکم دیا۔ دیو ہیکل ہاتھی چنگھاڑتے ہوئے آگے بڑھے اور گھوڑوں کو دہشت زدہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی پورس کے توپ خانے نے حملہ کر دیا اور پیادہ فوج بھی آگے بڑھی۔ وحشی ہاتھی یونانی

صفوں میں گھستے چلے گئے اور انہیں تتر بتر کردیا۔ یونانی فوج خوف کا شکار نظر آرہی تھی۔ پورس کے جنگجو دشمن پر آتشیں گولے اور تیر برسارہے تھے۔ وہ یونانی فوجی جو چند لمحات قبل فتح مندی کے نعرے لگارہے تھے، اب چھپنے کے لیے جگہ تلاش کررہے تھے۔ سکندر نے بازی پلٹتے دیکھ کر اپنے اس دستے کو حملے کا حکم دیا جو دست بدست لڑائی کا ماہر تھا۔ انہوں نے ہاتھیوں اور مہاوتوں پر آتشیں گولے پھینکنے شروع کردیے مگر ہاتھی ابھی بھی پیچھے نہیں ہٹ رہے تھے بلکہ یونانی سپاہیوں کو سونڈ میں لپیٹ کر اچھال رہے تھے۔ ہاتھیوں نے ہتھیاروں کو بھی توڑ مروڑ ڈالا، وہ اپنے دانتوں کے ساتھ بندھی تلواروں سے بھی یونانی فوج کو نقصان پہنچارہے تھے۔ اسی کشمکش میں دن بیت گیا اور شام کے سائے پھیلنے لگے۔

☆☆☆☆

سکندر کی سپاہ سخت پریشانی میں مبتلا تھی۔ سکندر نے اپنے ساتھیوں اور سپہ سالاروں کو جمع کیا اور ہاتھیوں کا توڑ نکالنے کے لیے مشورہ مانگا۔ آخر کار باہمی مشاورت سے طے ہوا کہ ہاتھیوں کو زخم لگا کر ان کو بدحواس کیا جائے۔ یونانیوں نے بھاری کلہاڑوں سے ہاتھیوں کے پاؤں کاٹ دیے، ان کے سونڈ پر زخم لگائے، نیزوں، تیروں اور تلواروں کا استعمال کیا۔ ہاتھی بوکھلا گئے، مہاوتوں کے لیے انہیں قابو کرنا مشکل ہوگیا۔ زخم خوردہ وحشی ہاتھی پلٹے اور اپنے ہی سپاہیوں کو کچل کر رکھ دیا۔ حالات پلٹنے لگے مگر پورس نے ہمت نہ ہاری اور چالیس ہاتھیوں کے دستے کی کمان خود سنبھالی اور نئے حوصلے کے ساتھ دشمن پر حملہ کردیا، پورس خود دست بدست لڑرہا تھا اور اس نے کئی یونانی سپاہی ٹھکانے لگائے۔ مقدونوی سپاہی حیرت سے پورس کو دیکھ رہے تھے، پورس کے ہاتھی کو پورس سے دلی لگاؤ تھا، اس کا ڈیل ڈول بھی پورس کی مانند عام ہاتھی سے دُگنا تھا۔ پورس کا وفادار ہاتھی حملہ آوروں کو روک کر پسپا کردیتا تھا۔ پے در پے زخموں کے بعد جب یہ ہاتھی زخموں سے چور ہوگیا تو اس نے بڑے سکون سے پورس کو نیچے اتارا اور سونڈ کی مدد سے اپنے جسم میں پیوست تیر نکالنے لگا۔ سکندر کا گھوڑا ابھی زخمی ہو چکا تھا، وہ بھی نیچے اتر آیا۔ علی الصبح شروع ہونے والی لڑائی ابھی تک جاری تھی۔ سکندر اس بے مثال مزاحمت پر بے حد حیران تھا وہ تو بپھرے ہوئے طوفان کی مانند ہر رکاوٹ تنکوں کی طرح اڑاتا ہوا یہاں تک آن پہنچا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک ہی ہلے میں وہ پورس کی سپاہ کو روند ڈالے گا مگر اُسے جنگ کے اختتام کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔

سکندر کے تمام سپاہی ایک جگہ جمع ہوگئے۔ ہاتھی بے قابو ہو کر اِدھر اُدھر جھومتے پھر رہے تھے، انہیں دوست دشمن کی کوئی تمیز نہیں رہی تھی۔ وہ سامنے آنے والے ہر شخص کو جکڑتے اور مار ڈالتے۔ سکندر کی فوج ایک وسیع جگہ پر موجود تھی۔ وہ ہاتھیوں کو رستہ دے کر ان کی پشت پر وار کرتے اور ہاتھی تڑپ کر پلٹ جاتے اور پورس کی فوج پر حملہ کردیتے۔ پورس کی فوج کئی دستوں میں تقسیم ہو کر بکھر چکی تھی۔ اتنے میں دریا پار سے سکندر کی کمک آن پہنچی اور اس نے پورس پر حملہ کردیا۔ کچھ مؤرخ یہ بھی لکھتے ہیں کہ جنگ کے دوران ایک مرحلے پر جب پورس کا ہاتھی تھک گیا تو پورس نے ہاتھی سے اترنے کے لیے اسے نیچے بٹھایا۔ پورس کی فوج کے تمام ہاتھی نیچے بیٹھ گئے کیونکہ ان کی تربیت یہی کی گئی تھی جس کی وجہ سے وہ دشمن کے نشانے پر آگئے، مگر یہ بات صرف وہ یورپی مؤرخ لکھتے ہیں جن کا نظریہ یہ ہے کہ پورس کو گرفتار کیا گیا تھا۔ مؤرخین کا غیر جانبدار گروہ اس کی تائید نہیں کرتا۔

☆☆☆☆

پورس کو سکندر کی فوج نے اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا بارش نے کیونکہ زمین دلدلی ہوگئی تھی۔ بگھیوں کو کھینچنا دشوار تھا۔ کمان کا زمین پر رکھ کر استعمال ناممکن ہو چلا تھا۔

یہ جنگ کوئی بھی نہ جیت پایا، سکندر کو اس جنگ میں علامتی شکست ہوئی کیونکہ وہ بار بار صلح کے لئے ایلچی بھیجتا رہا مگر پورس انکار کرتا رہا۔ سکندر کو اس جنگ میں کافی بڑے نقصانات پہنچے۔ سکندر کے اکثر گھوڑے ہلاک ہوئے۔ اس نقصان پر یونانی بین کرتے رہے، ان کا اعتماد زمیں بوس ہو چکا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ ہتھیار پھینک کر پورس کے ساتھ جا ملیں۔ پورس شدید زخمی ہوا مگر وہ میدان چھوڑ کر بھاگا نہیں۔ اس نے سکندر کی شرائط نہیں مانیں اور آخر وقت تک سکندر کا مقابلہ کیا۔ سکندر جنگ بندی کا خواہش مند تھا۔ سکندر نے پورس کے پاس جنگ بندی کے لیے متعدد ایلچی روانہ کیے، آخر کار اس نے پورس کے پرانے دوست میروس کو پورس کے پاس بھیجا جس نے اپنی دوستی کے واسطے دیے۔ جس پر پورس سکندر سے ملاقات کے لیے راضی ہوگیا۔ جنگ کے اختتام پر مختلف مؤرخ مختلف بات درج کرتے ہیں۔ ایک نظریہ تو یہی ہے کہ پورس نے اپنے دوست میروس کے مجبور کرنے پر سکندر سے بات چیت کرنا قبول کی، کچھ مؤرخ اس بات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ یونانی فوج نے سکندر کا ہاتھی تیر اندازی سے ہلاک کردیا اور پورس کو گرفتار کر کے سکندر کے سامنے پیش کیا۔ نو ہزار سپاہی قیدی بنا لیے گئے مگر یہ یورپی مؤرخین کا پروپیگنڈا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ سکندر ایک کینہ پرور شخص تھا۔ اس نے اپنے کسی مفتوح کو معاف نہیں کیا۔ اس وجہ سے ایتھوپیا اور ایشیا کے مؤرخین کی یہ بات دل کو لگتی ہے کہ سکندر کی فوج کا بہت نقصان ہوا۔ یونانی سپاہی بین کرنے لگے۔ سکندر کے حوصلے پست ہو چلے تھے، اس نے جنگ بندی کا حکم دیا اور میدان کے درمیان آکر چیخ کر کہا۔

"سنو پورس! ہم دونوں میں لڑائی طول اختیار کر گئی ہے، ہمارے اکثر سپاہی مایوسی کا شکار ہیں، آؤ ہم خود مقابلہ کرلیتے ہیں۔"

☆☆☆☆☆

سکندر اور پورس کی ملاقات میدانِ جنگ میں ہی ہوئی۔ سکندر اپنی فوج کی پہلی صف میں کھڑا تھا۔ اس کے دائیں بائیں اس کے کمانڈر تھے، پورس وہاں پہنچا تو سکندر اس کی وجاہت اور شاندار ڈیل ڈول سے متاثر ہوا۔ سکندر حیران تھا کہ پورس ان حالات میں بھی نڈھال نظر نہیں رہا تھا۔ اس کا سر تنا ہوا تھا اور انداز میں وقار تھا۔ بلاشبہ پورس نے اپنی سرزمین کے دفاع کے لیے بے مثال جدوجہد کی۔ سکندر نے گفتگو میں پہل کی اور پوچھا کہ بتائیے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ اس موقع پر پورس نے تاریخی جواب دیا۔

"اے سکندر جیسے ایک بادشاہ کے شایانِ شان ہو۔"

سکندر اس جواب سے بہت متاثر ہوا اور اس نے پورس کی ہندوستان پر حکومت برقرار رکھنے کا اعلان کر دیا۔ اس نے پورس کے علاج کا بھی حکم دیا۔

حالات وواقعات کا جائزہ لینے پر پتا چلتا ہے کہ اس جنگ کا اختتام پورس اور سکندر کے درمیان جنگ بندی کے معاہدے پر ہوا اور یہ جنگ بندی پورس نے نہیں بلکہ سکندر نے چاہی تھی۔ پورس آخر تک مذاکرات نہیں چاہتا تھا، یہ سکندر کی رحم دلی نہیں بلکہ مجبوری تھی۔ سکندر کو خدشہ تھا کہ اگر اس نے صلح کے لیے ہاتھ نہ بڑھایا تو پورس غالب آجائے گا، سکندر کی فوج حوصلہ ہار بیٹھی تھی اور سکندر یہ سب جانتا تھا، اس وجہ سے اس نے پورس سے صلح کرلی اور پورس کی سلطنت وسیع کرنے میں اس کی مدد کی۔

پورس ہی کی مدد سے چندر گپت نے فتوحات حاصل کیں۔ چندر گپت کے وزیر، چانکیہ نے پورس کو خطرہ محسوس کرتے ہوئے اسے یونانی جرنیل ایوداس کے ہاتھوں 317 قبل مسیح، مگدھ کی فتح کے جشن کے دوران قتل کروا دیا۔ اس طرح دھرتی کا یہ سپوت اپنوں کی سازش کا شکار ہوا۔ رہے نام اللہ کا!!!

☆☆☆☆☆

اپنے دیس سے، اپنے شہروں سے موصولہ، وہ سچ بیانیاں
جن کو پڑھ کر، اپنی مٹی کی خوشبو، آس پاس محسوس ہوتی ہے

پہلی سچ بیانی

تکون

محمد سلیم اختر

راولپنڈی سے محبت پر جاں نثار ہونے والوں کی داستان

شہر چترال سے گاؤں کا فاصلہ تو دس بارہ میل کا ہی تھا، مگر ہمیں گاؤں پہنچنے میں چار گھنٹے لگے تھے۔ میں ابا جان اور گھر والوں کے ہمراہ پہلی بار گاؤں جا رہا تھا۔ برسوں قبل ابا جانی ملازمت کے سلسلے میں کراچی آ گئے تھے۔ انہوں نے میری امی سے پسند کی شادی کی تھی۔ جس پر ان کا بہن بھائیوں سے اختلاف ہو گیا۔ اس وجہ سے انہوں نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کراچی کا رُخ کیا۔ امی بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ کراچی میں ان کو ایک سرکاری ادارے میں ملازمت مل گئی اور وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے اپنے گاؤں کے تمام عزیزوں اور رشتے داروں سے تقریباً ہر قسم کا تعلق ختم کر لیا اور کبھی کسی سے رابطہ نہ کیا۔ میرا جنم کراچی میں ہی ہوا اور میں یہیں پلا بڑھا۔ میرے علاوہ ان کی اور کوئی اولاد نہ ہوئی۔ امی جان نے ہی مجھے گاؤں اپنی شادی اور پھر کراچی آ جانے کے بارے میں بتایا تھا اور وہ اکثر گاؤں...... وہاں کے لوگوں اور گاؤں کی خوبصورتی کا ذکر کرتی رہتی تھیں۔ کئی بار میرا جی چاہا کہ گاؤں جاؤں مگر ابا جان کی ایک ہی ''نہ'' نے میرے اور امی کے قدم جکڑ رکھے تھے۔ کراچی میں ہمارا اپنا مکان تھا۔ ابا جان کی تنخواہ معقول تھی اور گزر بسر بہت ہی بہتر انداز میں ہو رہی تھی۔ میں امی ابا دونوں کا ہی لاڈلا تھا۔ کراچی میں کئی گھرانوں کے علاوہ کچھ چترال کے رہنے والے لوگوں سے بھی ہمارے اچھے تعلقات تھے اور ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ جب میں نے یہ



یقین کر لیا کہ ابا جان کو گاؤں اور گاؤں والوں سے نفرت ہے تو میں نے گاؤں کا تذکرہ کرنا ہی چھوڑ دیا، البتہ امی کبھی کبھار گاؤں والوں کو یاد کر لیتی تھیں۔ انہیں دُکھ تھا کہ اُن کے اور ابا جان کے رشتے داروں نے بھی کبھی ہماری خیر خبر نہیں لی کہ ہم کہاں ہیں۔ زندہ ہیں یا مر کھپ گئے ہیں۔ ابا جان کے دو دفتری ساتھیوں کے خاندان والوں کے ساتھ امی اور ابا کی خوب بنتی تھی اور وہ ان ہی کو اپنا رشتے دار...... اور سب کچھ تصور کرتے تھے۔ ہم ایک دوسرے کی غمی اور خوشی میں برابر کے شریک ہوتے تھے۔ انصاری صاحب کی ایک بیٹی نازیہ تھی۔ بہت ہی خوبصورت اور نازک سی...... امی کو نازیہ پسند تھی اور وہ اس کے ساتھ میری شادی کرنا چاہتی تھیں۔ مگر میں نے ابھی شادی کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا اور ان کو ٹال رہا تھا۔ میں نے بی کام کرنے کے بعد ملازمت شروع کی تو ان ہی دنوں ابا جان کی ریٹائرمنٹ ہو گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ ابا جان نے اچانک ہی گاؤں جانے کا اعلان کر دیا۔ میں اور امی حیران تھے کہ ان کو اچانک کیا ہو گیا ہے۔ میں نے اور امی نے کچھ کہنا چاہا مگر انہوں نے ہماری ایک نہ سنی اور تیاری پکڑ لی۔ ہم بھی تیار ہو گئے۔ ابا جان نے مجھے بتا دیا کہ اب وہ اور امی مستقل گاؤں میں ہی رہیں گے اور میں چھٹی گزار کر واپس کراچی لوٹ آؤں گا۔

☆......☆......☆

برسوں بعد گاؤں والوں اور رشتے داروں، عزیزوں نے ہمیں دیکھا تو وہ ماضی کو بھول گئے اور ہم سب کو گلے لگا لیا۔ سب رنجشیں اور کدورتیں مٹ گئیں۔ چچا کا بیٹا حبیب میرا ہم عمر تھا، اس لیے مجھے اچھی کمپنی مل گئی۔ حبیب بھی بہت خوش تھا...... رات کو میں نے خوب نیند کی...... اگلے دن پو پھٹتے ہی حبیب نے مجھے آ جگایا اور ہم چہل قدمی کرتے ہوئے دریا کے کنارے جا پہنچے۔ وہ عجیب سہانا وقت تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پوری دنیا آہستہ آہستہ دبیز اندھیروں سے نکل کر معصوم اور نرم اُجالوں کی طرف رواں دواں ہے۔ ٹمٹماتے ہوئے تارے نظروں سے اوجھل

ہورہے تھے اور پہاڑوں کی چوٹیاں بڑی خودنمائی کے انداز میں سر اٹھائے اپنے وجود کی سربلندیوں کا اعلان کرتی نظر آرہی تھیں۔ میں انتہائی انہماک سے اس سحرآمیز منظر کو اپنی آنکھوں میں سمیٹنے کی کوشش کررہا تھا اور چاہتا تھا کہ قدرت کی نقاشی کا ایک نقطہ بھی میری آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ اب اس کیف کو کن الفاظ میں بیان کروں۔ بس یوں سمجھیں کہ رنگ و نور کی بارش ہورہی تھی۔ جب سورج طلوع ہوا اور دنیا کے دھلے نکھرے روپ کی جوت جاگی تو میں نے دیکھا پہاڑوں کی بلندیاں سبز مخمل کی مانند سورج کی نرم کرنوں میں دھوپ چھاؤں کا منظر پیش کررہی ہیں۔ دریا کے دونوں جانب سبزے کا فرش بچھا تھا۔ جس میں ہنستے مسکراتے خودرو پھول مجھ آشفتہ سر کو گریباں چاک کرنے کا مشورہ دیتے نظر آرہے تھے۔ حبیب مسلسل بولے جارہا تھا۔ وہ چونکہ زمینداری کرتا تھا، اس لیے کبھی وہ چراگاہ کی بات کرتا، کبھی پھلوں کی کاشت کی اور کبھی ریشم کے کیڑے پالنے کی، مگر میرا دل بُری طرح بےقرار تھا۔ گونجتی لہروں کی آواز سننے کی خواہش نہ معلوم کیوں میرے دل میں اُبل پڑی تھی۔

ابھی اس کیفیت کو کچھ دیر ہی گزری تھی کہ دُور کسی گائے کی گھٹی گھٹی آواز دردوسوز کے ایک پُرکیف زیروبم کے ساتھ وادی و کوہسار میں گونج کر دھیرے دھیرے ختم ہوگئی۔ لطیف جذبات سے مغلوب ہوکر میں نے آنکھیں موندلیں۔ چند ثانیوں کے بعد دوسری جانب سے پھر ایک آواز سنائی دی جو شدت اور لے میں پہلے سے بڑھ کر تھی، یوں معلوم ہوا جیسے کسی سوال کا جواب دیا گیا ہو اور پھر دونوں جانب سے یہ آوازیں بار بار سُنائی دیں۔ یہ گائے اور بیل کی آوازیں تھیں، جو روزانہ ہی گونجا کرتی تھیں۔

پھر مجھے دُور ایک بہت بڑا سرخ سا پھول دکھائی دیا، جو ہوا کے چنچل تھپیڑوں سے ڈول کر کبھی اس پودے پر اور کبھی اس پودے پر اپنا دمکتا مکھڑا رکھ دیتا۔ پھر مرتبہ ایک نازک ہاتھ آگے بڑھتا اور پھول کو ان اٹھکھیلیوں سے باز رکھنے کی سعی کرتا...... وہ منظر خاصا دُور تھا۔ اس لیے میں یہ نہ دیکھ سکا کہ وہ سرخ گھا گھرے والی لڑکی اتنے سویرے سبزہ و گل میں کیا کررہی ہے، پھر میں نے چترالی زبان میں ایک دلکش لچکتی تان سُنی۔ وہ ایک انتہائی نازک آواز تھی جو ہوا کے چلنے سے کم اور زیادہ ہورہی تھی۔ میں نے مبہوت سا ہوکر حبیب سے پوچھا۔

"یہ کس کی آواز ہے؟" اس نے سُرخ گھا گھرے والی دوشیزہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"چاندنی گارہی ہے۔" پھر اس نے مجھے انگلی ہونٹوں پر رکھتے ہوئے خاموش رہنے کا اشارہ کیا...... کچھ دیر بعد کسی مردانہ آواز نے ان میٹھے بولوں کا جواب پُرسوز اور گمبھیر لہجے میں دینا شروع کردیا۔

حبیب نے ایک لمبی سانس لی اور کہنے لگا۔ "یہ دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے ہیں۔ "درد و فراق کے بیاباتوں میں بستے ہیں۔ شاید ان کی قسمت میں ملن نہیں۔" میں نے اضطراب اور ہمدردی میں ڈوب کر پوچھا۔ "آخر ان کے ملاپ میں کون سی چیز حائل ہے؟" حبیب کربناک لہجے میں بولا۔

"ان کا معاملہ کچھ اتنا آسان نہیں۔ چاندنی کی محبت کا ایک اور بھی دعویدار ہے۔ اس کا نام سُہراب ہے اور جس کی آواز تم نے سُنی ہے، یہ چاندنی کا عاشق سلطان ہے۔ سُہراب اور سلطان ایک دوسرے کے چچا زاد بھائی ہیں اور چاندنی ان کی پھوپی زاد بہن ہے۔ مگر سب سے بڑا ستم یہ ہے کہ چاندنی ان دونوں سے محبت کرتی ہے۔ وہ کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دے سکتی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تینوں اپنی اپنی جگہ سُلگ رہے ہیں۔ ان دونوں نوجوانوں پر بھی جوشِ رقابت کے دورے بھی پڑنے لگتے ہیں اور اکثر یہ دونوں آپس میں دست و گریباں بھی ہوجاتے ہیں۔"

میں ان تینوں کی محبت کی کہانی سُن کر بہت ہی حیران ہوا اور حبیب سے کہا۔ "کسی دن چاندنی سے میری ملاقات تو کراؤ ناں...... شاید میں اسے کسی ایک کو اپنانے کا مشورہ دے سکوں۔"

حبیب مسکراتے ہوئے بولا۔ "نوید! یہ تمہارے بس کی بات نہیں، پھر بھی میں تمہاری ملاقات چاندنی سے ضرور کراؤں گا' کیونکہ ان تینوں کی محبت کی تکون کا ہر ایک

کو علم ہے، مگر کوئی بھی اس مسئلے کا حل نہیں نکال سکا۔"

پھر ایک دن وہاں دریا کے کنارے ہی حبیب نے میری ملاقات چاندنی سے کرادی۔ میں نے جب پہلی بار چاندنی کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ بڑی عناں گیر اور متکبرانہ شان سے بالکل میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ اسے دیکھ کر میں جان پایا کہ دُنیا میں ہر خوبصورتی کو ہمیشہ چاند ہی سے کیوں منسوب کیا جاتا ہے۔ چاندنی کو دیکھ کر میں بڑبڑایا...... یہ جس گھر میں جائے گی۔ وہاں روشنی کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ وہ دراز قد بُھورے ریشمی بالوں اور بھرپور بدن کے نشیب و فراز والی بھرپور لڑکی تھی۔ چہرہ گلاب کے مانند کھلا ہوا اور خوبصورت آنکھیں جادو کا اثر رکھتی تھیں۔ واقعی اس نے مجھ پر ایک جادو سا کرڈالا اور میں لمحوں میں اس کی زلفوں کا اسیر ہوگیا اور یوں لگا کہ اس کے چاہنے والے اب تین ہوجائیں گے...... میں نے چاندنی سے شفقت بھرے انداز میں کہا۔

"حبیب نے مجھے تمہاری...... سُہراب اور سلطان کی محبت کی کہانی سُنائی ہے۔ تم ان دونوں میں سے کسی ایک کو منتخب کرلو ناں۔"

چاندنی میری بات سمجھ گئی۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "میں دونوں کو ایک جیسا سمجھتی ہوں۔" "دونوں میں سے کون زیادہ طاقتور ہے؟" میں نے خوامخواہ سوال داغ دیا۔

"دونوں برابر کے طاقتور ہیں۔" اُس نے فوراً ہی جواب دیا۔

"دونوں میں کون زیادہ خوبصورت ہے؟" میں نے ایک اور پتھر پھینکا۔

"آپ کی بھی تو آنکھیں ہیں ناں، خود ہی دیکھ لینا۔ میرے لیے تو دونوں میں کوئی فرق نہیں۔" اس نے برجستہ جواب دیا۔

میں شرمندہ سا ہوگیا، مگر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے ایک اور سوال کرڈالا۔

"اچھا یہ بتاؤ ان دونوں میں سے کون تمہیں زیادہ چاہتا ہے؟"

"کیا میں ان دونوں کے دلوں میں بیٹھی ہوں۔ جو یہ جانوں...... دونوں میرے ماموں زاد بھائی ہیں۔ ہم اکٹھے کھیلے کودے اور جوان ہوئے ہیں۔ میں دونوں ہی کو اچھا اور اعلیٰ کردار کا مالک سمجھتی ہوں۔"

"دیکھو چاندنی! پاگل پن کی باتیں نہیں کرتے۔ وہ دونوں جوان ہیں، آخر انہیں شادیاں تو کرنی ہی ہیں۔ تمہیں چاہیے کہ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلو اور اذیت اور کرب کے ان حالات سے نجات حاصل کرلو۔"

میں نے دیکھا۔ چاندنی کی آنکھیں یک لخت بھر بھرا سی گئیں۔ اس کے چہرے کی شادابی ماند پڑگئی۔ وہ اُداس لہجے میں بولی۔

"وہ دونوں بڑے شوق سے شادی کرلیں، مگر میں نہیں کروں گی۔" یہ کہہ کر وہ ایک طرف چل دی اور میں شرمندہ سا ہوگیا۔ حبیب مجھے واپس گھر لے آیا، مگر میں چاندنی کو دل سے نہ بھلا سکا۔ اس کی صورت ہی نہیں بلکہ اس کی باتیں بھی میرے ذہن میں گونجتی رہیں۔

☆......☆......☆

یوں ہی کچھ دن گزر گئے، میرا سامنا چاندنی سے نہ ہوا۔ ایک دن معلوم ہوا کہ سُہراب اور سلطان آپس میں دست و گریباں ہوئے ہیں۔ گاؤں والوں نے بڑی مشکل سے انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کیا ہے۔ بات بڑھتی دیکھ کر گاؤں کے نمبردار نے ایک فیصلہ کیا کہ سُہراب اور سلطان کے بیلوں کی لڑائی کرائی جائے گی اور جس کا بیل ہار جائے گا، وہ چاندنی سے شادی نہیں کرسکے گا۔ چاندنی کی شادی اس سے ہوگی جس کا بیل لڑائی میں فاتح قرار پائے گا۔ سُہراب اور سلطان نے بھی یہ شرط منظور کرلی اور اپنے بیلوں کو لڑائی کے لیے تیار کرنے لگے۔ گاؤں میں ہر طرف اور ہر زبان پر بیلوں کی لڑائی کے چرچے ہونے لگے۔

☆......☆......☆

بالآخر مقابلے کا دن آگیا۔ سہ پہر دو بجے کے قریب میدان تیار ہوگیا۔ وہ میدان نمبردار کے گھر کے قریب ایک چوڑا سا ہموار زمین کا ٹکڑا تھا۔ اس کے ایک جانب دریا اور دوسری جانب چھوٹا سا سبز ٹیلا تھا۔ گاؤں کے لوگ ٹیلے کے اوپر نیچے اور میدان کے دونوں طرف

جمع ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایک شور سا بلند ہوا۔ ''سہراب آ گیا...... سہراب آ گیا۔''
میں اور حبیب بھی وہاں موجود تھے۔ حبیب نے میرے کان میں کہا۔
''اوہ! یہ دونوں بدنصیب رقیب آج اپنے مقدر کا فیصلہ کرنے پر تلے معلوم ہوتے ہیں۔ دیکھنا ابھی سلطان بھی آ جائے گا...... خدا خیر کرے بات جانوروں تک ہی رہے۔''
ہم دونوں سناٹے کے عالم میں میدان کو ہی دیکھ رہے تھے کہ سہراب اپنے قوی ہیکل بیل کو لیے میدان میں داخل ہوا۔ اس نے ایک ہاتھ سے بیل کی رسی تھام رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ میں ایک لمبا سا برچھا تھا۔ اس نے میدان کے ایک گوشے میں کھڑے ہو کر اپنے بیل کے سر اور کانوں کو تھپکا...... چند ہی لمحوں کے بعد سلطان بھی اپنے بیل کو لیے اسی انداز میں میدان میں داخل ہوا۔ اس کا بیل بھی سہراب کے بیل کے ہم پلہ تھا۔ سلطان نے بھی وہی انداز اپنایا۔ اس کے ہاتھ میں لمبا سا برچھا تھا۔ چاندنی بھی اس ہجوم میں موجود تھی، جہاں صرف عورتیں نظر آ رہی تھیں۔ میری تمام توجہ چاندنی کی طرف ہی مبذول تھی۔ وہ ایک مجسمے کی طرح عورتوں کے ہجوم میں کھڑی گردن اُٹھا اُٹھا کر میدان میں ہی دیکھ رہی تھی۔
پھر سہراب اور سلطان اپنے اپنے بیلوں کو لے کر آگے بڑھے اور ان کو آمنے سامنے لا کر چھوڑ دیا۔ دونوں بیل غصے سے غرائے اور پھر ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ دونوں کے سر ایک دوسرے سے ٹکرائے، تماشائیوں نے بھی نعرے بلند کیے، پھر دونوں پیچھے ہٹے اور پھر ایک دوسرے پر حملہ آور ہو گئے۔ یہ سلسلہ آدھے گھنٹے تک چلتا رہا۔ کبھی ایک بیل آگے بڑھ جاتا اور دوسرے کو پیچھے دھکیل دیتا اور کبھی دوسرا اسے دھکیل کر پیچھے لے جاتا۔ کیا مرد، کیا عورتیں، کیا بچے اور کیا بوڑھے، سبھی جوش میں آ کر اپنے اپنے نعرے بلند کر رہے تھے۔ وہ بیلوں کی حرکات و سکنات کے ساتھ نعرے بلند کرتے...... مگر چاندنی بُت کی طرح ساکت کھڑی بیلوں کی لڑائی دیکھ رہی تھی۔

بہت دیر گزر گئی۔ بیلوں کی لڑائی برابر رہی۔ کوئی بھی ہار ماننے کو تیار نہ تھا، بالآخر دونوں بیل تھک ہار کر بے ہوش سے ہو کر گر پڑے۔ گویا چاندنی کی قسمت کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ جوں ہی دونوں بیل زمین پر گرے۔ سہراب اور سلطان بھاگ کر اُن کے پاس گئے اور انہوں نے اپنے اپنے بیلوں کو تھپکیاں دینی شروع کر دیں، مگر ان میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔ سہراب اور سلطان اُٹھ کھڑے ہوئے اور بیلوں ہی کی طرح ایک دوسرے کے مقابل آ گئے۔ دونوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ مجمع میں سناٹا چھا گیا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ اب کیا ہو گا؟
اتنے میں سہراب نے برچھا لہرایا اور سلطان کے کندھے کو چیر ڈالا۔ سلطان لڑکھڑا کر زمین پر گرا اور پھر پھرتی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور سہراب پر پل پڑا۔ اُس کا برچھا سہراب کے سینے میں اُتر گیا۔
''نہیں...... نہیں۔'' ایک زوردار چیخ بلند ہوئی اور چاندنی دیوانہ وار دوڑتی ہوئی میدان میں جا پہنچی، مگر اس کے سہراب اور سلطان کے قریب پہنچنے سے قبل ہی...... سہراب اور سلطان زندگی سے ناتا توڑ گئے تھے۔
چاندنی کی چیخیں آسمان کو چھونے لگیں۔ سب لوگ بھی میدان میں پہنچ گئے، مگر اب سب کچھ لاحاصل تھا۔ عورتیں بڑی مشکل سے چاندنی کو پکڑ کر میدان میں باہر لے گئیں۔
گاؤں میں پہلی بار دو جنازے اکٹھے اُٹھے تو اک کہرام مچ گیا۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔ بچے، بوڑھے، عورتیں مرد سب دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ جب ان کا جنازہ پڑھ کر ان کو دفنا کر آئے تو پتا چلا...... چاندنی بھی اس دنیا میں نہیں رہی۔ وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی تھی اور زندگی سے ناتا توڑ گئی...... اگلے دن چاندنی کو اس کی آخری آرام گاہ پہنچا دیا گیا۔ سہراب، سلطان اور چاندنی کی قبریں قریب قریب ہیں، بالکل تکون کی مانند۔ ہاں ان کی محبت بھی ایک تکون ہی تو تھی۔
میں اب جب بھی گاؤں جاتا ہوں تو ان کی قبروں پر جا کر فاتحہ ضرور پڑھتا ہوں۔

☆......☆......☆

دوسری سچ بیانی

دشمن، دوست

کوکب جمیل

کراچی سے ایک درزی کی عجب کتھا



زوار علی کو سب سے پہلے میں نے اپنے دفتر کے ٹائم آفس میں بحیثیت ٹائم کیپر کے دیکھا تھا۔ زوّار علی سے پہلے جو ٹائم کیپر تھے وہ نہایت مشفق اور ملنسار تھے۔ وہ دیر سے آنے والوں کے ساتھ اس چھوٹ کے علاوہ جو کمپنی کی طرف سے کارکنوں کو ملی ہوئی تھی کوئی رعایت تو نہیں کرتے تھے، لیکن وہ کسی کے ساتھ نہ تو درشتی سے پیش آتے تھے اور نہ طعنوں تشنوں سے کام لیتے تھے، نہ کسی کی مجبوری کا مذاق اُڑاتے تھے اور نہ اس کی شکایت اپنے سے اوپر والوں سے کرتے تھے بلکہ وہ وقت پر آنے کے لیے سمجھانے کے انداز میں گفت گو کرتے تھے اور اگر کسی کے دیر سے آنے پر اس کے کسی دکھ بیماری یا شدید مجبوری کا پتا چلتا تو اس کی دلد ہی بھی کرتے تھے اور روز مرہ کی دشواریوں پر قابو پانے کا حوصلہ پیدا کرنے کی تلقین بھی کرتے تھے۔ مجھے وہ پسند تھے، وہ عمر رسیدہ تھے، وہ شہر میں تنہا رہتے تھے، اُن کے دو لڑکے تھے جو، جوان ہو کر ملک سے باہر جا کر ملازم ہو گئے تھے، ان کی بیوی کا پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ وہ اپنے ذاتی معاملات میں بڑے کم گو تھے۔ میں نے بعض اوقات ان سے گفتگو کرتے ہوئے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ بچوں کے دور چلے جانے سے خوش نہیں وہ کبھی چھٹی بھی نہیں کرتے تھے۔ ہمیشہ ٹائم آفس میں اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ نرم گفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ موجود ملتے تھے۔

ایک دن ٹاؤن آفس میں وہ نہیں تھے، دوسرے تیسرے دن پتہ چلا کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ مجھے اتنی فرصت نہیں تھی کہ ان کے گھر کا پتا معلوم کر کے ان کی تعزیت کو جاتا، لیکن جاتا تو کس کے پاس! پتا چلا تھا کہ وہ جس کمرے میں رہتے تھے اس کے آس پاس رہنے والوں کو بھی اُن کی موت کے سولہ گھنٹے بعد معلوم ہوا کہ اندر اُن کی لاش پڑی ہوئی ہے۔ سب کو اُن کے انتقال پر صدمہ ہوا۔

ان کی جگہ زوار علی جو پرسونل آفس میں کسی کلریکل جاب پر لگے ہوئے تھے ٹائم آفس میں بہ حیثیت ٹائم کیپر کے بیٹھے نظر آئے، اُن کے طور اطوار اور لوگوں سے اُن کی رَوِش کا جوں جوں پتا چلتا گیا، زوار علی سے سب جلتے چلے گئے اور ٹائم آفس کے سامنے سے گزرنے والے ہر شخص کے چہرے پر تناؤ اور کھچاؤ انہیں دیکھ کر پیدا ہو جاتا۔ زوار علی وقت سے کچھ دیر بعد آنے والوں کے ساتھ نہایت درجہ اہانت آمیز سلوک کرتے اور عورتوں کی طرح فقرے بازی کرتے اپنے غیض و غضب کا اظہار کرتے، ان کی آنکھوں میں لوگوں کے لیے ایک نفرت موجود ہوتی اور اُن کے چہرے پر ہمیشہ ایک استہزائی مسکراہٹ کھنڈی رہتی۔ ان کا لب و لہجہ تو دُرشت تھا ہی لیکن ان کی آواز میں تلوار کی ایک شدید کاٹ تھی کہ جس کے کانوں سے ٹکراتے ہی پکے پھوڑے کے ٹیکنے کی سی جلن اور تکلیف، سننے والے کے تمام بدن میں تیر جاتی تھی۔

زوار علی درمیانے قد و قامت کے دُبلے پتلے انسان تھے، ان کے نقش و نگار اچھے ہو سکتے تھے اگر ان کے چہرے اور گالوں پر کچھ گوشت کی بوٹی چڑھی ہوتی، وہ سانولے نہیں بلکہ کالے کلوٹے کے قریب تر رنگ والے تھے، غصّے میں تو ان کی آنکھوں سے سانپ کی آنکھوں کی طرح کی خوف زدہ اور مسحور کر دینے والی شعاعیں نکلتی رہتی ہیں، اُن کی لانبی اور اُٹھی ہوئی ناک کے نیچے انھوں نے گھنی مونچھیں سجا رکھی تھیں لیکن چہرہ متناسب ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ وہ جب بھی اپنے سے کسی چھوٹے رتبے والے سے بات کرتے تو اس طرح کہ جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ دیکھو سدھر جاؤ اور میرا رعب تسلیم کر لو ورنہ ایک دن یہ سب کس بل نکال کر رکھ دوں گا۔ وہ پان بکری کی طرح تو نہیں چباتے تھے لیکن اس طرح پان کھاتے رہتے تھے جیسے منہ میں آئس کریم کو رکھے ہوئے گھلا رہے ہوں۔ گالوں کی جھرّیاں اس وقت بڑا لطف دے جاتی تھیں جب وہ کسی کا مذاق اُڑانے کے لیے اپنے چہرے کا حلیہ بگاڑ لیتے تھے۔ اُن کی شخصیت ایک ایسے امرود کی طرح تھی کہ جو اوپر سے تو سبز ہو لیکن اندر سے سُرخ ہو، وہ عام کارکنوں کے لیے تو زہر ہلاہل تھے مگر اپنے سے بڑے رُتبے والے کارکنوں، افسروں کے لیے وہ ہمیشہ شربت الائچی بن جاتے کہ اس کو پی کر مزہ بھی آئے اور منہ میں خوشبو بھی بس جائے۔ افسروں اور اعلیٰ سطح کے لوگوں میں ان کو بہت سی ایسی خوبیاں نظر آ جاتی تھیں کہ جن کا اُن سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا تھا اور وہ عورتوں کے سے انداز میں بڑے نخروں کے ساتھ اُن کی تعریف و توصیف الفاظ چبا چبا کر کرتے تھے۔ جب زوار علی کو میں نے ٹائم آفس میں دیکھا، وہ مجھے ان تمام باتوں کی وجہ سے جن کا میں نے جائزہ لیا قطعی پسند نہیں آئے اور شاید نہ میں ان کو پسند آیا۔ ان کو میرا محتاط رویہ، میری کم سخنی، اپنی ذات کو اپنی ذات تک محدود رکھنے کا انداز اور ان کو نظر انداز کرتے رہنے کی میری کوشش نے ان کو تلملا کر رکھ دیا۔ میرے اور اُن کے تعلقات دل ہی دل میں خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے۔ ہم بظاہر ایک دوسرے کی طرف خوش مزاجی سے دیکھ لیتے تھے، لیکن وہ جو انسان کی ایک خُفتہ حِس ہوتی ہے اس نے دونوں کو باخبر کر دیا تھا کہ دونوں کو ایک دوسرے سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ کم سے کم میں نے پہلے دن سے ہی ان کو اپنا دشمن سمجھ لیا تھا۔ اپنی چاپلوسی سے زوار علی ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے پرسونل آفس میں ایک ذرا با اختیار رُتبے پر جا پہنچے۔ مجھے ان کا یہ رُتبہ، اثر و رسوخ اور ترقی و اختیار بالکل نہ بھائے مگر کیا کر سکتا تھا۔ میری ڈور بھی انہی کے ہاتھوں ہوتی ہوئی افسرانِ اعلیٰ تک پہنچتی تھی۔ میری گردن میں پڑی ڈور کو وہ جب بھی ہلاتے میرا رُواں رُواں جھنجھنا اُٹھتا، مگر صبر کے علاوہ چارہ نہیں تھا! میں جہاں تھا وہیں رہ گیا اور وہ اعلیٰ افسروں کی ناک کا بال بن گئے، اور زیادہ با اختیار ہو گئے، اور وہ ان اختیارات کو کارکنوں کو ذلیل کرنے اور اپنی دبی ہوئی شخصیت کو منوانے کے لیے استعمال کرتے۔ اکثر میں اُن کے بارے میں سوچتا کہ اُن کے اِس مردانہ جسم میں کس بساندھی بوڑھی عورت کی روح آ بسی ہے۔ جو وہ لوگوں سے جلنے ان کو نیچا دکھلانے اور اپنا آپ منوانے کے لیے رکیک حرکات کرتے رہتے ہیں۔ اُن کا چیزوں کو سینت سینت کر رکھنا اور اپنے کپڑوں اور سر پر منڈھی ہوئی ٹوپی کا خاص خیال رکھنا، خوشبودار پان کھا کر ہونٹوں پر لاکھا جمائے رکھنا انگلیوں میں انگوٹھیوں کو ٹھونسے رکھنا، اور ہر ہر ایسی ادا اختیار کرنا کہ ہر شخص کو اُن کے ہونے کا احساس ہوتا رہے، یہ سب باتیں ایسی بوڑھی عورتوں کی سی تھیں جو اپنے جوانی کا نوحہ اور ڈھلتے ہوئے جسم کو بچائے رکھنے کا مرثیہ پڑھتی رہتی ہیں۔

رنجش، وقت کے سموں سے اُٹھنے والی دھول نے بہت کچھ درمیان میں دھندلا ڈالا۔ مجھے تو ان کا چہرہ اور طور طریقے اس طرح یاد رہے کہ تو بہ ہی بھلی نہ جانے ایسا کیوں ہوتا ہے اور یہ کون سی نفسیاتی گتھی ہے جو ہمارے ذہن و دماغ کو کسی ایک شخص کو خواہ مخواہ اپنا دشمن سمجھ لیتی ہے اور محبت و تلطف کی جگہ نفرت اور غصّے کو بڑھاتی چلی جاتی ہے، اُس شخصیت سے دور بھی ہو جاؤ تو وہ شخصیت اسی روپ میں ذہن پر سوار رہتی ہے جس روپ میں اس کا بُت ذہن میں نفسیاتی اُلجھن نے تراش چھوڑا ہوتا ہے۔ اسی طرح زوار علی میرے ذہن اور دماغ پر چپک کر رہ گئے تھے۔

مجھے زوار علی سے پہلے ریٹائر ہو جانا تھا سو ہو گیا۔ مجھے یاد ہے کہ میرے ریٹائر ہونے پر میرے دفتری دوستوں نے ایک الوداعی دعوت دی تھی اس میں زوار علی نے بھی شرکت کی تھی اور میری بہت سی ایسی خوبیوں کا ذکر کیا تھا، جو میں نے اپنے آپ میں کبھی نہ پائی تھیں، زوار علی نے میرے حلم، بردباری، اخلاص اور دوستانہ روش کا اپنی تقریر میں شان دار انداز میں ذکر کیا، اور رخصت کے وقت دوسروں کے مقابلے میں مجھے نہایت گرم جوشی سے سینے سے لگایا، میرے لیے کلماتِ خیر کہے اور اس دوستی کو جو میرے اُن کے درمیان کبھی نہ تھی جاری رکھنے پر زور دیا۔

میں شاید پہلے ہی کچھ بے زار سا تھا، ریٹائر ہو کر تو کچھ عجیب سا حال ہوا، ریٹائر ہو کر انسان کچھ عجیب سا جانور ہو کر رہ جاتا ہے کہ جس کی ضرورت باقی نہیں رہتی، بالکل اس طرح جیسے جب رکشا چلنے لگے تو تانگے ختم ہو گئے اور اُن کے گھوڑے بے مصرف۔ میں نے کئی ایسے گھوڑوں کو دیکھا ہے جو بوڑھے ہو کر بھوکے پیاسے چھوڑ دیے گئے تھے اور جو لنگڑاتے سڑک سڑک کوچے کوچے گھومتے رہتے اور بھوک ان پر سوار ہو کر اُن کے سب کس بل نکال کر انہیں کہیں کونے کھدرے میں گر پڑنے پر مجبور کر دیتی اور پھر وہاں پاؤں ٹیک ٹیک کر مرجاتے۔

میرے ساتھ خیر ایسا تو نہیں ہوا میں اپنی بیوی کی موت میت سے تو پہلے ہی فارغ ہو چکا تھا جس کی وجہ سے میرے ذہن پر تنہائی کا بڑا خوف طاری ہو گیا تھا، مگر

میرے دونوں بیٹے خاصے سعادت مند نکلے تھے اور مجھ سے کہیں زیادہ اعلیٰ تعلیم پا کر بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ بڑے بیٹے کو اچھا مکان ملا ہوا تھا اس کی شادی ہو چکی تھی وہاں مجھے بھی ایک اچھا آرام دہ کمرہ دے دیا گیا۔ بہو، میرا بڑا خیال رکھتی تھی۔ البتہ مجھے اس وقت بڑا ہی ہول اُٹھتا تھا، جب وہ چھٹی کے دن شام کو تینوں مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔ میرا زیادہ وقت بنگلے کے سبزہ زار پر کرسی پر بیٹھے اونگھتے ہوئے گزرتا یا پھر سوتے جاگتے کی سی حالت میں ٹی وی دیکھتا رہتا۔ اس تنہائی، اس ہول اور خوف کے ماحول میں اکثر زوار علی کا چہرہ اُبھرتا اور میرا مذاق اُڑاتا رہتا۔ عجیب عجیب شکلیں بنا کر ان کا چہرہ میرا منہ چڑاتا رہتا اور جس قدر میں اس تصور سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا وہ اس قدر تندی اور تیزی سے ذہن پر سوار ہوتا چلا جاتا۔ بعض اوقات تو میں سوچتا کہ شاید موت ایسی ہی صورت میں مجھ پر وارد ہوگی جیسی شکل وصورت زوار علی کی ہے۔ اللہ کی پناہ میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

ایک شام بڑی خوش گوار تھی شاید میں کئی دنوں سے تنہا نہیں رہا تھا، میری بہو میری دل جوئی کر رہی تھی اور میرے مرغوب کھانے بھی مجھے مل رہے تھے، میرے بیٹے بھی اکثر میرے پاس آ کر بیٹھ جاتے۔ تو اس خوش گوار شام کو تھوڑا سا حبس تو تھا لیکن ایسا نہیں تھا کہ طبیعت کو پژمردہ کر دے۔ میری بہو خاموشی سے میرے پاس آ کر لان میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی، اور میری مزاج پرسی کے بعد بولی کہ ”آپ کے لیے چائے اور پکوڑے بنا کر لاؤں؟ پکوڑے میرے دل پسند پکوانوں میں سر فہرست تھے۔ چائے بھی آئی اور پکوڑے بھی اور جب میں اس لذتِ کام ودہن سے لطف اندوز ہو رہا تھا تو میں نے محسوس کیا کہ میری بہو مجھ سے کوئی بات کہنے کے لیے پر تول رہی ہے۔

مجھے کئی دن سے یہ خوف محسوس ہو رہا تھا کہ اب ان سب کو مجھے اپنے ساتھ رکھنا کچھ کھلنے لگا ہے۔ کئی دن سے وہ تینوں دھیمے لہجے میں اِدھر اُدھر کبھی اپنے کمروں کے دروازے کے سامنے، کبھی برآمدے میں اور کبھی صحن میں کوئی مشورہ سی کرتے نظر آتے۔ تو میں نے جو اپنی بہو کو بات کرنے کے لیے پر تولتے دیکھا تو سوچا۔ چلو جو بات کل ہونی ہے وہ ابھی ہو جائے تو کیا بُرا ہے۔ میں نے بہو کی طرف نظر اُٹھا کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے بہو؟“

اس نے اپنے دوپٹے کا پلو انگلیوں میں مروڑتے ہوئے نگاہیں نیچے کر کے کہا۔

”آپ سے ایک اہم بات کرنا ہے، نعیم میاں کے بارے میں۔“ نعیم میرے چھوٹے لڑکے کا نام ہے۔

”کیا ہوا نعیم کو؟“ میں نے بہو سے پوچھا میرے لہجے میں اطمینان تھا، جس بات کا مجھے خطرہ تھا وہ بات نہیں تھی۔

”وہ نعیم میاں شادی کرنا چاہتے ہیں، انہوں نے لڑکی پسند کر لی ہے۔ آپ لڑکی والوں سے ملاقات کر لیجیے اور اگر یہ رشتہ آپ کو پسند ہو تو بات بھی پکی کر لیجیے۔“

”کون ہیں وہ لوگ؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ لڑکی کا بھائی نعیم میاں کے ساتھ پڑھتا تھا۔ اب وہ امریکہ میں رہتا ہے۔ آج کل آیا ہوا ہے، وہ شادی کے بعد اپنی بہن کے ہمراہ نعیم میاں کو بھی امریکہ لے جانا چاہتا ہے، اور نعیم میاں کی بھی ایسی ہی خواہش ہے وہاں اُن کو یہاں سے اچھی ملازمت مل جائے گی۔ وہ اچھے لوگ ہیں آپ مل کر تو دیکھیے۔ لڑکی کی ماں تو ہے نہیں اس کے والد بہت پیارے ہیں اور بہت گرہست مرد ہیں، انہوں نے اپنی بیٹی کے لیے اپنے ہاتھوں سے تمام شادی کے کپڑے سیئے ہیں اور جہیز تیار کیا ہے۔“

بہو کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ چپکے سے دونوں بھائی بھی دبے پاؤں آ کر خالی پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

”اچھا تو کب چلنا ہے۔“ میں نے چھوٹے لڑکے کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

”کل ہی چلیے۔“ چھوٹے کے بجائے بڑے لڑکے نے جواب دیا دوسرے دن شام کو جب ہم لوگ شہر کے سب سے فیشن ایبل علاقے میں پہنچے تو جہاں بڑے صاحبزادے نے گاڑی جا کر روکی تو وہ ایک بہت بڑی کشادہ ماڈرن بنی ہوئی کوٹھی کا گیٹ تھا۔ اس گیٹ کے بازو میں سنگ مرمر کی تختی پر میری نظر پڑی جس پر ”منزل زوار“ لکھا تھا تو مجھے یکا یک بخار چڑھتا ہوا محسوس ہوا اور گیٹ کھلنے پر جب ہماری گاڑی پورٹیکو میں پہنچی اور ہم اُترے تو سامنے ہی زوار علی کھڑے تھے۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی بس ان کے بال سفید ہو گئے تھے اور چہرے اور گالوں پر جھریاں زیادہ ہو گئی تھیں۔ ان کے ہونٹوں پر پان کا لاکھا نہیں تھا کہ اب شاید انہوں نے پان کھانا چھوڑ دیا تھا مگر اُن کے ہونٹوں پر وہی بدذات مخصوص استہزائی مسکراہٹ موجود تھی جیسے ٹائم آفس میں تاخیر سے پہنچنے والے کو دیکھ کر اُن کے چہرے پر بکھر جاتی تھی۔ مجھے اس وقت اُن کے وہ تمام انتباہی نوٹس یاد آ گئے جو وہ میرے تاخیر سے آنے پر پرسونل آفس سے ہر ماہ بلیک وارنٹ کی صورت میں جاری کرایا کرتے تھے۔ یکا یک زوار علی نے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ ”ارے تم! آج بھی تم دیر سے آئے ہو، صاحبزادے نے تو گھنٹہ بھر پہلے پہنچ جانے کو کہا تھا۔“ پھر میرے بچوں اور بہو سے مخاطب ہو کر بولے۔

”ارے بھائی ہم تو ایک دوسرے کے نہایت گہرے دوست رہے ہیں کیا شان ہے اللہ کی۔“ پھر میری طرف مڑتے ہوئے میرا بازو تھام کر بولے۔

”ارے میاں تم اتنے دن کہاں غائب رہے، یار تم سے پہلے ہی گہرا رشتہ تھا اور اب یہ رشتہ تو آسمانوں پر طے ہو جانے والا رشتہ ہے۔ آؤ، اوا اندر آؤ۔ اس مسئلے پر اب کیا بات کرنا ہے بس ہوا سمجھو۔“ میں سب کے ساتھ بادلِ نخواستہ اندر پہنچا۔ زوار علی کی لڑکی بڑی خوب صورت تھی، شرمیلی بھولی بھالی سی۔ اور ان کا لڑکا بھی اُن سے بہت مختلف تھا خوب صورت جوان رعنا۔ گورا چٹا۔

”تو زوار علی تم بیٹی کے ساتھ داماد کو بھی لے کر اپنے بیٹے کے ہمراہ امریکہ چلے جاؤ گے؟“ میں نے پوچھا اپنی مخصوص کھڑ کھڑاتی اور سماعت کے پردوں پر تیکھے پھوڑوں کی ٹیک پیدا کر دینے والی مخصوص قہقہہ لگاتی آواز میں زوار علی نے کہا۔ ”ارے میاں۔ میں اب کہاں جاؤں گا۔ اب تو میں اور تم دونوں یہیں رہیں گے۔“

میں نے سوچا یہاں سے بھاگ جاؤں۔ اور اپنے لڑکے سے اس رشتہ کے بارے میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دوں۔ مگر مجھے بے یار و مددگار پھرنے والے وہ لنگڑے گھوڑے یاد آ گئے جو سڑکوں سڑکوں بھوکے پیاسے مارے پھرتے ہیں اور بالآخر کہیں کونے کھدرے میں جان دینے کو پڑ رہتے ہیں اور ساتھ ہی مجھے زوار علی سے پہلے والے ضعیف اور بے آسرا ٹائم کیپر کی کسمپرسی کی موت کے واقعے نے آ دبوچا۔

میں نے جی میں سوچا۔ ”ہم مرتے وقت کم سے کم دو تو ہوں گے۔“

اس شادی کے کچھ عرصہ بعد جب میرا چھوٹا بیٹا زوار علی کی بیٹی کے ہمراہ امریکہ چلا گیا اور میرے بڑے بیٹے کا تبادلہ ایک دوسرے شہر میں ہو گیا اور میرا بُک کرایا ہوا فلیٹ تیار ہو کر مجھے مل گیا اور ”زوار منزل“ کرائے پر دے دی گئی تو زوار علی اور میں فلیٹ میں اُٹھ آئے۔

زوار علی میری بڑی خاطر داری کرتے میرے کپڑے دھوتے، جوتوں پر پالش کرتے، مزے مزے کے کھانے پکاتے اور پھر ہم دونوں مل کر شطرنج کھیلتے، ٹی وی دیکھتے اور اکثر و بیشتر وی سی آر پر دن رات فلموں کا سلسلہ چلتا رہتا۔

بس زوار علی کو ایک تو میرے صبح دیر سے اُٹھنے کی شکایت تھی اور دوسرے اپنے کپڑوں کے بٹن خود نہ ٹانکنے کی۔ وہ ان باتوں پر بہت جھلاتے بُرا بھلا کہتے اور بعض اوقات تو بات چیت بند کر دیتے اور پھر اپنے غصے کا اظہار اپنے گزرے زمانے کی طرح دفتری پرچوں کی صورت میں لکھ لکھ کر کرتے اور اگر اس پر بھی میں ان کے سامنے ہتھیار نہ ڈالتا تو وہ ہتھیار ڈال دیتے اور مجھے منانے کے لیے میرے لیے اچھی چائے بناتے پکوڑے بناتے، مجھ سے بہانوں بہانوں سے بات کرتے اور پھر خوشامد پر اُتر آتے اور تمام خوبیوں کا ذکر شروع کر دیتے جو مجھ میں نہ کبھی تھیں اور نہ ہو سکی تھیں۔

اور پھر ایسا بھی ہوتا کہ میں ناکارہ گھوڑوں کی کسمپرسی کی موت کے خوف سے نڈھال ہو کر اُن کی باتوں پر عمل شروع کر دیتا تلطف اور دوستی کا برتاؤ کرتا، دل میں شرمندہ ہوتا کہ زوار علی کس قدر دشمن دوست انسان ہیں اور پھر بالآخر انہوں نے مجھے نہایت سلیقے سے نہ صرف بٹن ٹانکنا سکھلا دیے بلکہ سلائی اور تُرپائی بھی سکھلا دی۔

اور قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ میں نے اپنی سلائی کا دُرست اور کامیاب امتحان ان کا کفن سی کر دیا۔!!

☆☆......☆☆

تیسری سچ بیانی

سہارا

کاشی چوہان

کراچی سے ایک اور رنگ، سچ بیانی

آج ساحل پہ گر پڑا ہے سکوت
آج پانی پہ رک گئی ہے صبا
ٹھہری ٹھہری ہے زندگی ساری
تجھ سے ملنے کا انتظار سا ہے

تجھ سے ملنے کا انتظار سا ہے......

لفظ جیسے کسی جنگ کا روپ دھار چکے تھے۔ اُس کی دل دنیا میں طوفان بپا تھا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں جکڑے وہ مسلسل سوچتی جارہی تھی۔ کیسی بے کلی تھی، کیسی بے قراری تھی۔ دماغ شل اور سوچیں جیسے منجمد سی ہوگئی تھیں۔

''کیا میرا فیصلہ غلط تھا؟''

جب سے راؤ اکمل علی شاہ اُس کے کمرے سے گئے تھے، وہ جیسے اُلجھ کر رہ گئی تھی۔

یہ نام راؤ افضل علی شاہ......اُسے جیسے کہیں بہت پیچھے لے گیا تھا۔

اتنے عرصے بعد کسی روشن سحر کی طرح وہ اچانک یاد کا سینہ چیرتا اُس کے روبرو آ کھڑا ہوا تھا۔ اُس کا لہجہ، اُس کی نرم آواز میں چھپی کاٹ دار باتیں، جیسے زندہ ہو کر مُردوں کی طرح اُس کے اِردگرد ناچنے لگی تھیں۔

''عورت ہو۔ سہارے کی ضرورت تمہیں ہمیشہ رہے گی۔'' اُس نے تمسخر اڑایا تھا۔ ''بہت بہادر ہو۔ یار میں جب بھی تمہیں یاد آؤں، آواز دے لینا۔'' انداز بڑا ذومعنی تھا۔ جو آج بھی اُس کی انا کو زخمی کر رہا تھا۔

''میں عورت کے ساتھ ساتھ انسان بھی ہوں۔ انڈر اسٹینڈ۔'' وہ تلملائی تھی۔

''اِس انسان کو جسے عورت کہتے ہیں۔ مرد کی نصف بہتر کہا جاتا ہے۔''

''ہر معاملے میں تم مرد، عورت کو نصف ہی رکھنا۔ حالانکہ تم جیسے مکمل مرد بھی عورت ہی کی وجہ سے دنیا میں آتے ہیں۔''

''ارے ارے......تم تو بُرا مان گئیں۔ یہ میں تھوڑی کہہ رہا ہوں۔ یہ تو......خیر چھوڑو نا مٹی ڈالو......یہ بتاؤ، کیا واقعی تم سیریس ہو۔''

''واٹ ڈو یو، مین۔ یعنی میں اتنی دیر سے بکواس کر رہی تھی۔ تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو راؤ افضل علی شاہ؟'' وہ جُزبز ہو کے رہ گئی تھی۔

''ایک مرد؟ تمہارا علی شاہ......''

''میں آج کے بعد تم سے کبھی نہیں ملوں گی۔'' وہ سخت خفگی سے بولی۔ ''آج پورے دو سال ہو گئے ہیں۔ تم میرے ساتھ ہو۔ ہم ایک دوسرے کو بہت مان دیتے ہیں۔ محبت کے اسیر ہیں۔ ایک ساتھ زندگی گزارنا چاہتے ہیں اور......اور......یہ سب سنتے سنتے میں تھک چکی ہوں؟ میں پورے اٹھائیس سال کی ہوچکی ہوں۔ کیوں تم باقاعدہ طور پر اپنے والدین کو میرے گھر نہیں بھیجتے۔ کیوں مجھے ٹینشن میں رکھے ہوئے ہو۔'' وہ جیسے ہار چکی تھی۔ آج دل کا غبار نکال دینا چاہتی تھی۔

''یار تم کو بے اعتباری کیا ہے؟'' وہ بھی جیسے سیریس ہوا تھا۔

''بات اعتبار اور بے اعتباری کی نہیں ہے علی شاہ۔ بات اُس بھرم کی ہے، جو ہم لڑکیاں ایک عمر کے بعد اپنے والدین کی آنکھوں میں کھونے لگتی ہیں۔ بات اُس چبھن کی ہے، جو لڑکیوں کی عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ ماں باپ کی آنکھ میں دودھیا موتیے کی طرح تیرنے لگتا ہے۔ تم سمجھتے کیوں نہیں ہو۔ میری عمر کی تو سب لڑکیاں بیاہی گئیں علی شاہ۔ مگر میں......'' وہ جیسے رو دی۔

''او مائی ڈیئر، تم بڈھی بھی ہو جاؤ گی نا، تو بھی میری ہی دلہن بنو گی۔'' وہ ماحول خوشگوار بنانے لگا۔

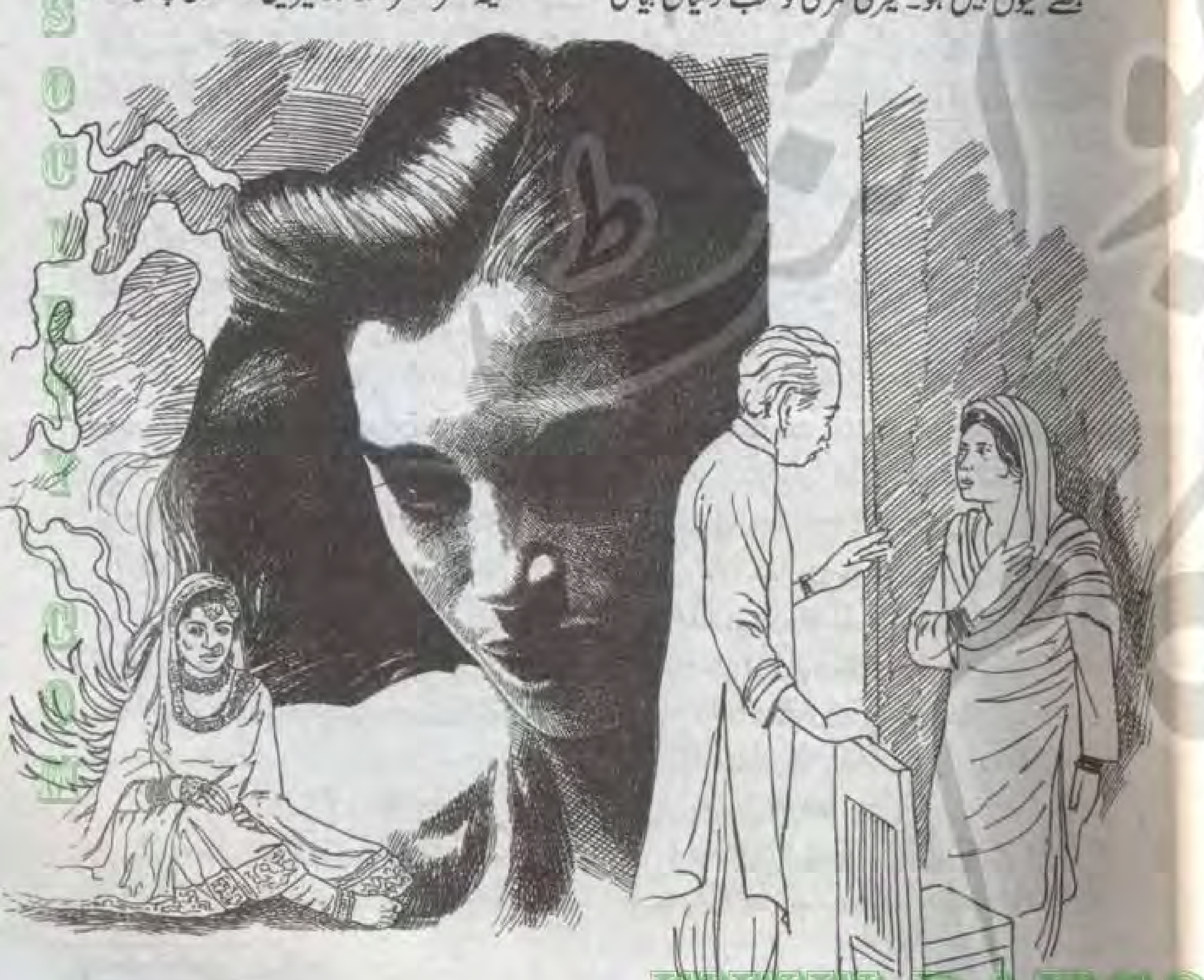
''یعنی تم......تم......تم مجھے بوڑھی کر کے لال جوڑا پہناؤ گے۔'' وہ تھوڑا سا مسکائی تھی۔

''علینہ۔ پلیز میں بہت ٹینشن میں ہوں۔ ابا کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ تم مجھے اگر یوں ڈسٹرب کرو گی تو، میں تو کچھ بھی نہیں کر پاؤں گا۔ ہماری ٹرائبل پرابلمز کو سمجھو یار۔ بہت جلد انشاءاللہ ہم ایک ہو جائیں گے۔''

اور پھر سمندر کی طلاطم خیز موجیں پوری طاقت کے ساتھ جھاگ اُڑانے لگیں اور مستقبل کے خواب جیسے ڈوبنے اُبھرنے لگے تھے۔ سمندر کا پانی بہت نمکین ہو گیا تھا جو اُن دونوں کو مزید تُرش و شیریں باتوں پر مجبور کر رہا تھا۔

☆......☆

علینہ ظفر، ظفر احمد اور شیریں فاطمہ کی چوتھی اولاد



تھی۔ علینہ سے بڑی فصیحہ تھی اور اُن سے بڑے دونوں بھائی۔ حمیر اور سمیر تھے۔

مڈل کلاس طبقے میں سب سے بڑا المیہ شادی ہے۔ مہنگائی کسی عفریت کی طرح دن بدن اپنی لپیٹ میں نفوس کو لیتی جارہی تھی۔

حمیر، سمیر نے جیسے تیسے تعلیم مکمل کی اور پھر برسرِ روزگار ہوتے ہی شادی کا ناگ اُن کو ڈس گیا۔

ماں باپ نے بڑی مشکل سے فصیحہ کو حمیر کی شادی کے ساتھ نمٹایا تھا، ورنہ آج وہ بھی علینہ کے ساتھ، اِس اسی گز کے کوارٹر میں پڑی، سر میں تیزی سے بڑھتے چاندی کے تار گن رہی ہوتی۔

علینہ نے تگ ودو کر کے تعلیمی ڈگریاں اِس حد تک جمع کرلی تھیں کہ باآسانی کسی بھی اچھی جگہ اُسے نوکری حاصل کرنے میں کوئی مسئلہ درپیش نہ آتا۔

آخرکار علینہ ماں باپ کی دعاؤں اور اپنی محنت سے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں نوکری حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ اب ظفر احمد کا گھر اُس نوکری کے طفیل بہتر انداز میں چلنے لگا تھا، مگر علینہ کے بارے میں والدین کو فکریں دامن گیر تھیں۔

ماں باپ کے سینے میں بیٹی بیسویں سن میں پہنچ کر ہُوک بھرنے لگتی ہے۔ بظاہر خوش نظر آنے والے سفید پوش، اندر سے فکر کے روگی ہوجاتے ہیں۔ یہی روگ اُن دونوں کو بھی آہستہ آہستہ گھن کی طرح کھاتا جارہا تھا۔

راؤ افضل علی شاہ اندرونِ سندھ کی ایک بڑی جاگیردار فیملی سے تعلق رکھتا تھا۔ آج کے جدید دور میں بھی ان کا خاندانی نظام اتنا مضبوط تھا کہ اکثر وہ علینہ کو جاگیرداری زنجیروں میں جکڑا ہوا محسوس ہوتا۔ وہ اُس کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز تھا۔

آہستہ آہستہ محبت کا پودا اُن دونوں کے بیچ پنپنے لگا اور جلد ہی ایک ایسا پُل بن گیا، جس کے بغیر اُن دونوں کا وجود ہی ناگزیر ہوگیا مگر ایک پُل اور پُل ملتے ہیں بھلا ایک دوسرے سے؟

☆......☆

جیسے زندگی ایک ہی ڈگر پر چلنے لگی تھی۔ گھر سے آفس، آفس سے علی شاہ کے ساتھ تھوڑا سا Tea Time میں ایک دوسرے سے آپس کے معاملے شیئر کرنا۔ کبھی کبھی گھٹن سے پریشان ہو کر ساحل سمندر نکل جانا اور اپنے دکھ سمندر کی لہروں کے سپرد کردینا۔

وہ ہر بار جلد شادی کا مطالبہ کرتی۔ اُس کی فکریں گھر پہنچ کر ماں باپ کی آنکھوں میں امید کا موتیا دیکھ کر مزید بڑھ جاتیں اور اُس کے گھٹا جیسے بالوں میں ایک اور نوری بال کا اضافہ ہوجاتا۔

علی شاہ اب تک گھر والوں کو اُس کے حق میں صحیح طرح سے کنوینس نہیں کرپایا تھا۔

اکثر وہ اُس سے اُلجھ جاتی تھی۔

”یار مسئلہ ہے گھر میں۔ بھابی کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ مسائل میں دبکتے ہوا جواب دیتا۔

”کیا ہوگیا ہے انہیں؟ پچھلے ماہ بھی تم نے یہی کہا تھا۔“ وہ پیچھے پڑجاتی۔

”یار جب سے گڑیا پیدا ہوئی ہے، تب سے اُن کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی اور پھر تم جانتی ہو، گاؤں میں ڈلیوری کی وجہ سے کچھ مسائل ہوگئے تھے۔“ اس نے مسئلہ بتایا۔ ”مگر شادی کے بعد میں گاؤں میں نہیں، شہر میں ہی رہوں گی۔“ اُس نے کسی حسین خواب کو اُگلا تھا اور پھر فوراً ہی شرمندہ ہو کر بولی۔

”چلو اللہ خیر کرے گا، مگر کم از کم بات تو کرو۔ کسی سے کہو گے نہیں تو عین وقت پر تو مشکلات پیدا ہوجائیں گی۔“ اُسے پریشانیاں آن گھیرتیں۔

”اللہ کرم کرے گا۔ تم حوصلہ رکھو۔ تم میری ہی دلہن بنو گی۔“ وہ دھیمے سے مسکراتا، مگر علینہ سلگ جاتی دل میں طرح طرح کے خیال آکر اُسے ہولاتے۔

بے یار و مددگار ہی کاٹا تھا سارا دن
کچھ خود سے اجنبی سا، کچھ تنہا، اُداس سا
ساحل پہ دِن بجھا کے میں لوٹ آیا پھر وہیں
سنسان سی سڑک کے اِس خالی مکان میں
دروازہ کھولتے ہی میز پر کتاب نے
ہلکے سے پھڑ پھڑا کے کہا
”دیر کردی دوست“

اور وہ اِسی چیز سے تو ڈرتی تھی۔ کہیں مزید دیر نہ ہو جائے۔ عمر کا موتی ایک بار دھندلا ہوجائے تو پھر شاید کبھی

اصل چمک نہیں پاسکتا۔ پھر سے دن گزرے اور چھ ماہ مزید گزر گئے، مگر علی شاہ کی پرابلمز وہیں پر اَٹکی رہیں۔

☆......☆

اُس دن وہ جب گھر پہنچی تو حمیر بھائی، ناہید بھابی اور دونوں بچوں کے ساتھ گھر میں موجود تھے۔ یعنی آج شام کا ڈنر جلد تیار کرنا ہوگا۔

وہ سب سے ملتی ملاتی اپنے کمرے میں پہنچی۔ فریش ہو کر باہر آئی تو جیسے کچن کی طرف اُس کے اٹھتے قدم رُک سے گئے تھے۔ یقیناً یہ ناہید بھابی کی آواز تھی۔

”آپ لوگ خود پوچھ لیں۔ ہم پوچھتے تو اچھے نہیں لگیں گے۔ اگر وہ اُسی کے ساتھ گھر بسانا چاہتی ہے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ آہستہ آہستہ جیسے اور رشتے نکل گئے تو یہ بھی......“

”بہو ایسا تو نہ کہو۔ ہم بات کریں گے مگر وہ ہے کون۔ کس خاندان کا ہے؟“ ماں تھیں بہو کی بات کاٹ کر بات آئی گئی کی تھی۔

”اچھے خاندان کا ہے۔ ایک بیٹی ہے۔ میں چھان بین کرچکا ہوں؟“ حمیر بھائی بولے تھے۔

اور پھر وہ خاموشی سے اپنے ناتواں وجود کو گھسیٹتی کچن میں لے آئی۔ گیس کا چولہا جلایا اور سوچوں کی آگ پر پانی ڈال کر کھانے کا انتظام کرنے لگی۔

آخر کو اُس کے ”اپنے“ ایک شادی شدہ، بچوں والے کا رشتہ اُس کے لیے لائے تھے۔ یہ احسان کم تھا۔ اِس احسان کو وہ جلدی جلدی مختلف ہانڈیوں میں بھوننے لگی تھی۔

’راؤ افضل علی شاہ‘ بہت ہوگیا۔ اب تم سے کل فائنل بات کرنا ہے۔ ورنہ میں اِس احسان تلے ہی اپنی محبت کی قبر بنانے کو ترجیح دوں گی۔

سوچتے سوچتے اُس نے جلتے دل کے ساتھ بھائی بھاوج کے لیے ڈنرز سرو کرنا شروع کردی تھیں۔

☆......☆

حالانکہ دونوں نے ایک عرصے سے‘ خود کو ایک دوسرے کو سونپ دیا تھا مگر...... اِس طرح کی سپردگی کا کیا فائدہ‘ جس میں مِل کر ایک ہونے کی کوئی راہ نہ ہو۔ کوئی روزن نہ ہو اور آج جب وہ دونوں سمندر کے پانی میں اترتے سوا نیزے پر موجود سورج کو سیلی سیلی دیوار پر بیٹھے دیکھ رہے تھے‘ تو جیسے کہیں بہت تیز دھماکہ ہوا تھا۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔ میں آج ہی اپنے ماں باپ کو اُس رشتے کے لیے ہاں کہہ رہی ہوں۔ ہوسکے تو مجھے ایک خواب کی طرح بھول جانا۔“ جیسے خوابوں کی لاش کو سمندر کے حوالے کردیا گیا تھا۔

”علینہ ...... تم یقین کرو۔ بس تھوڑا سا ٹائم اور دے دو۔ میری جان۔ میں جلد......“

”بس کرو۔ پلیز بس کرو۔ ایک لڑکی عمر کی سیڑھی پر ہر اوپر اٹھتے Step کے ساتھ لوگوں کے لیے مفت بر اور ماں باپ کے جسموں میں توانائی کی کمی اور چہرے پر جھریوں کی تعداد میں اضافہ کرتی ہے علی شاہ۔ ہم مڈل کلاس لوگ ہیں۔ مجھے بیاہنے کوئی راجہ مہاراجہ نہیں آئے گا، نہ ہی اِس ملک کا وزیراعظم مجھے اپنے بیٹے کے لیے پسند کرے گا۔ ہم زیادہ عمر کی کنواریاں تو ہر سال اپنے زندہ وجود کو ٹھنڈی قبر میں جھلستا ہوا دیکھتی ہیں۔ میں کل انتیس سال کی ہوجاؤں گی مگر تم جانتے ہو، سولہ برس اور چھبیس برس والی عمر کے بیچ کے دس سال، ہم لڑکیوں کے لیے کتنے حساس ہوتے ہیں۔ نہیں تم کیا، کوئی بھی نہیں جانتا۔ میں نے خواب دیکھے۔ گناہ تو نہیں خواب دیکھنا۔ آج جب میرے اُسی گز کے گھر میں، میرا بھائی میرے لیے ایک بچی کے باپ کا رشتہ لاتا ہے۔ اپنا فرض پورا کرتا ہے، تو بتاؤ میرا مول کیا رہ گیا۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

سمندر کی لہریں طلاطم خیز ہوگئی تھیں۔ نمکین پانیوں سے جہاں وہ بھیگ رہے تھے، وہیں آنکھوں کا نمکین پانی بھی اُن کے ساتھ چلاتا ہوا، اپنے دکھ کو اُس کے حوالے کررہا تھا۔

راؤ افضل علی شاہ کی زبان بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر...... جیسے کسی نے لب سی دیے تھے۔ وہ کسی مجرم کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔ ایسا قیدی جس پر بغیر کسی جرم کے فردِ جرم عائد کردی گئی ہو۔

”میرا یقین کرو، میں صبح کے نور کی قسم کھا کر کہتا ہوں علینہ۔ میں نے تمہارے علاوہ کسی سے محبت نہیں کی۔ میری پہلی اور آخری محبت تم ہو۔ تمہاری روح پر میرے

لفظ، مرہم نہیں رکھ سکتے اب لیکن میں مجبور ہوں۔ اس وقت تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ میں اپنے چاچا کی بیٹی سے شادی پر انکار کر چکا ہوں۔ بچپن کی منگ تھی وہ میری مگر شاید میں کسی سے بھی اب شادی نہ کر پاؤں۔" راؤ افضل یہ کہہ کر رُکا نہیں۔ سیلن زدہ دیوار سے نیچے اتر گیا۔

"کل تک مذاق میں کہتا تھا مگر آج پوری سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ زندگی کے کسی بھی موڑ پر مجھے آواز دے لینا۔ اپنا منتظر پاؤ گی۔"

☆......☆

سُمیر کو ظفر احمد نے اپنے فیصلے سے "ہاں" کی صورت آگاہ کر دیا تھا۔ بس پھر جیسے زندگی نے پرواز بھر لی تھی۔ آنگن کی چڑیا جیسے کو چھوڑنے کو تیار ہو گئی تھی۔

یہ لڑکیاں بھی کیسی سادہ دل، سادہ ورق سی ہوتی ہیں۔ بھرم اور عزتوں پر، اپنی خواہشات زندگی کی شاہراہ پر کالی کلوٹی سڑک کے تارکول میں لپیٹ کر تا عمر دفنا دیتی ہیں اور پھر عمر بھر کا سفر، خواہشات کو کچلتے ہوئے طے کرنے لگتی ہیں، جب تک کہ زندگی کا سفر تمام نہ ہو جائے۔

علینہ نے بھی اس سیاہ شاہراہ کے نیچے روشن خواب دفن کر دیے تھے اور دل کے ورق پر ایک نام کو کھرچ کر دوسرا نام لکھ لیا تھا۔

☆......☆

شادی سادگی سے انجام پا گئی تھی۔

اجمل شاہ کا اپنا بزنس تھا۔ ظفر احمد چاہتے تھے کہ علینہ گاؤں نہ جائے، اس لیے اُن کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اجمل نے ایک لگژری فلیٹ علینہ کے لیے لے لیا تھا۔

حجلۂ عروسی میں علینہ سرخ جوڑے میں لپٹی یوں بیٹھی تھی جیسے کسی مجرم کو تمام ثبوتوں اور گواہوں کے بعد سزا سنائی جانے والی ہو۔

جب خواب مر جائیں تو شاید ان کی لاش پر اسی طرح ماتم کیا جاتا ہے۔ وہ بھی اسی طرح خوابوں کی چتا پر، آگ کی لپٹوں سے جھلسنے کو تیار بیٹھی تھی۔ اسی ادھیڑ بن میں کتنا وقت گزر گیا پتا ہی نہیں چلا تھا۔

دروازہ ایک احتجاج کی سی آواز کے ساتھ کھلا تھا۔

اجمل دبے پاؤں اُس کے پہلو میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔

"علینہ میں آپ سے صرف ایک بات کرنا چاہتا ہوں اگر آپ اجازت دو تو میں......" دبے لفظوں میں جیسے کوئی احساسِ شرمندگی تھا، جسے سیکنڈ کے ہزارویں سیکنڈ میں وہ محسوس کر گئی تھی۔ اجمل کی جھنجھلاہٹ اور اجتناب کی وجہ، اُس کی بے بسی۔ وہ سب کچھ جانتی تھی۔

گھر یہ تین حرفی لفظ۔ اسے جوڑ کر زندگی کی اساس قائم کرنے کے لیے چوتھا ستون عورت ہوتی ہے۔ گھر مرد بناتا ہے۔ بساتی عورت ہے اور جہاں اُس نے اپنی متاع ہی قربان کر دی تھی، تو اب اس اساس میں اگر وہ چوتھا ستون نہ بنتی تو یہ گھر اُس کی سیج کے نیچے جلتی محبت کی چتا میں جل کر راکھ ہو جاتا، تربیت اور حالات نے اُسے اعتماد بخشا تھا۔ اسی اعتماد کے طفیل اس نے گھونگھٹ اُلٹ دیا۔ روایتی دلہنوں والے چونچلے اُسے اِس سے ڈرامہ لگ رہے تھے۔

"مجھے معلوم ہے۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ یقین کیجیے۔ میں نے اِس شادی کو کسی مجبوری کے تحت قبول نہیں کیا ہے۔ میرے ماں باپ کی رضا اِس میں شامل تھی اور پھر وہ جو اوپر والا ہے نا...... وہ بڑا منصف ہے۔ میرا اور آپ کا ساتھ تو اُس نیلی چھتری والے نے ممکن بنایا ہے۔" وہ دھیرج سے گویا ہوئی تو اجمل نے اس کے ہاتھوں کو اپنے لبوں سے چوم لیا۔ اُس کی آنکھوں میں ممنونیت کے کانچ چمکنے لگے تھے۔

"علینہ آپ کی زندگی میں نمل کی صورت میری شادی کی پہلی یادگار، جو مجھے میری زندگی مکمل کر کے زینت نے دی تھی۔ آپ کو کبھی پچھتاووں کو شکار تو نہیں کرے گی۔" اجمل کو بھی اب اس پر جیسے یک گونہ بھروسا سا ہوا تھا۔

"میں نمل کو اپنی اولاد سے زیادہ پیار دوں گی اور ہاں اس اعتبار کے لیے میں آج آپ سے بھی ایک وعدہ چاہوں گی۔" علینہ نے ہلکی سی مسکراہٹ لبوں پر سجاتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں میں دل و جان سے آپ کی بات مانوں گا۔" اجمل کی عاجزی اُس کے حکم کی منتظر تھی۔

"جائیے آپ پہلے نمل کو میرے پاس لے آیئے۔"

علینہ نے دھیمی آواز میں کہا۔

"مگر کیوں۔" اجمل ہکلائے۔

"آپ لے کر تو آئیں۔ میں پھر بات کروں گی۔"

اُس کے کہنے پر اجمل میکانیکی انداز سے کمرے سے باہر نکلا اور پھر تھوڑی دیر بعد نمل اُس کے پاس تھی۔

وہ نمل کو اپنی گود میں لٹائے اُس کا سر سہلا رہی تھی۔

"اجمل وعدہ کریں۔ میں اپنی اولاد کو نمل پر قربان کر دوں گی۔ میں ماں نہیں بنوں گی۔" جیسے کوئی بم تھا جو ایک دم سے اجمل علی شاہ کے سر پر کسی نے پھوڑا تھا۔

"علینہ یہ کیا بات کی آپ نے۔ پلیز یہ وعدہ...... یہ تو سراسر ناانصافی ہے۔ میں اس طرح کی ناانصافی شاید نہ کر پاؤں۔ خدا کے کاموں میں دخل اندازی انسان کے بس کی بات نہیں۔ ہماری لاکھ کوششیں بھی خدا کے فیصلوں کو نہیں بدل سکتیں۔" اجمل نمل کو واپس اُس کے کمرے میں، آیا کے پاس چھوڑ آیا تھا۔

"کیا آپ مجھے خود غرض سمجھیں گے؟"

"علینہ آپ...... اِس طرح کر کے کیا عظیم ماں، عظیم بیوی کا خطاب پا لیں گی۔" اجمل کے لہجے میں احتجاج در آیا تھا۔

"میں یہ کوئی Tag سجانے کے لیے تو نہیں کہہ رہی۔ شاید اپنی اولاد کے بعد میں وہ محبت......" وہ روہانسی ہوئی۔

"علینہ محبت کو تقسیم کے قاعدے سے بانٹتے ہیں۔ آئندہ 'تم' یہ بات زبان پر نہ لانا اور ہاں...... دیکھو میں بھول گیا۔ تمہارے لیے ایک چھوٹا سا تحفہ......" اجمل نے جیب سے دو مخملی ڈبیاں نکال کر کھولیں اور علینہ کے حوالے کر دیں۔

آپ سے تم تک کا سفر سیکنڈوں میں طے ہوا، تو جیسے اجنبیت کی دیوار گر گئی تھی۔ علینہ کو اب اپنی سیج کے نیچے دہکتی آگ کے شعلے سرد ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ جیسے سمجھوتے کے پانی نے اُس آگ پر پانی کی پھوار برسا دی تھی اور پھر علینہ نے ڈائمنڈ کا وہ لاکٹ سیٹ اور رنگ پہن کر نئی زندگی کی شاہراہ پر قدم رکھ دیا۔

☆......☆

وقت گزرا۔ حالات بدلے۔ وہ اجمل شاہ کی منکوحہ بن گئی۔ اجمل شاہ بھی ایک بڑی جاگیردار فیملی سے تعلق رکھتے تھے۔ علینہ کے والدین کی خواہش پر وہ اُسے گاؤں لے کر نہیں گئے۔

اس خوب صورت لگژری فلیٹ میں زندگی نے اپنا سفر شروع کر دیا تھا۔ سب کچھ کہیں بہت پیچھے رہ جاتا ہے مگر وقت اپنی رفتار سے رواں دواں تھا۔ بھلا اس کو کیا فرق پڑتا ہے۔ کسی بھی سانحے کے ہونے سے یا کسی بھی خوشی کی تھرکتی لو سے۔

کسی بے کسی کی ٹھنڈی نبض میں دھیمی دھیمی چلتی سانس یا بلند فشارِ خون کی صورت لہو کی جوار بھاٹے سے۔ کسی کوڑھی کی امید کے ناسور سے یا ناسور پر رکھے آخری تدبیری مرہم سے۔

اِسے کیا فرق پڑتا ہے؟ وقت کا کام حرکت کرتے رہنا ہے۔ موسموں کا آنا جانا، رنگ خوشبو سب کو ثبات ہے

ایٹم بم

دوسری عالمی جنگ کے دوران جولائی 1945ء میں امریکہ نے ایٹم بم بنانے کا کامیاب تجربہ کر لیا اور جاپان کو انتہائی تباہی کی دھمکی دے کر اسے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے کو کہا مگر جب جاپان اس پر آمادہ نہ ہوا تو پہلے 6 اگست 1945ء کو ہیروشیما اور پھر 9 اگست 1945ء ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر جاپان کی کمر توڑ دی۔ لاکھوں انسان ہلاک ہوئے" اربوں ڈالر کی املاک تباہ ہوئیں اور جاپان کی آنے والی نسلیں بھی تابکاری کے مہلک اثرات سے متاثر ہو گئیں۔ چند دنوں بعد 2 ستمبر 1945ء کو جاپان کے شہنشاہ ہیروہیٹو نے امریکی حکومت کے سامنے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے کی دستاویز پر دستخط کر دیے۔

مگر وقت...... یہ نہیں رکتا، چلتا رہتا ہے۔

اکثر شب کو جب چاند اندھیری رات کی ظلمت میں اپنی طلسماتی کرنوں سے دو دو ہاتھ کر رہا ہوتا، علینہ اپنے محرابی دریچے میں بے خودی ہو کر اس آنکھ مچولی کو دیکھتی اور پھر تھک کر اپنے گلے میں پڑے ڈائمنڈ کے لاکٹ کو آنکھوں کے بہت نزدیک کر لیتی۔ اِس روشنی میں وہ اکثر سوچتی کہ چاند بھی محبت ہی کی طرح روشن ہوتا ہے۔ جیسے پہلی محبت لاکھ چاہ کر بھی اپنی یاد دل سے کھرچ نہیں سکتی۔ حالات کی سنگینی اور لمحات کے فریب بھی اِسے جُھل نہیں دے پاتے اور اِس بیل کے شگوفے ہمیشہ رس اور خوشبو سے بھرے ہی رہتے ہیں۔ چاند کی طرح روشن رہتے ہیں اور دل کی دنیا میں یہ محبت اپنی قندیلیں روشن ہی رکھتی ہے۔

☆......☆

اُن کی شادی کے تین سال کیسے گزرے، پتا ہی نہ چلا تھا۔

حکومتیں بدلیں، مسائل نہ بدلے۔ بلکہ ملکی حالات دگرگوں ہوتے جا رہے تھے۔ ایسے میں ایک دیہاڑی لگانے والے سے لے کر مل اونر تک، سب کے سب پریشان تھے۔ گرانی کا گراف بتدریج اوپر اُٹھ رہا تھا۔

آج جب اجمل آفس سے گھر آئے تو کچھ پریشان سے تھے۔ علینہ اُن کا کوٹ ہینگ کر کے چائے لے آئی تھی۔

"آپ نے ابھی تک چینج کیوں نہیں کیا؟"

"بس ذرا طبیعت ست ہے۔"

"کیا بات ہے۔ پریشان لگ رہے ہیں۔" وہ چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کے اجمل کے بکھرے بال سہلانے لگی۔

"بتایئے نا۔ کیا بات ہے۔ مانتی ہوں کہ میں آپ کے دفتری معاملات میں دخل در معقولات نہیں کر سکتی، مگر آپ کی ہم سفر، آپ کی ہم قدم تو ہوں ناں۔" وہ کچھ دیر رکی اور اجمل کا سر اوپر کرتے ہوئے آنکھیں نم کر گئی۔ اُس کی آنکھ کے شیشے میں اِن اشکوں کی چمک یوں چمکی کہ اجمل علی شاہ کے دل میں جیسے تیر پیوست ہو گیا۔ انہوں نے بڑھ کر اُسے گلے لگا لیا۔

"حالات اچھے نہیں رہے۔ روزانہ ظلم ہوتے دیکھتا ہوں، سنتا ہوں۔ کتنا بے بس ہوں۔ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ بالکل اُس جلتی کشتی کی طرح جو پانی کے بیچ میں بھانبھڑ بھاڑ جل رہی ہوتی ہے اور سمندر اُس کی آگ بھی نہیں بجھا سکتا۔"

اجمل ایک جذب میں بولتا رہا۔ علینہ نے اُسے خود سے الگ کیا اور محبت سے ایک بوسہ ماتھے پر دے کر اُسے بیڈ پر بٹھا دیا۔

ٹی وی آن کیا تو بریکنگ نیوز میں "آج اتنے آج اتنے کل سے اب تک اتنے......" نیوز اینکر سپاٹ چہرہ لیے شہر کی تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کر رہی تھی۔

کبوتر کے آنکھیں بند کر لینے سے حقیقت تو نہیں بدلتی۔ پھر بھی اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔

"آپ کیوں ٹینشن لیتے ہیں۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ چائے کا کپ اُسے دیتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" غائب دماغی سے کہتے ہوئے اجمل کی نظریں ٹی وی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔

کہاں پہ ہوں کہاں پر دکھائی دیتا ہوں
وہاں نہیں ہوں جہاں پر دکھائی دیتا ہوں

☆......☆

نمل کو اسکول میں داخل کرا دیا گیا تھا۔ گھر آ کر وہ اسکول کی ساری باتیں کرتی تو علینہ کو بہت احساس ہوتا کہ کاش......

خدا کے آگے نمل اور اجمل کی صحت اور کامیابی کی دعائیں مانگتے ہوئے، ایک دعا مچل مچل کر لبوں پر آ جاتی کہ میں اپنی محبت کو بھول جاؤں۔" جیسے ہی یہ الفاظ اُس کے لبوں سے ادا ہوتے۔ کہیں بہت دور سے آوازیں آنے لگتی تھیں۔

"میں تمہارا انتظار کروں گا۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔ کسی بھی موڑ پر۔"

اور پھر وہ اِن بازگشتوں میں کھو سی جاتی۔ الفاظ گڈمڈ ہوتے اور اُس کے ہاتھ دعائیں بھول جاتے۔

"مما میں اسکول نہیں جاؤں گی۔" صبح جب وہ نمل کو اٹھانے لگی تو اُس نے پہلا جملہ یہی ادا کیا۔

"میری جان! آج سنڈے نہیں ہے ناں۔ بچے تو اسکول شوق سے جاتے ہیں۔ بس پیاری پیاری کہانی سناتی ہیں۔" وہ اُسے بہلانے لگی۔

"مما آپ کو پتا ہے، کل میری ایک فرینڈ کو نا، ایک انکل پکڑ کر لے گئے۔ ایک بچہ کہہ رہا تھا کہ اب وہ کبھی نہیں آئے گی۔ اُس کے پپا اور مما رو رہے تھے مما۔ مما میں اسکول جاؤں گی تو مجھے بھی کوئی انکل لے جائیں گے نا۔"

وہ بچی جس نے دنیا کو اپنی آنکھوں سے پوری طرح دیکھا تھا نہ سورج کی کرنوں سے اپنا دامن کبھی نہ بھرا تھا۔ حالات نے وقت سے پہلے ڈراوے معصوم ذہنوں میں اِس طرح انسٹال کر دیے ہیں کہ بچہ مسائل اور دہشت گردی کی جانکاری، کوکھ سے ہی لے کر پیدا ہوتا ہے۔

"یہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟" علینہ نے دھڑ دھڑ کرتے دل کو قابو میں کیا اور نمل کو گود میں اٹھا لیا۔

"مائی سویٹ بے بی۔ بیٹا آپ کو تو پاپا اسکول چھوڑ کر آتے ہیں نا۔"

"مما میری فرینڈ کے پاپا بھی تو چھوڑنے آتے تھے، مگر انکل اُسے پکڑ کر لے گئے۔" معصومیت نے جیسے علینہ کی زبان کو قفل لگا دیا تھا۔ وہ اُسے چومتی ہوئی واش روم میں لے گئی اور پھر یونیفارم پہنا کر اُسے لنچ باکس دیا اور اُس کے اسکول جانے کے بعد وہ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی نمل کی باتوں کی گہرائی پر غور کرنے لگی تھی۔

اِن حالات میں جیسے کسی نے سوچوں کو آگ کی لپٹوں کے حوالے کر دیا تھا۔ معصومیت کو خوف کے عفریت نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ملک کی تاریخ میں ایسی بربریت، جارحیت اور خون کی ہولی کی مثال نہیں ملتی تھی۔ کوئی محفوظ نہیں تھا۔ گھروں میں ویرانیاں ڈیرے جمائے ہوئے تھیں تو کالی سڑکوں پر موت ناچ رہی تھی۔ زندگی خوف کی پرچھائیوں میں منہ چھپائے سسک رہی تھی۔

"المدد، یا خدا۔ المدد یا خدا۔" وردِ زبانوں پر جاری تھے۔ گھروں سے باہر نکلنے والے، زندگی کی کب بازی ہار جائیں۔ کچھ پتا نہیں تھا۔ موت کی ناگن گن گن کر شکار دبوچ رہی تھی۔ سوچتے سوچتے علینہ کا دماغ کھولنے لگا۔

"عورت کو ہمیشہ مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔" علی شاہ کے الفاظ کانوں میں گونجے۔ نمل کا چہرہ آنکھوں میں آ گیا۔ اُس نے جلدی سے ٹی وی آن کیا۔

"کل سے اب تک اتنے......" اُس نے غصے سے سوئچ آف کر دیا۔

☆......☆

لواحقین

دیکھو اس اخبار میں لتھڑی
تصویریں جو پڑی ہوئی ہیں
جن پر آنکھیں چمک رہی ہیں
اُس اخبار میں اور بھی رنگ ہیں
سارے کے سارے سرخ لہو کے
سب کے لعل ہیں، سب کے سہارے
لٹے پٹے سے۔ کٹے پڑے ہیں
کوئی ماں سینا پیٹے ہے
ہائے میرے بیٹے کا گلا ہے
گردن میں تعویذ پڑا ہے
وہ تعویذ جو ردِ بلا ہے
بس تعویذ ہی باقی بچا ہے
جو گردن کے ساتھ جڑا ہے
کسی بہن نے دی ہے دہائی
لال لال سے خون میں ڈوبا
میرے بھیا کا کُرتا ہے
میں نے غازی شاہ کا دھاگہ
جس بازو میں خود باندھا تھا
دیکھو اِس کُرتے کے اندر
وہ بازو بھی کٹا پڑا ہے
کوئی معصوم سی گڑیا تڑپی
میرے پاپا کہاں گئے ہو؟؟
تم نے مری گڑی جو لی تھی
اور بھیا کا بیٹ لیا تھا
پاپا اُس بوری میں ملے ہیں
جس میں کٹے سے سب اعضاء ہیں

پاپا ہاتھ میں سر ہے تمہارا
بات نہیں تم کیوں کرتے ہو
پاپا میرے مجھے بتاؤ
تم کو کس کس نے ہے مارا
پاپا تم کو کس نے جلایا
کس نے تم پر سگریٹ داغا
کس نے تمہارے ہاتھ کو کاٹا
کس نے تمہارے پیر ہیں باندھے
پاپا...... پاپا...... کچھ تو بولو
پاپا...... پاپا...... مجھ کو بتاؤ
اب کی عید یہ کہاں ملیں ہم
پاپا میرے کچھ تو بتاؤ!!
اخباروں میں فریم جُوے ہیں
سب ہی ''بڑوں'' کے دعوے دھرے ہیں
بچھڑ گئے جو
کہاں ملے ہیں؟

وہ بے بس ہو کر جو دل میں آیا اُسے لفظوں کا روپ دیتی رہی۔

یہ ڈائری بھی کیسی رفیق، کیسی غمگسار ہوتی ہے۔ تنہائی کی سہیلی۔ دل کی رازدار...... منہ سے کچھ نہیں بولتی۔ بھید نہیں کھولتی مگر اپنے اندر اک دنیا سمائے ہوئے ہوتی ہے۔ اُسے واقعی اِس وقت قرآن کی وہ سورت بار بار یاد آ رہی تھی۔

''بے شک انسان خسارے میں ہے۔''

انسان واقعی خسارے میں ہے۔ کل کا کچھ نہیں پتا، بلکہ اِن حالات میں تو اگلے پل کا نہیں پتا کہ کیا ہو جائے۔ اجمل گھر آ جاتے تو اُسے جیسے سکون آ ہو جاتا۔ نمل کو وہ اسکول کے بعد ہتھیلی کا چھالہ بنا کر رکھتی تھی۔

حالات کی وجہ سے آؤٹنگ برائے نام رہ گئی تھی۔ ورنہ وہ تینوں ہی شام میں کہیں پارک نکل جاتے اور اکثر ہوٹلنگ کرتے مگر اب...... اِس شہر کے باسی خوف کی پناہوں میں تھے۔

☆......☆

دن شہر میں اور شام مضافات میں رہنا
اِس شہر میں رہنا ہے تو اوقات میں رہنا

نوشتہ دیوار، یہ شعر وہ اکثر ہی وال چاکنگ ہوا پڑھتی تھی مگر اِس بار اِس شعر کو پڑھتے ہوئے اُسے یکایک عدم تحفظ کا احساس ہوا تھا۔ خدانخواستہ اگر ابھی کوئی حادثہ......

اُس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ ''اللہ نہ کرے۔ خدا سب کو امان میں رکھے۔'' وہ جیسے روہانسی سی ہو رہی تھی۔

''کیا بات ہے علینہ۔'' آج جب وہ تینوں ایک عرصے بعد آؤٹنگ کے لیے نکلے تو یہ شعر پڑھ کر اُسے جیسے لگا کوئی ''وارن'' کر رہا ہے۔

''مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ چلیں واپس گھر۔'' وہ گھبرا کر بولی تھی۔

''علینہ واٹس دا میٹر۔ کیوں خوف زدہ ہو؟ حالات ہمارے لیے ہی نہیں، بلکہ پورے شہر کے لیے ایک جیسے ہیں۔ کب تک ہم خوف سے جینا چھوڑ کر بیٹھے رہیں گے۔ موت کا وقت معین ہوتا ہے۔ گھر میں بیٹھ کے بھی موت آ ہی جائے گی نا۔''

اُسے اجمل نے سمجھایا مگر اُس کا ذہن کسی بات کو قبول کرنے پر تیار نہ تھا۔ وہ بس اُن کے ساتھ تھی اور اُس کی آتما جانے کون سے آسمانوں پر اُڑتی ہوئی سرخ سرخ، لہولہو زمین کو تک رہی تھی۔

☆......☆

رات کے دس بج گئے تھے۔ اجمل کا موبائل مسلسل آف جا رہا تھا۔ شہر کے حالات کے باعث وہ جب تک اجمل نہ آ جاتا، پریشان ہی رہتی تھی۔ اُس نے بالکونی میں ٹہل ٹہل کر اُس کا انتظار کرنا شروع کر دیا۔

بالآخر گیارہ بجے کے وقت اُس نے حمیر بھائی کو فون ملایا اور پریشانی کا تذکرہ کیا۔

''علینہ تم اب فون کر رہی ہو۔ غیر ذمہ داری کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ چلو میں دیکھتا ہوں۔'' حمیر نے اُسے ڈانٹتے ہوئے فون رکھ دیا۔

''یا اللہ! میں تو یہ سمجھ رہی تھی کہ اجمل تھوڑی دیر میں آ جائیں گے مگر مجھے کیا پتا تھا کہ......'' اُسے اپنی غیر ذمہ داری پر واقعی افسوس ہو رہا تھا۔ دل بُرے بُرے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

''نمل بیٹی تم کھانا کھا لو۔ پاپا بس آتے ہی ہوں گے۔'' اُس نے نمل کو ہاتھ سے نوالہ بنا کر دیا۔

''ممی مجھے پتا نہیں کیوں اتنا ڈر لگ رہا ہے۔'' اُس نے اُس کے ہاتھ سے نوالہ لے لیا۔

''تم تو پاپا کی اچھی بیٹی ہو نا۔ تم کھانا کھا کر دُعا کرو کہ پاپا جلدی سے گھر آ جائیں۔''

اب تو اُس کو بھی پریشانی نے گھیر لیا تھا۔ آخر کو اُس کے سر کا سائیں تھا وہ۔

☆......☆

رات نے اپنے آتشیں اژدھے، جیسے پورے شہر میں چھوڑ دیے تھے۔ ہر نیوز چینل پر بریکنگ نیوز جلتے ہوئے کراچی کی آگ پر مزید تیل چھڑک رہی تھیں۔

اجمل اپنی کار میں آفس سے نکلا تھا۔ دیر ہو گئی تھی اور پھر شہر میں پھوٹنے والی دہشت گردی کی لہر نے جیسے آگ ہی تو لگا دی تھی۔ کار مین روڈ پر آ چکی تھی۔ روڈ پر ٹریفک برائے نام ہی تھا۔ تمام دکانیں اور دیگر مارکیٹیں وغیرہ بند کرائی جا چکی تھیں۔ کچھ لوگ خود ہی کاروبار، دن کے اُجالے میں بند کر کے گھروں کی راہ لے لیتے تھے۔

ابھی روڈ پر آئے اُسے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ اچانک گاڑی کے سامنے پانچ چھ لڑکے، بڑے بڑے ڈنڈے لیے نمودار ہو گئے۔

ایک نے کار کے اگلے ٹائروں میں موٹا لوہے کا ڈنڈا پھنسایا اور دوسرے نے اسٹیئرنگ سیٹ کے دروازے پر ڈنڈا مارا اور آن کی آن میں اسٹیئرنگ سے اُس کے ہاتھ الگ کر دیے۔

اجمل کچھ کہہ سکا اور نہ ہی کچھ بھی کر سکا۔ اُس کے سامنے ہی سامنے اُسے پکڑ کر ایک طرف کیا گیا اور گاڑی کو آگ لگا دی گئی۔

اجمل کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ آخر وہ اِن حالات میں کیا ردِ عمل ظاہر کرے۔ پانچوں لڑکوں کے چہرے سے عجیب وحشت ٹپک رہی تھی اور وہ کچھ اِس طرح فخر و غرور کی سی کیفیت میں تھے کہ خباثت ان کی ہر ہر حرکت سے عیاں تھی۔ یہ لٹیرے ہوتے تو اُسے لوٹ کر چھوڑ دیتے، گاڑی کو لوٹ کا مال سمجھ کر ہتھیا لیتے، یوں جلا کر خاکستر نہ کرتے۔ دونوں صورتوں میں اُسے جانے دیتے

مگر یہ تو کسی تعصب، کسی نفرت کی آگ میں کھولتے ہوئے ایسے وحشی تھے جنہیں نہ اپنے نفع نقصان کی پروا تھی، نہ ہی کسی دوسرے کے۔ انہیں تو بس بندے برابر کرنے کی ضد تھی اور......اور ضد کیسی ہی کیوں نہ ہو، کبھی بھلا نہیں کرتی ہمیشہ بُرا ہی کرتی ہے۔

اجمل کو دھیرے دھیرے اپنے وجود میں روح کی سرد پڑتی سرسراہٹ محسوس ہونے لگی تھی۔ موت یقینی تھی اور موت سے بچنے کے جس بھی طریقے پر وہ غور کرتا، اُسے وہ ہر طریقے سے کمزور اور بے چارگی میں لپٹا محسوس ہوتا۔ اِن کی آنکھوں اور چہرے پر ناچتی سفاکی کو محسوس کرتے ہوئے اجمل کو لگا کہ وہ اسے بڑی دردناک موت سے دوچار کرنے والے ہیں۔

اُس کے ذہن کے پیالے میں وہ سب قسم کی لرزہ خیز تفصیلات گونجنے لگیں کہ کس طرح مختلف علاقوں سے ملنے والی لاشوں کی درگت بنائی جاتی تھی۔ ڈرل مشین سے جسم کے مختلف حصوں میں سوراخ کرنا۔ ہاتھوں اور پیروں کی انگلیوں کے ناخن پلاس سے پکڑ کر کھینچ کھینچ کر نکالنا، انگلیوں کو کاٹ کر الگ الگ کرنا اور آخر میں سربریدہ لاشیں، جن کے سر تن سے جدا کر دیے جاتے تھے۔ بالکل اُسی طرح جس طرح پہلے زمانوں میں تلواروں سے سر کاٹنے کی روایت تھی۔

اخبار میں چھپنے والی اور ٹی وی چینلز سے نشر ہونے والی ایسی ہی خبریں اجمل کو لمحے بھر کے لیے دہلا تو دیتی تھیں مگر جس طرح کہاوت ہے کہ دوسرے کے تن کو لگی ہوئی آگ تو تماشا ہوتی ہے اور تپش کا پتا جب چلتا ہے جب وہ اپنے تن کو لگی ہو۔ اِس نوعیت کی دلخراش اور روح فرسا خبریں اجمل کو زیادہ دیر تک اپنی توجہ متوجہ کرتی تھیں، نہ ہی اِن خبروں کی صداقت اپنی پوری شدت سے اجمل یا کسی کے بھی ذہن کو محسوس ہوتی تھی مگر آج اِس قہر، اِس عذاب نے اجمل کو بھی دبوچ لیا تھا۔

اِس نے کئی بار اُن لڑکوں سے بات کرنے کی کوشش کی مگر اِسے مار کوٹ کے چپ رہنے کی تاکید کی گئی اور اِس وقت وہ چپ تھا۔

جس وقت اُسے ایک تنگ سی گلی کے قریب دھکیلتے ہوئے چلنے کو کہا گیا، تو وہ اچھی طرح پہچان گیا کہ یہ کراچی

کا ایک پرانا علاقہ تھا، جو گندی ندی اور نالوں کے آس پاس آباد تھا۔

'یقیناً اِن کا یہاں کوئی ٹارچر سیل ہوگا۔' اجمل نے دل میں سوچا تھا اور اِس سوچ کے ساتھ ہی اُسے تھرتھری سی آگئی۔

خداوند کریم سے اُس نے اَن گنت دعائیں مانگیں، مگر بے یقینی اور خوف نے خونخوار اژدھے کی طرح اِس کی سب دعاؤں کو نگل لیا۔

☆......☆

ایک چھوٹے سے دروازے سے جب وہ اِس عمارت میں داخل ہوا بلکہ کیا گیا تو اس کی سوچ کی کوئی بھی لہر یہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ اِس دروازے کے پیچھے اِس قدر وسیع اور کشادہ احاطہ اور جا بجا بنے ہوئے کئی کمرے تھے جو پختہ سیمنٹ اور بجری سے تعمیر کیے گئے تھے۔ 'تو کیا یہ سب تعمیر ٹارچر سیل بنانے کے مقصد سے کی گئی ہے۔' ہر سوچ آئی اور دوسری سوچ اِسے دھکیلتی ہوئی در آئی۔

ایک اُجاڑ اور دہشت ناک کمرے میں اُسے لایا گیا اور زور سے دھکا مار کر اندر دھکیل دیا گیا۔

''آپ لوگ یہ سب کیوں کر رہے ہو؟'' اجمل نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''آپ لوگ...... دیکھا سالا مہا...... ہے!''

''چل بھئی جلیل تو بغدا اور چھریاں تیز کرا۔'' بیک وقت دو لڑکوں نے تواتر سے کہا۔

''میں...... ہوں۔'' اجمل کو اپنے منہ سے نکلنے والا ہر لفظ یوں لگ رہا تھا، جیسے یہ سب ایسا سچ ہو، جو اُس وقت اُس کی سماعت کو بھی بے اعتبار معلوم ہو رہا تھا۔

''ہاں تو ٹھیک ہے۔ تُو بھی چلے گا۔ ہمیں تو تم سب کو بھی سبق سکھانا ہے۔''

''نہیں میں......'' اب اجمل کو لگا کہ وہ اپنی جو بھی پہچان بتائے گا۔ اس کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ یہ لوگ اِسے ہر حالت میں جھوٹا ہی سمجھیں گے۔ ''مجھے کیوں مارنا چاہتے ہو؟ میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔'' اجمل نے ایک دوسرے انداز سے بات شروع کی۔

''نہیں بگاڑا تو اِس کی کیا گارنٹی ہے کہ تُو بگاڑے گا بھی نہیں۔'' ایک بولا۔

''یہاں سے زندہ جانے کا مطلب ہے، تُو ہمارا بہت کچھ بگاڑے گا بھئی۔'' دوسرا بولا۔

''میرا یقین کرو نہ میں نے کسی کا کچھ بگاڑا ہے، نہ بگاڑوں گا۔ جیسی چاہے قسم لے لو۔'' اجمل نے ہر طرح کی کوشش کی، مگر اُن لوگوں نے ایک نہ سُنی۔ اُن کا کہنا تھا کہ جس مشکل سے ہم تجھے پکڑ کر لائے ہیں۔ اب تُو جو بھی ہے، تیری موت ہمارے لیے فرض ہے۔ ڈیوٹی ہے۔''

سب طرح کی منتیں، درخواستیں اور کوششیں رائیگاں چلی گئیں اور سفاک انسانیت کے دشمنوں نے ایسی بربریت سے راؤ اجمل کو ہلاک کیا کہ اس کے جسم پر جا بجا زخموں اور تشدد کے نشانات تھے۔ چھریوں سے بھی وار کیے گئے تھے اور گولیوں سے بھی بھون کے رکھ دیا گیا تھا۔ اُس کا جبڑا ابھی ٹوٹا ہوا تھا۔ شناختی کارڈ سے راؤ اجمل کی پوری شناخت بھی اُسے بوری میں لاش کی صورت بند ہونے سے نہ بچا سکی۔

اُس ٹارچر سیل کے مختلف کمروں میں بڑی تعداد میں بوریاں، چھریاں، بغدے اور مضبوط لکڑیوں کی مُڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ جس کمرے میں ذبیحہ کیا جاتا تھا۔ وہاں خون کی نکاسی کا بھی انتظام تھا۔ عجیب ذبیحہ خانہ تھا۔ بقر عید پر بھی قربانی کے جانور کو اس بے رحمی سے ذبیحہ نہیں کیا جاتا تھا، جیسے آج اِس شہر میں، اِس جگہ پر انسان کے ساتھ بے رحم سلوک کیا جاتا رہا تھا۔

کون جانے وحشی کتنی دیر کو سوئے ہوں اور پھر جاگ اُٹھیں، کسی بھی جھنکار سے......

دو لڑکوں نے بوری کا منہ کھولا اور دو لڑکوں نے رسی سے بندھی ہوئی راؤ اجمل کی لاش اُس بورے میں گٹھڑی کر کے ڈال دی۔ اِس کے بعد دو ماہر ہاتھوں نے بوری کا منہ ایک اور رسی سے مضبوطی سے باندھ دیا۔ اب یہ طے کرنا اُن کے لیے قطعی مشکل نہ تھا کہ اس بے یار و مدد گار لاش کو شہر کے کس علاقے میں پھینکنا ہے۔

سارے شہر پر اِن ہی کا راج تھا۔ قانون اور پولیس تو کبھی بھی شہریوں کی محافظ نہیں رہی، پھر بھی اُن محکموں کے ظالم اور فرض ناشناس ٹولوں کو، عوام کے ہی ہتھیائے گئے پیسوں سے تنخواہیں ملتی ہیں۔

کیسا اندھیر ہے نا، کھائیں بھی عوام کا اور غرائیں بھی عوام پر اور یہ فرض ناشناس، لٹیروں اور قاتلوں کو کھلے بندوں دندنانے کو اِس طرح چھوڑ دیتے ہیں کہ جیسے یہ اُن کی دین کھاتے ہوں اور وحشی درندے ہی دراصل اِن کے اصل آقا ہیں۔

☆......☆

''آج صبح ملنے والی بوری بند لاش کی شناخت ہوگئی ہے۔ مقتول کا نام راؤ اجمل علی شاہ بتایا جاتا ہے، جو کراچی کے علاقے گلشن اقبال کا رہائشی تھا......''

اِس بریکنگ نیوز کے نشر ہوتے ہی تمام گاؤں میں ہلچل مچ گئی تھی۔ پورا قافلہ آج شہر کراچی، بیٹے کی لاش لینے کے لیے پہنچ رہا تھا۔

لاش کو ورثاء کے حوالے کیا جا چکا تھا۔ اُس کے ساتھ ہی ایک اور لاش تھی مگر وہ زندہ تھی۔

لاش کے ساتھ اُسے بھی گھسیٹ کر کار میں ڈال دیا گیا تھا۔

☆......☆

گاؤں بھر میں ماتم تھا۔ جاگیردار کا قتل کوئی مذاق تو نہ تھا۔ حکومت ہل کے رہ گئی تھی۔ آخر کو ایک M.N.A اِس گاؤں کا بھی ایوانِ بالا میں دوٹوں کے ذریعے پہنچتا تھا، مگر دسویں کی نیاز کے ساتھ ہی ساری آگ پر اوس پڑ گئی۔ کچھ بھی تو نہ ہو سکتا تھا، جو ہونا تھا، ہو چکا تھا۔

علینہ اور نمل اپنے نصیبوں پر ماتم کناں تھیں۔

قسمت نے علینہ کو ایک بار پھر دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ اُس کے سسر راؤ اکمل علی شاہ آج صبح ہی کمرے میں اُس کے پاس آئے تھے۔

''بہو تم اجمل علی شاہ کے ساتھ شہر میں رہتی رہیں۔ ہمیں کوئی اعتراض نہ تھا، مگر بیٹا ہمارے کچھ رواج اور اقدار ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی انگلی اُٹھائے۔ تم ہمارے اجمل کی امانت ہو۔ تمہاری عزت کے امین ہم ہیں۔ اِس لیے بیٹا اب اجمل علی شاہ نہیں رہا۔ اَجل سے بلاوا آگیا اور وہ......'' وہ کچھ لمحے کے لیے رُکے...... اور پھر مضبوط لہجے میں گویا ہوئے۔

''ہم تمہیں راؤ افضل علی شاہ کے نکاح میں دینا چاہتے ہیں۔ تم سوچ لو۔ ورنہ دوسری صورت میں تم ہمیشہ ہماری ہی پناہ میں۔ اِسی چہار دیواری میں رہو گی۔''

آخری جملے میں جو کاٹ تھی، جو حکم تھا، جو گرج تھی اِس نے اُسے لرزا کر رکھ دیا۔

'راؤ افضل علی شاہ'...... لفظ اُس کے ذہن میں گونجنے لگا۔

''کیا تم......؟'' بس وہ اتنا ہی سوچ سکی تھی اور پھر کوئی سِل تھی جو اُسے اپنے سینے پر رکھی محسوس ہونے لگی تھی۔

☆......☆

برف پگھلے گی جب پہاڑوں پر
اور وادی میں کہرا سمٹے گا
بیج انگڑائی لے کے جاگیں گے
اپنی السائی آنکھیں کھولیں گے
سبزہ بہہ نکلے گا ڈھلانوں پر
غور سے دیکھنا پہاڑوں میں
پچھلے موسم کے بھی نشاں ہوں گے
کونپلوں کی اُداس آنکھوں میں
آنسوؤں کی نمی بچی ہوگی

موسم بدل گیا تھا۔ کہرا سمٹ گیا تھا اور تصویر روشن ہو گئی تھی۔ اُس کا اقرار، ایک زندگی نہیں بلکہ دو زندگیوں کی بقاء کے لیے ضروری تھا۔ ایک وہ جس کے لیے اُس نے برسوں اپنی کوکھ سونی رکھی اور دوسری وہ...... جو راؤ اجمل علی شاہ کی نشانی کی صورت اُس کے اندر سانسیں لینے لگی تھی۔

اور پھر جب راؤ افضل علی شاہ نے اُس کا گھونگھٹ اٹھایا، تو وہ صرف یہی بولی تھی۔

''راؤ افضل علی شاہ۔ عورت کو صرف مرد کی نہیں بلکہ اُس کے سینے سے چمٹے رشتوں کے لیے، اُس کے اندر جنمی ممتا کی کوکھ کو ہری بھری رکھنے کے لیے، زندگی کو صاف اور پاکیزہ رکھنے کے لیے مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ صرف مرد کے سہارے کی۔''

اور پھر وہ اُس کے سینے سے سر لگائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

......☆☆......

چوتھی سچ بیانی

عجب مقدّر رہے مِرا

رضوانہ کوثر

داتا کی نگری سے ایک بدنصیب دوشیزہ کی کتھا

یہ کہانی مجھے میری دوست آمنہ نے سنائی تھی سو اسی کی زبانی آپ قارئین تک پہنچا رہی ہوں جو کہ حرف بہ حرف سچ ہے۔ اور اس کہانی کے دونوں کرداروں آمنہ اور فریحہ سے میری اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔

فریحہ کا گھر میری امی کے محلے میں تھا۔ ہم دونوں کا بچپن اسی محلے کی گلیوں میں آنکھ مچولی، اونچ نیچ اور کوکلا چھپا کی کھیلتے گزرا۔ وہ والدین کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی۔ جس کی شاید ہی کوئی خواہش یا بات ماں باپ نے ردکی ہو۔ وہ میرے ساتھ ہی اسکول جاتی آتی تھی۔

ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر احمد حسن صاحب کا گھر تھا جو کہ واپڈا میں ایکسین تھے۔ ان کا فریحہ کے گھر آنا جانا تھا۔ وہ کوئی چالیس برس کے ہوں گے۔ ان کا بڑا بھائی ملتان میں تھا اور وہ فیملی بچوں کے ساتھ اکثر احمد حسن صاحب کے گھر رہنے آتے تھے کیوں کہ بھائیوں کا آپس میں بہت پیار اور سلوک تھا۔ احمد حسن کے بڑے بھائی اختر علی کا ملتان میں بہت بڑا کاروبار تھا پیسے کی فراوانی تھی۔

اختر علی کے بڑے بیٹے فرحان سے فریحہ کی ملاقات احمد حسن کے گھر میں ہوئی، دونوں ایک دوسرے کو اچھے لگے اور نہ جانے کب یہ پسند، محبت میں بدل گئی۔ اور بات شادی تک آ پہنچی۔

اُس وقت فریحہ کی عمر صرف چودہ سال تھی۔ نہم جماعت میں پڑھتی تھی اور فرحان تقریباً تیئس، چوبیس سال کا تھا۔ ایف اے کر چکا تھا۔ باپ کے ساتھ کاروبار میں شریک تھا۔ فرحان کے ماں باپ نے بڑے چاؤ سے فرحان کا رشتہ مانگا اسی دوران احمد حسن نے فریحہ کے والدین کو ایک دفعہ سمجھایا کہ رشتہ نہ کریں، مگر انہوں نے احمد حسن کی بات پر کان نہ دھرا۔ اور تمام تر رسومات کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے فریحہ بیاہ کر ملتان سدھاری۔

شادی کے دنوں تک ہم تقریباً روزانہ ہی ملتے فریحہ تو مانو اُن دنوں خوشیوں کے ہنڈولے میں جھول رہی تھی کہ جسے چاہا بغیر کسی رکاوٹ کے، سب کی رضامندی سے اُسے پالیا۔

شادی کے اگلے دن ولیمہ ملتان میں تھا، مگر کسی وجہ سے ہم نہ جا سکے مگر جب ولیمے کے بعد فریحہ آئی تو ملاقات ہوئی، خوشی اُس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ وہ کافی دیر میرے ساتھ فرحان اور اس کی دیوانی محبت کی باتیں کر کے خوش ہوتی رہی۔ اور دو یا تین دن

کے بعد وہ لوگ واپس ملتان چلے گئے اور اِس کے بعد میری اُس سے ملاقات نہ ہو پائی، کیوں کہ ہم نے وہاں سے گھر بدل لیا اور دوسرے علاقے میں نیا گھر بنا کر وہاں شفٹ ہو گئے تھے۔

☆......☆

مجھے فریحہ بہت دفعہ یاد آتی کہ وہ کتنی خوش ہوگی، پھر میں بھی شادی ہو کر اپنے میاں کے ساتھ لندن جا بسی، وقت کچھ اور گزرا اور میں دو بیٹوں کی ماں بن گئی اور اپنی اس چھوٹی سی جنت میں مگن ہو گئی۔

تین چار سال بعد جب بھی پاکستان جانا ہوتا میں سوچتی کہ پرانے محلے میں جا کر فریحہ کے والدین سے مل کر، اُس سے رابطہ کروں گی اور وقت ملا تو ملتان جا کر ملوں گی یا اسے کہوں گی کہ وہ فرحان کے ساتھ مجھے ملنے آئے، اب تک وہ نہ جانے کتنے بچوں کی ماں بھی بن چکی ہوگی اور ان کی محبتوں میں کیا اسی طرح وارفتگی ہوگی؟

مگر یہ سب صرف سوچ تک ہی رہا کیوں کہ پاکستان میں آ کر ہم کچھ ایسے مصروف ہوتے، سسرالی اور میکے کے بھرے پُرے خاندان میں بھی کئی رشتوں سے ملاقات بھی نہ ہو پاتی کہ واپسی کا دن آ پہنچتا۔

اسی طرح بیس سال گزر گئے اور وطن کی کشش نے واپس کھینچا تو ہم وہاں سے سب کچھ سمیٹ کر واپس پاکستان آ گئے کہ اپنا وطن اپنا ہی ہے۔ اِس دوران میں میرے میاں نے یہاں ڈیفنس میں اپنا علیحدہ گھر بھی بنالیا تھا۔ میرے والد اس دوران وفات پا چکے تھے اور



عامر کے والدین بھی یکے بعد دیگرے ملکِ عدم سدھار گئے۔ نندیں، دیور، جیٹھ سب اپنی اپنی زندگی میں مصروف تھے، کبھی غمی خوشی پہ سب سے ملاقات ہوجاتی۔ زندگی کی اس قدر مصروفیت میں بھی فریحہ اور فرحان مجھے اکثر یاد آتے۔

کچھ دن پہلے کچھ گروسری کے لیے میں لاہور کی ڈیفنس مارکیٹ گئی، سبزی کی دکان پر ڈرائیور کو گاڑی روکنے کے لیے کہا اور خود اُتر کر سبزی لینے لگی تو اچانک اپنے ساتھ کھڑی خاتون پر نظر پڑی تو وہ بہت شناسا اور خدوخال جانے پہچانے لگے۔ ایک دم دماغ میں جھماکا ہوا "فریحہ" مگر یہ تو بالکل عام اور سادہ سے سستے مگر صاف ستھرے کپڑوں اور چپل میں ملبوس ہے۔ بھلا یہ فریحہ کیسے ہوسکتی ہے۔

وہ تو کپڑوں کی شوقین اور بہت ویل ڈریس ہوتی تھی، آسائش اور آسودگی کا خمار اُس کے ہر عضو سے عیاں ہوا کرتا تھا۔ اچانک وہ میری طرف مڑی اور غور سے دیکھنے کے بعد "یقیناً تم آمنہ ہو" کہہ کر وہ ایک دم مجھ سے لپٹ گئی۔

میں بھی بہت خوش ہوئی کہ میری کئی سالوں کی خواہش اللہ نے کیسے پوری کردی۔ میں نے اُس سے بے صبری سے پوچھا۔

"تم کہاں ہو؟ فرحان کیسا ہے۔ اس کے اور تمہارے گھر والے کیسے ہیں۔ لاہور میں کیا کررہی ہو؟ کتنے بچے ہیں؟" اس نے میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں پانیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ کہنے لگی۔

"یار اتنے سوالوں کے جواب ایک دم کیسے دوں۔ آرام سے بیٹھ کر تمہیں ان بیتے سالوں کے بارے سناؤں گی۔"

میں نے کہا کہ "تم گھر فون کردو میرے ساتھ چلو، میرا گھر قریب ہے، پھر ڈرائیور تمہیں واپس ڈراپ کردے گا۔"

وہ تیار ہوگئی۔ میں نے اپنا موبائل اس کی طرف بڑھایا کہ گھر اطلاع کردو۔ وہ کہنے لگی۔ "اس کی ضرورت نہیں۔"

ہم گھر آئے تو نسرین (میری ملازمہ) کھانا میز پر لگا چکی تھی۔

میں نے کہا "کھانا کھالیں پھر بیٹھ کر آرام سے باتیں کریں گے۔" وہ میری طرف دیکھنے لگی کہ "بس ہم دونوں باقی گھر والے کہاں ہیں۔"

میں نے اسے مختصر بتایا کہ "میرے میاں عامر کسی کام سے اسلام آباد گئے ہیں، پرسوں شام کی فلائٹ سے واپسی ہوگی۔ بڑا بیٹا ڈاکٹر ہے، میری بیٹے احمد کی بیوی بھی ڈاکٹر ہے اور وہ دونوں امریکہ میں سیٹ ہیں، دوسرا بیٹا فرخ لندن میں ڈاکٹری پڑھ رہا ہے۔ عامر بہت اچھے محبت کرنے والے، خیال رکھنے والے ہیں۔ سو راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔"

کھانا کھانے کے بعد اس نے جانے کی اجازت مانگی میں نے کہا کہ "مجھے تو ابھی تم سے اپنی سب باتیں کرنی ہیں اور تمہاری سننی ہیں۔ مگر تم جس حال میں مجھے ملی ہو میں تو کچھ سمجھ ہی نہیں پارہی۔"

وہ کہنے لگی کہ "میرا تو سب کچھ ختم ہوگیا میں تمہارے قریب جو کچی آبادی ہے اس میں کرائے کے ایک کمرے میں رہ رہی ہوں۔ شاید خدا مجھے اس آبادی میں اس لیے لایا کہ تم سے ملاقات ہونی تھی۔ اب مجھے اجازت دو۔ اس وقت تو تمہیں اتنے سالوں بعد دیکھ کر میں اتنی حیران ہوں کہ شاید کچھ کہہ نہ پاؤں کل صبح میں انشاء اللہ خود آجاؤں گی تو پھر تمہیں اپنی بدقسمتی کی داستان سناؤں گی۔"

☆......☆

اگلے دن میں ناشتے سے فارغ بھی نہیں ہوئی تھی کہ ڈور بیل بجی۔ چوکیدار نے انٹرکام پر بتایا کہ "کل جو خاتون آپ سے ملنے آئی تھیں وہ آئی ہیں۔" میں تو کل سے اس کے لیے بے چین تھی سو فوراً گیٹ پر جاکے اسے ساتھ لائی اور کہا کہ ناشتا کرکے ہم آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔

ناشتے سے فارغ ہوکر میں نے نسرین کو کہا کہ "ہمیں ڈسٹرب نہ کرے اور سارے کام خود دیکھ لے۔ کھانے کے لیے بھی نہ بلائے۔ جب تک میں نہ کہوں۔"

نسرین کو ہدایت دینے کے بعد میں فریحہ کو لے کر اپنے بیڈروم میں آگئی اور کہا کہ اب آرام سے اوپر ہوکر بیٹھو اور مجھے سب کچھ بتاؤ۔ میں بہت بے چین ہوں، اپنے بارے تو میں اسے بتا ہی چکی تھی، اس نے میری طرف دیکھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور کہنے لگی۔

آگے فریحہ کی زبانی اس کی داستان الم سنیے۔

"میری فرحان سے ملاقات سے لے کر شادی تک کے سب حالات سے تو تم واقف ہی ہو۔ جب میری شادی کے دو تین دن بعد لاہور تمہاری اور میری ملاقات ہوئی تھی تو اس وقت تک میں خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھتی تھی کہ میں نے جس شخص کو پہلی دفعہ دیکھ کر پسند کیا اور پہلی نظر میں محبت کر بیٹھی، اُس نے بھی مجھے پہلی نظر میں دیکھ کر محبت کی اور چند ماہ میں اپنے والدین کی رضامندی سے مجھے بیاہ کر گھر لے گیا اور سب نے وہاں بھی محبت بھرا استقبال کیا مجھے اور کیا چاہیے تھا۔ میں خدا کی بہت شکر گزار تھی، میرے والدین بھی بہت خوش اور مطمئن ہوگئے تھے کہ ہماری اکلوتی بیٹی بہت قدردان اور محبت کرنے والے لوگوں میں بیاہی گئی ہے جو مالی طور پر بھی بہت آسودہ ہیں۔ مگر میں اور میرے والدین یہ نہیں جانتے تھے کہ میری خوش قسمتی نہیں بلکہ بدقسمتی کے دروازے کھل رہے ہیں۔ تم سے شادی کے بعد ملاقات ہوئی اور اگلے دن میں ملتان واپس چلی گئی تھی۔ وہاں پہنچنے کے دو دن بعد ہی مجھ پر واضح ہوگیا کہ میں نے جذبات کے اندھیرے میں فرحان کی ظاہری شکل و صورت سے متاثر ہوکر درحقیقت دوزخ میں چھلانگ لگادی ہے۔ فرحان کا تین منزلہ گھر کافی بڑا تھا اور شادی سے پہلے گھریلو کام کاج کے لیے ملازم تھے۔ دو عورتیں اور ایک لڑکا باہر سے سودا سلف لانے کے لیے، گھر میں بھی کھلا خرچ ہوتا تھا، اس لحاظ سے کوئی کمی نظر نہیں آتی تھی۔ مگر ہانڈی میری ساس خود ہی پکاتی تھیں۔ مرچ مسالا روزانہ ملازمہ سِل بٹے سے تازہ پیستی تھی۔ میری ساس کو بس سبزی گوشت صاف کرکے دے دیتی اور وہ سالن خود بناتی اور روٹی ملازمہ پکاتی۔"

"میں نے دو دن میں محسوس کرلیا کہ میری ساس کسی ملازمہ یا کوئی ہمسائی آتی تو مجھے ایک منٹ کے لیے بھی کسی کے پاس تنہا نہ چھوڑتیں۔ فرحان نے مجھے پہلے ہی باور کرادیا تھا کہ تم نے جو میری ماں کہے وہ ہی کرنا ہے۔ اور مجھ سے کبھی بھی میری ماں یا بہن بھائیوں کی کوئی شکایت نہیں کرنی، ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ مجھ دو تین دن کی بیاہی کو یہ بات عجیب سی لگی۔ میرے والدین نے تو پہلے ہی مجھے یہ اچھی طرح سمجھادیا تھا کہ بیٹی اب وہ ہی تمہارا گھر اور فرحان کے والدین ہی تمہارے والدین ہیں ان سے کبھی اونچی آواز میں بات بھی نہ کرنا۔ ان کی جتنی خدمت کروگی اللہ تمہیں اتنی خوشیاں دے گا۔ اس کے بہن بھائیوں سے محبت کرنا، تمہاری عمر چھوٹی ہے اس لیے تمہیں یہ سب باتیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہئیں۔ سو میں ان کی پیار بھری نصیحتیں پلو سے باندھ کر سسرال رخصت ہوئی تھی۔ مگر مجھے تو دو تین دن بعد پتا چل گیا کہ یہ محبت کا چشمہ تو عین صحرا اور سراب ہے۔ میری ساس نے ایک ہفتے بعد ہی گھر کے اندر کام کرنے والیوں کی چھٹی کرا کے وہ سب کام میرے ذمے لگادیے۔"

"میں والدین کی اتنی لاڈلی تھی کہ میرے لیے ابا نے الگ سے ملازمہ رکھی ہوئی تھی جو میرے اسکول یونیفارم اور کپڑے دھوتی۔ استری کرتی، جوتے پالش کرتی یہ سب کام اس کے ذمے تھے۔ مگر یہ نہیں کہ میں خود سر تھی، میری ماں نے ہر لحاظ سے میری تربیت کی تھی۔ ابا نے کہنا کہ اسے گھر کے کام کاج کی بھی تربیت دو تو امی نے مجھے پیار کرتے ہوئے کہنا کہ میٹرک کے امتحان دے گی تو اس فارغ وقت میں اسے کھانا پکانا سکھاؤں گی، میری بیٹی بہت ذہین اور سمجھدار ہے۔ انشاء اللہ جلد سب سیکھ لے گی۔ مگر اس کی تو نوبت ہی نہ آئی اور فوراً شادی ہوگئی۔ وہاں اب سب کام میرے ذمے لگ گئے تو میں نے ساس سے کہا کہ امی میں جلدی سب سیکھ لوں گی۔ مگر وہاں تو سب جو ہمیں نظر آئے تھے اُن کی فطرت اندر سے بالکل الٹ تھی۔ مجھے کام میں ذرا دیر ہوجاتی تو ساس جھڑکیاں اور گالی گلوچ شروع کردیتی، فرحان مجھے تھپڑوں اور لاتوں پہ رکھ لیتا۔ کیوں کہ میں نے اسے کبھی باپ کے ساتھ مارکیٹ کام کے لیے جاتے نہ دیکھا۔ جب کہ اُس کے تینوں بھائی باپ کے ساتھ جاتے اور رات گئے واپس آتے تھے۔ کیوں کہ ان کی مارکیٹ میں دو دکانیں تھیں اور کپڑے کا بہت بڑا کاروبار تھا۔

میرے ایک چچا اُن دنوں بینک منیجر تھے اور ان کی پوسٹنگ ملتان میں ہی تھی۔ میرے ابو نے انہیں کہا کہ مجھے اتنی دور اور خاص کر بیٹی کے گھر جلدی جلدی جانا اچھا نہیں لگتا۔ تم کبھی کبھار جا کر فریحہ کو مِل آیا کرو۔ میکے سے کوئی جائے تو لڑکیوں کو خوشی اور تسلی ہوتی ہے۔ ابا نے فرحان کے چچا احمد حسن کو بھی کئی بار کہا کہ فریحہ چھ ماہ سے لاہور نہیں آئی میں جب بھی فون کروں آپ کی بھابی کبھی کہتی ہیں وہ فرحان کے ساتھ میری بہن کے گھر پشاور گئی ہے۔ کبھی کہتی ہے میری نند کے گھر پنڈی گئے ہیں۔ وہ کہنے لگے ''بھائی صاحب ابھی تو رشتے داروں کے ٹور اور دعوتیں ہی چل رہی ہیں آخر میرا اتنا بڑا خاندان ہے۔''

میرے چچا ایک دو دفعہ اچانک بھی آئے تو مجھے ساس کا حکم تھا کہ تم نے اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلنا جب تک میں نہ کہوں۔ اور چچا کو کہنا کہ وہ تو نند کے ساتھ کسی کے گھر گئی ہے، یا مارکیٹ گئی ہے، یعنی ان سے بھی نہ ملنے دیا۔ فرحان کا رویہ میرے ساتھ ظالمانہ تھا۔ سارا دن اس کی امی مجھے کاموں میں لگائے رکھتیں ایک منٹ بھی فارغ نہ ہونے دیتیں اور نندیں بیٹھی سارا دن گپیں مارتیں کبھی پانی کا گلاس بھی اُٹھ کر نہ پیتیں۔ میرے سسر اور دیور رات 11 بجے گھر واپس آتے تھے ان کے آنے سے 15 منٹ پہلے میری ساس کا حکم تھا کہ میں اپنے کمرے میں چلی جایا کروں۔ جہاں فرحان ڈرنک کر کے پہلے سے موجود ہوتا۔ پھر جو میری شامت آتی کہ آج تم نے میرا جوتا ٹھیک پالش نہیں کیا۔ اسی جوتے سے میری مرمت شروع ہو جاتی۔ اسی طرح روز میری کوئی غلطی پکڑی جاتی اپنے یا گھر والوں کے کام کے حوالے سے اور ساتھ سگریٹ سے میرے جسم کو جگہ جگہ سے داغنا شروع کرتا۔ میں ان چھ ماہ میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی۔ کھانے کے لیے بھی ان کے دستر خوان نعمتوں سے سجے ہوتے اور میرے لیے الگ سے صرف دال اور روٹی ہوتی۔''

ایک دن یہ سب ماں بیٹیاں کسی شادی میں گئیں تو ایک ہمسائی نے آ کر ڈور بیل بجائی، میں نے اپنی ساس کی حکم عدولی کرتے ہوئے دروازہ کھول دیا میری خوش قسمتی کہ اس وقت فرحان بھی اپنی شراب کا انتظام کرنے گیا تھا اور مجھے پتا تھا وہ دو گھنٹے سے پہلے نہیں آئے گا۔

وہ ایک عمر رسیدہ پڑھی لکھی عورت تھی جو پہلی نظر میں مجھے اچھی لگی مجھے دیکھتے ہی کہنے لگی کہ ''تم یقیناً فرحان کی بیوی ہو۔ میں بالکل ساتھ والے گھر میں رہتی ہوں، فرحان تو نفسیاتی مریض ہے، تمہارے ماں باپ نے بغیر چھان بین کے تمہیں ان آوارہ نندوں، نفسیاتی مریض اور ظالم ساس کے ساتھ کہاں پھنسا دیا۔ مجھے صرف اپنے والدین کا ایڈریس لکھ کر دے دو میں انہیں اطلاع کروں کہ تمہیں اس جہنم سے نکالیں۔ میں کئی دنوں سے اس تاک میں تھی کہ کسی وقت اللہ مجھے مہلت دے۔ تم اکیلی ہو تو میں تمہاری مدد کروں۔ میں دس منٹ کے بعد آؤں گی تم مجھے ایڈریس لکھ کر دے دینا۔'' اُس وقت تو موبائل کا تصور بھی نہیں تھا۔ مگر لاہور بھی ہمارے گھر فون لگا تھا۔ میں نے اپنے والد کا نام اور فون نمبر لکھ کر اسے دیا اور دروازہ بند کر کے کپڑے استری کرنے میں مصروف ہو گئی میری ساس کا آرڈر تھا کہ ہماری واپسی تک سارے کپڑے استری ہوں، وہ سب واپس آئے تو پھر فرحان کی وہی روٹین رات بھر کی۔

میں اپنے والدین کو دکھ نہیں دینا چاہتی تھی مگر اب میری ہمت، خون، صحت سب کچھ ان چھ ماہ نے ہی کھا لیا تھا۔

☆......☆

اگلے دن رات بارہ بجے گھنٹی بجی میرے سسر نے دروازہ کھولا تو میرے ابو کھڑے تھے۔ میں اوپر کمرے میں تھی۔ میرے ابو نے بغیر کسی بات کو ظاہر کیے میرے سسر سے کہا کہ ''میں اپنی بیٹی کے لیے اتنا اُداس اور بے چین تھا کہ میں بغیر اطلاع کے ہی چل پڑا۔''

ساس کہنے لگی ''آپ کھانا کھائیں آرام کریں وہ دونوں تو سو رہے ہیں، صبح ملاقات ہو گی۔'' جب کہ میں سب کچھ سُن رہی تھی۔

میرے ابو نے کہا کہ ''نہیں مجھ سے صبر نہیں ہو گا۔ اُس کی والدہ کی طبیعت خراب ہے وہ اسے یاد کر رہی ہیں۔ مجھے صبح واپس جانا ہے۔ اور اسے لے کر جانا ہے۔''

ساس کترانے لگیں مگر میرے سسر نے اوپر آ کر دروازہ ناک کیا اور مجھے نیچے آنے کو کہا۔

میرے ابو نے میری حالت دیکھ کر رونا شروع کر دیا۔ جب انہوں نے مجھے گلے لگایا تو ان کا جسم کانپ رہا تھا۔ میری ساس کہنے لگیں ''ہم نے اسے نہیں بھیجنا۔''

ابو نے کہا کہ ''تم نے اسے کیا لاوارث سمجھا تھا۔ یہ تو میرے ساتھ جائے گی میں سب انتظام کر کے آیا ہوں۔ تم بھیجتے ہو یا پولیس کے ساتھ خود چھوڑنے آؤ گے۔''

یہ سن کر وہ راضی ہو گئی میرے ابو نے اسی حالت میں مجھے ساتھ لیا اور ان کے گھر سے نکل آئے۔

رات ہم باپ بیٹی نے ہوٹل میں کمرہ لے کر گزاری اور صبح لاہور کا سفر شروع کیا۔ سہ پہر کو گھر پہنچے تو میری ماں میری حالت دیکھ کر بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

دو دن میں بالکل چارپائی پر نیم غنودگی میں رہی، ذرا حواس درست ہوئے تو ابو مجھے اپنے فیملی ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے کیوں کہ میں وہاں سے آ کر حواس باختہ اور نیم پاگل حالت میں تھی۔

تمام چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے کہا کہ ''شدید ڈپریشن خون کی کمی کا شکار ہیں۔ اسے خوش رکھیں، اچھی خوراک اور تجویز کردہ طاقت کی دوائیاں دیں اور مکمل آرام کرائیں۔''

بہرحال ابو نے سب سے پہلے میری صحت پر توجہ دی اور پھر فرحان سے طلاق کا مطالبہ کیا۔ جس طرح اُس سے جان چھڑائی یہ ایک الگ کہانی ہے۔ بہرحال پورا سال دوائی، خوراک اور مکمل آرام کے بعد صحت یاب ہوئی، مگر طلاق کے چند دن بعد ہی ابو شاید اپنی لاڈلی اور نازوں پلی بیٹی کا یہ انجام دیکھتے ہوئے صدمہ برداشت نہ کر سکے اور لمبے سفر پر چل دیے۔ جہاں سے کوئی واپس نہیں آ سکتا۔ مگر جانے سے پہلے مکان اور تمام بینک بیلنس مجھ بدنصیب کے نام کر گئے۔

اب اس بڑے سے گھر میں ہم ماں بیٹی دو بڑے صدموں سے دوچار بھٹکی روحیں لگتیں۔ ابو کی وفات کے چھ ماہ بعد امی نے مجھے کہا کہ ''بیٹی میں کب تک تمہارا ساتھ دوں گی تم شادی کر لو۔'' مجھے جو تجربہ ہوا تھا مجھے تو شادی کے نام سے ہی خوف آتا تھا۔ پھر میں نے ہمت کر کے پرائیویٹ ایف اے کیا۔ ٹائپنگ کورس کیا اور ایک آفس میں جاب کر لی، پھر مجھے تجربہ ہونے لگا کہ اس معاشرے میں ایک اکیلی اور وہ بھی طلاق یافتہ عورت کا

کیا مقام ہے۔ وقت کے ساتھ مجھ میں اعتماد تو آتا گیا مگر مرد کے اس معاشرے کے بہت سے پہلو بھی بے نقاب ہوتے گئے۔ اِدھر میری ماں مجھے دیکھ دیکھ کر دن بدن فکر مند اور کمزور ہوتی گئی۔

☆......☆

مجھے نوکری کرتے دو سال ہو گئے۔ کئی رشتے آئے مگر میں انکار کرتی گئی۔ امی کی طبیعت بہت خراب رہنے لگی۔ انہیں زبردستی ایک دن ہسپتال لے کر گئی۔ تو چیک اپ کے بعد پتا چلا انہیں بلڈ کینسر ہے۔ میری ماں بھی لاڈلی بیٹی کا دکھ برداشت نہ کر پائی تھی۔

ان کے علاج کے دوران ہمارے پرانے ہمسائے کی وساطت سے میرے لیے ایک رشتہ آیا کہ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں اس بزرگ ہمسائے نے بتایا کہ لڑکا میرے ہی آفس میں کام کرتا ہے۔ نیک اور شریف ہے تو میں آپ تک آیا ہوں۔

ان کے جانے کے بعد میری ماں نے رو رو کر میرے آگے ہاتھ جوڑنے شروع کر دیے کہ ”میرے بعد اکیلی کیا کرو گی، مجھے مر کر بھی چین نہیں آئے گا ظہیر صاحب (ہمسائے) گارنٹی دے رہے ہیں۔“

ماں کی حالت دیکھ کر میں نے ہاں کر دی گو کہ میرا دل نہیں مان رہا تھا کہ لڑکا کنوارہ، بالکل میرا ہم عمر اور میں طلاق یافتہ۔

ماں کہنے لگیں کہ ”بینک بیلنس تو میرے علاج پر خرچ ہو گیا۔ گھر تمہارے نام ہے اور میری بیماری اور اکیلے پن کی وجہ سے وہ لڑکا جس کا نام طاہر ہے ہمارے ساتھ ہی رہنے کو تیار ہے کیوں کہ وہ کرائے کے گھر میں رہتا ہے“ سو میں پھر نکاح کے بندھن میں بندھ گئی۔

ماں شاید اسی انتظار میں تھی کہ اگلے ہفتے ہی ابو کے پہلو میں جا سوئیں۔

☆......☆

طاہر مجھے اچھا اور مخلص سا لگا۔ صبح وہ مجھے دفتر چھوڑتا اپنے دفتر چلا جاتا کیوں کہ میری صرف پندرہ دن کی چھٹی تھی۔ واپسی پر وہ مجھے لیتا ہوا آتا۔ ہمیں ایک دوسرے سے کوئی شکایت نہ تھی۔ ایک سال ہم نے اسی روٹین میں گزارا۔

ایک دن طاہر کہنے لگا کہ ”فریحہ ہم نے اتنے بڑے گھر کا کیا کرنا ہے، میں نے ایک چھوٹا اپارٹمنٹ دیکھا ہے، تم بھی پسند کر لو وہ ہم دونوں کے آفس کے پاس ہے۔ یہ سیل کر کے وہ خرید لیتے ہیں، جو باقی پیسے بچیں گے وہ فکس کر دیں گے۔ کل کو ہماری فیملی میں اضافہ ہوا تو کام آئیں گے۔“

جبکہ میں نے طاہر کو کبھی بھی بچے کی خواہش کرتے محسوس نہ کیا تھا، اور میں سمجھتی تھی کہ ابھی عرصہ ہی کتنا ہوا ہے۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا کہ یہ گھر ہماری ضرورت سے بہت بڑا تھا اور اسے صاف ستھرا کرنا ہی بڑا مشکل تھا۔ کہنے لگا کہ ”تم اس کی رجسٹری دو میں سارا پروسیجر مکمل کر کے اپارٹمنٹ کی رجسٹری کے وقت تمہیں لے جاؤں گا کچہری میں کہ یہ تمہارا ہی تو ہے۔“

میں نے رجسٹری اس کے حوالے کی۔ چند دن بعد میں نے پوچھا کہ کہنے لگا اس کو بیچنے اور دوسرے کی رجسٹری میں کچھ وقت تو لگے گا چند دن کے بعد کہنے لگا کہ ”اس گھر کا فائنل ہو گیا ہے آج پندرہ تاریخ ہے اگلے ماہ یکم کو اس کا قبضہ دینا ہے۔ مگر اپارٹمنٹ کا قبضہ ہمیں دو ماہ بعد ملے گا۔ اس کی رجسٹری میں اتنا وقت لگ جائے گا۔ ایک ماہ کے لیے میں نے دفتر کے نزدیک کرائے کا ایک کمرہ لیا ہے، اس کے بعد ہم اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو جائیں گے۔ اس دوران میں نے جس کے پاس یہ گھر سیل کیا ہے اس سے میں نے دو کمروں میں سامان رکھنے کی اجازت لے لی ہے۔ یہ گھر نوے لاکھ میں بکا ہے اور وہ اپارٹمنٹ چالیس لاکھ کا ہو گا۔“ سو ہم اس کا قبضہ دے کر کرائے کے کمرے میں شفٹ ہو گئے۔

پندرہ دن کے بعد طاہر مجھے دفتر کے کام سے ہیڈ آفس اسلام آباد تین دن جانے کا کہہ کر گیا کیوں کہ اکثر پہلے بھی جاتا تھا۔ اور ایسا گیا کہ آج تک واپس نہیں آیا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ اپارٹمنٹ مجھے صرف دکھایا ہی تھا، خریدنا کہاں تھا کہ پراپرٹی ڈیلر کے تھرو اور میرے گھر کی ساری رقم بٹور کر وہ بیرونِ ملک جا چکا ہے۔

کچھ ماہ میں نے اس کرائے کے کمرے میں گزارے کہ میری جاب تھی تو تنخواہ بہت زیادہ نہ تھی۔ مگر مجھے تین چار ماہ میں اندازہ ہو گیا کہ میں تنہا لڑکی جس کا رب کے سوا کوئی وارث نہیں یہاں اکیلے نہیں رہ سکتی۔ میں اس سلسلے میں بہت پریشان تھی کیوں کہ میرا تو اب ننھیال ددھیال میں بھی کوئی رشتہ دار نہ تھا جو امی ابو کے دور پار کے تھے وہ بھی لاہور میں نہ تھے۔ ویسے بھی جوان لڑکی کو کون اپنے خاوند یا بیٹوں والے گھر میں رکھتا ہے۔ وہ تو ایک دن میں سرکاری ہسپتال میں بخار کھانسی کی دوا لینے گئی تو میری وہاں ایک عمر رسیدہ خاتون سے ملاقات ہوئی، وہ میرے ساتھ ہی باری کے انتظار میں بیٹھی مریضوں کی لمبی قطار کو دیکھ رہی تھی۔ مجھ سے باتیں کرنے لگیں اور پوچھنے لگیں کہ ”اتنے تیز بخار میں اکیلی کیوں آئی ہو، بیٹا کسی بہن بھائی کو ساتھ لے آتیں۔“

ان کا اتنا کہنا تھا کہ میرا ضبط جواب دے گیا میں نے کہا کہ میں اکیلی ہوں میرا کوئی نہیں ہے۔“ انہوں نے مجھے دلاسہ دیا اتنے میں ہمارا نمبر آ گیا۔ ہم دوا لے کر آگے پیچھے باہر نکلے۔ تو وہ میرا ہاتھ تھام کر ہسپتال کے احاطے میں ہی بیٹھ گئیں اور میرے بارے میں پوچھنے لگیں۔ مجھے ایک دم وہ اچھی لگیں اور ان پر اعتماد کرنے کو دل چاہا تو اپنی زندگی کے اب تک کے حالات مختصر بتا دیے۔

انہوں نے کہا کہ ”ہم میاں بیوی ڈیفنس کے پاس کچی بستی میں رہتے ہیں۔ بے اولاد ہیں، میری اپنی بیٹی ہوتی تو اس کا دکھ شاید میں اس طرح محسوس کرتی، بیٹا تم ہمارے ساتھ رہو۔ میرے میاں میری بات کبھی بھی رد نہ کریں گے۔ تمہیں اور ہمیں بوڑھوں کو اللہ کے بعد ایک دوسرا کا سہارا ہو جائے گا۔ تم ابھی میرے ساتھ چلو میں تو یہاں کسی ملنے والی کے گھر آئی تھی تو اس نے مجھے یہاں سے کھانسی کی دوا لینے کا مشورہ دیا تو میں چلی آئی۔ شاید اللہ نے ہمیں ملانا تھا۔“

میں ان کے ساتھ آئی تو ان کے میاں اور بھی خوش ہوئے کہ رب نے ہمیں گناہ گاروں کو شاید نیکی موقع دیا ہے۔ وہ اگلے دن ہی میرا مختصر سا سامان بھی اٹھوا لائے کیوں کہ طاہر نے گھر کے سامان کے بھی پیسے بٹور لیے تھے۔ میں نے انہیں خالہ اور خالو کہنا شروع کر دیا کیوں کہ انہوں نے بھی سب کو اپنی بیوہ بہن کی بیٹی بتایا تھا کہ اب بہن بھی مر گئی ہے تو میں جوان لڑکی کو اکیلا تو نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ دونوں میرے لیے فرشتہ ثابت ہوئے گو مالی تنگی ہے کیوں کہ میری تھوڑی سی تنخواہ اور خالو کی معمولی سی پنشن میں تو دال روٹی ہی پوری ہو جائے تو بہت ہے۔

”بس یہ ہے میری کہانی۔ آج مدت کے بعد میرے دل کے درد کو محسوس کرنے والا ملا ہے۔“ یہ کہہ کر فریحہ چپ ہو گئی۔

ہم دونوں کے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ ہم دونوں گلے مل کر خوب روئے۔ جب اس کا دل ہلکا ہو گیا تو میں نے اسے دلاسا سا دیا۔ گھڑی دیکھی تو کافی وقت ہو چکا تھا۔

کھانے کی ٹیبل پر گئے تو کھانا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ جسے ملازمہ نے دوبارہ گرم کیا۔ بے دلی سے ہم نے کھانا کھایا، چائے پی اور فریحہ جانے کے لیے تیار ہو گئی کہ خالہ خالو انتظار کر رہے ہوں گے۔

میں گاڑی میں اسے چھوڑنے گئی تو اس کے سادہ اور مخلص سے خالہ خالو سے بھی ملی جن سے فریحہ میرا غائبانہ تعارف کرا چکی تھی۔ وہ تین دن بعد دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے افسردہ دلی سے گھر لوٹ آئی کہ اتنے بڑے گھر میں خوشحال والدین کی لاڈلی شہزادی کچی بستی کے اس نیم پختہ کمرے میں رہ رہی ہے۔

☆......☆

اگلے دن میرے میاں واپس آئے۔ شام کو وہ اچھے موڈ میں میرے پاس بیٹھے تھے۔ میں نے فریحہ کے بارے میں سب کچھ بتا کر ان سے اجازت مانگی کہ ہم اسے اپنے پاس رکھ لیتے ہیں۔ انیکسی تو خالی پڑی ہے۔

وہ فوراً ہی مان گئے۔ پھر ہم دونوں اس کے پاس گئے وہ بڑی مشکل سے اس شرط پر راضی ہوئی کہ میں تم پر بوجھ نہیں بنوں گی اور کھانا میں خود بناؤں گی کیوں کہ وہ اپنے محسنوں کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ انہوں نے ہمارا ساتھ دیا کہ اللہ نے تمہیں کوئی اپنا ملایا ہے تو انکار نہ کرو۔ آرام دہ گھر میں رہو۔ جب چاہے ہمیں مل لیا کرنا۔

سو اس وقت سے وہ میرے گھر کی انیکسی میں رہتی ہے۔ وہ آفس سے آتی ہے تو شام کو میں بھی اس کے پاس چلی جاتی ہوں۔ میرے میاں بھی اسے بہنوں کی طرح چاہتے ہیں اور وہ بھی ان کا بہت احترام کرتی ہے۔

☆☆......☆☆

پانچویں سچ بیانی

زندگی اِک جُوا

شعبان کھوسہ

کوئٹہ سے موصول ایک دوشیزہ کی دل گداز کہانی

میری خالہ کہتی ہیں۔ ''جس عمر میں تم ہو اس میں تو لڑکیوں کے لیے رشتوں کے ڈھیر لگ جایا کرتے ہیں اور یہ عمر تو ایسی ہوتی ہے کہ بدصورت سے بدصورت انسان بھی غضب ڈھانے لگتا ہے مگر تم پر تو خوب صورتی کی AGE آئی ہی نہیں۔'' وہ درست کہتی ہیں جب کہ وہ خود بھی دو بچوں کی ماں ہونے کے باوجود بے حد حسین اور پُرکشش لگتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں بچپن میں تمہارا رنگ روپ بالکل اپنی خالہ جیسا تھا اور یہی وجہ ہے کہ اپنوں نے مجھے چاہا بھی بہت۔ سب سوچتے تھے یہ بڑی ہو کر سنہری، صحت مند رنگ روپ کی دراز قد لڑکی نکلے گی۔ سلمٰی خالہ جیسی ذہانت بھی خدا نے اسے عنایت کر دی تو کیا کہنے۔ سب ہی اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ لوگ ایسا سوچتے ہی رہ گئے اور میں جوانی کی عمر آنے کے بعد جیسے اپنے رنگ روپ اور قد و قامت میں ٹھٹھری سی گئی۔ چودہ سال کی عمر میں نظر کا چشمہ لگ گیا۔ بال تیزی سے سفید ہو گئے۔ جھڑتے جھڑتے آدھے بھی نہ رہے۔ سنہرا رنگ سیاہ ہو گیا اور چہرے کے نقوش کسی شدید اذیت کا سا تاثر اپنا کر سہم گئے۔ اب ان میں انتقام اور حسد کی گہری چھاپ نے کھنچاؤ سا پیدا کر دیا ہے۔ جس سے چہرے پر پتھریلا پن آ گیا۔ امی کہتی ہیں۔ ''ایسا لگتا ہے جیسے اللہ میاں نے تمہیں بچپن کسی اور لڑکی کا دیا تھا۔'' میں لوگوں کی یہ سب باتیں سنتی ہوں اور میرے اندر چھپی ہوئی لڑکی دیوانہ وار قہقہے لگانے لگتی ہے۔ حقیقت تو صرف میں ہی جانتی ہوں کہ میرا بچپن کیسے سکڑ، سمٹ کر اپنی شکل بدل بیٹھا۔ مجھے معلوم ہے کہ کچھ دنوں بعد میرے اندر ہی اندر اُبلنے والے انتقامی قہقہوں کی آوازیں میرے لبوں سے بھی پھوٹنے لگیں گی۔ میں ہسٹریا کی مریضہ بن جاؤں گی اور یہ حالت اب بھی ہے لیکن ابھی میرے پاس اپنے احساسات کے نکاس کے کچھ راستے ہیں جو میں رفتہ رفتہ اپنے ہاتھوں بند کرتی جا رہی ہوں اور جب چاروں طرف کی دیواریں اونچی ہو جائیں گی تو میں اندر ہی اندر گھٹ کر اتنی زور زور سے چلانے لگوں گی کہ ایک دنیا میری دیوانگی اور ہسٹریا پن کا تماشہ دیکھے گی مگر ان لمحات میں قیاس آرائیاں کرنے اور الزامات تراشنے سے پہلے میری یہ داستان ایک بار ضرور پڑھ لینا کہ کبھی میرے اندر بھی خالہ جیسی شگفتہ دلی اور ذہانت تھی۔

آٹھ سال پہلے جب میں صرف تیرہ سال کی تھی تو کیسی شوخ شریر اور کھلنڈری لڑکی تھی۔ اپنی بکھری لٹوں کو جھلاتی بھاگتی دوڑتی پھرا کرتی تھی۔ امی زبردستی میرے بالوں کو کس کر ربن میں جکڑ دیتیں مگر ذرا دیر بعد وہ میرے دو تین جھٹکوں سے ریشمی بالوں سے پھسل کر راستے میں گر جاتا اور میری دراز چوٹی کھنٹے بھر میں لمبی لمبی لٹوں کی صورت میں آگے پیچھے جھولنے لگتی۔ مجھے گھر میں اسکول میں سب بونگی لڑکی کہتے تھے۔ باتیں اچھی کرتی تھی مگر حرکتوں میں حد درجہ لا ابالی پن تھا۔ سب پیار کرتے تھے۔ کوئی زبردستی بال باندھ دیتا، کوئی کپڑوں پر استری کر دیتا۔ مجھے تو ڈھنگ سے کپڑے پہننے آئے، نہ خود کو بنانا سنوارنا، اٹنگے اٹنگے سے کپڑوں میں اِدھر اُدھر بھاگتی دوڑتی پھرا کرتی۔

ہمارے ایک قریبی عزیز ساجد بھائی مجھے بہت پسند کرتے تھے۔ میں ان کی گودوں میں کھیلی تھی۔ مجھ سے سولہ سترہ سال بڑے تھے میرے لیے بچوں جیسی شفقت رکھتے تھے۔ ایک ساجد اور دوسری میری خالہ سلمٰی، یہ دونوں میرا بہت خیال کرتے تھے۔ سلمٰی خالہ کی منگنی ساجد بھائی کے چھوٹے بھائی سے طے ہوئی تھی، اس اعتبار سے وہ سلمٰی خالہ کے جیٹھ لگتے تھے اور خالہ کی شادی ساجد بھائی کی شادی کے بعد ہونا تھی۔ منگنی تو ان کی بھی ہو چکی تھی۔ شادی میں تاخیر ہو رہی تھی اور مجھے معلوم تھا کہ خالہ سلمٰی ان کی شادی جلد ہونے کی دعائیں چپکے چپکے مانگا کرتی ہیں۔ سلمٰی خالہ اپنے منگیتر کو بے پناہ چاہتی تھیں۔ ساجد بھائی کی شادی لیٹ ہونے سے سلمٰی خالہ خاصی جھنجلا رہی تھیں۔ آخر خدا خدا کر کے شادی کی نئی تاریخ طے ہوئی اور سب نے سکھ کا سانس لیا۔

مجھے سب سے زیادہ خوشی تھی کیونکہ وہ سب سے



قریبی دوستوں کا مسئلہ تھا۔ ان کے بعد اب خالہ کو دلہن بننا تھا۔ کپڑوں کی زور و شور سے تیاریاں ہونے لگیں۔ امی خالہ کو لے کر گھنٹوں بازار کے چکر کاٹا کرتی تھیں۔ میں گھر میں سب سے بڑی تھی۔ اس لیے مجھے گھر پر چھوڑ جاتیں۔ ساجد بھائی کا آفس ہمارے گھر سے تھوڑے فاصلے پر تھا' اس واسطے امی فون کر کے انہیں بلوالیا کرتیں کہ گھر میں راشدہ اکیلی ہے اس کا دھیان رکھنا۔ ہمارا گھر بہت بڑا تھا۔ تنہا انسان واقعی ڈر جاتا تھا۔ ساجد بھائی خوب اچھل کود کر کے مجھے بہلائے رکھتے تھے۔

ایک روز (مجھے رتی رتی یاد ہے) امی حسب معمول مجھے گھر چھوڑ گئیں۔ یونہی باتیں کرتے کرتے ساجد بھائی نے مجھے اپنے پاس بلایا' کہنے لگے راشدہ جب تم بہت چھوٹی سی تھیں تمہاری امی تمہیں لڑکوں کا لباس پہنایا کرتی تھیں۔ اس وقت تم مجھے بہت ہی پیاری لگتی تھیں۔ آج میرا جی چاہ رہا ہے۔ تمہیں لڑکوں کے لباس میں دیکھوں۔ میں ان کی اس بے تکی خواہش پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ وہ مجھے بڑے غور سے دیکھنے لگے۔ کچھ عجیب سی نظریں تھیں ان کی۔ میں بھاگ کر دروازے پر جا کھڑی ہوئی اور ڈرتے ڈرتے بولی۔ ''پلیز ساجد بھائی مجھے ڈر لگتا ہے۔ مجھے یوں گھور گھور کے مت دیکھیں۔'' میں سچ مچ ڈر گئی تھی۔ بالکل ڈاکو چور جیسے لگنے لگے تھے۔ وہ ہنستے ہوئے بولے۔

''اچھا اچھا بھاگ کر بلی کے کپڑے پہن کر آؤ۔'' میں ٹھنکتی ہوئی دوسرے کمرے میں آ گئی۔ انہیں مجھ سے محبت ہی ایسی تھی کہ کبھی ان کا کہا نہ ٹالا۔ الماری کھول کر بلی کے کپڑے نکالے وہ مجھ سے دو سال چھوٹا تھا مگر قد میں وہ میرے برابر تھا۔ اس کی پتلون اور قمیص اڑا کر جب میں بھاگتی بھاگتی ساجد بھائی کے پاس پہنچی تو وہ دروازے میں ہی مل گئے۔ بڑی زور سے میری ان کی ٹکر ہوئی۔ انہوں نے مجھے اپنی بانہوں میں اٹھا لیا اور بچوں کی طرح دیر تک گھماتے رہے۔ میرے بال حسب معمول کھل گئے تھے۔ سانس پھول گئی تھی، غصہ بھی آ رہا تھا اور ان کی حرکتوں سے ہنسی بھی نہیں رک رہی تھی۔ میں بمشکل ان سے پیچھا چھڑا کر بھاگی تو وہ پھر بھاگ کر مجھے پکڑنے لگے۔ میں نے دانتوں سے انہیں کاٹنا چاہا۔ یہاں تک یہ کھیل بالکل بچوں والا تھا' آخر میری عمر ہی کتنی تھی تیرہ سال بمشکل سمجھو۔ گھر بھر کے لاڈلے پن نے مجھے ذہنی طور پر آٹھ نو سال کی بچی بنا رکھا تھا۔ ساجد نے میرے کاٹنے کے جواب میں قدرے ناراضگی کا اظہار کیا اور مجھے جھٹکا دے کر چارپائی پر پھینک دیا۔ میرا سر اتفاقیہ طور پر پٹی سے ٹکرا گیا چوٹ ذرا سی لگی تھی لیکن میں نے منہ بری طرح سے پھلا لیا۔ ساجد بھائی نے بھاگ کر میرا سر سہلایا۔ میں نے جھٹکے سے اپنا منہ پھیر لیا۔ مجھے منانے کے لیے وہ مجھ پر جھک گئے۔ گدگدیوں سے ہنستے ہنستے میری آنکھوں میں پانی آ گیا تھا۔ میں بے ساختگی میں ہنستی گئی اور وہ مجھ پر جھکتے چلے گئے اور پھر اس کے بعد یہ کھیل بچوں والا نہیں رہا۔ میرے گرد۔ میرے نوخیز جسم کے گرد جذبات کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ مجھے عجیب سی بات ضرور لگی تھی مگر سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے اور میرے ساتھ ساجد کا یہ سلوک کیا معنی رکھتا ہے۔ سمجھ کا تو جیسے دروازہ ہی بند ہو چکا تھا اور جب اپنے دامن میں کچھ نہ رہا تب زیاں کا احساس ہوا اور اس شدت سے ہوا کہ میں بے اختیار چلا چلا کر رونے لگی۔ اس شخص نے' جس نے مجھ سی انتہا درجے کی بونگی لڑکی کو اپنے وقت سے بہت پہلے عورت بنا دیا تھا' اس وقت پیار سے میرا سر اپنے شانے پر رکھا ہوا تھا' شاید میرا بے تحاشہ رونا دیکھ کر وہ گھبرا گیا تھا کہنے لگا۔

''مجھے معاف کر دو روشی اب کبھی ایسا نہیں ہوگا۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ تم اب بڑی ہو گئی ہو۔'' میں مسلسل گھٹنوں میں منہ دیے روتی رہی۔ وہ باہر چلے گئے واپس آئے تو بہت ساری چاکلیٹ (میری پسندیدہ مٹھائی تھی۔ وہ اکثر مجھے لا کر دیتے تھے) میرے آگے ڈھیر کر دیں۔ میں نے ایک نظر چاکلیٹ کے ڈھیر کو دیکھا اور جی اس بُری طرح سے متلایا کہ ابکائی آ گئی۔ جنون میں انہیں زمین پر دے مارا اور ایڑیوں سے کچل دیا (اور اس روز سے مجھے چاکلیٹ سے ابکائی آتی ہے) ذرا دیر بعد ساجد نے ڈرتے ڈرتے بٹوے سے پیسے نکالے اور میرے سامنے رکھ دیے۔ نفرت کا الاؤ اور دہک اٹھا۔ میں نے پیسوں کے عوض بکنے والے جسموں کا نام سن رکھا تھا۔ ایسا لگا کہ مجھے بہت بڑی گالی بھی دی گئی ہے۔ نوٹوں کو وحشت میں پرزے پرزے کر دیا۔ میرے

اندر کی معصوم کھلنڈری لڑکی مر چکی تھی اور اب اس جسم کے اندر جس راشدہ نے آنکھیں کھولی تھیں' اسے کسی پر اعتماد نہ تھا۔ میرا ان سے سارا پیار حد درجہ نفرت میں ڈھل چکا تھا۔ وہ کہنے لگے۔

''میں تم سے شادی کر لوں گا۔'' میں روتے روتے زور زور سے ہنسنے لگی کہ یہ دنیا کا کتنا بڑا جھوٹ ہے۔ جس شخص کی شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی ہو' وہ مجھ سے شادی کا وعدہ کر رہا ہے۔ وہ میری اکلوتی خالہ کے جیٹھ تھے اور خالہ بھی وہ جنہیں میں جی جان سے چاہتی تھی۔ اول تو ساجد سے ایسے اقدام کی توقع ہی نہ تھی۔ بالفرض ایسا ہو بھی جاتا تو خالہ کی شادی بھی کھٹائی میں پڑ جاتی اور میں جانتی تھی' وہ اپنے منگیتر کو کس شدت سے چاہتی ہیں۔ بھلا پھر ہنستی نہ تو کیا کرتی کہ حضرت مجھ سے اتنا بڑا جھوٹ بول رہے تھے۔

وہ وقت گزر گیا۔ آگے حالات بھی اسی طرح چلے جیسے انہیں جانا چاہیے تھا۔ ان کی شادی وقتِ مقررہ پر اپنی منگیتر سے ہی ہوئی۔ اس کے کچھ ماہ بعد سلمٰی خالہ بھی اپنے منگیتر کو بیاہ دی گئیں اور وہ اس کے بعد بھی ڈھٹائی سے آتے رہے۔ وہ جتنی بار بھی آئے میرے غصے نفرت اور انتقام کی آگ کو بری طرح دہکا گئے۔ یہ احساس جونک بن کر میری جسمانی نشوونما کو چاٹ گیا کہ میں عورت ہوں اور ایک گناہ گار عورت۔ اپنے آپ سے ڈری ڈری رہتی تھی۔ اعتماد نام کو نہیں رہا تھا۔ اندر ہی اندر مردوں سے نفرت اور انتقام کا جذبہ پروان چڑھتا گیا۔ جی چاہتا کہ ہر خوب صورت مرد کو الو بناؤں۔ اعتماد نے جیسا روگ مجھے لگایا ہے ان مردوں کو وہی روگ لگا دوں۔ اس کے بعد میری زندگی میں بیک وقت دو مرد آئے۔ میں بدصورت مردوں کو نظر بھر کر بھی نہیں دیکھتی تھی اور نہ ان سے بات کرنے کو جی چاہتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ساجد بے حد خوب صورت اور خوش گفتار آدمی تھا۔ اب ہوتا یہ تھا کہ اچھی آواز اور اچھی صورت والا مرد پہلے تو ایک دم اچھا لگنے لگتا' بے اختیاری میں اس سے بات کرنے اور اسے اپنا گرویدہ کرنے کو جی چاہنے لگتا اور جب محسوس کرتی ہوں کہ یہ مجھ پر مرنے لگا ہے (اب احساس ہوتا ہے۔ یہ بھی میری خوش فہمی تھی) تو ان سے بے نیازی برت کر دامن چھڑا لیتی۔

میرا پہلا شکار میرے دو کزنز تھے۔ میں نے جی بھر کے ان سے فلرٹ کیا اور پھر چھوڑ دیا۔ دونوں مجھ پر

نیوٹن کی کتاب ''پرنسپیا میتھ میٹیکا''

1687ء میں عظیم سائنسدان سر آئزک نیوٹن کی مشہور کتاب پرنسپیا میتھ میٹیکا شائع ہوئی۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل تھی۔ پہلی جلد میکانیات کی عام تشریح پر دوسری جلد مختلف اقسام کی حرکتوں کے بیان سے متعلق اور تیسری جلد اجرام فلکی کی حرکات کے بارے میں تھی جس میں اس نے عالمگیر تجارت کے قوانین پیش کیے تھے۔ اس کتاب نے نیوٹن کی شہرت میں بے حد اضافہ کیا یہ کتاب لاطینی زبان میں لکھی گئی تھی لیکن نیوٹن کی وفات تک اس کا سات زبانوں میں ترجمہ کیا جا چکا تھا۔ نیوٹن 25 دسمبر 1642ء کو پیدا ہوا تھا اور اس نے 20 مارچ 1727ء کو وفات پائی۔

مرنے کا بڑی سچائی اور شدت سے اظہار کرتے تھے۔ دونوں کا کہنا تھا۔ ''تم نہ ملیں تو میں مر جاؤں گا۔'' مگر دونوں ہنوز زندہ ہیں اور صحت مند بھی۔ غیر ملک میں شادی کر کے بے حد خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔ میں سمجھ رہی تھی کہ جب یہ دونوں میری بے وفائی پر سر پٹکیں گے۔ تب میرے انتقام کی آگ پر چھڑکاؤ سا ہو جائے گا۔ لیکن یہ آگ تو اور زیادہ بھڑک اٹھی۔ میں جلتی' بھنتی رہ گئی۔ میں اب خاصی بڑی ہو گئی تھی۔ اس حادثے کو گزرے بھی چھ سال بیت چکے تھے لیکن میرا ذہن اور جسم دونوں جیسے اسی سانحے کے محور پر گھوم رہے تھے۔ لوگ کہتے تھے یہ لڑکی تو بڑھتی نظر ہی نہیں آ رہی ہے۔ اس عمر میں تو لڑکیاں کدو کی بیل کی طرح بڑھتی ہیں۔ یہ تو جیسے اور سکڑ سمٹ رہی ہے۔ وہ ٹھیک کہتے تھے۔ میں اپنی نشوونما کھو چکی تھی۔ دکھ اور رنج کی شدت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ساجد کو اس کے چار بچوں میں ہنستا مسکراتا دیکھتی تو سلگتی اور ان دونوں کزنز کے متعلق سنتی کہ مزے میں عیش کر رہے ہیں تب کڑھتی۔ یہ انتقام تو اپنا ہی وجود

جلا رہا تھا اور اب جو تیسرا شخص میں نے چنا۔ وہ میری ممانی کا بھائی تھا۔ وہ بھی ساجد' اقبال اور سرور کی طرح خوبرو تھا' جس چیز نے مجھے اسے منتخب کرنے کی تحریک دی۔ وہ اس کی شرافت تھی۔ بہت خاموش اور نیک لڑکا تھا۔ میں نے سوچا کہ جب اسے فلرٹ کرکے چھوڑوں گی تو میرا نشانہ بالکل صحیح لگے گا۔ یہ میری یاد میں تڑپ تڑپ کر روئے گا۔ شریف لڑکا ہے۔ میرا دیا ہوا زخم ساری عمر نہ بھلا پائے گا اور جو میں نے سوچا تھا' وہ کیا۔ اسے محبت کے دام میں پھنسایا' بار بار اسے پیار کا یقین دلایا کہ تم نہ ملے تو مر جاؤں گی اور جب وہ پوری طرح سنجیدہ ہو گیا تو پتا ہے کیا ہوا۔ میں نے جب یکدم بے رخی اختیار کی تو وہ ہکا بکا سا رہ گیا۔ پہلے مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر تازگی سی آجاتی تھی۔ اس نے مجھے چھونے یا جسمانی طور پر قریب لانے کی کوشش نہیں کی تھی' بس ایک ٹک دیکھتا رہتا تھا۔ زیادہ پیار آتا تو پیار سے سر تھپتھپا دیتا لیکن جب میں ایک دم اجنبی سی بن گئی اور اس کی محبت کو بری طرح سے ٹھکرا کر اسے ذلیل کر چکی تو ہکا بکا سا کھڑا رہ گیا۔ میں نے اس لمحے اپنے دل کو ٹٹولا کہ دیکھ اب تیرا انتقام پورا ہو رہا ہے۔ دیکھ راشدہ یہ مرد تیری دی ہوئی چوٹ اپنے دل پر محسوس کر رہا ہے' دیکھ اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی ہے۔ یہ آنسو ہیں' ایک مرد کے آنسو جو تُو نے اسے بخشے ہیں اور دیکھ وہ اپنے آنسو چھپانے کے لیے یکدم پیٹھ موڑ کر تیز قدموں سے جا رہا ہے۔ ناکام تہی دست' زخم خوردہ' اب تیرا انتقام پورا ہو چکا۔ خوب جشن منا اور...... اور ان لمحات میں میرے دل نے خوشی منانے سے قطعی طور پر انکار کر دیا۔ وہ تو جیسے دھڑکتے دھڑکتے بند سا ہونے لگا اور پھر اس ضدی دل نے ایک عجیب سی بات محسوس کی کہ وہ اس لڑکے کو پسند کرتا ہے۔ وہ نادان دل اسے چاہنے لگا۔ کیونکہ میرا دل ایک عورت کا دل تھا نا۔ میرے کھیل کی ساری بساط ہی الٹ چکی تھی۔ دکھ' کسک' تڑپ پھر اس دل کے مکین بن گئے تھے۔ میں پھر مات کھا چکی تھی۔ عورت محبت کے معاملات میں مرد سے کبھی انتقام نہیں لے سکتی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کے آنسو میری آنکھوں میں اتر آئے ہیں اور وہ بھی ندی نالے بن کر۔ میں روتی رہی' روتی رہی آنسو پھر بھی خشک نہ ہوئے۔

خودداری نے جھٹکے ہوئے ہاتھ کو دوبارہ تھامنے پر آمادہ نہ ہونے دیا اور یہ دوسرا روگ اپنے دل کو لگا بیٹھی۔

آنسو تھمے' جذبے تھپک کر سلا دیے تب پھر وہی انتقام کی صدا بلند ہوئی۔ شاید میں بہت آگے بڑھ چکی ہوتی جو میں پڑھائی نہ چھوڑ دیتی۔ ایک دو دفعہ فیل ہو کر بددل ہو گئی۔ گھر بیٹھ گئی۔ لوگوں سے ملنے کے مواقع کم ملے۔ ورنہ ان دنوں کی سوچ کچھ ایسی تھی جو مجھے ایسی جگہ لے جاتی جہاں سے واپس آنا محال ہو جاتا۔ دو سال گھر بیٹھ کر میں اپنے گرد حصار کھڑا کرتی رہی۔ کبھی انتقام کے جذبے سے مغلوب ہو جاتی۔ کبھی مذہب کی دیوار آڑے آجاتی تب نیکی اور بدی کی جنگ میرے خود ساختہ باغی نظریات کا قتل و غارت شروع کر دیتی اور کبھی میری محبت غالب آجاتی۔ گھر بسانے کی فطری خواہش عود کر آتی۔ جو ان متضاد کیفیتوں کا شکار ہو کر دم توڑ دیتی۔

اور آج لوگ کہتے ہیں۔ اس کی نشوونما تو جیسے ٹھٹھر گئی ہے۔ اس پر تو خوبصورتی کی AGE آئی ہی نہیں۔ اس کا بچپن کا رنگ روپ کہاں گیا؟ تیرہ برس تک تو یہ غضب کی خوب صورت تھی۔ رنگت بھی جھلس گئی ہے۔ کیسی سرخ و سپید ہوا کرتی تھی' تو حضور یہ تھا۔ وہ پس منظر جس نے تیرہ سال کی عمر میں مجھ پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ مجھے لڑکپن میں ہی بہت بڑا بنا دیا تھا مزید بڑی کیسے ہوتی؟ چہرے پر رات دن اپنے آپ سے لڑتے رہنے سے جو کھنچاؤ سا آگیا ہے اس نے معصومیت نگل لی اور پتھریلا پن بخش دیا۔ سنہری رنگت کے خوشے جھلسا دیے۔ چھپ چھپ کر رونے سے آنکھوں پر چشمہ چڑھ گیا۔ بال اپنی رنگت اور خوب صورتی کھو بیٹھے گو عام زندگی میں ایسے واقعات ہزاروں ہوتے رہتے ہیں لیکن میں ذہین اور حساس لڑکی تھی۔ اس سانحے سے کسی طور بھی سمجھوتہ نہ کر سکی اور آج محض اس واسطے وہ لمحات کاغذ پر بکھیر رہی ہوں کہ خدارا معصوم جسموں اور ذہنوں پر ظلم کرنے والو! تمہاری وقتی لغزش ان کی پوری زندگی پر اپنی بدنما چھاپ ڈال سکتی ہے۔ ہم معصوم لڑکیاں زبان کھولنے کا حوصلہ نہیں رکھتیں۔ اندر ہی اندر سلگ کر نفسیاتی مریضہ بن کر رہ جاتی ہیں۔ انتقام لے نہیں سکتیں کہ وہ بازی بھی مرد کے ہاتھ میں رہتی ہے۔

......☆☆......

چھٹی سچ بیانی

میں ایک بیٹی ہوں

نگہت غفار

کراچی ہی سے ایک اور دوشیزہ کی زبانی زندگی کی تلخ حقیقتیں

"امی جی! ابھی ان سبزیوں کے علاوہ بھی کچھ بنالیا کریں دل بھر گیا ہے یہ سبزیاں کھا کھا کر۔" جنید نے دسترخوان پر بیٹھتے ہوئے شوشہ چھوڑا۔

زوہیب اور فیضان بھی بول پڑے "دراصل بھائی یہ سستی



ہوتی ہیں اس لیے ہر دوسرے روز دستر خوان پر نظر آتی ہیں۔"
بچوں کی باتیں سن کر میرا پارہ ہائی ہوگیا۔
ایک تو کمپنی سے آنے میں ٹریفک کے اژدحام کی وجہ سے لیٹ ہوگئی دوسرے اتنی شدید گرمی تیسرے سر میں درد ہو رہا تھا۔
میں کچن سے روٹیاں پکاتے ہوئے قدرے زور سے بولی۔ "میرا خیال ہے یہ سوچو کہ یہ سبزیاں بھی تم تک کس طرح پہنچتی ہیں۔ جس سبزی پر ہاتھ رکھو اسی' سو روپے کلو سے کم ہی نہیں۔ اب میرے اپنے کھیت تو ہیں نہیں کہ میں نت نئی سبزیاں اپنی مرضی سے اگاؤں اور تم سب کی فرمائشیں الگ الگ پوری کروں۔ وقت پر جو مل جائے نا' اُس پر صبر شکر کرلیا کرو۔ اگر کسی روز یہ بھی نہیں ملے گا تب پتا چلے گا ناشکرے کہیں کے۔"
بس کنٹری شروع ہوجاتی ہے۔
میں روٹیاں لے کے دوسرے کمرے میں آئی جہاں موم بتی کی روشنی میں بچے کھانا کھا رہے تھے۔
زوہیب نے جیب سے موبائل نکالا۔ "ارے ارے امی ذرا رکیں تو! میں آپ کی ایک تصویر لے لوں۔ میری پیاری ماں اتنی تھکی ہوئی باہر سے آئی اور کس طرح ہماری خدمت میں لگ گئی۔"
"اے اُولڑ کے' بند کر اسے۔ فلیش کی روشنی دیکھ کر اُدھر سے باپ کی آواز آئے گی۔ یہ روشنی کیوں ہوئی ہے کمرے میں؟" میں نے خدشہ ظاہر کیا اور جابر کی آواز نکلی۔ یہ کمرے میں روشنی کیوں ہوئی ہے؟
"ابا! یہ لائٹ نے جھپکی ماری ہے۔" جنید نے فوراً بات بنائی ورنہ اس کی شامت آجاتی کہ یہ موبائل کیوں خریدا؟
"ارے منحوس' کم بخت' بجلی والوں کی حرکتیں' کبھی وولٹیج کم ہوتا ہے' کبھی لائٹ سے آنکھ مچولی کا کھیل شروع ہو جاتا ہے۔"
جابر کے اس جملے پر سب کی ہنسی چھوٹ گئی مگر دبی دبی' گھٹی گھٹی سی مبادا جابر سن لیں ورنہ ایسی صلواتیں شروع ہوں گی کہ سانس لینا مشکل ہو جائے گا۔
"ثانیہ بیٹی' برتن اکٹھے کر کے کچن میں لے آؤ اور جلدی سے دھو لو۔" میں نے بیٹی کو آواز لگائی۔
بڑی ثوبیہ جس کی شادی ہوگئی تھی' چھوٹی ثانیہ اور پانچ بیٹے جنید' زوہیب' فیضان' سفیان' فاران اور رات دن بک بک جھک جھک کرتا زندگی کا ساتھی' جو کئی سال سے اسی روپ میں تھا۔ ہر لمحہ منفی سوچ' کڑوی باتیں' دل میں اتر جانے والے لفظوں کے تیر جن کے زخموں سے قطرہ قطرہ لہو رستا۔
بڑی ہی خشک اور کھردری زندگی تھی۔ بچے ماشاء اللہ سے سات تھے مگر جابر کسی سے خوش نہ تھے اور نہ ہی بیوی سے مطمئن تھے۔ کبھی کسی وقت اللہ کی عطا کردہ نعمتوں پر اس کا شکر ادا نہیں کیا۔ ہمیشہ پارہ چڑھا رہتا۔ سروس چھوڑے ہوئے کئی سال ہوگئے تھے۔ سارا سارا دن گھر میں رہ کر ہر کام میں مین میخ نکالنا ہر ایک کو ٹوکنا' ہر بات میں دخل اندازی گویا ان کے پسندیدہ مشغلے تھے۔ تین بیٹے اور بیوی سروس کرتی ہو تو ایسے شخص کو بھلا ذریعہ معاش کی کیا فکر؟
میں رات دن کولہو کے بیل کی طرح کام میں جتی رہتی۔ جسم تو متحرک رہتا مگر دل و ذہن بھی ہمیشہ مصروف کار رہتے۔ گھر کے ہزار جھنجٹ' سسرال والے انتہائی اکھڑ مزاج اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو خوب طول دینے والے اور جب وہ ہمارے گھر آتے تو جابر کچھ زیادہ ہی آپے سے باہر ہو جاتے' بیوی کو تو بالکل پیر کی جوتی سمجھتے تھے۔ ایک انتہائی کمتر اور بے وقعت ملازمہ کی طرح اور آنے والے اُن سے دو قدم آگے رہتے۔
ایک دن میں کمپنی سے گھر پہنچی تو ثانیہ کو کچھ پریشان دیکھا۔ اُس نے کھانا بھی ٹھیک طرح سے نہیں کھایا عشاء کی نماز بھی جلدی سے پڑھ لی اور بستر پر چلی آئی۔ میں نے عشاء کے بعد اپنی تسبیح مکمل کی اور سب کو آنکھیں بند کر کے فرداً فرداً دم کیا۔
پھر ثانیہ سے مخاطب ہوئی جو بے چینی سے بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ "ثانیہ بیٹا' کیا بات ہے' تم کچھ پریشان سی لگ رہی ہو؟"
"نن...... نہیں امی' بس ایسے ہی سر میں درد ہے' طبیعت پر بوجھل پن ہے۔" اُس نے کہا اور میں مان گئی۔
"پیناڈول لے لو اور آیت الکرسی پڑھ کر دم کرلو۔ نیند آجائے گی۔" میں نے بھی کروٹ بدلی اور نیند کا انتظار کرنے لگی۔
گھر میں رونق سی لگ رہی تھی ثوبیہ ننھی سومیا کے ساتھ کچھ روز رہنے آئی ہوئی تھی۔
"امی جی' آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔" ثوبیہ نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

میں بھی سنبھل کر بیٹھ گئی "ہوں! بولو کیا بات ہے؟"

"امی! یہ اپنے ساتھ والا مکان ہے نا اس میں جو فیملی رہتی ہے وہ لوگ آپ کو کیسے لگتے ہیں؟"

"دیکھو بیٹا! اُن لوگوں کو یہاں شفٹ ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا لیکن لوگ پڑھے لکھے اور اچھے لگتے ہیں۔ تمہیں تو پتا ہے میں صبح گھر سے نکلتی ہوں تو شام کو اتنی تھکی ماندی گھر لوٹتی ہوں کہ اڑوس پڑوس میں جھانکنے کی ہمت بھی نہیں ہوتی! بس آتے جاتے علیک سلیک ہو جاتی ہے مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟" میں نے سوال کیا۔

وہ مسکرائی۔ "دراصل شاہینہ نے ثانیہ کو بتایا ہے کہ اُس کا دیور ثانیہ کو پسند کرنے لگا ہے اور اپنی امی اور بھابیوں کو رشتے کے لیے بھیجنا چاہتا ہے۔"

"کوئی حرج نہیں ہے۔ اچھا لڑکا ہے! اکثر مجھے راستے میں مل جاتا ہے تو سلام ضرور کرتا ہے خیریت پوچھتا ہے۔ پڑھا لکھا سلجھا ہوا شریف لڑکا ہے۔" میں نے دل کھول کے شاہ زیب کی تعریف کی۔

"امی! میں سوچ رہی ہوں! میری موجودگی میں آجائیں تو اچھا رہے گا۔" ثوبیہ نے تجویز پیش کی۔

"ہاں! ہاں! بالکل! تم شاہینہ سے کہہ دو ایک دو روز میں پروگرام سیٹ کر لیں۔"

وہ لوگ آئے...... شاہ زیب کی امی بھابیاں ایک بہن اور بھائی۔ میں نے ناشتے کا خاص اہتمام کیا۔

ابا! شاہ زیب کے بھائیوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد جابر کمرے میں آئے تو شاہ زیب کی بھابیاں اپنے شوہروں کے پاس چلی گئیں۔ میں جب کمرے میں گئی تو اُن لوگوں نے رشتے کی کوئی بات نہ کی۔ مجھے بے حد تشویش ہوئی ثوبیہ بھی پریشان تھی۔ ثانیہ تو باقاعدہ رو پڑی یہ تو اُس کی بہت بڑی بے عزتی ہوئی تھی۔

میں تو اِدھر اُدھر مصروف ہو گئی۔

لیکن دونوں بہنوں میں کھسر پھسر ہو رہی تھی۔ میں جان بوجھ کر دونوں کے کمرے میں نہیں گئی۔ انہیں اکیلا چھوڑ دیا۔

"باجی! ایک بار نہیں کئی بار میری شاہ زیب سے ملاقات ہوئی۔ میں جب بھی کپڑے سکھانے چھت پر جاتی ہوں وہ ضرور آتے ہیں۔ انہوں نے یقین دلایا تھا کہ وہ لوگ یقیناً تمہیں پسند کر کے ہی آئیں گے اور رشتے کی بات کر کے ہی لوٹیں گے۔ میری سمجھ میں یہ معمہ نہیں آ رہا ہے۔ میں کل چھت پر جا کر شاہ زیب سے بات کرتی ہوں۔"

"ثانیہ چھت پر اگر کسی نے دیکھ لیا تو یہ تو اچھی بات نہیں ہوگی۔ پگلی یہ بڑا رسکی کام ہے۔" ثوبیہ نے سمجھانا چاہا۔

"نہیں باجی! آخر معلوم تو کروں کہ ایسا کیوں ہوا ہے؟"

پھر ایک دو تین دن ثانیہ لگاتار چھت پر جاتی رہی شاہ زیب کو آنا تھا نہ آیا۔ تب ثانیہ دل بھر کے روئی ایک تو شاہ زیب کی بے وفائی پر دوسرے اپنی امی اور ثوبیہ کی بے عزتی پر لیکن وجہ معلوم نہ ہو سکی۔

ثوبیہ بھی گھر چلی گئی میں بھی اپنے معمولات میں مصروف ہو گئی مگر ثانیہ کو تو جیسے چپ لگ گئی۔ بالکل خاموش! گھر میں کسی اور کو اس بات کا علم نہیں تھا صرف مجھے ثوبیہ اور ثانیہ تینوں اِس بات سے متاثر ہوئے تھے مگر سب سے زیادہ ثانیہ کے دل و دماغ پر اثر ہوا تھا۔

ایک روز وہ چھت پر کپڑے پھیلا رہی تھی کہ اچانک ایک مڑا تڑا سا کاغذ اُس کے قریب آ کر گرا۔ اُس نے جھک کر اٹھایا اِدھر اُدھر نظریں گھمائیں کوئی نہیں تھا۔ اُس نے پرزہ مٹھی میں دبایا اور تیزی سے سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ جابر اور ثانیہ گھر پر اکیلے تھے جابر سو رہے تھے۔

ثانیہ نے خط پڑھا شاہ زیب نے بہت غصے میں لکھا تھا وہ اس سے بہت زیادہ خفا تھا اور اسے بہت بُرا سمجھ رہا تھا۔ میرے بارے میں بھی بہت کچھ لکھا تھا۔

"آخر تمہاری اماں نے اس رشتے سے انکار کیوں کیا؟ کیوں میرے پروپوزل کو ریجیکٹ کیا؟ کیا کمی تھی مجھ میں؟ ہر لحاظ سے تمہارے قابل تھا۔ تم سے اونچا نہیں تو نیچا بھی نہ تھا؟ اس طرح سے منع کر دیا میرے گھر والوں کے سامنے مجھے ذلیل کر دیا۔ کتنی مشکل سے کتنی منت سماجت کے بعد اماں راضی ہوئی تھیں۔ میرے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ لمحوں میں میری خوشیوں کو ختم کر دیا میرے مان کا خون کر دیا۔ میں تو تمہاری اماں کو بہت اچھا سمجھتا تھا اوروں سے مختلف مگر وہ بھی ایک سطحی عورت نکلیں۔ بلا سوچے سمجھے نجانے کس زعم میں انکار کیا۔ کیوں ٹھکرایا مجھے؟ میں تمہاری اماں کو کبھی بھی معاف نہیں کروں گا کبھی نہیں۔ میں نے تم سے ڈھیر سارے سوال تو کر ڈالے مگر نہیں...... نہیں چاہیے مجھے ایک سوال کا بھی جواب نہیں چاہیے۔ میں تمہارے بغیر جینا سیکھ لوں گا۔

مجھے خط لکھنے یا جواب دینے کی غلطی بالکل بھی نہ کرنا۔“

خط پڑھ کر ثانیہ تو بری طرح چکرا گئی۔ غصے سے وہ کانپنے لگی اس قدر سفاکی سے جھوٹ بولا گیا تھا۔ ان لوگوں نے میری ماں کو معصوم بے قصور سیدھی سادی اور شاہ زیب کو اس قدر پسند کرنے والی ہستی کو اتنا بے وقعت اور غلط انداز میں شاہ زیب کے سامنے پیش کیا گیا۔ شاہ زیب تم نے بار بار جواب دینے سے منع کر کے بہت برا کیا۔

آج میں کمپنی سے گھر پہنچی ہی تھی کہ بیرونی گیٹ پر گی بیل بجی بچوں نے دروازہ کھولا۔ علیک سلیک کی آوازیں مجھ تک پہنچیں۔ جابر کے کزن برکت علی آئے تھے جو ان سے کئی سال بڑے تھے۔ ان کے ساتھ ان کا بیٹا صمد بھی تھا۔ میں اُن کی آواز سن کر حیران رہ گئی۔ خاصے کھاتے پیتے تھے اس وجہ سے ہم سے کم ہی ملنا جلنا تھا۔ عید بقر عید پر جابر مجھے لے کر ضرور عید ملنے جاتے تھے۔

میں نماز پڑھ کر جب اُس کمرے میں پہنچی جہاں دونوں بھائی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ”السلام علیکم چچی!“ صمد نے سلام کیا۔ میں نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا اور برکت بھائی کے آگے ادب سے جھک گئی۔ ”السلام علیکم! بھائی صاحب!“ میں نے سلام کیا۔

انہوں نے میرے ساتھ پر ہاتھ رکھا میں بھی وہاں بیٹھ گئی اور برکت بھائی سے گھر کے باقی افراد کی خیریت معلوم کی بھابی کا انتقال ہو چکا تھا۔ برکت بھائی اور ان کے دس بچے بڑے سے مکان میں رہتے تھے۔ بڑا بیٹا ظہیر دبئی میں ملازمت کرتا تھا چھوٹا اکبر مسقط میں تھا بیٹیاں چھ تھیں اور سب کی سب کنواری۔ عمریں گزر رہی تھیں مگر کوئی رشتہ نہیں آ رہا تھا۔

میں نے ثانیہ کو کچن میں جا کر ہدایت دی کہ چائے کے ساتھ ناشتا بھی لے آنا فاران کو بھیج کر بازار سے کچھ منگوالو۔

میں دوبارہ کمرے میں گئی تو برکت بھائی بولے۔ ”دلہن! تمہارا کیا خیال ہے اس بارے میں؟“

ان کے اس اچانک سوال پر میں نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ ”بھائی صاحب کس بارے میں؟“ میں نے سوال کیا۔

”میں ظہیر کے لیے ثانیہ کا رشتہ مانگنے آیا ہوں۔“

”جی...... جی ظہیر کے لیے؟“ میں حیرت اور تعجب سے انہیں دیکھ رہی تھی کیونکہ ظہیر ان کے گھر کا سب سے بڑا بیٹا جس کی عمر تقریباً چونتیس سال تھی اور ثانیہ اُن کی آٹھویں بیٹی کی عمر کی تھی تقریباً سترہ سال کی......

مجھے اس طرح حیرت اور تعجب میں دیکھ کر وہ مسکرائے۔

”جابر نے تو ہاں کر دی ہے۔ اب تم اپنا خیال بتاؤ۔“

میں نے بڑی بے بسی سے جابر کی طرف دیکھا جو غصیلی نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔

”ہاں بھائی! ٹھیک ہے آپ جب چاہیں بچیوں کو لے کر آئیں یہ آپ ہی کا گھر ہے اور ثانیہ آپ ہی کی بیٹی ہے۔“ پھر میں نے بہت ہی دھیمی آواز میں کہا۔ ”بھائی صاحب جب انہوں نے ہاں کر دی تو بھلا اب میری کیا مجال کہ میں نہ کر سکوں۔“

میری بے بسی دیدنی تھی مگر کوئی نہ تھا جو میری بات کو سنتا اور سچ کہتا صرف عمروں کا فرق نہیں تھا۔ ظہیر چھوٹے قد کا گنجا اور کالا لڑکا نہیں بلکہ مرد تھا اور ثانیہ دودھ جیسی رنگت والی گڑیا جیسی فطرت کی نہایت ہی معصوم بالکل سیدھی سادی بے حد بھولی! تو بیہ پھر تیز حاضر جواب اور عقل مند تھی مگر یہ جوڑ بالکل بھی کسی بھی لحاظ سے قابل قبول نہ تھا۔

رات بچے آئے ان کے سامنے یہ بات رکھی گئی سب نے یک زبان سختی سے منع کیا مگر جابر...... آخر جابر ٹھہرے...... جو اپنی بات منوانے کے لیے عجیب ہتھکنڈوں پر آ جاتے۔

اس قدر شور مچانے لگے کہ دراصل میرے بھائی کا بیٹا ہے اس لیے تم لوگ مخالفت کر رہے ہو۔ لاکھوں کی جائیدادیں ہیں تین چار مکان ہیں۔ ظہیر کی جاب اور آمدنی دیکھو۔ تم لوگوں نے خواب میں بھی نہیں دیکھی ہو گی اتنی رقم اور ایسی جائیدادیں۔ بس مجھے وہیں شادی کرنا ہے جوڑ ووڑ کچھ نہیں ہوتا۔

جابر اتنی بلند آواز میں بول رہے تھے کہ گالی گلوچ کی آوازیں گھر سے باہر جانے لگیں۔ میں نے بچوں کے آگے ہاتھ جوڑ لیے کہ بیٹا تمہاری بہن کا نصیب یہ شخص نہیں مانے گا آج تک بھلا کبھی کوئی بات انہوں نے ہماری مانی ہے۔ سچ کو سچ کہا ہے؟ سدا سے من مانی کرتے چلے آئے ہیں بس اللہ پر چھوڑ دو جو ہو رہا ہے ہونے دو۔ اللہ ہماری مدد کرے گا۔

پھر وہ دن بھی آ ہی گیا جس کا انتظار تھا۔ ہر بات ہر رسم ہر کام اُن لوگوں کی مرضی سے ہو رہا تھا کیونکہ وہ لوگ امیر تھے پیسے والے تھے۔

”تم...... تم بیک ورڈ قسم کے لوگ ہو تمہیں کیا معلوم اسٹینڈرڈ کیا ہوتا ہے فیشن کیا ہے آج کل کیا ہو رہا ہے؟ جابر اکثر مجھے اور بچوں سے کہتے۔

تو بیہ کوئی مشورہ دینا چاہتی تو جابر سختی سے رد کر دیتے۔ بری میں بیوٹی بکس نہیں آیا کہ ظہیر کو میک اپ پسند نہیں ہے جبکہ بہنیں سدا لیپا پوتی کرتی رہتی تھیں لیکن بیوی کا میک اپ کرنا اُسے پسند نہیں ہے۔

ابتدا یہاں سے ہوئی کہ اگر ثانیہ صرف منہ دھو کر کاجل بھی لگا لے گی تو خوبصورت اور حسین لگے گی۔ یہ چیز اُسے پسند نہیں تھی۔ احساسِ کمتری میں اس قدر مبتلا ہوا کہ ثانیہ کا جینا حرام کر دیا۔

ولیمے والے دن میں نے خود اپنے کانوں سے سنا چند خواتین گفتگو کر رہی تھیں۔ انہیں خبر نہیں تھی کہ میں دلہن کی ماں ہوں۔

”بہن مجھے تو لگتا ہے اس لڑکی کی ماں سوتیلی ہے۔ سگی ماں کبھی بھی ایسے مرد سے ایسی پھول جیسی گڑیا بیٹی اس کے حوالے نہ کرتی۔

”میرا تو خیال ہے بہن لڑکی میں کوئی عیب ہو گا تبھی تو سارے ہی گھر والے اس رشتے پر راضی ہوئے۔“ دوسری عورت نے گویا میرے کلیجے پر نشتر چلایا۔

میرے کانوں کے راستے جیسے بم بلاسٹ ہو رہے تھے اور میں...... خاموش تھی۔ چیخ بھی نہیں سکتی تھی کہ نہیں لوگو! ایسا کچھ بھی نہیں ہے صرف اور صرف ایک شخص کی ضد اکھڑ پن اور اپنوں پر اندھا اعتماد ہے جسے ہم سب نے قبول کیا ہے۔

دونوں باہر نکلتے دوست احباب دیکھتے اور مذاق میں ریمارکس دیتے۔ ”ارے یار ظہیر وہی مثال لگ رہی ہے حور کے پہلو میں لنگور۔“

”یار بھابی کے نصیب پھوٹ گئے۔ بڑی بے جوڑ شادی ہوئی ہے۔“

اس قسم کے ریمارکس سن سن کر وہ اور پاگل ہو جاتا گھر آ کر ثانیہ پر سارا غصہ اتارتا دونوں ساتھ بیٹھتے رنگ روپ ہر چیز کا فرق صاف واضح ہوتا تو وہ فوراً کہتا۔ ”کلو ذرا منہ ہاتھ دھولو...... کیسی کالی لگ رہی ہو...... لگتا تھا جیسے نفسیاتی مریض بن گیا ہو۔

کبھی کہتا پاؤں کتنے میلے ہو رہے ہیں جاؤ انہیں خوب اچھی طرح دھو کر آؤ۔ کبھی کہتا بالوں میں تیل لگاؤ ثانیہ نے تیل لگایا اور دو چوٹیاں باندھ لی چیخ پڑا۔ ”زیادہ ننھی بچی بننے کی ضرورت نہیں ہے کھولو ان چوٹیوں کو۔“

صبح پانچ بجے کا الارم لگا کر ثانیہ کو جگاتا ابا اور بہن بھائیوں کے لیے ناشتا تیار کرو۔ نو بہن بھائی ایک ابا اور ایک ثانیہ گیارہ افراد کے لیے پراٹھے بنتے اور کام پر جانے والوں کے لیے ٹفن بھی ثانیہ کو تیار کرنا پڑتا۔

دوپہر سیروں کے حساب سے سالن بنتا۔ سب کے کپڑے دھونا جھاڑو صفائی سب کچھ تنہا ثانیہ کو کرنا پڑتا کیونکہ ظہیر کی شادی ہوتے ہی گھر میں کام کرنے والی کی چھٹی کر دی گئی تھی۔

ثانیہ میری نادان بھولی بھالی بچی ان لوگوں کے حکم کے آگے سر جھکائے رکھتی۔ شادی کی رات کو ظہیر اور نندوں اور سسر نے یہ بات بھی اسے سمجھا دی تھی کہ اس گھر کی کوئی بات بھی میکے میں نہیں پہنچنی چاہیے جس روز یہ غلطی کی سمجھو اس گھر میں آخری دن ہو گا اور یہی دھمکی ظہیر دن میں پچاسوں بار دیتا جسے سن کر ثانیہ دہل جاتی۔

یا اللہ! مجھے حوصلہ اور ہمت عطا فرما۔ میرے کسی بھی قول فعل یا عمل سے یہ ظاہر نہ ہو کہ میں کسی دوزخ میں جی رہی ہوں؟

وہ نندوں کی بدسلوکی پر بھی خاموش ہی رہتی کہ جب شوہر نے ہی اسے بیوی ہونے کا مان نہیں دیا تو وہ کسی سے کیا گلہ کرے۔

صرف ایک نند جو اُس کی عمر کی تھی نہ منفی کردار تھا اُس کا نہ مثبت۔ وہ بالکل خاموش رہتی زیادہ تر اپنا کام خود کر لیتی وہ الگ تھلگ سی چپ چپ رہتی جیسے یہ سب کچھ اُسے بھی اچھا نہ لگ رہا ہو لیکن نہ تو کبھی ثانیہ کے کمرے میں آتی نہ کبھی ہمدردی کی کوئی بات کرتی۔

محلے میں ثانیہ کو کہیں جانے اور کسی سے ملنے کی اجازت نہیں تھی اگر اڑوس پڑوس سے کوئی آ جائے تو نندوں میں سے کسی ایک کو مستقل تعینات کر دیا جاتا کہ جب تک یہ خاتون چلی نہ جائیں کمرے سے باہر قدم نہ نکالنا کہیں ایسا نہ ہو کہ ثانیہ اپنا دکھڑا سنانے لگے اور بات میکے تک پہنچ جائے۔

ٹینشن کام کی زیادتی سارا سارا دن بھوکی پیاسی

کام میں لگی رہتی آخر ایک انسان تھی وہ بھی۔ ایک روز وہ کچن میں کام کر رہی تھی' اچانک تیورا کر گر پڑی۔ ڈاکٹر بھی گھر پر ہی بلوایا گیا تو پتا چلا کہ یرقان بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ سخت پرہیز اور آرام کی ضرورت ہے۔ لیکن اس گھر میں آرام ندارد۔

رات دستر خوان پر بیٹھے پانچوں بھائیوں نے تشویش ظاہر کی کہ ثانیہ بہت یاد آ رہی ہے کہیں خدانخواستہ وہ بیمار تو نہیں ہے۔ میں نے اپنے امنڈتے آنسو اندر ہی اتار لیے اور کہا "تم لوگوں نے میرے منہ کی بات چھین لی دو تین دن سے میرا دل بھی بہت اُداس ہے ثانیہ بہت یاد آ رہی ہے۔" میں نے ہاتھ کا نوالہ پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"تو ابھی فون کر لیتے ہیں۔" جنید نے موبائل جیب سے نکالا۔

"نہ...... نہ بیٹا' تم رہنے دو...... میں پوچھ لوں گی۔" میں نے انہیں روک دیا۔

"مگر کیوں امی' میرے پوچھنے میں کیا حرج ہے؟" وہ تھوڑا سا خفا ہوا۔ مجھے اس پر ترس بھی آیا۔ آخر ثانیہ اس کی لاڈلی بہن تھی۔

"ہر بات' ہر کام میں نہ جانے یہ کیسی پابندیاں ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم نے اُس گھر میں بیٹی بیاہی نہیں ہے بھاری رقم کے عوض فروخت کی ہے جس سے اب ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ آخر ثوبیہ کی شادی بھی ہوئی ہے۔ اس کی بھی سسرال ہے حالانکہ ثانیہ کے مقابلے میں غریب اور کم پڑھے لکھے ہیں مگر یہ پابندیاں اور رکاوٹیں تو نہیں ہیں۔"

"اچھا چلیں' آپ ہی فون کر لیں' تین چار روز سے میں محسوس کر رہا ہوں' آپ ڈسٹرب ہیں۔"

مگر نہ جانے فون کرنے سے کیوں احتیاط برت رہی تھیں۔" زوہیب نے کہا۔

میں دستر خوان سے اٹھ گئی۔ ان بھائیوں کو کیا بتاتی کہ ایک روز ثانیہ نے کہا تھا کہ اپنے میکے والوں کو اچھی طرح سمجھا دو یہ ہر دوسرے روز ٹیلی فون نہ کھڑکھڑایا کریں تم یہاں سولی پر نہیں لٹکی ہو جو خیریت معلوم کرتے ہیں۔

میں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر دوسرے کمرے میں جا کر اسے فون پہ بلایا۔ بات ختم کر کے میں جیسے ہی پلٹی پانچوں کی نظریں مجھ پر تھیں۔ میں نے بتایا' "کہہ رہی تھی آپ اور ثوبیہ آپی آ جائیں بہت دل چاہ رہا ہے ملنے کا۔ شائد کوئی سن رہا ہوگا۔" فیضان بولا۔

"شاید نہیں یقیناً وہ منحوس خبیث سر پر سوار رہتا ہے وہی سن رہا ہوگا۔" جنید بولا۔

"اچھا آہستہ...... ادھر بھی کوئی ہے سُن لیا تو زور زور سے صلواتیں شروع ہو جائیں گی۔" میں نے جنید کو چپ کروایا۔

میں نے ثوبیہ کو فون کر کے بلوایا ہم دونوں وہاں پہنچے وہ نندوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ ملگجے سے کپڑے' بکھرے بال' زیور اور میک اپ سے بے نیاز چہرہ سرخ و سفید رنگت سیاہی مائل ہو رہی تھی۔ سب سے زیادہ حیرت اور تعجب کی بات تو یہ تھی ہمیں اتنے دنوں کے بعد دیکھ کر اُس کے چہرے کے تاثرات بدلے نہ اُس نے سلام کیا اُسے تو لپک کر ہم سے لپٹ جانا چاہیے تھا۔

وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی قریب بیٹھی نند نے کہا۔ "ارے' چچی آئی ہیں۔ انہیں سلام تو کرو۔" تب اُس نے نند سے سوال کیا۔ "چچی...... کس کی چچی؟ کون چچی؟"

"ارے' تمہاری امی بھول گئیں؟" اس نے دانت نکالے۔ "مذاق کر رہی ہیں۔" میں نے آگے بڑھ کر ثانیہ کے سر پر کانپتا ہوا ہاتھ رکھا۔

"ثانیہ بیٹی......!" میرا دل میری آواز میرا لہجہ سب ہی نوحہ کناں تھے۔

تب اُس نے مجھے غور سے دیکھا پھر سلام کیا۔ میں نے کمال برداشت سے کام لیا اور مسکرا کر بولی۔ "تم سب کیسی ہو؟"

"جی' ہم سب ٹھیک ہیں' آپ چلیں اندر' ابا کے پاس بیٹھیں' ظہیر بھائی بھی وہیں بیٹھے ہیں۔" میں بڑی مشکل سے چل کر کمرے تک گئی جہاں ظہیر اپنے باپ کے ساتھ بیٹھا تھا مجھے دیکھ کر پہلی بار تو اس نے اگنور کیا؟ پھر دوسری دفعہ سلام کیا میں نے حسب عادت اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں۔

میں اور ثوبیہ بیٹھے تھے۔ ظہیر نے ثانیہ کو آواز دے کر پانی مانگا ثانیہ نے لڑکھڑاتے قدموں سے اسے پانی لا کر دیا لیکن کمزوری کے سبب اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ میں نے اور ثوبیہ نے دوڑ کر اسے سنبھالا اور اسے کمرے میں لے گئے۔

"میری اتنی پیاری بہن کا ظالم شخص نے کیا حال کر دیا۔" ثوبیہ نے روتے ہوئے کہا۔ "کاش کہ ابا' شاہ زیب کے گھر والوں سے جھوٹ نہ کہتے تو آج میری بہن بھی خوش و خرم زندگی گزار رہی ہوتی۔"

میں نے آنسو بھری آنکھوں سے ثوبیہ کو اشارہ کیا۔ کمرے کے دروازے پر ظہیر اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ موجود تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ ثوبیہ کا یہ جملہ کہیں اس نے سن نہ لیا ہو۔ اس کے بعد وہ نجانے میری پھول جیسی بچی کا کیا حشر کرے گا۔

کچھ دیر وہاں ٹھہرنے کے بعد ہم لوگ واپس آ گئے لیکن میرا دل کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ بار بار ثانیہ کی مرجھائی صورت میری نگاہوں کے سامنے آ جاتی تھی۔ "میرا کیا قصور تھا امی؟" وہ سوال کرتی۔

اس روز صبح سے ہی میرا دل بہت پریشان تھا۔ اس بے چینی میں رات بھی آ گئی۔ میں بستر پر لیٹی کروٹیں بدل رہی تھی۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بار بار کتوں کا بھونکنا' جھینگروں کی آوازیں اور وقفے وقفے سے بجنے والی چوکیدار کی سیٹی یہ سب رات کے سناٹے کو توڑ رہی تھیں۔

تب اچانک موبائل نے بجنا شروع کر دیا۔ رات کے اس پہر کس کا فون ہوگا۔ یا اللہ رحم کرنا! میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اسکرین پر ظہیر کا نمبر چمک رہا تھا۔

"ہیلو۔" میں نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا۔

"آپ جلدی سے گھر آ جائیں۔" ثانیہ کی نند کی آواز آئی۔

"کیوں کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"بس آپ آ جائیں۔" میں نے جابر کو نیند سے جگایا۔

"کوئی کارنامہ کیا ہوگا تمہاری بیٹی نے۔" پریشانی کے عالم میں بھی وہ شخص بک بک جھک جھک میں مصروف رہا۔

ہم ٹیکسی کر کے جلدی جلدی ثانیہ کے گھر پہنچے۔

گھر کے باہر پولیس دیکھ کر میری تو گویا جان نکل گئی تھا۔ اندر پہنچی تو ثانیہ کی نند مجھ سے لپٹ گئی۔

"مار ڈالا ظالموں نے ہماری اتنی پیاری بھابی کو۔" ان سب نے مل کر واویلا کرنا شروع کر دیا۔

میرا سر چکرانے لگا۔ "میری بچی......"

مجھے بتایا گیا کہ ظہیر گھر پر نہیں تھا۔ ڈاکوؤں نے گھر میں گھس کے ثانیہ کے ہاتھ پاؤں باندھ کر تیز دھار آلے سے اسے ذبح کر دیا تھا۔ جس کے بعد ملزمان باآسانی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

ہم پر تو جیسے قیامت ہی ٹوٹ پڑی۔

"یہ یقیناً اس کمینے شخص کی حرکت ہے۔" میرے بیٹوں نے چیخنا شروع کر دیا۔

حادثات کا ہماری زندگی کے اتار چڑھاؤ میں اہم کردار ہوتا ہے اور بعض حالات و حادثات انسانی زندگی کو بدل کر رکھ دیتے ہیں۔

"ڈاکو آئے اور صرف ثانیہ کو قتل کر کے چلے گئے سارا سامان جوں کا توں موجود ہے' یہ یقیناً اسی شخص کی حرکت ہے۔" یہ جابر تھے۔ بیٹی کے درد نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں۔

پولیس نے شک کی بنیاد پر ظہیر کو حراست میں لے لیا تھا۔

چند حقیقتیں اس قدر تلخ ہوتی ہیں کہ انسان سوچ بھی نہیں سکتا کہ انسانوں کے اس معاشرے میں لوگ ایسے بھی اپنے ضمیر کو گہری نیند سلا دیتے ہیں۔

ظہیر نے دوران تفتیش کیس کو نیا رنگ دینے کی کوشش کی اس نے میری معصوم بیٹی پر الزام لگایا کہ اس کا چکر کسی دوسرے آدمی سے چل رہا تھا اور یہ معلوم ہونے پر اس نے طیش میں آ کر یہ حرکت کی ہے۔

وہ گویا اس طرح سزا سے بچنا چاہ رہا تھا لیکن محلے والوں کی گواہی اور ثانیہ کے جسم پر موجود تشدد کے نشانات نے ہمارا کیس مضبوط کر دیا تھا اور پوسٹ مارٹم کی اس رپورٹ نے کہ ثوبیہ کو ابھی تک بیوی کا حق نہیں ملا تھا۔ میرا دل ہلا کر رکھ دیا تھا۔

میری بیٹی یہ اذیت بھی سہہ رہی تھی اور آج تک ثوبیہ یا مجھ سے اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا۔

کیس ابھی چل رہا ہے۔ سارے شواہد اور ثبوت ہمارے حق میں ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ثانیہ کا صبر رنگ لائے گا۔

☆☆......☆☆

ساتویں سچ بیانی

جیون کا کھیل

تمثیلہ زاہد

ایک دوشیزہ کی عبرت ساماں تحریر کراچی سے

آج اتنے سالوں بعد جب پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو صرف رسوائیاں ہی پیچھا کرتی نظر آتی ہیں، یہ رسوائیاں تو میں نے اپنے مقدر میں اس دن خود ہی اپنے ہاتھوں سے لکھ ڈالی تھیں جب اپنے گھر کی چاردیواری سے پہلا قدم باہر نکالا تھا۔ غربت کا بھیانک عفریت مجھے تنگ کرتا تھا۔ رات کے اندھیرے سے مجھے سخت نفرت تھی۔ دن کا اجالا، نئی نئی روشنیاں اور چمکتے دمکتے ستارے اچھے لگتے تھے۔

خواہشوں اور خوابوں کے گھوڑے پر سوار اگر کوئی کم سن، راستوں سے ناآشنا اور ناسمجھ ہو تو کسی نہ کسی مقام پر یہ دوڑتا گھوڑا ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گرتا ہے اور سوار بھی اوندھے منہ گر کر زمین چاٹنے لگتا ہے۔

میں بھی ایسے ہی گھوڑے پر سوار وہ کم سن دوشیزہ تھی جو خواہشوں کے حصول کی خاطر اس قدر بھاگی اور اتنی دور نکل آئی کہ اب مڑ کر دیکھنے پر سوائے اندھیرے کے، کچھ نظر نہیں آتا۔

سنا ہے زہر دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو پل بھر میں جسم کی رگ رگ میں سرایت کر جاتا ہے اور جسم کو روح سے آزاد کر دیتا ہے، دوسرا زہر سلو پوائزن ہوتا ہے، وہ جسم میں سرایت تو کرتا ہے مگر دھیرے دھیرے، لمحہ لمحہ اذیت دے کر جان لیتا ہے، میں بھی ایسے ہی زہر کا شکار بنی۔

یہ میٹھا زہر شروع شروع میں امرت کی طرح تھا لیکن آہستہ آہستہ جب یہ زہر میرے جسم میں لہو بن کر نس نس میں دوڑنے لگا، تب مجھے اس کی ہلاکت خیزی کا احساس ہوا۔ یہ احساس شدید تکلیف کا تھا۔ ایک ایسی اذیت جس میں پل پل کا سسکنا موت سے بھی بدتر تھا مگر افسوس، اب بہت دیر ہو چکی ہے، سوائے تڑپنے، سسکنے کے، کچھ نہیں ہو سکتا۔

میری پیدائش پر اماں ابا کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی تھی۔ پانچ بیٹیوں کے بعد ابا کو پوری امید تھی کہ اس بار اُن کے نصیب میں نعمت ہی ہوگی۔ ہر سال رحمت کے رُوپ میں پانچ رحمتیں نہ چاہتے ہوئے گھر میں نازل ہو گئی تھیں۔ دن گزرتے رہے، جوں جوں اماں کی ڈلیوری کے دن قریب آتے گئے، ابا کی بے چینی و بے قراری میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ انہیں کامل یقین تھا کہ اس دفعہ نتیجہ اچھا اور اُن کے حق میں ہوگا، پھر وہ دن بھی آ گیا مگر جب اماں نے میری صورت میں ایک اور بیٹی کو جنم دیا تو ابا مایوسیوں کے اندھیرے میں ڈوب گئے۔ وہ روز بہ روز



چڑچڑے رہنے لگے۔

میں نے سنا تھا کہ تین ماہ تک ابا نے میری شکل تک نہ دیکھی تھی۔ اماں بھی سسکتی اور کڑھتی رہتی تھیں۔ میرا ننھا وجود جب بھوک کے مارے بلکتا تو وہ کئی ہاتھ میرے چہرے پر جڑ دیتیں اور میں گلا پھاڑ کر رونے لگتی اور اماں، ابا کے عتاب کا یونہی نشانہ بنتی رہتی، پھر اسی بھوکے شکم کے ساتھ سو جاتی۔

یہ تمام باتیں مجھے بہت بعد میں معلوم ہوئی تھیں۔ ابا کی پرچون کی دکان تھی جو کرائے کی تھی۔ کئی سالوں سے ابا ذاتی دکان کے حصول کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے لیکن کوئی سبب نہیں بن پا رہا تھا۔ کرائے کی مد میں ابا کی آمدنی سے کئی ہزار یونہی نکل جاتے، تاہم میری پیدائش کے تین ماہ بعد ابا اچانک ہی اپنی دکان کے مالک بن بیٹھے۔ کرائے کی جو دکان وہ چلاتے تھے، مالک اُن ہی کو بیچ کر جا چکا تھا۔ دکان اپنی ہوئی تو ابا نے اُس میں مزید چیزوں کا اضافہ کر لیا۔ محلے میں ایک ہی پرچون کی دکان تھی جس سے سارا محلہ راشن لیتا تھا۔ اب ابا کی دکان سے لوگوں کو سہولت میسر ہو گئی۔ جو رش ایک دکان پر رہتا، اب بٹ گیا تھا۔

جس روز ابا کو دکان ملی، وہ گھر آتے ہی مجھے گود میں لیتے ہوئے بولے۔ ”میری یہ بیٹی بختیار ہے، بھاگاں والی، نصیباں والی۔“

ابا کی بات سن کر اماں حیرت میں ڈوب گئیں، تب میرا نام ”بختیار“ رکھا گیا۔ میرے پیدا ہوتے ہی نہ صرف ابا کی دکان کو ترقی ملی بلکہ میرے بعد تین بھائیوں کی پیدائش نے میرے ”نصیبوں والی“ ٹیگ پر مہر لگا دی تھی۔

میں بے حد لاڈ میں پلنے لگی۔ ابا مجھے بیٹوں سے بڑھ کر چاہتے تھے۔ میرا رُوپ رنگ بھی تمام بہنوں میں سب سے جدا نکلا تھا۔ ہلکے سنہری بالوں پر دمکتی رنگت اور بھوری بڑی بڑی آنکھوں کی معصومیت سب ہی کی توجہ کا مرکز بنتی۔ ابا پیار سے مجھے شہزادی کہتے۔ بہنوں میں سب ہی میٹرک پاس تھیں مگر مجھے پڑھائی سے دلچسپی نہ تھی۔ ہر بار جب فیل ہونا میری قسمت میں تھا تو مجھے اسکول جانے سے ہٹا دیا گیا۔ میں نے پانچویں تک بہ مشکل رو رو کر پڑھا تھا۔ ابا کی خواہش تھی کہ میں اعلیٰ تعلیم

حاصل کروں لیکن تعلیم میں میری عدم توجہی پر وہ چپ ہوگئے اور یوں اسکول سے ہمیشہ کے لیے میری جان چھوٹ گئی۔ تعلیم چھوڑنے پر میری بہنوں نے مجھے خوب کوسا تھا۔

"ہمیں ابا آگے پڑھنے نہیں دیتے اور جسے شوق ہی نہیں اُسے اپنے نخروں ہی سے فرصت نہیں۔" ایک بہن تنک کر بولی تھی۔

بچپن ہی سے مجھے فیشن میگزین اچھے لگتے تھے اور میں ان ماڈلز کی طرح بننے کی کوشش کرتی تھی جن کی نیم عریاں تصویریں میگزین میں چھپی ہوتی تھیں۔

اماں مجھے خوب لتاڑتی تھیں۔ "بے غیرت' یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ شکل دیکھ آئینے میں جا کر' منہ دھو کے آ' اس لیپا پوتی کو اچھی طرح صاف کر' کب سے آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر تماشا کر رہی ہے۔ تیرا باپ آنے ہی والا ہوگا۔"

میں جو ایک میگزین کی ماڈل کے نیم عریاں لباس کی تقلید کرتے ہوئے آئینے کے سامنے اپنے پاس موجود میک اپ کے سامان سے بڑے انہماک سے خود کو سنوارنے میں مصروف تھی اور ساتھ ہی ماڈل کی طرح مٹک مٹک کر' خود کو دیکھ کر لطف اندوز ہو رہی تھی کہ جانے کہاں سے اماں نے آ کر لتاڑا۔

میرے ہاتھ سے میگزین چھین کر وہ اونچی آواز میں چلانے لگی تھیں اور ساتھ ہی فیشن میگزین کے کئی ٹکڑے کر دیے۔ اماں کے جانے کے بعد میں بہتے آنسوؤں کے ساتھ میگزین کے پرزوں کو دیکھنے لگی۔ کتنی محنت سے میں نے اپنی سہیلی شبنم کو پیسے دے کر یہ میگزین منگوایا تھا۔ محلے میں رہنے والی شبنم کے گھر میرا آنا جانا تھا۔ وہ بھی میرے گھر آتی تھی۔ ہم دونوں ردی کی دکان سے لائے ہوئے فیشن میگزین مزے لے لے کر دیکھتے تھے' ایک ایک ماڈل پر تبصرہ ہوتا' ان کے میک اپ' کپڑوں اور جیولری کا تجزیہ ہوتا۔

"ہائے اللہ! بختیار' دیکھ تو سہی' کتنا سوہنا جوڑا ہے اور یہ جھمکے تو دیکھ۔" شبنم ایک حسرت سے کہتی۔

"نصیب والی ہیں یہ لوگ جو ایک سے ایک کپڑے' جوتے پہنتی ہیں۔ ہمیں تو عید پر بھی ایسا جوڑا نصیب نہیں۔" ہمیشہ کی طرح قسمت سے خائف میری زبان شکوہ کناں رہتی۔

ایک دن حسب معمول میں شبنم کے گھر گئی تو اُس کا چہرہ دیکھ کر میں ٹھٹکی' وہ بے تحاشا گھبرائی ہوئی تھی' وہ جلدی سے مجھے ایک کمرے میں لے گئی اور کمرے کے دروازے کی کنڈی اندر سے لگا دی۔

"کیا ہوا شبو! خیر تو ہے؟"

"سب خیریت ہے' بس تجھے کچھ دکھانا ہے۔" شبنم اپنی سانس بحال کرتے ہوئے بولی پھر اخبار کے ایک ڈھیر میں چھپا ایک میگزین نکال کر میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔ "میں آج گئی تھی اسی ردی والے کی دکان پر' ردی والے نے ایک نیا لڑکا کام پر رکھا ہے۔ اس نے مجھے یہ میگزین دے کر کہا کہ وہ ہمیں کئی روز سے فیشن کے میگزین لیتے دیکھ رہا ہے۔ وہ کئی ایسی ایجنسیوں کو جانتا ہے جو نئی لڑکیوں کو ماڈلنگ سکھاتے ہیں۔ کہہ رہا تھا' اس میں بہت پیسا ہے۔ یہ پرچی دی ہے اس نے۔ کہہ رہا تھا' اگر راضی ہو تو اس جگہ پر کل انتظار کرے گا۔"

میں نے وہ پرچی کھولی تو اس میں محلے سے دور ایک پارک کا پتا اور وقت لکھا تھا۔ میں کچھ سوچنے لگی۔ میری عمر اُس وقت اٹھارہ سال تھی۔ مجھے اپنے خوابوں کو حقیقت بنانے کا ایک سنہرا موقع ہاتھ آ رہا تھا۔ اندر ہی اندر خوشی سے میرا دل مچلنے لگا لیکن اس کے ساتھ ایک خوف بھی دماغ پر سوار تھا۔

"اماں' ابا یہ کام کبھی نہیں کرنے دیں گے۔ جان سے ہی مار ڈالیں گے۔" میرا خوف شبنم کی زبان سے ادا ہوا۔ میرے سر پر مشہور ہونے اور دولت مند بننے کا بھوت سوار تھا' دولت ہر عیب پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ میں کم پڑھی لکھی تھی لیکن دماغ ایسی باتوں کے لیے تیز تھا۔

'دولت جب میرے قدم چومے گی تو سارے رشتے میرے قدموں میں ہوں گے۔' میں نے سوچا۔ میں یہ موقع گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ اپنی قسمت کو ایک بار آزمانے کی خاطر میں نے ڈرپوک سی شبنم کو راضی کر لیا۔ وہ ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔

اگلے روز مقررہ وقت پر ہم دونوں ہی اپنے اپنے گھروں سے بازار جانے کا بہانہ کر کے نکلے تھے۔ مقررہ جگہ پر پہنچے تو وہ لڑکا پہلے ہی ہمارا منتظر تھا۔ وہ ایک گاڑی میں آیا تھا جس میں ہمیں بٹھا کر وہ ایک ایجنسی لے گیا۔

ہم دونوں ایک شاندار آفس میں داخل ہوئے۔ اے سی کی کولنگ کے باوجود ہمارے وجود ٹھنڈے پسینے سے شرابور تھے۔ انجانا خوف ہم پر سوار تھا۔ ریسپشن پر بیٹھی لڑکی فون پر کچھ بات کرنے کے بعد ہمیں اندر جانے کا اشارہ کرنے لگی۔ ہم دونوں اس لڑکے کی ہمراہی میں بڑے سے روم میں داخل ہوئے۔

"سر' آپ کو نئی ماڈل لڑکیوں کی ضرورت تھی تو لے آیا ہوں۔" وہ لڑکا گول' شفاف میز کے پیچھے بیٹھے شخص سے بے تکلفی سے گویا ہوا۔

اُس شخص کی بے باک نظریں ہمارے وجود کا پوسٹ مارٹم کرنے لگیں۔ شبنم خوف کے مارے میرے پیچھے سمٹ گئی۔

"جی' مجھے ماڈل بننے کا شوق نہیں' اسے ہی ہے۔" شبنم نے مجھے آگے دھکیل دیا۔

کرسی میں دھنسا شخص بولا۔ "او کے' ان کا اسکرین ٹیسٹ لے لیتے ہیں۔"

"وہ کیا ہوتا ہے؟" میں نے معصومیت سے پوچھا۔

"اس سے معلوم ہو جائے گا کہ آپ کا چہرہ ماڈلنگ کے لیے موزوں ہے یا نہیں؟ آپ کے چند پوز لیے جائیں گے۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"اگر ہم فیل ہو گئے تو ہمیں گھر چھوڑ آؤ گے نا؟" شبنم جلدی سے بولی۔

وہ لڑکا شبنم کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے ہمیں ایک اور کمرے میں لے گیا جہاں میرے کئی پوز لیے گئے پھر کچھ ہی دیر میں رزلٹ سامنے تھا' میرا فریش' کم سن اور معصوم چہرہ ماڈلنگ کے لیے ہر لحاظ سے پرفیکٹ تھا۔ اس شخص نے میری تصویریں دیکھ کر کچھ ایسے تعریفی جملے کہے کہ میں خود کو آسمانوں میں اڑتا محسوس کرنے لگی۔ اس شخص نے کہا کہ تمہارے پاس سیل فون تو ہوگا؟ مجھے اپنا سیل نمبر دے دو اور ہماری کال کا انتظار کرنا۔

کچھ دیر میں ہم واپس آ گئے۔ میں نے ضد کر کے ابا سے ایک سیل فون منگوا لیا تھا حالانکہ میری کسی بہن کے پاس سیل فون نہیں تھا۔ گھر میں داخل ہوئی تو وہی معمول کا منظر سامنے تھا۔ وہی اماں کی چیخ پکار' اب مجھے اپنے گھر سے نفرت ہونے لگی۔ سارا گھر مجھے ایک گندگی کا ڈھیر لگ رہا تھا۔ اپنے گھر کے کچے صحن کو دیکھتے ہوئے میں نے ایک فیصلہ کیا کہ مجھے مسائل کے انبار سے پُر اس گھر سے نکلنا ہے' میں ان تنگ و تاریک گلیوں سے نکل کر کھلی فضا میں سانس لینا چاہتی تھی' آزاد ماحول مجھے اپنی جانب کھینچ رہا تھا۔

دو روز بعد اس شخص کی کال آ گئی۔ میں اس کے بتائے ہوئے پتے پر وقت مقررہ پر پہنچ گئی۔

"یہ لیجیے ایگریمنٹ کے پیپرز' تین ماہ کی ٹریننگ کے بعد آپ کو ہمارے لیے ایک سال تک ماڈلنگ کرنا ہوگی۔"

"سر' اگر ماڈل بننے پر میرے گھر والوں نے مجھے گھر سے نکال دیا تو میں کہاں جاؤں گی؟" میرا خدشہ زبان پر آ گیا۔

"یہ مسئلہ بھی حل کر دیں گے' بس آپ ہمارے ساتھ "کوآپریٹ" کرتی رہیں' ہم آپ کے مسائل حل کرتے رہیں گے۔ فکر کیوں کرتی ہیں' بڑا پیسا ہے اس کام میں۔" اس نے مسکراہٹ کے ساتھ میری مٹھی میں چابی تھمانا چاہی۔ میں نے گھبرا کر اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ چابی ٹیبل پر گری۔

"مس بختیار! گھبرائیں نہیں' یہ فلیٹ کی چابی ہے۔ آج سے وہ فلیٹ آپ کا ہوا۔ ایسے موقع بار بار نہیں ملتے' سوچ لو۔"

مگر میں گھبرا کر بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ گھر آ کر پھر وہی گھٹا گھٹا سا ماحول' اماں کی صلواتیں' بہنوں کی

بوائے اسکاؤٹ

بوائے اسکاؤٹ تحریک کا آغاز 29 جولائی 1907ء کو لارڈ بیڈن پاؤل نے برطانیہ میں براؤن سی کے مقام پر کیا۔ جس کا مقصد طلبہ اور نوجوانوں میں نظم و ضبط اور فرائض کی بجا آوری' خدمت اور اچھے شہری کی خصوصیات پیدا کرنا تھا۔

بے زاری اور مسائل کے انبار۔ میں جانتی تھی دولت ہر مسئلے کا حل ہے مگر دولت جائز طریقے سے حاصل نہیں ہو سکے گی پھر دولت پانے کی خواہش مجھ پر کچھ اس طرح حاوی ہوئی کہ میں اچھائی برائی کی تمیز کھو بیٹھی ویسے بھی میں ان حالات میں کسی شہزادے کی تمنا نہیں کر سکتی تھی۔ اگر میں اس زندگی کا انتخاب نہ کرتی تو میری زندگی بھی اماں کی طرح آدھے درجن بچے پالنے میں گزر جانا تھی۔

زندگی میں جن آسائشوں کی تمنا میں نے کی تھی وہ پانے کا یہ نادر موقع میں ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ ایک دن میں نے اپنی خواہش کا اظہار اماں سے کر دیا۔ میری بات سنتے ہی اماں نے ایک زناٹے دار تھپڑ میرے منہ پر جڑ دیا۔

''اماں! میں ماڈل بننا چاہتی ہوں اور لڑکیاں بھی کرتی ہیں پھر میں کیوں نہیں؟'' اماں کا تھپڑ کھانے کے باوجود میں نے اعتماد سے کہا تھا۔

''بے غیرت چلو بھر پانی میں ڈوب کے مر جا اسی دن کے لیے پیدا کیا تھا تجھے؟ تیرا باپ تیری بات سنے گا تو نہ جانے کیا حال کرے گا۔'' اماں نے روتے ہوئے واویلا کیا مگر اماں کا رونا پیٹنا مارنا اور دھمکی دینا وغیرہ کوئی بھی چیز مجھے میرے ارادوں سے باز نہ رکھ سکی۔

میں گھر کی دہلیز پھلانگ کر روشنیوں اور رنگوں کی اس چکا چوند دنیا میں جا پہنچی جو بظاہر تو چمک دمک سے بھرپور ہے مگر اندر سے انتہائی غلیظ تھی۔ یہاں میں نے اپنی عزت و عصمت کے عوض وہ کچھ حاصل کر لیا جو میں چاہتی تھی یوں بھی اس دنیا میں شرم و حیا اور عزت و عصمت نام کی چیزوں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ یہاں صرف عیش ہی عیش تھے اسی عیش پرستی میں میری زندگی کے بیس برس گزر گئے۔

آج میرے پاس دنیا کی ہر آسائش موجود ہے دولت شہرت اور معاشرے میں خاص مقام ہے میری جنبشِ ابرو سے بڑے بڑے کام لمحوں میں ہو جاتے ہیں کیونکہ سیاست و ریاست کے بظاہر معزز افراد میرے تلوے چاٹتے ہیں مگر ان سب کے باوجود میرا دامن حقیقی خوشیوں سے خالی ہے۔ میرے اندر ایسا اندھیرا ہے جسے یہ ظاہری چمک دمک دور نہیں کر سکتی کیوں کہ میں ایڈز کی مریضہ بن چکی ہوں۔

اس روز میں اپنی گاڑی میں کہیں جا رہی تھی کہ راستے میں ایک میڈیکل اسٹور پر میری نظر پڑی جہاں ایک شناسا چہرہ موجود تھا۔ میں گاڑی سے اتر کر اس عورت کے پاس گئی۔

''آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتی ہوں؟'' میں نے اس کے قریب جا کر پوچھا۔

''وہ...... دراصل میری امی کی طبیعت بہت خراب ہے میرے ابا کے انتقال کے بعد وہ بہت بیمار رہنے لگی ہیں۔ مجھے کچھ دواؤں کی ضرورت تھی کچھ پیسے کم پڑ رہے ہیں لیکن یہ صاحب دے نہیں رہے۔'' وہ نڈھال سے لہجے میں بولیں۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ میری آپا تھیں۔ حالات نے انہیں وقت سے پہلے ہی بوڑھا کر دیا تھا۔ میں نے خود کو کالی چادر میں چھپا لیا تھا اسی لیے وہ مجھے نہ پہچان سکیں پھر میں نے اپنے پرس سے چند نوٹ نکال کر آپا کو تھما دیے۔ وہ تشکر آمیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگیں جبکہ میں تیزی سے دکان سے نکل گئی۔

''میری والدہ آپ کو دُعائیں دیں گی۔'' آپا کی آواز میرے پیچھے گونج رہی تھی۔ میرے قدم مزید تیز ہو گئے اور میں بھاگ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

آپ کو میری بپتا جان کر ہرگز ترس نہیں آ رہا ہوگا۔ آنا بھی نہیں چاہیے۔ میری جیسی خود غرض لڑکیوں کا انجام یہی ہوتا ہے۔ خواہشیں بڑی ہوں یا چھوٹی اعتدال کی دیوار پھلانگ کر جنون کی شکل اختیار کرنے لگیں تو رسوا کر دیتی ہیں۔

اب مجھے صرف اپنی موت کا انتظار ہے جو دبے قدموں ایڈز کی شکل میں آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہی ہے۔ مجھے اس موت سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ البتہ مرنے سے پہلے ایک کام میں نے یہ کر دیا ہے کہ اپنی تمام دولت و جائیداد اپنے گھر والوں کے نام کر دی ہے شاید اسی طرح میرے گناہوں کا کفارہ ادا ہو جائے۔

......☆☆......

آٹھویں سچ بیانی

ایسا بھی ہوتا ہے

مور شاہد حسین

حب چوگی اسیلہ سے ایک پریم کہانی

گانوں سے شہر کا فاصلہ تقریباً پانچ کلو میٹر تھا، مگر بلاول کو خالہ سے بڑی انسیت تھی اور خاص طور پر خالہ کی دھی نازو سے، لہٰذا اُس کے لیے دس کلو میٹر کا فاصلہ معنی ہی نہیں رکھتا تھا اور وہ کم و بیش روز ہی خالہ کے گھر کا چکر لگا لیتا تھا۔

وہ قیامت کا سا دن تھا، کا کا نور دین کے گھر قیامت



صغریٰ کا منظر تھا۔ ایک کہرام مچا ہوا تھا، ماتم برپا تھا، خالہ نوراں اور خالہ امیراں پر غشی طاری تھا، بلاول کی بہنیں چیخ رہی تھیں۔ ہر آنکھ سے اشکوں کا سیلاب جاری تھا۔ گاؤں کے لوگ سناٹے میں آگئے تھے۔ ایسا سانحہ ان کے سامنے گاؤں میں پہلی بار رونما ہو رہا تھا۔ دل دہل کر رہ گئے تھے جب ایک ہی وقت کاکا نور دین کے گھر سے تین لاشیں، صحن میں رکھی تھیں۔

کاکا نور دین شہر سے دور ایک قصبے میں رہتے تھے، ان کی چار بیٹیاں اور اکلوتا بیٹا تھا۔ ان کی بیوی خالہ نوراں بچپن سے صوم وصلواۃ کی پابند تھیں۔

بلاول کی ایک خالہ شہر میں رہتی تھی۔ خالو سرکاری ملازم تھے اور شام کے وقت ایک سینٹر میں ٹیوشن پڑھاتے تھے۔

اُن دنوں نازو جوانی کی دہلیز کو چُھو رہی تھی، وہ اکلوتی اور لاڈلی ضرور تھی مگر مغرور ہرگز نہیں، اپنے والدین کے علاوہ رشتے داروں سے بھی محبت اور اپنائیت کا اظہار کرتی تھی۔ ان کی عزت کرتی، سارے خاندان میں اس کا نام تھا سارے اسے بہت محبت پیار دیتے تھے۔ بلاول جب بھی اپنی خالہ کے گھر آتا وہ اسے چائے پیے بغیر جانے نہیں دیتے تھے۔ نازو اپنے ہاتھوں سے چائے بناتی تھی، بلاول کو بھی نازو کے ہاتھوں کی چائے پینے کی عادت سی بن چکی تھی۔

ان ہی دنوں بلاول کے دل میں ایک میٹھا سا درد سر اٹھانے لگا۔ یہ جذبہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ ہر وقت نازو کو سوچتا رہتا، اس کے خیالوں میں کھویا رہتا۔ جب وہ اس کے سامنے آتی اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا اس کی باتیں اسے شہد سے میٹھی لگنے لگیں وہ چاہتا تھا بس نازو باتیں کرتی رہے اور میں سنتا رہوں۔ وہ اس کی آواز کے سحر میں کھو جاتا تھا۔ جب بھی اپنی خالہ کے گھر آتا اس کی نظر نازو پر ہی ٹکی رہتی تھی۔ خالہ نے بلاول کو کبھی چائے پیے بغیر جانے نہیں دیا اس کے آتے ہی چائے بنا کر لاتی، وہ تو جیسے اس کا عادی ہی بن چکا تھا۔ نازو کے ہاتھوں کی چائے پیے بغیر اُسے چین نہیں تھا وہ اسے دیکھتے ہی دیکھتے اس پر قربان جاتا اور اسے پانے کی دل ہی دل میں دعائیں مانگتا، رات کو جب اپنے بستر پر لیٹتا اس کے سامنے نازو کا خوب صورت چہرہ مسکراتا خیال بن کر اس کے خوابوں پر چھا جاتا۔ وہ گڑگڑا کر خدا سے اس کا ساتھ مانگتا۔ بلاول کی زندگی نازو کی محبت میں خوش گوار گزرنے لگی۔ دوسری طرف نازو کے دل میں بھی انوکھا جذبہ بیدار ہو گیا تھا، بلاول بھی اسے اچھا لگنے لگا تھا وہ اس کے خیالوں میں گم صم رہنے لگی تھی۔

دونوں پریمی ایک دوسرے سے شدید محبت کرنے لگے۔ مگر اپنی محبت کا اظہار کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی اور دوسری طرف نازو کا بھی یہی حال تھا اسے بھی بھی حوصلہ نہیں ہوا کہ اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کر سکے۔

دن بدن وہ ایک دوسرے کے لیے بے تاب رہنے لگے۔ بلاول کو تو ایک پل بھی قرار نہیں ہوتا تھا جب دیکھو نازو کی باتوں کو دہراتا رہتا۔

اس کا ایک ماموں زاد دوست سلمان تھا، ان کی دوستی مثالی تھی۔ وہ اکثر سلمان سے نازو کی محبت کا تذکرہ کرتا رہتا، اس نے ہمت کر کے اپنی محبت کا اظہار کرنے کا ہی مشورہ دیا تھا۔

بلاول حسب معمول شام کو نازو کے گھر جاتا مگر اسے خالہ کی موجودگی مار دیتی تھی۔ اگر خوش قسمتی سے اسے کبھی نازو سے اکیلے میں ملنے کا موقع ملتا تو اسے اپنی ساری ہمت کھوکھلی نظر آتی۔ وہ کئی بار اظہار محبت کرتے کرتے موضوع بدل لیتا شاید اُسے نازو کی طرف سے انکار کا ڈر تھا جو اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔

دن یوں ہی گزر رہے تھے، دونوں پریمیوں کے دلوں میں محبت کے سمندر موجزن تھے۔ اب وہ صرف کسی موقع کی تلاش میں تھے کہ موقع ملتے ہی اپنی محبت کا اظہار کر دیں۔ خدا کی قدرت کہ انہی دنوں میں سلمان کے بھائی کی شادی تھی۔ سلمان بلاول کو ہمت اور حوصلہ سے اپنی محبت کا اظہار کرنے کے روز بروز مختلف مشورے دیتا رہا آخر وہ شادی کا دن بھی آن پہنچا۔

شام ڈھل چکی تھی ڈھولک پر ناچ گانا اپنے عروج پر تھا۔ سب موج مستی میں مگن تھے مگر نازو کی نظریں اپنے محبوب کے تعاقب میں تھیں۔ وہ ہر چہرے کو غور سے دیکھتی کہ کہیں سے اسے اپنا محبوب نظر آجائے۔ وہ انہی خیالوں میں گم تھی کہ اچانک اسے کسی کی آواز نے چونکا دیا۔

''نازو!'' وہ چونک کر اِدھر سے اُدھر دیکھنے لگی یہ آواز تو اس کے بلاول کی تھی مگر اُسے وہ جھلک نظر نہیں آئی جس کی وہ پیاسی تھی۔ وہ بے قابو ہو کر سیڑھیاں اترنے لگی کہ ایک آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

''نازو۔'' یہ آواز چھت کی طرف سے آئی تھی۔ اس نے مڑ کر اپنی نظریں چھت کی طرف دوڑائیں، سامنے کیا دیکھتی اسے اپنا محبوب بلاول مسکراتا ہوا نظر آیا، اس کی اس مسکراہٹ نے پہلے ہی اسے گھائل کر دیا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ بلاول نے نازو کو اوپر آنے کا اشارہ کیا، وہ تو اسی حکم کی منتظر تھی۔ اب وہ ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ نازو کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

''نازو! جب میں تمہیں دیکھتا ہوں میرا دل بے قابو ہو جاتا ہے، خود کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ میری ہر سوچ، میرے ہر خیال میں تم ہی بستی ہو، نازو برا نہیں ماننا۔'' بلاول نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔ ''مجھے تم سے پیار ہو گیا ہے۔'' نازو کسی گہری سوچ میں گم ہو گئی تھی۔

''نازو، تم سن رہی ہو ناں میں کیا کہہ رہا ہوں۔'' وہ چونکی وہ تو خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ جس کے لیے وہ بے تاب تھی آج اس محبوب نے اپنی محبت کا خود ہی اظہار کر دیا۔ وہ دل ہی دل میں خدا کو سجود کرنے لگی۔

''نازو بتاؤ ناں تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے ناں۔'' بلاول بے قرار ہو کر بولا۔

''بھلا مجھے کیوں اعتراض ہوگا۔'' نازو نے شرماتے ہوئے کہا۔ وہ خوشی کے مارے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر اپنی محبت کا دنیا بھر میں اظہار کرے مگر یہ ناممکن تھا۔ کیوں کہ وہ دنیا سے واقف تھی۔ پیار کرنے کی خوب سزا ملتی ہے اور بدنامی بھی اپنا گھر کر جاتی ہے۔ نازو نے اپنے محبوب سے لپٹ کر اپنی محبت کا اظہار کیا، وہ دونوں عجیب سی کیفیت سے گزر رہے تھے۔ ان کے جسم میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔

کافی دیر وہ ایک دوسرے میں کھوئے رہے۔ وہ وقت اور حالات سے بے گانا ہو گئے تھے۔ اچانک نازو اپنے محبوب بلاول سے الگ ہو کر دو چار قدم ہٹ گئی۔

''کک کیا ہوا نازو۔'' بلاول بوکھلا کر بولا۔ ''ناراض ہو گئی کیا؟''

''کوئی آرہا ہے۔'' نازو نے بہت ہی دھیمے سے لہجے میں کہا۔ ''تم چلے جاؤ۔''

''کوئی نہیں ہے۔ یہ تمہارا وہم ہے۔'' بلاول نے نازو کو کلائی سے پکڑ کر اپنی طرف زور سے کھینچا۔

''آہ!'' وہ دھیمے سے چیخی۔ اس نے اپنا سر بلاول کے کاندھے پر رکھ دیا وہ اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیر رہا تھا کہ سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز دونوں کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ گھبرا کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ نازو سیڑھیوں کی طرف دوڑی جب کہ بلاول اندھیرے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

''نازو تم یہاں ہو۔'' بلاول کی بہن نے اسے کہا۔ ''تمہیں سب نیچے ڈھونڈ رہے ہیں۔'' اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اسے اپنے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ وہ ڈر کر سہم گئی اور بوکھلا کر بولی۔

''امی کہاں ہیں۔'' اس کے قدموں میں لرزش آگئی۔

''خالہ تو گھر چلی گئی ہیں۔'' بلاول کی بہن نے اسے بتایا کہ خالو کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔

''کیا؟ کب؟ کیسے؟ ابو کہاں ہیں ابھی۔'' نازو نے ایک دم بہت سے سوال کیے۔ اب وہ سیڑھیوں سے نیچے اتر آئی تھی۔

''نازو بیٹا کہاں تھیں تم۔'' خالہ نے اسے گلے لگایا تو وہ رونے لگی۔

''مجھے ابو کے پاس جانا ہے۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔

''بیٹا خدا نے خیر کی ہے۔ تمہارے ابو بالکل ٹھیک ہیں۔ اب وہ اپنے گھر پر ہیں، میں ابھی ان سے مل کر آرہا ہوں۔'' خالو نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

سب نے اسے دلاسے دیے مگر وہ روئے جا رہی تھی۔ سسکیاں بھرنے لگی اس کے آنسو کسی قیمت نہیں رُک رہے تھے۔ سب کے دلاسے تسلیاں اسے جھوٹی لگ رہی تھیں۔ وہ ہر حال میں اپنے ابو سے ملنا چاہتی

تھی۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ گاؤں سے شہر تک ایک سنسان رستہ تھا، وہ رستہ کسی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اب سارے پریشان تھے کہ ایسے حالات میں کیا کیا جائے نازو بلک بلک کر رو رہی تھی، اس کے آنسو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے جو بلاول سے ناقابل برداشت تھا۔ نازو کی سسکیاں اُس کے دل کو کاٹ رہی تھیں۔ اس نے چپکے سے سلمان سے مشورہ کیا کہ ہم دونوں نازو کو اس کے گھر چھوڑ آتے ہیں۔

بلاول کے کہنے کی دیر تھی کہ سلمان بائیک لے آیا انہیں جس راستے سے جانا تھا وہ سنسان ہونے کے ساتھ خطرناک بھی تھا۔

بڑوں نے انہیں بہت سی دعاؤں اور نصیحتوں سے رخصت کیا۔ سلمان بائیک چلانے لگا، اس کے ساتھ بلاول بیٹھا اور پھر نازو اپنے محبوب کے کاندھے کو مضبوطی سے پکڑ کر بیٹھ گئی جیسے کوئی طوفان آنے والا ہو اور وہ اس میں اُڑ نہ جائے۔

وہ خیر وعافیت سے گھر پہنچے تھے، نازو کے ابو بالکل ٹھیک تھے بس انہیں معمولی سی چوٹیں آئی تھیں۔ ابو کو دیکھ کر اسے اطمینان ہوا اور اُس نے سُکھ کا سانس لیا تھا۔ اُس رات بلاول اور سلمان وہیں رُکے تھے۔

☆......☆

بلاول اور نازو کی محبت میں روز بروز شدت آ رہی تھی، یوں ان کی زندگی خوشیوں کے ہنڈولے میں جھول رہی تھی کہ بلاول پر خالہ امیراں کی بڑی بیٹی نادیہ مرمٹی۔

گرمیوں میں اکثر بلاول رات کو اپنے گھر کی چھت پر سوتا تھا۔ اُس رات بھی وہ حسب عادت سویا ہوا تھا کہ سب کی نظر سے بچا نادیہ چھت پر آ گئی۔ بلاول گہری نیند میں تھا وہ اس کے ساتھ چارپائی پر لیٹ گئی۔ اس نے اپنا سر بلاول کے سینے پر رکھا اور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔ اچانک بلاول کی آنکھ کھلی وہ ہکا بکا رہ گیا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" بلاول نے چونکتے ہوئے کہا۔ "اگر کسی نے دیکھ لیا تو انجام کیا ہوگا؟"

"بلاول میں تم سے بے پناہ محبت کرتی ہوں۔" نادیہ نے اپنی محبت کا بے اختیار اظہار کر دیا اور اس کو اپنی بانہوں میں جکڑنے کی کوشش کی مگر بلاول نے اسے ناکام کر دیا۔

"تم پاگل ہو گئی ہو کیا؟" بلاول نے اسے پرے دھکیل دیا۔

"بلاول میرا یقین کرو۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔" نادیہ نے اپنی محبت کا یقین دلانے کی کوشش کی۔ "میں تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے، میرے بارے میں سوچنا تک نہیں یہاں سے جلدی جاؤ۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو شامت آ جائے گی۔" بلاول نے اسے سیڑھیوں کی طرف دھکیل دیا۔

"میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی۔" نادیہ نے التجا کی۔ "پلیز بلاول مت ٹھکراؤ مجھے۔"

"میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں۔" بلاول نے کہا۔ "وہ میری زندگی ہے۔"

"تمہاری زندگی میں کوئی اور آئے میں یہ بالکل برداشت نہیں کروں گی۔" نادیہ والہانہ انداز میں بولی۔ "تم میرے ہو صرف میرے۔"

"خدا نبی کے واسطے یہاں سے چلی جاؤ۔" بلاول نے مجبور ہو کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا گاؤں کا معمول ہے، اگر کسی کو ذرا بھی شک ہو گیا تو نہ جانے کیا کیا الزام سر اٹھانے پڑیں گے۔ اور زیادہ تو اسے اپنے پیار کی فکری تھی کہ وہ نازو کا سامنا کیسے کر سکے گا۔

نادیہ شکستہ قدموں سے واپس آ کر اپنے کمرے میں بے اختیار رونے لگی۔ زندگی میں پہلی بار اسے شکست ملی تھی۔ اس کی آنکھوں سے گرما گرم آنسو پلکوں سے ہو کر برسات کی مانند برس رہے تھے۔ اس نے بلاول سے بڑی امیدیں واسطہ کر رکھی تھیں مگر آج اس نے ٹھکرا دیا۔ یہ اس کے لیے سب سے بڑا صدمہ تھا۔ وہ ہر سوچ ہر خیال میں بلاول کو اپنے ساتھ ساتھ رکھتی تھی مگر وہ تو کسی اور پر قربان تھا۔ نادیہ یہ کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ وہ کافی دیر تک روتی سسکتی رہی۔ نہ جانے پھر کب نیند کی دیوی اس پر قربان ہوئی۔

☆......☆

نادیہ دن بدن بلاول کی طرف کھنچی چلی جا رہی تھی۔ اسے پانے کی ہر کوشش کر رہی تھی، اسے دیوانوں کی طرح چاہنے لگی۔ اس کی زندگی کا مقصد بلاول ہی رہ گیا تھا۔ وہ اسے کسی قیمت کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کھانا پینا اور سونا بھی کم کر دیا تھا۔

نیند تو اس کی آنکھوں سے کوسوں دور ہو گئی تھی وہ ہر وقت بلاول کے خیالوں میں کھوئی رہتی یوں اس کی ہم سفر بن جاتی تھی۔ وہ جب بھی اسے ملتا اس سے اپنی محبت کا اظہار کرتی، وعدے کرتی۔ قسمیں کھاتی، اسے اپنی محبت کا یقین دلاتی مگر وہ ہر بار اسے ٹھکرا دیتا۔ نادیہ اس غم، درد، دکھ سے نڈھال ہو چکی تھی۔ وہ اکثر بلاول کو خط لکھتی اور جوابی خط کی شدت سے منتظر رہتی، مگر بلاول نے کبھی بھی اپنائیت کا اظہار نہیں کیا۔ "میری زندگی میں کوئی اور ہے۔" ہمیشہ یہی کہہ کر اسے ٹھکرا دیا۔ بلاول کو نادیہ اچھی ضرور لگتی تھی، وہ اسے بھی پسند ضرور کرتا تھا مگر وہ نازو کی محبت میں مکمل طور پر گرفتار تھا۔ وہ جب نادیہ کے بارے میں سوچتا اسے نازو سے کیے وعدے، اس کی بے پناہ محبت کا احساس دلاتے یوں وہ نادیہ سے انکار کر دیتا۔

دن یوں ہی گزرتے رہے، بلاول اور نازو اپنی زندگی میں بشاش تھے دوسری طرف نادیہ بے تاب تھی، اسے ایک پل بھی قرار نہیں تھا وہ روز ایک نئی امید کا آغاز کرتی، بلاول کو اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کی دھمکیاں دیتی، مگر اس پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا تھا۔ آخر ایک روز بلاول اپنی خالہ کے گھر حسب معمول شام کے وقت جا رہا تھا کہ نادیہ نے اس کا رستہ روک لیا۔ نادیہ نے آج خودکشی کرنے کی دھمکی نہیں یقین دلایا۔ وہ اس کی روز بروز ایسی حرکتوں کا عادی ہو چکا تھا۔ اس دن بھی بلاول اس کی دیوانی کو بے نیازی سے دھکیل کر آگے چلا گیا۔

بلاول نازو کے گھر پہنچ گیا، وہاں کا کچھ ماحول عجیب تھا۔ گھر میں کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔ اس کی خالہ مہمانوں کے ساتھ بیٹھی تھی بس کمی تھی تو اس کی محبوبہ کی۔ اس کی نظریں اپنی نازو کی تعاقب میں تھیں۔ وہ مہمانوں سے ملا، خالہ سے پوچھنے پر اسے معلوم ہوا کہ نازو اپنے کمرے میں ہے۔ وہ اس کے کمرے کی طرف بڑھا تو نہ جانے کیوں اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ کمرے کے

اخبار میں پہلا سیاسی کارٹون

دنیا کے کسی بھی اخبار میں پہلا سیاسی کارٹون 9 مئی 1754ء کو شائع ہوا۔ اخبار کا نام پنسلوانیا گزٹ تھا۔ اس کا مدیر بینجمن فرینکلین تھا اور یہ کارٹون بھی اسی نے بنایا تھا اس کارٹون کا عنوان Join Or Die تھا اور اس سے امریکہ کی مختلف ریاستوں کو متحد ہو کر جدوجہد کرنے کی ترغیب دی گئی تھی۔

دروازے پر پہنچتے ہی نازو کی سسکیوں کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس نے ناچاہتے ہوئے بھی دروازہ کھولا۔ اس کی نازو موٹے موٹے آنسو بہا رہی تھی۔ وہ بلاول کو دیکھتے ہی اس سے لپٹ کر رونے لگی۔

"جان کیا ہوا؟ تم کیوں رو رہی ہو؟" بلاول نے بے تاب ہو کر نازو سے پوچھا۔

"خدا کے واسطے مجھے معاف کر دینا۔ میں بہت مجبور ہوں۔" نازو نے ہاتھ جوڑے۔

"بتاؤ ہوا کیا ہے؟" بلاول بے چین ہو گیا۔

"باہر جو مہمان آئے ہیں وہ میرے رشتے کے لیے آئے ہیں اور اس رشتے کے لیے مجھے صرف ہاں کرنی ہے۔" نازو سسکیوں کے درمیان بولی۔

"کیا؟ کیا کہہ رہی ہو تم۔" بلاول یہ سن کر دیوانہ وار بولا۔ "کہو کہ یہ سب جھوٹ ہے۔"

"یہی سچ ہے۔ میں نے تمہارے بارے میں امّی کو بتایا تھا مگر امی نے بتایا کہ میرے ابو میرا رشتہ اپنے رشتے داروں میں کرنا چاہتے ہیں۔ ابو کسی قیمت میرا رشتہ امی کے رشتے داروں میں دینے کو تیار نہیں ہیں۔ میں بہت مجبور ہوں۔ بس خدا کے واسطے مجھے معاف کر دینا۔" نازو کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

"نازو تم نے میرا سوچا ہے کہ میرا کیا ہوگا۔" بلاول رو دینے والا تھا۔ "میں تمہارے بغیر مر جاؤں گا۔"

"میں نے سُنا ہے نادیہ تم سے بے پناہ محبت کرتی

ہے، مگر تم ہر بار اسے ٹھکراتے رہے ہو۔ میں تمہاری محبت کبھی نہیں بھولوں گی مجھے امید ہے وہ تمہارے بہت خیال رکھے گی۔ اسے اپنا لو بلاول۔ بتاؤ ایسا کرو گے نا؟'' نازو نے اُمید اور محبت سے کہا۔

بلاول نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔ بھلا وہ اپنی محبوبہ کی بات کو کیسے ٹال سکتا تھا۔

بلاول نے وہاں سے واپس آتے ہی اپنی ڈائری اٹھائی اور پھر بیٹھا نادیہ کو خط لکھ رہا تھا جس کی تحریر یوں تھی۔

دل و جان!

السلام علیکم

میں اپنے سابق رویئے پر بہت شرمندہ ہوں۔ آج اس تحریر کے ذریعے دل کی گہرائیوں سے معذرت خواہ ہوں، اگر مجھے معافی کے قابل سمجھو تو معاف کر دینا۔ تم ہمیشہ مجھے اپنی محبت کے لیے التجائیں کرتی رہیں مگر میں خود غرض اس کے عوض تمہیں بے نیازی سے ٹھکراتا رہا۔ آج تمہاری محبت نے مجبور کر دیا ہے۔ میں تمہاری محبت پر فخر کرتا ہوں، تم سے التماس ہے کہ مجھے معاف کر دینا امید ہے تم معاف ضرور کرو گی۔

معافی کا طالب

تمہارا بلاول

بلاول نے ابھی یہ تحریر لکھی ہی تھی کہ بہت سوں کے چیخنے چلانے اور رونے کی آواز سنائی دی، وہ بھاگم بھاگ گھر کی طرف دوڑا۔ راستے میں ایک بچے نے اُسے نادیہ کا خط تھمایا اس نے اس خط کو نظر انداز کر کے ڈائری میں رکھ دیا۔ شور نے اس کا دماغ سن کر دیا تھا۔

جب وہ اپنے گھر پہنچا تو ان کے گھر میں کہرام مچا ہوا تھا، اس کی امی اور خالہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ اس کی بہنوں کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اڑوس پڑوس کے لوگ وہاں جمع تھے۔

''امی کیا ہوا ہے۔'' بلاول نے اپنی ماں سے پوچھا۔

''بیٹا تمہاری خالہ امیراں بیوہ ہو گئی ہے۔'' اس کی ماں نے اسے بتایا۔

''کیا! مگر کیسے؟'' وہ چیخا۔ ''چاچو تو بالکل ٹھیک تھے۔''

''بھیا نادیہ نے خودکشی کر لی تو چاچو یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے اور وہ بھی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔'' بلاول کو اس کی بہن نے بتایا۔

''نادیہ نے خودکشی کر لی!!'' بلاول نے دہرایا اور لڑکھڑا کر زمین پر منہ کے بل گرا، اس کے ہاتھ سے ڈائری گر پڑی اور ایک ایک ورق بکھر گیا۔ ان میں سے ایک ورق خون سے لال تھا۔ سلمان نے بلاول کو سہارا دیا اور وہ ورق اٹھایا جس پر خون سے یہ تحریر لکھی ہوئی تھی۔

بلاول جان!

میں ہمیشہ تم سے اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کرتی مگر تم نہ جانے کیوں ٹھکراتے رہے۔ میں نے کئی بار تمہیں خودکشی کرنے کی دھمکیاں بھی دی تھیں۔ ذرا سا بھی تم کو احساس نہیں ہوا۔ تم دن بدن خود غرض ہوتے جا رہے تھے، جو میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔ میں تو تم سے ایک پل کی دوری برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ تم مجھے اس دنیا میں نہیں ملے تو کوئی بات نہیں اُمید ہے اگلے جہاں میں ضرور ملو گے۔ تمہاری دوری اور بے رُخی مجھ سے بالکل بھی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ سو اس لیے میں آج اپنی زندگی کا خاتمہ کر کے تمہاری زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور جا رہی ہوں۔ جہاں سے واپسی ناممکن ہے۔''

تمہاری نادیہ

سلمان کی آنکھوں میں سمندر اُمڈ آیا، اس نے بلاول کی طرف دیکھا۔ اس کے ہوش اُڑ گئے، سر چکرانے لگا۔ بلاول بُت بن چکا تھا، اس کی روح پرواز کر چکی تھی وہ بھی نادیہ کے پاس جا چکا تھا۔ ماں بہنوں کی چیخیں اُسے سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ اس کا جسم لاش میں تبدیل ہو چکا تھا۔ سب کی آہیں سسکیاں چیخ و پکار آسمان کو چیر رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے زمین پر زلزلہ آیا ہو یا کوئی قیامت آئی ہو۔

دوسرے دن کاکا نوردین کے گھر سے اس کے بڑے بھائی، اکلوتے بیٹے اور بھتیجی کی تین میتیں نکلی تھیں۔ لوگ جنازہ نماز میں شامل ہوئے۔ جس نے بھی یہ سنگین خبر سنی اس کا دل دہل کر رہ گیا۔ کاکا نوردین نے بڑے بھائی کی قبر کے قدموں میں بیٹے اور بھتیجی کی قبر بنوائی۔ وہ تینوں تو ایک ہی دن مر گئے مگر کاکا نوردین کا خاندان اس صدمے سے روز جیتے ہیں اور روز مرتے ہیں۔

☆......☆

آتشِ جنوں

سلیم فاروقی

ایک شعلہ صفت نوجوان کی سرگزشت۔ وہ اپنے ملک سے غداروں کا نام و نشان مٹا دینا چاہتا تھا۔ اس معرکے میں اس نے اپنا سب کچھ ہار دیا لیکن حوصلہ نہیں ہارا

انتقام کے جوالہ مُکھی میں سب کچھ بھسم کر دینے کا
حوصلہ رکھنے والے نوجوان کی رُوداد کیسویں کڑی

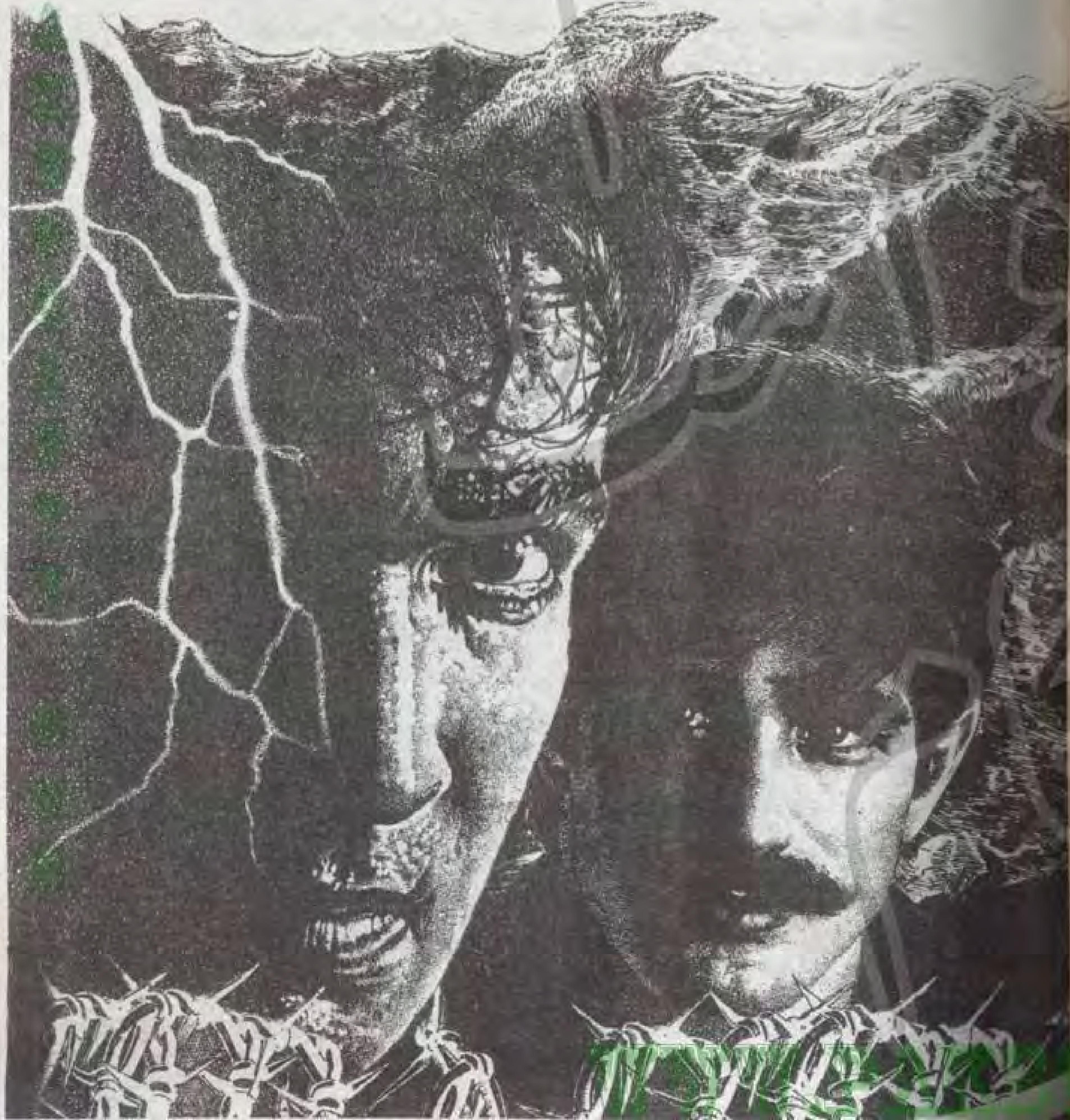
گزشتہ اقساط کا خلاصہ

عمران اور ارسلان دو بھائی ہیں' ایک دوسرے سے شدید محبت کرنے والے' نہایت جرأت مند اور اپنی عزت وانا کے لیے زمانے سے لڑ جانے والے...... ارسلان کچھ لاابالی ہونے کے ساتھ بہت زیادہ جذباتی بھی ہے جبکہ عمران بہت سمجھدار اور سوچ سمجھ کر فیصلے کرنے والا۔ عمران کا ایک دوست راشد ہے جس کی سمندر میں لانچیں چلتی ہیں۔ عمران اور ارسلان' راشد کی لانچ پر سمندر کی سیر کے لیے جاتے ہیں۔ سفر کے دوران میں اُن کا راشد کی لانچ پر کام کرنے والے ایک جرائم پیشہ ملازم غنی اور اس کے ساتھیوں سے جھگڑا ہوتا ہے۔ غنی' راشد کی لاعلمی میں اس کی لانچ کو غیر قانونی کام کے لیے استعمال کر رہا ہوتا ہے۔ راشد انہیں پولیس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس عمل کے بعد راشد کے پاس دھمکی آمیز فون آتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ غنی کسی بڑے جرائم پیشہ گروہ کا آلہ کار ہے۔ ایک روز راشد کے گھر پر جب عمران اور ارسلان بھی موجود ہوتے ہیں' اس جرائم پیشہ گروہ کے کچھ افراد حملہ آور ہوتے ہیں اور ان کا دونوں بھائیوں سے مقابلہ ہوتا ہے۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ راشد کے گھر حملہ کرنے والوں کا تعلق ایک ایرانی علی اکبر مشہدی سے ہے جو ایک بین الاقوامی گینگ کا ڈان ہے۔ پولیس کی آمد ہوتی ہے اور وہ ان مجرموں کے ساتھ عمران اور ارسلان کو بھی پولیس اسٹیشن لے جانا چاہتی ہے۔ ان کے درمیان تلخ کلامی ہوتی ہے اور راشد کے ایک اعلیٰ پولیس افسر سے رابطے کے باعث پولیس انہیں تھانے میں بیان ریکارڈ کرانے کا کہہ کر چلی جاتی ہے۔ دوسرے دن راشد کا مرڈر ہو جاتا ہے اور پھر مشہدی کے آدمی عمران اور ارسلان کی بہن شائستہ کو گھر سے اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔ دوسری طرف پولیس عمران کو تھانے لے جا کر شدید تشدد کا نشانہ بناتی ہے۔

تھانے میں عمران پر شدید تشدد کا سلسلہ جاری ہوتا ہے کہ ارسلان اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسے وہاں چھڑانے آ جاتا ہے اور آزاد کرا کے کسی نامعلوم مقام پر لے جاتا ہے۔ یہاں عمران کو ارسلان بتاتا ہے کہ ان کی بہن شائستہ کو مشہدی نے کراچی سے باہر کہیں منتقل کر دیا ہے۔ عمران جب گھر پہنچتا ہے تو اُس کے گھر والے خصوصاً چھوٹا بھائی عدنان اس کی حالت پر سخت پریشان ہو جاتا ہے۔ اسی دوران میں پولیس' عمران کے گھر پر ریڈ کرتی ہے اور اُس کے گھر سے ہیروئن برآمد کرتی ہے۔ عمران کی ماں کی اس صورتِ حال میں طبیعت بگڑتی ہے اور اُن کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

ستم یہ ہی نہیں ہوا کہ عمران کی والدہ کا انتقال ہوا' اُس کے والد بھی اِس غم کے باعث زندگی چھوڑ کر موت کے مہمان ہو گئے تھے۔ عمران اور ارسلان غم سے نڈھال تھے جبکہ ان کے چھوٹے بھائی عدنان پر تو سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ ماں باپ سے محرومی کے بعد اُن کی دہشت گردوں اور پولیس سے جنگ جاری ہوتی ہے کہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ' عدالت میں اُن کا کیس لڑنے والا بیرسٹر بھی پولیس کے ساتھ مل گیا ہے۔ ارسلان' بیرسٹر بخاری کو اغوا کر کے لے آتا ہے اور پھر ایک مقام سے اس کی لاش ملتی ہے۔ ایسے میں اُن کے پاس ان کی اغوا شدہ بہن شائستہ کا فون آتا ہے اور پھر انہیں اطلاع ملتی ہے کہ شائستہ نے خودکشی کر لی ہے...... عمران اور ارسلان اپنی بہن کے اغوا کار مشہدی سے اپنی بہن شائستہ کی ڈیڈ باڈی کا مطالبہ کرتے ہیں......



راستے میں تیمور اور عمران' شیر خان پر قابو پالیتے ہیں یہاں تک کہ وہ بابر خان کے پاس پہنچتے ہیں اور وہاں تیمور اچانک ریوالور نکال کر بابر خان کی کنپٹی پر رکھ دیتا ہے۔ بابر خان سکتے کی کیفیت میں تیمور کو دیکھنے لگتا ہے۔

فائلوں کے حصول کے بعد عمران اور تیمور گھر آتے ہیں تو اُن کے گھر پر بم سے حملہ ہو چکا تھا۔ اس حملے میں ان کا بھائی ارسلان بھی کام آجاتا ہے' اس کا کوئی پتا نہیں ملتا۔ یہ سب کچھ مشہدی نے کرایا تھا۔ جوابی وار کے طور پر عمران اور تیمور' مشہدی کے ایک قریبی ساتھی جان محمد کی دو بیٹیوں کو اغواء کر کے اسے اطلاع دیتے ہیں کہ وہ اُن کی بہن کے بارے میں بتائے ورنہ اُس کی بیٹیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

جان محمد کی بیٹیاں ندا اور حرا' عمران کو بھائی کہہ کر مخاطب کرتی ہیں تو وہ بھی جذباتی ہو کر انہیں بہن کا درجہ دے کر اُن کے گھر چھوڑ کر آنے کا وعدہ کرتا ہے۔ اسی دوران میں عمران کے بھائی عدنان کی آمد ہوتی ہے جسے وہ مُردہ تصور کر چکا تھا۔ آگے چل کر عمران' تیمور اور نادیہ اپنے دشمن بابر خان کو اغوا کرتے ہیں اور عمران اُسے معذور کر دینے کی دھمکی دیتے ہوئے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

دوسری طرف مشہدی تھا۔ نادیہ' عمران کو بتاتی ہے' اسے علم ہو گیا ہے کہ میں آپ کے ساتھ کام کر رہی ہوں۔ مشہدی کا دوبارہ فون آتا ہے اور وہ نادیہ کو جاب آفر کرتا ہے۔ نادیہ انکار کر دیتی ہے۔ جان محمد کا فون آتا ہے اور وہ عمران کو بتاتا ہے کہ وہ اب مشہدی کے ساتھ نہیں ہے۔ نادیہ اور عمران ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں۔ عدنان کی امریکہ روانگی کے انتظامات مکمل ہو جاتے ہیں مگر روانگی کے وقت اُسے روک لیا جاتا ہے کہ اُس کے پاس آتش گیر مادہ ہے۔ یہ اطلاع غلط ہوتی ہے لیکن عدنان کی فلائٹ مس ہو جاتی ہے۔ تیمور' عمران کو بتاتا ہے کہ یہ غنی بلوچ کی سازش تھی۔ گھر آتے ہیں تو نادیہ' عمران کو اپنی کہانی سناتی ہے۔ دوسرے دن تیمور' عمران کو لے کر لی مارکیٹ میں موجود مشہور بادشاہ ہوٹل جاتا ہے اور کاؤنٹر پر جا کر غلام رسول کے بارے میں معلوم کرتا ہے۔

غلام رسول مچھلی والے سے ملاقات کے دوران میں وہ انہیں کسی خطرے سے خبردار کرتے ہوئے اپنے خاص آدمی کے ذریعے روانہ کرتا ہے جہاں اُن کا ایک گینگ سے جھگڑا ہوتا ہے۔ وہ لوگ انہیں مار بھگاتے ہیں' راستے میں اُن کا ایک جعلی پولیس انسپکٹر سے رابطہ ہوتا ہے اور پھر کہانی میں ایک نئے کردار کا اضافہ ہوتا ہے۔

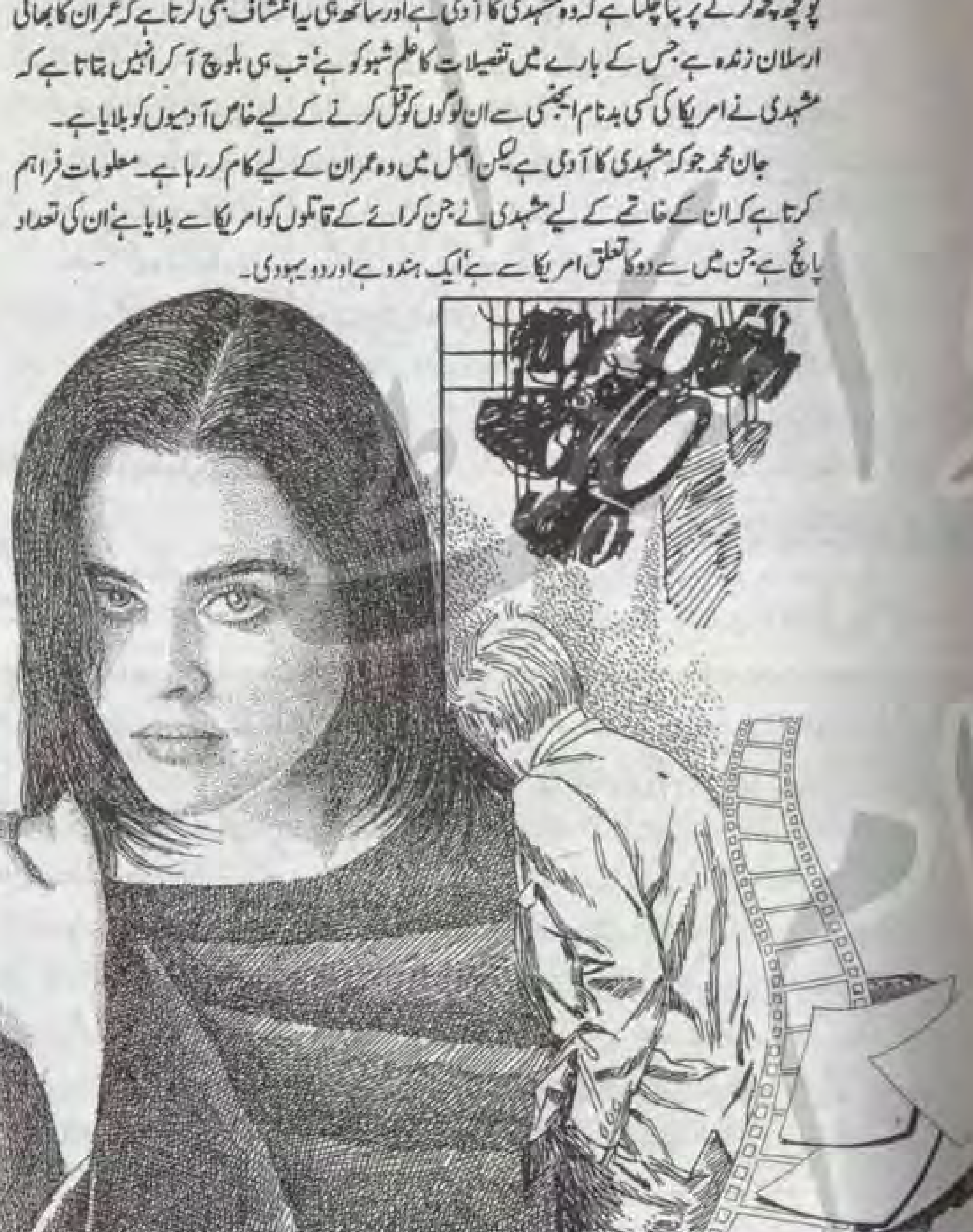
عمران اپنی بہن کی تلاش میں اس کی دوست وردہ کے گھر پہنچتا ہے جہاں وردہ کے والد بتاتے ہیں کہ رات میں کسی لڑکی کا فون آیا تھا' فون نمبر کی انکوائری پر معلوم ہوتا ہے' وہ نمبر اسٹیشن کے قریب کسی پی سی او کا ہے۔ عمران اور نادیہ کینٹ اسٹیشن پہنچتے ہیں جہاں نادیہ کو اغوا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ عمران ان اغوا کاروں کو پکڑ کر پوچھ گچھ کرتا ہے۔

عمران اور تیمور' شائستہ کو تلاش کرتے کرتے حاکم خان کے اڈے پر پہنچ جاتے ہیں مگر شائستہ' حاکم خان کے غنڈوں کو زخمی کر کے پہلے ہی فرار ہو جاتی ہے۔ تیمور' حاکم خان کو ہلاک کر دیتا ہے۔ وہ دونوں حاکم خان کے سیف سے ضروری کاغذات لے کر وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ مشہدی فون کر کے ان کاغذات میں سے ایک ریڈ فائل کا تقاضہ کرتا ہے مگر عمران اسے فائل دینے سے انکار کر دیتا ہے۔

ٹیلی فون پر مشہدی اور عمران کی تلخ کلامی ہوتی ہے۔ مشہدی اسے دھمکیاں دیتا ہے اور ملٹری انٹیلی جنس کو اس کے پیچھے لگا دیتا ہے۔ وہ اس کے آفس میں کچھ ممنوعہ فائلیں اور دوسرا میٹر رکھوا دیتا ہے لیکن ہاشم اور تیمور کی بروقت مداخلت سے عمران بچ جاتا ہے اور ملٹری انٹیلی جنس والے ناکام لوٹ جاتے ہیں۔ ہاشم شبے میں آفس کے جی ایم سمیت کئی افراد کو اٹھا لیتا ہے۔ وہ آفس کے ایک پیون کو پکڑ لیتے ہیں۔ وہ سب کچھ اگل دیتا ہے۔ ہاشم اسے ویرانے میں لے جا کر ہلاک کر دیتا ہے۔ اسی دوران میں عمران کا ایک دشمن غنی بلوچ' عمران سے آملتا ہے۔ بلوچ' عمران کو بتاتا ہے کہ اس نے مشہدی کا جہاز غرق کرنے کی تیاری کر لی ہے۔ وہ لوگ جہاز میں ریموٹ بم لگا کر آتے ہیں تو جہاز کے کسی آدمی کی نظر بلوچ پر پڑ جاتی ہے۔ وہ تیزی سے اس تنگ کھاڑی میں گھس جاتا ہے جہاں ان کی لانچ لنگر انداز تھی۔ اچانک کھاڑی کے سامنے تیز روشنی ہو جاتی ہے اور کوئی چیخ کر کہتا ہے کہ اندر جو کوئی بھی ہے' باہر آجائے ورنہ یہ کھاڑی اس کی قبر بن جائے گی......

کوسٹ گارڈز کی لانچ انہیں ڈھونڈنے میں ناکام ہو کر واپس چلی جاتی ہے۔ ہاشم بوٹ کو لے کر جٹی پہنچتا ہے جہاں پہنچ کر ہاشم ریموٹ کنٹرول کے ذریعے مشہدی کے جہاز ایم وی موتارک کو تباہ کر دیتا ہے اور ریموٹ کنٹرول سمندر میں پھینک دیتا ہے جہاں سے یہ لوگ علیحدہ علیحدہ گھروں کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ راستے میں عمران کو محسوس ہوتا ہے کہ کوئی گاڑی اس کے تعاقب میں ہے۔ وہ کمال ہوشیاری سے اس شخص کو قابو کرتا ہے اور اسے گھر لے آتا ہے جہاں تیمور بھی آجاتا ہے۔ اس شخص سے پوچھ گچھ کرنے پر پتا چلتا ہے کہ وہ مشہدی کا آدمی ہے اور ساتھ ہی یہ انکشاف بھی کرتا ہے کہ عمران کا بھائی ارسلان زندہ ہے جس کے بارے میں تفصیلات کا علم شبو کو ہے' تب ہی بلوچ آ کر انہیں بتاتا ہے کہ مشہدی نے امریکا کی کسی بدنام ایجنسی سے ان لوگوں کو قتل کرنے کے لیے خاص آدمیوں کو بلایا ہے۔

جان محمد جو کہ مشہدی کا آدمی ہے لیکن اصل میں وہ عمران کے لیے کام کر رہا ہے۔ معلومات فراہم کرتا ہے کہ ان کے خاتمے کے لیے مشہدی نے جن کرائے کے قاتلوں کو امریکا سے بلایا ہے' ان کی تعداد پانچ ہے جن میں سے دو کا تعلق امریکا سے ہے' ایک ہندو ہے اور دو یہودی۔



بلوچ، شبو کے بارے میں بتاتا ہے کہ وہ کسی زمانے میں چھوٹا موٹا بدمعاش تھا جسے بعد میں مشہدی نے اپنے گینگ میں شامل کرلیا تھا۔ اس کا اصل نام شہاب ہے اور اس کی ڈیوٹی پورٹ پر ہوتی ہے۔ مشہدی کے خاص آدمیوں میں سے ہے اور پورٹ سے بہت کم باہر نکلتا ہے۔ اسے صرف اسٹیمر سے باہر لانا ہوگا جہاں سے اسے کھلے سمندر میں لے جائیں گے اور اس آپریشن میں اس کے ساتھ ہاشم اور عمران بھی شریک ہوں گے۔

دوسری جانب جان محمد فون پر بتاتا ہے کہ مشہدی کے امپورٹڈ دہشت گردوں میں سے ایک پی سی کے ریسٹورنٹ میں موجود ہے جس کا نام آرنلڈ ہے۔

عمران، نعیم کو ساتھ لے کر ہوٹل کی جانب روانہ ہوجاتا ہے جہاں سے وہ امریکن اپنے گارڈز کے ہمراہ ہوٹل سے نکلتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ لوگ محتاط ہوکر ان کا تعاقب کرتے ہیں۔ گاڑی ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور کے سامنے رکتی ہے۔ وہ امریکن اسٹور میں چلا جاتا ہے۔ عمران اور نعیم باہر ہی اس کا انتظار کرتے ہیں۔ جیسے ہی آرنلڈ باہر آتا ہے نعیم اس سے بغل گیر ہوجاتا ہے اور عمران بھی یوں ظاہر کرتا ہے جیسے صدیوں کی شناسائی ہو اور ساتھ ہی آہستگی سے اس سے کہتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں ریوالور ہے لہٰذا وہ بغیر چون وچرا کیے ان کے ساتھ چلے۔ آرنلڈ خاموشی سے ان کے ساتھ چل پڑتا ہے۔

گھر لاکر پوچھ گچھ میں آرنلڈ اقرار کرتا ہے کہ وہ کرائے کا قاتل ہے اور مشہدی نے اسے بلایا ہے۔ عمران، تیمور سے کہتا ہے اسے گولی ماردو اور اس کے سینے پر ایک ٹیگ لگادینا ہے۔ "مشہدی کے لیے اس کے ایک پرانے دوست کا تحفہ۔"

تیمور، نعیم کی مدد سے آرنلڈ کے مردہ جسم کو لے کر باہر نکل جاتا ہے۔ ابھی تیمور کو نکلے مشکل سے دس منٹ ہوئے تھے کہ عمران کے گھر کے نزدیک پولیس موبائل کے سائرن کی کرخت آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

پھر موبائل عین دروازے کے سامنے آکر رکتی ہے جس کا سائرن مسلسل بج رہا تھا اور عمران کے دماغ پر گویا ہتھوڑے برس رہے تھے۔

(اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے۔)

اسی وقت چوکیدار اندر آیا اور مجھ سے بولا۔ "صاحب جی! باہر پولیس آئی ہے۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اندر آنا چاہ رہے ہیں۔"

"اچھا، تم چلو میں آرہا ہوں۔" میں نے کہا۔

پھر میں نے نادیہ سے کہا۔ "تم ملازمین کی مدد سے اس کمرے سے آرنلڈ کی موجودگی کا ہر نشان مٹادو۔ میں پولیس والوں سے بات کرتا ہوں۔ یہ لوگ آخر یہاں کیسے پہنچ گئے؟"

میں نے انگلیوں سے اپنے بال سنوارے اور گیٹ پر پہنچ گیا۔

وہاں ایک انسپکٹر اور چار سپاہی موجود تھے۔

"کیا بات ہے آفیسر؟" میں نے باوقار لہجے میں پوچھا۔ "اور یہ سائرن کو بند کردو۔ اس سے تو مجرم مزید ہوشیار ہوجاتے ہیں کہ پولیس کس طرف ہے؟"

انسپکٹر کے اشارے پر ڈرائیور نے سائرن آف کردیا اور معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ "سر! آپ کے گھر میں باہر سے کوئی آدمی داخل تو نہیں ہوا؟"

"میں سمجھا نہیں......" میں نے کہا۔

"سر! ہم ایک خطرناک دہشت گرد کا پیچھا کررہے تھے۔ وہ اس اسٹریٹ پر آکر غائب ہوگیا ہے۔ میں نے سوچا کہ وہ اردگرد کے کسی بنگلے میں نہ گھس گیا ہو؟"

"تمہاری کتنی سروس ہے آفیسر؟" میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"میں پندرہ سال سے ملازمت کررہا ہوں سر!" اس نے جواب دیا۔

"اس اسٹریٹ پر آمنے سامنے تقریباً آٹھ بنگلے ہیں۔" میں نے کہا۔ "پھر تم میرے ہی دروازے پر آکر تقریر کیوں کررہے ہو؟"

"سر مجھے ایسا لگا تھا کہ جیسے کوئی آپ کی باؤنڈری وال پھلانگ کر اندر گھسا ہو۔" انسپکٹر نے کہا۔

"میری باؤنڈری وال پھلانگ کر!" میں نے حیرت سے کہا۔ "تم ذرا میری باؤنڈری وال پھلانگ کر دکھاؤ یا اپنے کسی جوان سے کہو۔ میرے دروازے پر دو دو گارڈز موجود ہیں، ایک چوکیدار اُن کے علاوہ ہے۔ ان کی موجودگی میں کوئی گھر میں داخل ہوسکتا ہے؟"

"سوری سر......!" انسپکٹر نے کہا۔ "مجھے دور سے کسی کی ایک جھلک دکھائی دی تھی، میں سمجھا کہ......"

"وہ دہشت گرد یا ڈاکو ہمارے گھر میں گھس گیا؟"

"تمہیں شبہ ہی ہوا تھا تو کم سے کم سائرن بند کرکے آتے، تم نے تو میرا سکون غارت کردیا۔ میں ابھی آئی جی صاحب سے بات کرتا ہوں۔ انہوں نے کس قسم کے احمق لوگ پولیس میں ملازم رکھے ہوئے ہیں؟"

"سر میں نے آپ سے معافی مانگی ہے اس کے باوجود اگر آپ شکایت کرنا چاہتے ہیں تو کردیں۔ آئی جی صاحب زیادہ سے زیادہ میرا ٹرانسفر کردیں گے یا پھر لائن حاضر کردیں گے۔"

"ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا آفیسر، لیکن نیکسٹ ٹائم آن کیئرفل رہیں، اوکے!" میں نے مسکرا کر کہا۔

اس نے ممنونیت سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "اوکے سر!"

اس کی موجودگی میں تیمور بھی واپس آگیا۔ پولیس وین گیٹ کے عین سامنے کھڑی تھی اس لیے تیمور کچھ فاصلے پر رک گیا۔ انسپکٹر سلام کرکے رخصت ہوگیا تو تیمور اور نعیم اندر آگئے۔ گاڑی انہوں نے باہر ہی چھوڑ دی تھی۔

"سب خیریت تو ہے عمران بھائی؟" تیمور نے تشویش سے پوچھا۔

"ہاں، سب خیریت ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا پھر اسے بتایا کہ انسپکٹر کیوں آیا تھا؟

"تم نے اپنا کام کردیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، میں نے اپنا کام کردیا ہے۔ اسے سرجانی ٹاؤن سے بھی آگے ایک ویرانے میں سائلنسر لگے ریوالور سے سر میں گولی ماری اور اس کے سینے پر "تحفے" والا ٹیگ لگادیا۔ لاش ابھی کچھ دیر میں پولیس کو مل جائے گی۔ وہاں سے گزرنے والا کوئی بھی ٹرک یا بجری کی گدھا گاڑی والا پولیس کو انفارم کردے گا۔"

"یار، ہماری زندگی سے سکون تو رخصت ہی ہوگیا ہے، ایک مشہدی کا ٹنٹا ہی کیا کم تھا کہ اب اس کے کرائے کے قاتلوں کا بکھیڑا بھی کھڑا ہوگیا؟" میں نے کہا۔

میں تیمور سے باتیں کرتا ہوا اپنے بیڈروم ہی میں آگیا تھا اور کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا۔

اس وقت بلوچ اور ہاشم آگئے۔

"میں نے شبو کے ٹھکانے کا سراغ لگالیا ہے۔" بلوچ نے کہا۔ "وہ ہفتے میں ایک دو دفعہ پورٹ سے باہر نکلتا ہے اور ضروری سامان کی خریداری کے بعد واپس چلا جاتا ہے۔"

"تو پھر اسے باہر ہی کہیں گھیر لیتے ہیں۔" تیمور نے کہا۔

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "اس سلسلے میں بلوچ کا مشورہ مناسب ہے۔ ہم اسے اپنی بوٹ میں کھلے سمندر میں لے جائیں گے۔"

''اسے وہاں سے لے جانا خاصا مشکل ہوگا کیوں کہ مشہدی کے اس اسٹیمر پر پانچ چھ آدمی ہر وقت موجود ہوتے ہیں' ساتواں شبو ہے۔''

''ہاشم!'' میں نے کہا۔ ''تم ایسی بات کر رہے ہو؟''

''میں نے کہا کہ مشکل ہے' ناممکن نہیں ہے۔ ہمیں بہت احتیاط سے کام کرنا ہوگا۔''

''جب بلوچ' مشہدی کا اسلحے سے بھرا ہوا جہاز ڈبو سکتا ہے تو یہ کون سا مشکل کام ہے۔'' تیمور نے ہنس کر کہا۔

''مشکل یہ ہے کہ وہ جہاز کھلے سمندر میں کھڑا تھا۔ مشہدی کا اسٹیمر ایسی جگہ کھڑا ہے جہاں ارد گرد کئی اور اسٹیمرز اور بڑی بوٹس بھی ہیں۔ میں اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ ہمیں بہت احتیاط سے کام کرنا ہوگا۔''

''ولجہ......!'' بلوچ نے کہا۔ ''ہمیں یہ آپریشن آج رات ہی کرنا چاہیے۔''

''اتنی جلدی مت کرو بلوچ......!'' ہاشم نے کہا۔ ''پہلے مجھے معلوم کرنے دو کہ شبو کے ساتھ کتنے لوگ ہوتے ہیں اور ان کی ڈیوٹی کیا ہے؟''

''اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ چھ سات آدمی ہوتے ہیں۔'' بلوچ نے کہا۔ ''ان کا بندوبست تو میں کر سکتا ہوں۔''

''کبھی دشمن کو اتنا ہلکا مت سوچ لینا بلوچ!'' ہاشم نے کہا۔ ''مجھے تو حیرت ہے کہ تم جیسا تجربے کار آدمی ایسی بات کر رہا ہے؟''

''ٹھیک ہے ہاشم بھائی!'' بلوچ نے کہا۔ ''آپ کل ان لوگوں کے بارے میں انفارمیشن جمع کرو۔ کل رات کو میں آپریشن کی تیاری کرتا ہوں۔''

''اس بات چیت میں ہم تم لوگوں کو ایک اہم اطلاع تو دے ہی نہیں سکے' اطلاع کیا بلکہ خوش خبری ہے۔'' تیمور نے کہا۔

''خوش خبری؟ کیا ارسلان کا کوئی سراغ مل گیا؟'' ہاشم کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''وہ بھی انشاء اللہ مل جائے گا۔'' میں نے کہا۔ ''فی الحال تو ہم نے مشہدی کے امپورٹڈ آدمیوں میں سے ایک آدمی کم کر دیا ہے۔''

''کیا؟'' ہاشم جوش کے عالم میں کھڑا ہو گیا۔ ''اتنی اہم اطلاع تم مجھے اب دے رہے ہو؟''

''ہاشم بھائی' آپ نے ہمیں کچھ بتانے کا موقع ہی کب دیا؟'' تیمور نے ہنس کر کہا۔ ''اس آپریشن میں عمران بھائی کے ساتھ میں نہیں بلکہ نعیم تھا۔ اس کی تفصیل تو عمران بھائی خود ہی بتائیں گے۔''

ہاشم نے سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا۔

میں نے اسے شروع سے لے کر آخر تک سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔

''یہ ہوئی نا بات!'' بلوچ جوش میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ ''ویسے ولجہ! تم نے بہت اچھا کیا' خود کو ڈیگال کا آدمی ظاہر کیا۔''

''یار' یہ ڈیگال کون ہے اور اس کے بارے میں مزید تم کیا جانتے ہو؟'' میں نے ہاشم سے پوچھا۔

''ڈیگال اس وقت انڈر ورلڈ میں مشہدی اور اس گینگ کے دو تین بدمعاشوں کا سب سے بڑا حریف ہے۔ وہ پاکستان میں ایکٹو نہیں ہے لیکن کسی بھی وقت ہو سکتا ہے۔ مشہدی کی طرح اس کا نیٹ ورک بھی پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ وہ نسلاً فرنچ ہے لیکن اٹلی کا شہری ہے اور وہاں کی ایک بہت بڑی مافیا کا چیف ہے۔ اسے گنتی کے چند لوگوں نے دیکھا ہے اس لیے اس کے حلیے اور قد کے بارے میں بھی کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ یہ سب قصے کہانیوں کی باتیں ہیں۔ ہاں' ممکن ہے یہ درست ہو کہ دراز قد ہونے کی وجہ سے اس کا نام ڈیگال پڑ گیا ہو۔''

''ولجہ!'' بلوچ نے کہا۔ ''آج کا سب سے بڑا خبر بلکہ بریکنگ نیوز تو یہ ہے کہ تم نے ان پانچ ٹیررسٹ میں سے ایک کو ختم کر دیا۔''

شہر میں یوں بھی کہرام مچا ہوا تھا' ایم وی مونارک کی تباہی کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ مشہدی اور اس کے حامی پریس

نے پورے شہر کو سر پہ اٹھا لیا تھا۔ اس کا اربوں روپے کا نقصان ہوا تھا۔ وہ تو جو کچھ نہ کرتا تو وہ کم تھا۔ وہ پولیس اور کوسٹ گارڈز کو ذمے دار ٹھہرا رہا تھا کہ ان کی موجودگی میں دہشت گردی کی اتنی بڑی واردات ہو گئی۔ اسے مجھ ہی پر شبہ ہوگا کیوں کہ اس شہر بلکہ اس ملک میں اس کا بدترین اور واحد دشمن میں ہی تھا لیکن کوئی ثبوت نہ ہونے کے باوجود وہ کچھ کر نہیں پا رہا تھا پھر میں نے سوچا کہ اس نے کسی طرح میرا ٹھکانا معلوم کر ہی لیا ہوگا اور اب میرے خلاف کارروائی کرنے جا رہا ہو۔

ہاشم بہ غور میری طرف دیکھ رہا تھا پھر اس نے پوچھا۔ ''مشہدی نے تم سے کوئی رابطہ کیا؟''

''مشہدی مجھ سے رابطہ کر ہی نہیں سکتا۔ میرے پاس جو نمبر ہے' وہ سیل فون کی اسکرین پر نہیں آتا۔ یہ بھی شاید عامر کا کوئی کمال ہے۔ سیل فون اسکرین پر میرے نام کے ساتھ No Number نظر آئے گا۔''

''عامر......!'' ہاشم نے پُر خیال لہجے میں کہا۔ ''اچھا' وہ پروفیسر!''

''ہاں' وہ آئی ٹی کا کیڑا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ہیکنگ بھی کر سکتا ہے۔''

''تم ذرا مشہدی کو کال کرو۔'' ہاشم نے کہا۔ ''اور اس کا ری ایکشن معلوم کرنے کی کوشش کرو۔''

''پہلے تو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ آرنلڈ کی لاش ابھی تک پولیس کو ملی بھی ہے یا نہیں؟''

''آرنلڈ کی لاش پولیس کو مل چکی ہے لیکن ابھی تک اس کی شناخت نہیں ہو سکی ہے۔'' نادیہ نے کہا۔ ''میں نے آج کئی دفعہ ٹی وی پر خبریں دیکھی ہیں۔ ہر چینل اس سلسلے میں سنسنی پھیلا رہا ہے۔ کوئی اسے ٹارگٹ کلنگ کہہ رہا ہے اور کوئی اس میں کسی سیاسی پارٹی کا ہاتھ ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے۔''

''پھر میں مشہدی کو کال کر سکتا ہوں۔'' میں نے اپنی جیب سے وہ سیل فون نکال لیا جس میں وہ مخصوص سم لگی تھی اور مشہدی کا نمبر ڈائل کر دیا۔

اس نے فوراً ہی کال ریسیو کر لی۔ ''ہیلو......!''

''ہاں میرے دوست' کیا حال ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آرنلڈ کی موت میں تمہارا ہاتھ ہے؟''

''آرنلڈ!'' میں نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔ ''کون آرنلڈ؟''

''مجھ سے اڑنے کی کوشش مت کرو۔'' مشہدی نے کہا۔ ''اسے تم ہی نے قتل کیا ہے۔''

''تو پھر تم پولیس کو انفارم کرو اور مجھے پھانسی پر چڑھوا دو......'' میں نے کہا۔

''دیکھو عمران! میں اب تک تمہیں طرح دیتا آیا ہوں لیکن اب نہیں دوں گا۔''

میں نے کب کہا ہے کہ تم میرے ساتھ کوئی رعایت کرو۔ تم نے رعایت کے طور پہ میرے پورے خاندان کو ختم کر دیا اور میرے گھر کو ملبے کا ڈھیر بنا دیا۔ ایسی ''رعایت'' تو میں بھی تمہیں دینا چاہتا ہوں۔''

''تم کیا سمجھتے ہو کہ میں تمہارے ٹھکانے سے واقف نہیں ہوں؟'' مشہدی نے کہا۔ ''تم اپنے بل میں گھسے ہو گے اور میں بیٹھا تماشا دیکھتا رہوں گا۔''

''تو مت دیکھو تماشا!'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''لیکن آرنلڈ کے قتل سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ ڈیگال بھی میدان میں آ گیا ہے؟'' وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔ ''پھر یقیناً یہ اسی کی کارروائی ہو گی۔''

''مجھ سے ایک ڈیل کر لو...... میں......''

''تم سے تو بس ایک ہی ڈیل ہو سکتی ہے' اب یا تو تم زندہ رہو گے یا میں۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے تو ابھی تک شائستہ کا پتا بھی نہیں بتایا؟''

''مجھے خود معلوم نہیں ہے کہ شائستہ کہاں ہے؟''

''حیرت کی بات ہے' تم ایک انٹرنیشنل نیٹ ورک چلا رہے ہو اور تمہیں ایک لڑکی کے بارے میں علم نہیں ہے کہ وہ

کہاں ہے؟''

''میں اس بارے میں جلد ہی پتا لگالوں گا۔ مجھے اپنی بہن چاہیے اور بس!'' یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

میں نے اسپیکر فون آن کردیا تھا اس لیے مشہدی کی باتیں وہاں موجود ہر شخص سن رہا تھا۔

''بکواس کرتا ہے یہ......'' ہاشم نے کہا۔ ''اسے شائستہ کے بارے میں علم نہیں ہے۔''

''ولجہ......!'' بلوچ نے کہا۔ ''شائستہ کا پتا بھی معلوم ہوجائے گا۔'' بلوچ نے کہا۔ ''مشہدی کو غرق کروا بھی تو تم ان لوگوں کے بارے میں سوچو جو باہر سے آئے ہیں۔ میں شبو کو پکڑوں گا تو شاید اسے شائستہ کے بارے میں کوئی علم ہو۔''

کھانے کے بعد بلوچ رخصت ہوگیا۔ ہاشم بھی کچھ تھکا تھکا نظر آرہا تھا اس لیے وہ بھی معذرت کرکے اٹھ گیا۔ میرے ساتھ صرف تیمور اور نادیہ رہ گئے۔ تیمور نے ہی انگڑائی لی اور مجھ سے بولا۔ ''عمران بھائی! مجھے بھی شدید نیند آرہی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی سوجاؤں؟''

''تم کیا میری اجازت سے سوتے ہو؟'' میں نے کہا۔

وہ ہنستا ہوا اٹھ گیا۔

''اگر تمہیں نیند آرہی ہے تو تم بھی سوجاؤ۔'' میں نے نادیہ سے کہا۔

''میں نے کون سے ہل چلائے ہیں جو مجھے نیند آئے گی؟'' نادیہ نے کہا۔ ''ہاں' اگر تمہیں نیند آرہی ہے تو میں چلی جاتی ہوں۔''

''نہیں' کچھ دیر بیٹھو۔'' میں نے کہا۔ ''دن بھر ذہنی طور پر ٹینشن میں رہنے کے بعد اب میں کچھ ریلیکس ہونا چاہتا ہوں۔''

''میں تمہارا سر دبا دوں؟'' نادیہ نے کہا پھر خود ہی آگے بڑھ کر میرا سر دبانے لگی۔ اس کے لباس سے اٹھنے والی اشتعال انگیز مہک میرے اعصاب پر اثر انداز ہورہی تھی۔

میں نے اچانک نادیہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس سے کہا۔ ''بس کرو نادیہ! مجھے مزید آزمائش میں مت ڈالو۔''

''کیسی آزمائش؟'' نادیہ نے اپنی بھاری پلکیں اٹھا کر پوچھا۔

''میں بھی گوشت پوست کا انسان ہوں' میرے سینے میں بھی دل دھڑکتا ہے' میرے بھی کچھ جذبات ہیں' وہ بھڑک گئے تو میں زندگی بھر خود سے بھی آنکھیں نہیں ملا پاؤں گا۔''

نادیہ شرما کر پیچھے ہٹ گئی۔

''اس مسئلے کا ایک حل ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں کل ہی تم سے شادی کرلوں؟''

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟'' نادیہ نے کہا۔ ''ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں' کیا ان میں شادی کرنا مناسب ہوگا؟''

''یہ حالات اگر مزید چند سال رہے تو کیا میں بڑھاپے میں شادی کروں گا؟''

''اب تم واقعی نیند کی جھونک میں ہو اور بہکی بہکی باتیں کررہے ہو۔'' یہ کہہ کر نادیہ اٹھی اور اشتعال انگیز انداز میں چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ مجھے کمرا ایک دم خالی خالی سا لگنے لگا۔ میں سنجیدگی سے اس بات پر غور کررہا تھا کہ نادیہ کے ساتھ شادی کرہی لوں پھر میں نے سوچا کہ یہ تو خود غرضی کی انتہا ہوگی۔ شائستہ کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا' ارسلان کے زندہ ہونے کا ثبوت تو ملا تھا لیکن جب تک اس کا سراغ نہ مل جاتا' میں کچھ اور سوچ بھی کیسے سکتا تھا؟

یہی سب کچھ سوچتے ہوئے مجھے نہ جانے کب نیند آگئی۔

میں دن چڑھے تک سوتا رہا۔ نادیہ ہی نے آکر مجھے جگایا۔ وہ گلاب کی طرح تروتازہ اور کھلی کھلی نظر آرہی تھی۔

''ساڑھے دس بج رہے ہیں عمران!'' اس نے کہا۔ ''ابھی تک تمہاری نیند پوری نہیں ہوئی؟''

''میں اتنا خوب صورت خواب دیکھ رہا تھا' تم نے عین وقت پر مجھے جگا دیا۔'' یہ کہہ کر میں نے اس کا ہاتھ پکڑنے کی

کوشش کی لیکن وہ بل کھا کر میری گرفت سے بچ گئی۔ ''یہ بھی اچھا ہی ہوا' اسی وقت تیمور کمرے میں داخل ہوا اور بولا۔ ''عمران بھائی! آپ کے چکر میں تو ہم سب بھوکے مرجائیں گے۔''

''تم اتنی آسانی سے مرنے والوں میں سے نہیں ہو۔'' میں نے کہا اور اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔

میں تیار ہوکر باہر نکلا تو ناشتے کی میز پر صرف تیمور اور نادیہ ہی تھے' ہاشم غائب تھا۔

''ہاشم کو بھی بلالو۔'' میں نے تیمور سے کہا۔ ''وہ بھی صبح سے بھوکا ہوگا۔''

''ہاشم بھائی تو صبح ہی کہیں نکل گئے تھے۔'' تیمور نے جواب دیا۔

میں نے ناشتا کرتے ہوئے پوچھا۔ ''تیمور! تم اپنے ان ساتھیوں کا بھی خیال رکھتے ہو جو محض تمہاری دوستی میں یہاں پڑے ہوئے ہیں؟''

''تیمور سے زیادہ ان کا خیال میں رکھتی ہوں۔'' نادیہ نے کہا۔ ''انہیں بھی وہی کچھ کھانے کو ملتا ہے جو ہم لوگ کھاتے ہیں۔ میں نے کلثوم اور بخت آور (ڈرائیور کی بیوی) کو ہدایت کردی ہے کہ ان لوگوں میں سے کوئی کسی بھی چیز کی فرمائش کرے تو انکار مت کرنا' وہ لوگ ان کے لیے دن میں کئی مرتبہ چائے اور کافی بناتی ہیں۔''

ناشتے سے فارغ ہوکر میں نے تیمور سے کہا۔ ''ذرا ٹی وی تو کھولو۔ آرنلڈ کی خبر تو آرہی ہوگی۔ ہمارے ملک میں تو کوئی غیر ملکی کتا بھی مرجائے تو ہمارا میڈیا اسی ایسی کوریج دیتا ہے کہ عام آدمی کا دل چاہے کہ کاش' وہ غیر ملکی کتا ہی ہوتا......''

میری بات پر نادیہ ہنسنے لگی۔

اس دوران میں تیمور نے ٹی وی آن کردیا تھا اور ریموٹ کنٹرول سے چینل بدل رہا تھا۔

ایک معروف چینل سے اس وقت آرنلڈ کے بارے میں ہی خبر نشر کی جارہی تھی۔ امریکی سفارت خانے نے اسے اپنے شہری کی حیثیت سے شناخت کرلیا تھا لیکن ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ وہ پاکستان کس سلسلے میں آیا تھا؟ سب سے زیادہ سنسنی اس وجہ سے پھیلی تھی کہ آرنلڈ کے سینے پر ایک ٹیگ تھا اور اس پہ خاصے واضح کمپیوٹرائزڈ حروف میں لکھا تھا۔ ''مشہدی کے لیے ایک پرانے دوست کا تحفہ......''

ٹی وی چینلز کے رپورٹرز اور پولیس نے یقیناً مشہدی کا ناطقہ بند کردیا ہوگا۔ نیوز کاسٹر بتارہی تھی کہ مسٹر مشہدی مقتول کو نہیں جانتے تھے اور یہ کہ ان کا نام لے کر ان کے کسی دشمن نے ان کے خلاف سازش کی ہے۔''

''ویسے یہ آرنلڈ بہت کمینہ اور گھٹیا آدمی تھا۔ میں نے اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کی ہیں۔ وہ اتنی آسانی سے قابو میں آنے والا نہیں تھا لیکن اس وقت وہ اوور کانفیڈنس کا شکار ہوگیا۔ اسے اپنے لوکیشن فائنڈر' گھڑی اور انگوٹھی پر پورا بھروسا تھا۔'' تیمور نے کہا۔ ''بس اس کی موت ہی آئی تھی جو وہ اس خود اعتمادی کا شکار ہوکر یہاں تک آگیا۔''

''اسے یہ بھی اطمینان تھا کہ اسے پولیس والے اپنے ساتھ لے جارہے ہیں۔ اس نے سوچا ہوگا کہ پولیس تو مشہدی کی مٹھی میں ہے' وہ فوراً ہی وہاں سے باہر آجائے گا۔''

''اب دوسرے لوگوں کی فکر کریں عمران بھائی!'' تیمور نے کہا۔ ''ہم کم سے کم قدوائی صاحب کو تو خطرے سے آگاہ کرسکتے ہیں۔ آرنلڈ کی موت کے بعد اس کے دوسرے ساتھی مزید چوکنا ہوجائیں گے۔''

''میں شرطیہ کہتا ہوں کہ انہیں ایک دوسرے کے بارے میں علم ہی نہیں ہوگا' ایسا اگر ہوتا بھی تو وہ اب وہ ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے۔ ممکن ہے' اس وقت بھی وہ اپنے طور پہ اپنے اپنے ٹارگٹ کو نشانہ بنانے کے منصوبے بنارہے ہوں۔''

ہم لوگ بہت دیر تک اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔

ہماری گفتگو کا سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب میرے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ٹیبل پر رکھا ہوا سیل فون اٹھا کر دیکھا'

اسکرین پر جان محمد کا نام تھا۔

''ہاں جان محمد!'' میں نے خوش ہو کر اس سے کہا۔ ''کیسے ہو؟''

''میں...... بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں لیکن آپ نے تو کمال ہی کر دیا' آپ نے ان کی فائیو مین آرمی کا بیس فی صد ختم کر دیا۔''

''یہ بس اتفاق ہے کہ آرنلڈ ہمارے ہتھے چڑھ گیا ورنہ وہ اتنی آسانی سے قابو میں آنے والا نہیں لگتا تھا۔''

''عمران صاحب......!'' جان محمد نے کہا۔ ''مجھے مشہدی کے ایک اور امپورٹڈ قاتل کا سراغ ملا ہے۔ اطلاع ابھی کنفرم نہیں ہے' کنفرم ہوتے ہی آپ کو بتاؤں گا۔''

''کیا وہ کسی ہوٹل میں مقیم ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں' وہ نارتھ ناظم آباد کے ایک بنگلے میں ہے لیکن ابھی کچھ کنفرم نہیں ہے۔ ابھی تو مجھے اس کا نام بھی معلوم نہیں ہوا۔'' جان محمد نے کہا۔ ''میں نے تو اس وقت آپ کو مبارک باد دینے کے لیے کال کی تھی۔ میں صبح سے بہت مصروف تھا اس لیے ٹی وی دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے کے نیوز بلیٹن میں اس کی موت کے بارے میں سنا ہے۔ آپ نے ایک تیر سے دو شکار کیے ہیں' اپنے دشمن کو بھی ختم کر دیا اور مشہدی کو بھی عذاب میں مبتلا کر دیا۔ اب وہ پولیس کو' میڈیا کو جواب دے دے کر تنگ آ چکا ہے۔''

اچانک ہاشم آ گیا۔ وہ چہرے سے خاصا تھکا تھکا نظر آ رہا تھا۔

''تم صبح صبح کہاں نکل گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں پورٹ کی طرف گیا تھا اور مشہدی کے اسٹیمر کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کر کے آیا ہوں۔'' ہاشم نے جتایا۔

''اس کے لیے اتنی صبح صبح جانے کی کیا ضرورت تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''اصل میں میرا ایک دوست پورٹ پر کام کرتا ہے۔ وہ پورٹ کے لیے صبح سویرے گھر سے نکلتا ہے۔ اسے سب کچھ معلوم ہے کہ کون سا جہاز اس وقت جیٹی پر ہے' کون سا جہاز مال اتارنے کے بعد اب مال لوڈ کر رہا ہے اور کون سا اسٹیمر کہاں ہے اور کس کی ملکیت ہے؟ یہ اس کی ڈیوٹی ہے۔''

''تمہارا وہ دوست کیا مشہدی کے لیے کام کرتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں' وہ تو بے چارہ سیدھا سادہ محنت کش آدمی ہے' اس سے اس وقت ملاقات ہوئی تھی جب میں مشہدی کے لیے کام کرتا تھا۔ ظاہر تو وہ یہ کرتا ہے کہ میری اصلیت سے واقف نہیں ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ میرے بارے میں اچھی طرح جانتا ہے۔''

''اس کے باوجود وہ تمہارا دوست ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ صرف اتنا جانتا ہے کہ میں مشہدی کے اسٹیمرز اور بوٹس کی نگرانی کرتا ہوں۔ اس بے چارے کو تو یہ علم بھی نہیں ہے کہ میں نے اب مشہدی کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔''

''کہیں ہماری وجہ سے وہ بھی کسی عتاب میں نہ آ جائے؟'' میں نے کہا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔'' ہاشم نے کہا۔ میں نے باتوں باتوں میں اس سے مشہدی کے اسٹیمر کے بارے میں معلوم کیا اور اس سے کہا کہ وہ لوگ میری لاعلمی میں اکثر اسٹیمر کو کھلے سمندر میں لے جاتے ہیں۔ اس نے کہا کہ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے' آپ کا اسٹیمر جہاں کھڑا ہوتا ہے' وہیں کھڑا ہے۔''

''یہ تم نے بہت زبردست کام کیا ہے۔''

وہ صبح سے بھوکا تھا اس لیے میں نے کلثوم سے کہہ کر اس کے لیے ناشتا منگا لیا۔ اس وقت کھانے کا وقت تھا لیکن ہم لوگوں نے ناشتا بہت دیر سے کیا تھا اس لیے مجھے' تیمور یا نادیہ کو کھانے کی بالکل خواہش نہیں تھی۔

............*......*

شام کو بلوچ بھی آ گیا۔ وہ پوری تیاری سے آیا تھا۔ ہاشم بھی گھنٹوں اس آپریشن کی تیاری کرتا رہا تھا۔

''ولیہ! ہمارا بوٹ اس وقت بالکل بند ہے اور اس وقت پورٹ پر مشہدی کے اسٹیمر کے پاس موجود ہے۔''

رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ کچھ دیر حالاتِ حاضرہ پر بات چیت کرتے رہے پھر ہاشم اٹھ کر اپنے میں چلا گیا۔ وہ واپس آیا تو اس کے جسم پر کے پی ٹی کی سیکورٹی یونیفارم تھی۔ وہ اس وقت کے پی ٹی کی سیکورٹی کا کوئی افسر نظر آ رہا تھا۔

''ولیہ! یہ تم نے اچھا کام کیا' ہمارے پاس بھی کے پی ٹی پر کام کرنے والے ورکر کا یونیفارم ہے' ہم وہ پہن لے گا۔''

''تیمور اور عمران میرے مہمانوں کی حیثیت سے جائیں گے۔'' ہاشم نے کہا۔ ''میں نے احتیاطاً غوطہ خوری کے لباس کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔''

روانگی سے پہلے اچانک ہاشم نے کہا۔ ''نادیہ! تم بھی ہمارے ساتھ جا رہی ہو' جاؤ اور جلدی سے تیار ہو کر آؤ۔''

''ہاشم!'' میں نے کہا۔ ''نادیہ کو اس خطرے میں کیوں شریک کر رہے ہو؟''

''تم نادیہ کے سلسلے میں خاصے جذباتی ہو اس لیے عقل سے کام نہیں لیتے۔'' ہاشم نے کہا۔ ''نادیہ ان کے اسٹیمر کے پاس جا کر سیٹھ عبدالمنان کے اسٹیمر کا پتا پوچھے گی تو وہ لوگ فوراً ایک خوب صورت اور تنہا لڑکی سے ہمدردی جتانے کو باہر نکل آئیں گے۔ نادیہ ان سے مسکرا کر بات کرے گی تو وہ اپنی بوٹ اور اسٹیمر سب کچھ بھول جائیں گے اور ان کی کوشش ہوگی کہ وہ نادیہ کو بھی اندر لے جائیں۔'' ہاشم مسکرا کر بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تمہیں یہ بات بہت بری لگ رہی ہے لیکن اس وقت کوئی خوب صورت لڑکی ملنے کی نہیں اور اگر مل بھی گئی تو میں اس پہ اعتبار کرنے کو تیار نہیں ہوں۔''

نادیہ تیار ہو کر باہر آ گئی تو میں حیران رہ گیا۔ اس نے ٹائٹ جینز' جیکٹ اور جوگرز پہن رکھے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار بھی ہوگا۔

''کیا نعیم یا عامر میں سے کسی کو ساتھ لے لیں؟'' تیمور نے پوچھا۔

''وہاں زیادہ بھیڑ بھاڑ کی ضرورت نہیں ہے۔ نادیہ کو بھی میں مجبوراً لے جا رہا ہوں۔ ممکن ہے' اس کی ضرورت ہی نہ پڑے۔'' ہاشم نے کہا۔

پھر ہم لوگ گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ ہاشم نے لینڈ کروزر کا انتخاب کیا تھا جو چلتا پھرتا اسلحہ خانہ تھی۔

اسٹیئرنگ پر ہاشم تھا' اس کے ساتھ بلوچ بیٹھا تھا۔ عقبی نشست پر میرے ساتھ تیمور اور نادیہ تھے۔

ہم لوگ مین روڈ پر آئے تو بلوچ نے کہا۔ ''ولیہ......! آگے سے دوسری گلی میں ایک خالی پلاٹ پر میری گاڑی کھڑی ہے۔ میں بھی اپنا یونیفارم پہن لوں اور اپنا دوسرا سامان گاڑی میں سے نکال لوں۔''

بلوچ کی گاڑی مطلوبہ جگہ پر موجود تھی۔ ہاشم نے اس سے کچھ فاصلے پر اندھیرے میں گاڑی روک دی۔ بلوچ گاڑی سے اتر کر اندھیرے میں کہیں غائب ہو گیا۔

مشکل سے دس منٹ بعد وہ واپس آیا تو کے پی ٹی کے ورکرز کے یونیفارم میں تھا۔ اس کے کندھے سے ایک بھاری بیگ لٹک رہا تھا۔ اس کے بعد ہاشم نے گاڑی اسٹارٹ کی اور جب تک مین روڈ پر نہیں آ گیا' اس کے ہیڈ لیمپس نہیں کھولے۔ مین روڈ پر آتے ہی اس نے گاڑی کو برق رفتاری سے دوڑانا شروع کر دیا۔

کچھ دور چلنے کے بعد اس نے گاڑی ایک طرف روک دی اور نادیہ سے کہا۔ ''نادیہ! تم فرنٹ سیٹ پر آ جاؤ۔ اگر پولیس کی کسی پارٹی نے روکا بھی تو وہ تمہیں دیکھ کر ہمیں فوراً جانے کی اجازت دے دیں گے پھر پورٹ میں داخلے کے وقت بھی وہاں کے گارڈز زیادہ سختی نہیں کریں گے۔ خواتین کو دیکھ کر عموماً سیکورٹی اور پولیس والے زیادہ چھان بین نہیں کرتے۔''

بلوچ اتر کر عقبی نشست پر بیٹھ گیا اور نادیہ فرنٹ سیٹ پر جا بیٹھی۔ گاڑی ایک مرتبہ پھر تیز رفتاری کے ریکارڈ توڑتی ہوئی پورٹ کی طرف بڑھی۔

کے پی ٹی کے مین گیٹ پر موجود سیکورٹی اہل کار نے جب ہاشم کو آفیسر کی یونیفارم میں دیکھا تو اس نے فوراً بیریئر ہٹا دیا۔ وہ نہ صرف ہاشم کی وردی سے مرعوب ہو گئے تھے بلکہ لینڈ کروزر اور اس کے ساتھ بیٹھی نادیہ سے بھی مرعوب ہوئے تھے۔

ہاشم لینڈ کروزر اندر لے گیا اور اسے ایک مخصوص جگہ پر پارک کر دیا جہاں پہلے بھی چند گاڑیاں موجود تھیں لیکن اندھیرے میں ان کے صرف ہیولے نظر آ رہے تھے۔

''واجہ......!'' بلوچ نے کہا۔ ''ابھی ادھر سے ایک راستہ سیدھا جیٹی کی طرف جاتا ہے۔''

''اس راستے پر کسی گارڈ سے مڈبھیڑ ہو سکتی ہے۔'' ہاشم نے کہا۔ ''وہاں عمران' تیمور اور نادیہ کی موجودگی کا کیا جواز ہوگا؟''

''بات تو آپ کا ٹھیک ہے۔'' بلوچ نے کہا۔

ہم لوگ سیدھے راستے ہی سے تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جیٹی پر آگے بڑھتے رہے۔ وہاں کئی جگہ روشنی بھی تھی۔ کچھ دور چلنے کے بعد ہمیں پہلا دیو پیکر جہاز دکھائی دیا۔ اس میں روشنی ہو رہی تھی اور لوگوں کے ہنسنے بولنے کی آوازیں باہر تک آ رہی تھیں۔ وہ انڈونیشیا کا مال بردار جہاز تھا۔

مزید کچھ دور چلنے کے بعد اور کچھ جہازوں کو پیچھے چھوڑنے کے بعد ہم لوگ اس علاقے میں پہنچ گئے جہاں چھوٹے اسٹیمرز لانچز اور بوٹس کھڑی تھیں۔

وہاں پہنچ کر ہاشم اور بلوچ مجھے چیتے کی طرح چوکنا نظر آنے لگے اور وہاں سے کچھ فاصلے پر چلے گئے تاکہ اسٹیمر میں سوار کوئی شخص ہمیں دیکھ نہ سکے۔ ہاشم نے اشارے سے بتایا کہ وہ سامنے جو بڑا اسٹیمر ہے' وہ مشہدی کا ہے۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک اسی سائز کا اسٹیمر اور تھا۔ بلوچ نے بتایا کہ وہ اسٹیمر سیٹھ عبدالمنان کا ہے۔ اس میں صرف اس وقت دو آدمی ہوں گے۔ یہ اسٹیمر ہفتے میں دو دفعہ مچھلی کے شکار کے لیے کھلے سمندر میں جاتا ہے۔ اب یہ دو دن بعد جائے گا تو اسٹیمر کا دوسرا اسٹاف بھی آ جائے گا۔

''میرا خیال ہے کہ ہم سیٹھ عبدالمنان کے اسٹیمر پر چلیں۔'' میں نے کہا۔ ''وہاں سے مشہدی کے اسٹیمر میں جانے میں آسانی ہوگی۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔'' ہاشم نے کہا۔

پھر ہم ایک لمبا چکر کاٹ کر سیٹھ عبدالمنان کے اسٹیمر گلیکسی تک پہنچے۔ اس کا نام جلی حروف میں لکھا تھا اور اندھیرے میں بھی چمک رہا تھا۔ اسٹیمر کے اندر بھی زیادہ روشنی نہیں تھی۔ اسٹیمر میں جو لوگ بھی تھے' وہ اس وقت شاید سو رہے تھے۔

اسٹیمر تک جانے کے لیے لکڑی کے تختوں کا ایک چھوٹا سا پل تھا۔

سب سے پہلے بلوچ نے اس پر پاؤں رکھا تو لکڑی کا وہ پل ہلنے لگا۔ وہ پھونک پھونک کر ایک قدم رکھتا ہوا اسٹیمر تک پہنچ گیا اور آہستہ سے کود کر اس میں داخل ہو گیا۔ اس نے اپنے کندھے پر جو بھاری بیگ اٹھا رکھا تھا' اس کی وجہ سے اسے دقت پیش آ رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں ریوالور یا ماؤزر تھا اور دوسرے ہاتھ میں پنسل ٹارچ تھی۔

اوپر پہنچ کر اس نے ٹارچ سے مخصوص اشارہ کیا تو ہاشم نے پل پر قدم رکھ دیا۔ وہ بھی بہت آہستگی سے پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا اسٹیمر تک پہنچ گیا۔ اس نے ہم لوگوں کو اسی جگہ پر رکنے کا مشورہ دیا تھا لیکن میں نے ان کے مشورے پر عمل نہیں کیا۔ میں نے نادیہ کو تیمور کے ساتھ چھوڑا اور خود پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا لکڑی کے اس پل پر چلنے لگا۔ لکڑی کے پل پر چلتے ہوئے میں بری طرح ڈول رہا تھا۔ ہاشم اور بلوچ تو شاید اس قسم کے پلوں پر چلنے کے عادی تھے لیکن میرے لیے یہ تیسرا یا چوتھا اتفاق تھا۔ اس سے پہلے میں جب بھی راشد کے ساتھ مچھلی کے شکار پر جاتا تھا تو کبھی کبھی اس قسم کے پل پر چلنے کا موقع ملتا تھا ورنہ اس کی بوٹ میں ہمیں ہوڑے (مچھلی پکڑنے کا چھوٹا جہاز) تک پہنچا دیتی تھی۔

میں اوپر پہنچا تو بلوچ اور ہاشم میرے منتظر تھے۔ پورے اسٹیمر پر سناٹا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہاں کوئی ذی روح ہی نہ ہو۔

ہاشم نے ایک مرتبہ پھر ارد گرد کا جائزہ لیا۔ وہ خاصا بڑا اسٹیمر تھا۔ سیٹھ منان شاید اسے تفریح کے لیے بھی استعمال کرتا تھا۔ اس میں تین کیبن بھی تھے لیکن ان میں اس وقت اندھیرا تھا۔

ہاشم نے سرگوشی میں کہا۔ ''اگر وہ لوگ یہاں نہیں ہیں تو پھر انجن روم میں ہوں گے اور وہاں چائے وغیرہ پی رہے ہوں گے۔ آپ لوگ یہیں ٹھہریں' میں آگے کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔''

میں اور بلوچ وہیں ایک لائف بوٹ کی آڑ میں چھپ گئے۔

ہاشم آگے بڑھا ہی تھا کہ اچانک مجھے ایک اور ہیولیٰ نظر آیا جو دبے قدموں ہاشم کے پیچھے بڑھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں شاید لوہے کی کوئی راڈ یا ڈنڈا تھا۔

بلوچ پھرتی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور اس سے پہلے کہ وہ ہاشم پر وار کرتا' اس نے پیچھے سے اس شخص کو دبوچ لیا۔ وہ خاصا جان دار آدمی تھا۔ وہ پلٹ کر بلوچ سے لپٹ گیا۔ اس کے ہاتھ سے ڈنڈا چھوٹ کر گرا تو مجھے اس کی آواز سے اندازہ ہوا کہ وہ لوہے کا راڈ ہے۔ بلوچ نے اسے دو ٹکروں ہی میں ناک آؤٹ کر دیا۔

دھینگا مشتی کی خفیف سی آوازیں سن کر ہاشم بھی پلٹ آیا تھا۔

اس نے کہا۔ ''ہم سے غلطی ہو گئی۔ پہلے ہمیں ان کیبنوں کا جائزہ لینا چاہیے تھا۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو واجہ! اگر ان کیبن میں اندھیرا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس میں کوئی آدمی بھی نہیں ہوگا۔''

بلوچ نے محتاط انداز میں آگے بڑھ کر پہلے کیبن کے دروازے پر ہاتھ رکھا تو وہ لاک تھا' دوسرے کیبن کا دروازہ ہاتھ رکھتے ہی آہستہ سے کھل گیا۔ اندر ہلکی روشنی ہو رہی تھی اور منظر بہت عجیب تھا۔ ایک نوجوان لڑکی اور لڑکا کیبن کے فکس بیڈ پر راز و نیاز میں مصروف تھے۔ وہ ایک دوسرے میں اتنے گم صم تھے کہ انہیں دروازہ کھلنے کی آواز ہی سنائی نہیں دی۔

ہاشم نے دیوار پہ ٹٹول کر سوئچ بورڈ تلاش کیا اور اچانک لائٹ آن کر دی۔ کمرا اینگلوں روشنی سے اچانک تیز روشنی میں نہا گیا۔

لڑکی کے منہ سے ہلکی سی ایک چیخ نکل گئی۔ نوجوان بھی بوکھلا کر ہماری طرف مڑا۔ لڑکی جلدی جلدی اپنا لباس درست کرنے لگی۔

وہ نوجوان ہاشم کو کے پی ٹی کا کوئی آفیسر سمجھا تھا۔ وہ درشت لہجے میں بولا۔ ''کیا بات ہے آفیسر؟ تم اوپر کیسے آئے؟''

''تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟'' ہاشم نے سخت لہجے میں سوال کیا۔

''میں اس اسٹیمر کا مالک ہوں۔'' نوجوان نے کہا۔ ''میرا نام سلمان ہے۔ میں سیٹھ منان کا بیٹا ہوں۔''

''لیکن تمہاری یہاں آمد کی کوئی اینٹری نہیں ہے۔'' ہاشم نے اندھیرے میں تیر پھینکا۔ ''اور یہ لڑکی کون ہے؟ اس کی بھی کوئی entry رجسٹر میں نہیں ہے۔ تم پورٹ کی حدود میں بلا اجازت داخل کیسے ہوئے؟''

''تم میرے باپ کو جانتے ہو؟'' اس نے درشت لہجے میں ہاشم سے پوچھا۔

''میں تمہارے باپ اور دادا کو بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔'' ہاشم نے جواب دیا۔ ''لیکن یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔ تم پورٹ کے علاقے میں داخل کیسے ہوئے؟ تمہارے پاس کسی قسم کا کوئی اینٹری پاس ہے؟''

''میرے پاس سب کچھ ہے لیکن تم یہاں میری اجازت کے بغیر کیوں آئے؟'' نوجوان بپھر کر بولا۔

''تمہاری اجازت!'' ہاشم نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''اس کا جواب تو تم چیف سیکورٹی آفیسر پھر پولیس کو دینا۔ میں تمہیں گرفتار کر رہا ہوں۔'' ہاشم نے ریوالور نکال کر اس پر تان لیا۔

''کک...... کیا مطلب؟'' وہ نوجوان ہکلا کر بولا۔ ''تم مجھے گرفتار کیوں کر رہے ہو؟''

''اس کا مطلب بھی تمہیں چیف سیکورٹی آفیسر ہی بتائے گا۔'' ہاشم کا انداز جارحانہ تھا۔

"دیکھو آفیسر! ہم برسوں سے یہی کاروبار کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارا ایک ہوڑا (ماہی گیری کی بوٹ) بھی ہے۔ ہم لوگوں کا کام ایک دوسرے کے تعاون سے چلتا ہے۔ تم میرے ساتھ تعاون کرو میں تمہارے ساتھ تعاون کروں گا۔" اس نے کہا۔

"مثلاً کیسا تعاون کرو گے؟" ہاشم نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"آپ جو بھی حکم کریں میں اسے پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے پولیس یا سیکورٹی فورس سے کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن شمائلہ ایک باعزت خاندان کی لڑکی ہے۔ اگر آپ نے ہمیں گرفتار کرلیا تو صبح تک میڈیا اس خبر کو بہت بری طرح اچھالے گا۔"

"اچھا تو یہ بات ہے؟" ہاشم نے کہا۔ "یہاں تمہارے علاوہ اور کتنے آدمی ہیں؟"

"صرف دو آدمی ہیں' ایک آدمی انجن روم میں ہے اور دوسرا باہر ڈیک (deck) پر ہوگا۔"

"باہر ڈیک والا آدمی تو بے ہوش پڑا ہے۔"

"تم نے اسے ماردیا؟" سلمان چونک کر بولا۔

"میں نے کہا ہے کہ وہ بے ہوش پڑا ہے۔" ہاشم نے درشت لہجے میں کہا۔ "تمہارے اس آدمی کو اسٹیمر چلانا آتا ہے جو انجن روم میں موجود ہے؟"

"نہیں۔" سلمان نے جواب دیا۔ "وہ تو صرف ہیلپر ہے۔"

"اگر تم اسے بلانا چاہو تو کیسے بلاؤ گے؟" ہاشم نے پوچھا۔

"اس کے پاس سیل فون ہے۔ میں اسے کال کر کے بلا سکتا ہوں۔"

"تو پھر اسے یہاں بلاؤ۔"

"تم کرنا کیا چاہتے ہو؟" سلمان درشت لہجے میں بولا۔

"اگر گرفتاری سے بچنا ہے تو وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔" ہاشم نے کہا پھر وہ بلوچ سے مخاطب ہوا۔ "باہر جو آدمی بے ہوش پڑا ہے' اس کے ہاتھ باندھ کر اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر کسی کونے میں ڈال دو۔"

بلوچ فوراً ہی باہر نکل گیا۔

سلمان نے اپنا سیل فون اٹھایا اور نمبر ملا کر بولا۔ "قاسو! ذرا اوپر میرے کیبن میں آؤ۔"

دو منٹ سے بھی کم عرصے میں بلوچ اپنا کام کر کے واپس آگیا۔ اس کے پیچھے پیچھے قاسو بھی کیبن میں داخل ہوا۔ وہ کیبن کا منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔

ہاشم نے اچانک ریوالور کا دستہ قاسو کے سر پہ رسید کر کے اسے ناک آؤٹ کردیا۔ لڑکی کے منہ سے ایک سریلی چیخ نکلی۔ اس سے پہلے کہ قاسو فرش پر گرتا' ہاشم نے اسے ہاتھوں میں تھام لیا اور بہت احتیاط سے فرش پہ رکھ دیا۔

"یہ تم نے کیا کیا آفیسر؟" سلمان تلخ لہجے میں بولا۔

ہاشم نے آگے بڑھ کر سلمان کے سر پہ بھی ریوالور کا دستہ رسید کردیا۔ لڑکی پھر سریلے انداز میں چیخی۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کی دونوں کہنیاں دبا دیں۔ اس نے تھوڑی سی مزاحمت کی' میرے ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی پھر میرے ہاتھوں میں جھول گئی۔

"بلوچ......!" ہاشم نے کہا۔ "ان سب کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان کے منہ میں کپڑا ٹھونس دو' جلدی کرو' میں اسٹیمر اسٹارٹ کرنے جارہا ہوں۔ میں اسٹیمر کو مشہدی کے اسٹیمر کے ساتھ لگادوں گا پھر وہاں سے ہم مشہدی کے اسٹیمر میں چلے جائیں گے۔"

بلوچ نے وہیں کا ایک پردہ پھاڑ کر اس کی پٹیاں بنائیں اور ان پٹیوں کو نہ صرف ہاتھ پر باندھ دیے بلکہ اس کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونس دیا۔

میں نے باہر نکل کر سلمان کے کیبن کا دروازہ بند کر دیا۔
اس وقت مجھے اسٹیمر اسٹارٹ ہونے کی ہلکی سی آواز آئی۔ ہاشم نے اسٹیمر اسٹارٹ کر لیا تھا۔
سمندر کی لہروں کے شور میں اسٹیمر کے انجن کی آواز دب کر رہ گئی تھی۔ بلوچ نے لنگر اٹھائے اور بوٹ آہستگی سے مشہدی کے اسٹیمر کی طرف بڑھنے لگی۔
مشہدی کے اسٹیمر کے نزدیک پہنچ کر میں نے دوربین سے اس کا جائزہ لیا۔ مجھے ڈیک پر دو مسلح آدمی دکھائی دیے۔ اسٹیمر کو اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ دونوں بھی اب ڈیک کے سرے پر آ گئے تھے اور غور سے اسٹیمر کو دیکھ رہے تھے۔
میں نے سلمان کے اسٹیمر کی ڈیک لائٹ آن کر دی اور بلند آواز میں ان سے پوچھا۔ ”آپ لوگوں کے پاس فرسٹ ایڈ باکس ہے؟ اس اسٹیمر کا ایک آدمی زخمی ہو گیا ہے اور ان کا فرسٹ ایڈ باکس بالکل خالی ہے۔“
”فرسٹ ایڈ باکس تو ہے سر، لیکن......“
”میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ میں نے کہا اور کود کر ان کے اسٹیمر پر چلا گیا۔
وہ دونوں بار بار اپنی گنوں پر ہاتھ مار رہے تھے لیکن میرے پیچھے انہیں ہاشم بھی نظر آ رہا تھا اس لیے وہ مجھ پہ گن بھی نہیں تان سکتے تھے۔
”جلدی کرو والیو......!“ ہاشم نے کہا۔ ”زخمی کی جان خطرے میں ہے۔“ یہ کہہ کر وہ بھی کود کر مشہدی کے اسٹیمر پر آ گیا۔
پھر میں نے اچانک ایک آدمی کو دبوچ لیا اور اس کی گن چھین کر دور پھینک دی۔ ہاشم نے دوسرے آدمی کے ساتھ یہ ہی سلوک کیا۔ اس وقت تک بلوچ بھی اسٹیمر پر آ چکا تھا۔
میں نے اپنی گن نکال کر ان میں سے ایک کی کنپٹی پر رکھ دی اور درشت لہجے میں اس سے پوچھا۔ ”اس بوٹ پر کتنے آدمی ہیں؟“
”ہمارے علاوہ پانچ آدمی اور ہیں۔“ اس نے جلدی سے جواب دیا۔
”شہاب کس کیبن میں ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”وہ درمیان والے کیبن میں ہیں لیکن اس وقت سو رہے ہوں گے۔“
”اور باقی چار آدمی‘ وہ آخری کیبن میں ہیں۔ وہ بھی شاید سو رہے ہوں گے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کیوں کہ وہاں سے کوئی آواز نہیں آ رہی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک تو وہ لوگ تاش کھیل رہے تھے۔“
وہ آدمی شاید سوگیا تھا اور ابھی تک اس قسم کی صورتِ حال سے گزرا نہیں تھا اس لیے موت کے خوف سے سب کچھ جلدی جلدی بتا رہا تھا۔
ہاشم نے اچانک اپنے شکار کو ناک آؤٹ کر دیا۔ میں نے بھی اپنے شکار کی کنپٹی پر ہلکا سا ایک ہاتھ مارا اور وہ تیورا کر فرش پر گر گیا۔
پھر ہم آخری کیبن کی طرف بڑھ ہی رہے تھے کہ کوئی درشت لہجے میں بولا۔ ”خبردار! اپنے ہتھیار پھینک دو اور زمین پر اوندھے لیٹ جاؤ۔“
میں نے گھوم کر دیکھا‘ وہ کوئی مقامی بلوچ ہی تھا اس لیے مجھے یہ تو اطمینان تھا کہ وہ شہاب نہیں ہے۔ میں نے زمین پر لیٹتے ہوئے اچانک اس کی کھوپڑی پر بے آواز فائر کر دیا۔
وہ الٹ کر گرا تو ہاشم اور بلوچ تیزی سے اسٹیمر کے آخری کیبن کی طرف بڑھ گئے۔
ان دونوں نے اپنے ریوالور نکال لیے تھے۔ ہاشم کے دونوں ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ اس نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی تو اندر سے کوئی گالی دے کر بولا۔ ”......اندر آ جانا‘ کیا باہر سے ٹھک ٹھک کر رہا ہے؟“
بلوچ نے ایک دم کیبن کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہاشم تھا۔ کیبن میں ہلکی روشنی کا بلب

جل رہا تھا' میں نے ٹٹول کر سوئچ بورڈ تلاش کیا اور کیبن میں روشنی کر دی۔

وہ تینوں ہکا بکا ہو کر ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے اپنی گن کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میں نے اچانک اس پہ بے آواز فائر کر دیا' گولی اس کی گردن سے پار ہو گئی۔ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''کوئی حرکت نہیں کرے گا......''

''شہاب کون ہے تم لوگوں میں؟'' میں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

''وہ برابر والے کمرے میں ہیں' اُن کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے۔''

بلوچ نے آگے بڑھ کر ان کی کھوپڑیوں پر بھی اپنے ریوالور کے دستے سے وار کیا اور وہ تینوں بے ہوش ہو گئے۔

''ان لوگوں کو زندہ چھوڑنا ہے یا پھر ختم کر دیں؟'' بلوچ نے کہا۔

''زندہ کیوں چھوڑیں؟'' ہاشم نے کہا۔ ''یہ سب مشہدی کے نمک خوار ہیں۔ اس نے ہمارے ساتھ کون سی رعایت کی ہے جو ہم کوئی رعایت کریں۔'' اس کے ریوالور سے تین بے آواز فائر ہوئے اور باقی تینوں آدمی موت کی اندھی وادیوں میں اتر گئے۔

''اب ہمیں شہاب عرف شبو کو زندہ پکڑنا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہم جانتا ہے واجہ!'' بلوچ نے کہا۔ ''وہی تو اس کہانی کا ہیرو ہے۔''

ہم لوگ باہر آئے تو بلوچ نے باہر والے دونوں آدمیوں کو بھی باری باری اس دنیا سے رخصت کر دیا۔

پھر ہم درمیانی کیبن کی طرف بڑھے۔ ہاشم نے کیبن پر دستک دی کیوں کہ دروازہ اندر سے بند تھا۔

''کون ہے؟'' اندر سے ایک مخمور آواز سنائی دی۔

''واجہ! باہر کوسٹ گارڈ والا آیا ہے۔'' بلوچ نے حتی المقدور اپنی آواز بدلنے کی کوشش کی۔

''کیا بکتے ہو؟'' اندر سے آواز آئی پھر فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔

اس نے جوں ہی دروازہ کھولا' میں نے اسے دھکیل کر کیبن کے اندر کیا اور اپنا ریوالور اس کی کنپٹی پر رکھ دیا۔ ''اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا شہاب!'' میں نے سفاک لہجے میں کہا۔ ''ورنہ میں نے جہاں تمہارے چھ آدمیوں کو مارا ہے' وہاں تمہیں بھی مار سکتا ہوں۔''

''تم نے...... تم نے...... میرے آدمیوں کو ہلاک کر دیا؟'' اس نے ہذیانی لہجے میں کہا۔

ہاشم نے اندر داخل ہو کر کمرے میں روشنی کر دی۔ کمرے میں ایک لڑکی بھی موجود تھی۔ لڑکی کہنا غلط ہے' وہ کافی پکی عمر کی عورت تھی لیکن تھی بہت خوب صورت اور پرکشش! اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ وہ بس پلکیں جھپکا جھپکا کر ہمیں دیکھ رہی تھی۔

''کون ہو تم لوگ؟'' شبو نے کہا۔ ''وہ اب کافی حد تک سنبھل گیا تھا۔''

''ہم لوگ موت کے فرشتے ہیں۔'' میں نے کہا پھر بلوچ سے مخاطب ہوا۔ ''ان دونوں کے ہاتھ پیر باندھو اور انہیں باہر لے چلو۔''

بلوچ نے پھرتی سے وہاں پڑی ہوئی ایک چادر پھاڑی اور ان دونوں کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ اس سے بغیر کہے ان کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونس دیا۔

''بلوچ!'' میں نے کہا۔ ''تم اپنی بوٹ لے کر آؤ۔''

بلوچ نے جیب سے سیل فون نکالا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ چند منٹ بعد ہمیں موٹر بوٹ کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ اسٹیمر پر رسی کی سیڑھیاں بھی موجود تھیں۔ بلوچ نے شبو کو آٹے کی بوری کی طرح اپنے کندھے پر لادا اور رسی کی سیڑھی سے بوٹ میں اتر گیا۔

ہاشم نے اس عورت کو کندھے پر اٹھایا پھر وہ بھی بوٹ پر اتر گئے اور عورت کو بوٹ میں چھوڑ کر پھر واپس آ گیا۔

''ابھی سلمان کے اسٹیمر کو اس کی جگہ پر واپس پہنچانا ہے' ان لوگوں کے ہاتھ پیر کھولنا ہیں۔''

''تم اکیلے یہ کام کر لو گے؟'' میں نے کہا۔

''یہ کون سا مشکل کام ہے۔'' ہاشم نے کہا۔ ''آپ رسی کی سیڑھی کے ذریعے بوٹ میں اتر جائیں تاکہ میں سیڑھی اوپر کھینچ لوں پھر میں یہیں سے کود کر سلمان کے اسٹیمر پر چلا جاؤں گا۔''

میں رسی کی سیڑھی سے بوٹ میں اتر گیا۔ وہ بوٹ چھوٹی تھی لیکن اس میں ایک کشادہ کیبن موجود تھا۔ میں نے بلوچ کو بتایا کہ ہاشم' سلمان کی بوٹ واپس چھوڑ کر ادھر آئے گا۔

''واجہ......! آپ تیمور اور اس بی بی کو بھول گئے ہو۔ وہ دونوں تو ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ ہاشم صاحب سے بولو کہ شبو سے ہم نمٹ لیں گے' وہ تیمور اور اس بی بی کو لے کر واپس چلا جائے۔ ویسے بھی اب اتنے لوگوں کا کام نہیں ہے۔''

میں نے ہاشم سے سیل پر اسے کال کی اور اسے تیمور اور نادیہ کے بارے میں بتایا۔

''اوشٹ......'' ہاشم نے کہا۔ ''میں تو تیمور کو بالکل بھول ہی گیا تھا۔''

''تم ایسا کرو کہ سلمان کے اسٹیمر کو اسی جگہ چھوڑ کر تیمور اور نادیہ کو لے کر واپس چلے جاؤ۔ وہ لوگ اکیلے تو باہر ہی نہیں نکل سکیں گے۔ شبو سے ہم لوگ نمٹ لیں گے۔''

''یہی کرنا پڑے گا۔'' ہاشم نے کہا۔ ''مجبوری ہے یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں تیمور اور نادیہ کو لے کر بوٹ پر آ جاؤں؟''

''یہاں اتنے لوگوں کی ضرورت نہیں ہے۔ نادیہ یوں بھی پریشان ہو رہی ہو گی۔ تم......''

''او کے' او کے!'' ہاشم ہنس کر بولا۔ میں ان دونوں کو لے کر گھر چلا جاتا ہوں۔ مجھے اتنا تو یقین ہے کہ آپ اور بلوچ' شبو کی دکان کھلوا لیں گے۔''

''بلوچ بھی اس سلسلے میں باہر ہے اور میں بھی۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''تم فکر مت کرو' ایک گھنٹے میں وہ سب کچھ اگل دے گا۔''

''او کے' وش یو گڈ لک!'' ہاشم نے کہا۔

میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور بلوچ سے کہا کہ بوٹ کو کھلے سمندر میں لے چلو۔

بلوچ نے اپنے آدمی کو حکم دیا کہ بوٹ کا رخ کھلے سمندر کی طرف کر دو۔

بوٹ تیزی سے روانہ ہو گئی۔ اس کی اسپیڈ بھی خاصی تھی اور انجن بھی خاصا طاقتور لگ رہا تھا۔

جب بوٹ کھلے سمندر میں پہنچ گئی تو بلوچ اس کیبن میں داخل ہوا جہاں ہم نے شبو کو رکھا تھا۔ بلوچ نے اس کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکالا تو وہ گہرے گہرے سانس لینے لگا پھر بولا۔ ''تم لوگ جو کوئی بھی ہو' مشہدی تمہیں نہیں چھوڑے گا۔''

''ابھی تو تم اپنی فکر کرو شبو!'' بلوچ نے اچانک بلوچی میں کہا۔

ان لوگوں کے ساتھ رہ کر میں بھی اتنی بلوچی تو سیکھ ہی گیا تھا کہ بلوچ کی بات کا مفہوم سمجھ سکوں۔

''کون شبو؟'' شبو نے اُردو میں کہا۔ ''میرا نام شہاب ہے اور میں مشہدی صاحب کی بوٹ' اسٹیمر اور ہوڑوں کا نگراں ہوں۔''

''زیادہ بکواس کرے گا تو ابھی ذبح کر کے سمندر میں پھینک دوں گا۔ تجھ سے جو کچھ پوچھا جائے' بالکل سچ سچ بتانا۔ ہمارے پاس وقت کم ہے تو نے اگر آدھے گھنٹے کے اندر اندر زبان نہ کھولی تو میں واقعی تجھے ذبح کر کے سمندر میں پھینک دوں گا۔''

''اور اگر زبان کھول دی تو؟'' شبو نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''تو پھر ہم بھی تجھے کھول دیں گے۔'' بلوچ نے کہا۔

''پوچھو کیا پوچھنا ہے؟'' شبو نے کہا۔

''ارسلان کہاں ہے؟'' میں نے اچانک پوچھا۔

"کون ارسلان؟" شبو نے چونک کر پوچھا۔
ہاشم نے اس کے چہرے پر زناٹے دار تھپڑ رسید کر دیا اور بولا۔ "میں نے کہا تھا کہ سچ بولنا تو ارسلان کو نہیں جانتا؟"
"وہ...... ارسلان جو عمران کا بھائی تھا؟" اس نے پوچھا۔
"ہاں' وہی ارسلان!" میں نے کہا۔
"وہ تو مر گیا تھا واجہ......!" شبو نے کہا۔
بلوچ نے اپنی پنڈلی میں بندھا ہوا باریک پھل کا خنجر نکالا اور بے دردی سے شبو کی ران پر ایک گہرا چرکا لگا کر بولا۔ "اگر اِدھر اُدھر کی ہانکنے کی کوشش کی تو زندہ تیرے بدن کی کھال اتار لوں گا۔"
شبو اس وقت ڈھیلے ڈھالے پاجامے اور ٹی شرٹ میں تھا اس لیے چرکا کچھ گہرا ہی لگ گیا۔ جینز ہوتی تو شاید اس کی کھال کی کچھ حفاظت کرتی۔ اس کی ران سے خون بہنے لگا لیکن اس نے دونوں ہونٹ بھینچ کر اپنی تکلیف کو روکا اور بولا۔ "میں تم سے جو کچھ کہہ رہا ہوں' سچ کہہ رہا ہوں۔"
"ارسلان کہاں ہے؟" بلوچ نے ایک مرتبہ پھر درشت لہجے میں پوچھا۔
"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کس ارسلان کی بات کر رہے ہو؟" شبو نے کہا۔ "میں دو تین ایسے بندوں کو جانتا ہوں جن کا نام ارسلان ہے۔"
بلوچ نے اس کی دوسری ران پر خنجر سے چرکا لگایا اور بولا۔ "ساری کہانی سننے کے بعد کہہ رہا ہے کہ ارسلان کون؟ ارسلان' عمران کا بھائی۔ اس کی ایک بہن شائستہ بھی ہے جسے مشہدی نے اغوا کر رکھا ہے۔"
"اچھا' تم اُس ارسلان کی بات کر رہے ہو جو ایک کروڑ پتی بزنس مین کا بیٹا تھا؟"
"ہاں' میں اُسی ارسلان کی بات کر رہا ہوں۔" بلوچ نے کہا۔
"میں نے بتایا تو ہے کہ بم کے دھماکے میں......"
بلوچ نے پھر اس کی ران پر ایک چرکا لگایا اور بولا۔ "میں صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔" اس مرتبہ ضبط کے باوجود شبو کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکل ہی گئی۔
"اسے مت مارو پلیز......!" عورت نے پہلی دفعہ زبان کھولی۔ بلوچ نے اس کا منہ بھی کھول دیا تھا۔
"تمہارا اس سے کیا رشتہ ہے؟" میں نے پوچھا۔ "یہ تمہیں ایک رات کے لیے لایا ہوگا' تمہارے پیسے تمہیں مل جائیں گے بلکہ میں تمہیں دگنے پیسے دلواؤں گا۔ تم کچھ مت کرو۔ اگر یہ مر بھی گیا تو پیسے بھی دوں گا۔"
"مجھے گالی مت دو......" عورت بپھر کر بولی۔ "میں کوئی آوارہ یا بدچلن عورت نہیں ہوں بلکہ شہاب کی بیوی ہوں۔"
اُس کے اس انکشاف سے میں سناٹے میں آ گیا۔
"تم اس کی بیوی ہو؟" میں نے پوچھا۔
"ہاں' میں اس کی قانونی بیوی ہوں۔ ہمارا باقاعدہ نکاح ہوا ہے اور ہمارا ایک بیٹا بھی ہے۔ اُسے میں اپنی ماں کے پاس چھوڑ کر آئی ہوں۔ شہاب مجھے پہلی دفعہ تو سمندر کی سیر کے لیے لایا تھا۔"
"تو پھر اس سے کہو کہ یہ سچ بولے ورنہ تم بیوی سے بیوہ ہو جاؤ گی۔"
"شہاب کبھی جھوٹ نہیں بولتا ہے۔" اس کی بیوی نے پر یقین لہجے میں کہا۔
"اچھا......!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "کیا تم اسے بچپن سے جانتی ہو؟"
"کسی کو جاننے کے لیے بہت لمبا عرصہ درکار نہیں ہوتا۔" وہ عورت بولی۔ "آپ کسی کو ایک دن میں بھی جان سکتے ہیں' ایک گھنٹے میں بھی اور ایک پل میں بھی!"
"تم تو مجھے پڑھی لکھی بھی لگتی ہو؟" میں نے کہا۔
"میں صرف لگتی ہی نہیں ہوں بلکہ پڑھی لکھی ہوں بھی۔" عورت نے کہا۔ "میں نے گریجویشن کیا ہے۔"

"تو پھر شہاب کا اصل نام بتا دو' وہ نام جس سے یہ پہلے مشہور تھا؟" میں نے کہا۔ "اس نے تم سے تو سچ بولا ہوگا اور یہ بھی بتایا ہوگا کہ اُس وقت یہ کیا کرتا تھا؟"
"میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ میرے شوہر کا نام شہاب بلوچ ہے اور یہ ایک شپنگ کمپنی کا سپروائزر ہے۔" اس نے جواب دیا۔
"اس پہ تمہیں دعویٰ ہے کہ یہ سچ بولتا ہے؟ اس سے پوچھو کہ اب سے دس سال پہلے یہ کہاں رہتا تھا؟ اور اب کیا کرتا ہے؟ دس سال پہلے یہ کس نام سے مشہور تھا؟"
"دس سال پہلے یہ اپنے باپ کے ساتھ کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹاتا تھا۔" عورت نے کہا۔ "اس کا باپ آلو' پیاز وغیرہ کا آڑھتی تھا۔"
"قصے کہانیاں بہت ہو گئیں شبو!" بلوچ نے کہا۔ "تو نے تو اپنی بیوی کو بھی دھوکے میں رکھا ہے۔ اب بتا' سچ بولے گا یا بے غیرتوں کی طرح اپنی بیوی کی بے عزتی کا تماشا دیکھے گا؟"
"پوچھو کیا پوچھتے ہو لیکن پہلے میرا خون بند کرنے کا کوئی بندوبست کرو۔ اگر میرا خون اسی طرح بہتا رہا تو میں کچھ دیر میں مر جاؤں گا۔"
"کتنی دفعہ پوچھوں؟" بلوچ نے کہا۔ "اب میں آخری دفعہ پوچھ رہا ہوں' اب اگر تو نہیں بولا تو میں تیری بیوی کو سب کے سامنے برہنہ کر دوں گا اور تو بے غیرتوں کی طرح تماشا دیکھنا۔ بتا' ارسلان کہاں ہے؟"
"ارسلان...... دھماکے کے بعد وہاں پہنچا تھا۔ اُس وقت تک وہاں بہت لوگ جمع تھے۔ شاید عمران بھی وہاں موجود ہو۔ مشہدی کے آدمی وہیں موجود تھے۔ وہ ارسلان کو وہیں سے گن پوائنٹ پر اٹھا کر لے گئے تھے۔ بھیڑ بھاڑ میں کسی کو احساس بھی نہیں ہوا۔ ان لوگوں میں' میں بھی شامل تھا اور بابر خان بھی۔"
"بابر خان تو جہنم رسید ہو چکا ہے تو اب یہ بتا کہ ارسلان اب کہاں ہے؟"
"ارسلان...... مشہدی کی قید سے فرار ہو گیا تھا۔ وہ بہت جی دار آدمی ہے۔ مشہدی کہتا تھا کہ اگر ارسلان جیسے دس آدمی میرے ساتھ ہوں تو میں ڈیگال کو بھی جہنم رسید کر سکتا ہوں۔"
"میں پوچھ رہا ہوں کہ اس وقت ارسلان کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔
"مشہدی اسے ایران لے گیا تھا۔ اس نے ارسلان کو کچھ عرصہ ایران میں رکھا پھر وہ نہ جانے کیسے اس کی قید سے فرار ہو گیا اور افغانستان کی طرف نکل گیا۔ افغانستان میں بھی ہمارے لوگ موجود ہیں' انہوں نے ارسلان کو وہاں گھیرنے کی کوشش کی لیکن ارسلان وہاں سے فرار ہو کر دوبارہ پاکستان آیا پھر انڈیا کی طرف نکل گیا۔"
"مشہدی کو اس سے ایسی کیا دلچسپی تھی کہ وہ اس کا پیچھا کر رہا تھا؟" میں نے پوچھا۔
"ارسلان جاتے جاتے اس کی ایک انتہائی خفیہ فائل لے گیا ہے۔ مشہدی کو اس فائل کی ضرورت تو ہے ہی لیکن وہ ارسلان کو کسی بھی قیمت پر اپنے ساتھ ملانا چاہتا ہے۔ مشہدی کے لوگوں نے انڈیا میں اس کا پیچھا کیا پھر نہ جانے کیسے وہ "را" والوں کے ہتھے چڑھ گیا اور آج کل تہاڑ جیل میں ہے۔"
"تہاڑ جیل میں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "دہلی کی تہاڑ جیل میں؟"
"ہاں' وہ اس جیل میں ہے' اب وہ وہاں سے بھی بھاگ چکا ہو تو الگ بات ہے' ایک ہفتے پہلے تک وہ اسی جیل میں تھا۔"
اچانک سامنے سے ایک تیز رفتار موٹر بوٹ آتی دکھائی دی۔ بلوچ نے چھلانگ لگا کر اپنے آدمی کو ہٹایا اور خود بوٹ کا کنٹرول سنبھال لیا پھر اس نے انتہائی خوف ناک انداز میں اس کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں بوٹ الٹتے الٹتے بچی۔
"یہ بدبخت لوگ کوسٹ گارڈز والے ہیں۔" بلوچ نے کہا پھر ایک لانچ بائیں طرف بھی نمودار ہوئی اور وہ پورا علاقہ روشنی میں نہا گیا۔ بلوچ نے اپنی موٹر بوٹ کی اسپیڈ بڑھائی اور اپنے دونوں آدمیوں سے کہا۔ "اسموک بم نکالو اور جب

میں کہوں اُس وقت وہ بم پھینک دینا۔ تم لوگ اپنی اپنی دور مار رائفلیں بھی نکال لو لیکن فائرنگ میں پہل مت کرنا۔"

دونوں لانچیں بہت تیز رفتاری سے ہماری بوٹ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

"شکر ہے کہ ہم لوگ کو جدھر جانا ہے اُدھر کوئی لانچ نہیں ہے' بس دس منٹ کا بات ہے' اس کے بعد ان کا باپ بھی ہم لوگ کو نہیں پکڑ سکے گا۔" پھر وہ اپنے آدمی سے مخاطب ہوا۔ "اڑے...... عمران والجہ کو بھی دور مار رائفل دو' اس کا نشانہ بہت اچھا ہے۔"

اس کے ایک آدمی نے ایک رائفل مجھے بھی دے دی۔ وہ SIG کمپنی کی انتہائی بیش قیمت ٹیلی اسکوپک رائفل تھی۔ اس سے نشانہ لگانا تو میرے لیے بچوں کا کھیل تھا پھر وہ وزن میں بھی بہت ہلکی تھی۔

"اس کے وزن پہ مت جاؤ والجہ......!" بلوچ کے آدمی نے کہا۔ "اس کا گولی بہت دور تک مار کرتا ہے۔ ابھی اگر آپ کوسٹ گارڈ کی موٹر بوٹ پر فائر کر دے گے تو وہاں تک جائے گا۔"

"میرا خون بہت بری طرح بہہ رہا ہے۔" شبو نے کہا۔ "مجھے فرسٹ ایڈ دے دو۔"

"اگر آپ لوگ مجھ پہ اعتماد کریں تو میرے ہاتھ پیر کھول دیں۔ شہاب کو فرسٹ ایڈ میں بھی دے سکتی ہوں۔"

میرے اشارے پر بلوچ کے ایک آدمی نے اس عورت کے ہاتھ پیر کھول دیے اور فرسٹ ایڈ باکس نکال کرا دے دیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے اُس عورت سے پوچھا۔

"میرا نام تاج بخت ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"دیکھو تاج بخت! میں نے تم پر اعتماد کر کے تمہارے ہاتھ پیر کھولے ہیں۔ میرے اعتماد کو ٹھیس مت پہنچانا ورنہ......"

"دھمکیاں مت دیں۔" اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ "میں نے جب وعدہ کر لیا ہے تو میں اپنے وعدے پر قائم بھی رہوں گی۔" وہ فرسٹ ایڈ باکس کھول کر بیٹھ گئی اور شبو کے زخم صاف کرنے لگی۔

کوسٹ گارڈز کی موٹر بوٹس بہت تیزی سے ہمارے نزدیک آ رہی تھیں پھر انہوں نے گویا ہماری بوٹ کو گھیر لیا۔

"دس' پانچ منٹ کا بات اور ہے والجہ......! پھر ہم لوگ ان کے گھیرے سے نکل جائیں گے۔" بلوچ نے پُر امید لہجے میں کہا۔ وہ بوٹ کے انجن سے الجھا ہوا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ بوٹ کو جیٹ فائٹر کی طرح اڑانا شروع کر دے۔

اچانک کوسٹ گارڈز کی بوٹ کی طرف سے فائرنگ شروع ہو گئی۔

جواب میں بلوچ کے لوگ بھی فائرنگ کرنے لگے۔

میں نے کوسٹ گارڈز کی ایک بوٹ کی سرچ لائٹ کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اندھی ہو گئی۔ میں نے دوسری بوٹ کی سرچ لائٹ کا نشانہ لیا اور اس پہ بھی فائر کر دیا۔ وہاں اچانک اندھیرا چھا گیا۔

"عمران والجہ......!" بلوچ نے خوش ہو کر کہا۔ "تمہارا نشانہ تو واقعی بہت سچا ہے۔"

بلوچ نے اپنی بوٹس کی لائٹس پہلے ہی بند کر دی تھیں۔ اب کوسٹ گارڈ والے اندھوں کی طرح فائرنگ کر رہے تھے۔

"عمران صاحب!" تاج بخت نے کہا۔ "شہاب کے پیر کھولے بغیر میں اس کے زخم صاف نہیں کر سکتی۔ ایک زخم تو اتنا گہرا ہے کہ اس پہ ٹانکے لگانے پڑیں گے۔ کیا میں اس کے پیر کھول دوں؟"

"کھول دو۔" میں نے کہا۔ صرف پیر کھلنے سے وہ کیا کر سکتا تھا۔ تاج بخت نے اس کے پیر کھول دیے اور ٹارچ کی روشنی میں پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

کوسٹ گارڈز کی طرف سے مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی لیکن یہ فائرنگ ایسی تھی جیسے کوئی اندھا ہوا میں لاٹھی چلا رہا ہو۔

اچانک وہ میگا فون پر چیخنے لگے۔ "تم لوگ اپنی بوٹ روک دو اور خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ تمہیں چاروں طرف سے گھیرا جا چکا ہے اور تم بچ نہیں سکتے۔"

ہماری طرف سے کافی دیر سے کوئی فائر نہیں ہوا تھا اس لیے وہ یہ ہی سمجھ رہے تھے کہ ہمارے پاس ایمونیشن ختم ہو چکا ہے۔

میں نے بولنے والے کی آواز کا نشانہ لیا اور فائر کرنے والا تھا لیکن ہاتھ روک لیا کہ ممکن ہے' اب ان کی طرف سے فائرنگ تھم جائے۔

"تم لوگ اپنی بوٹ روک دو۔" پھر میگا فون پر کوئی چیخا۔

اس کے ساتھ ہی ایک فائر ہوا اور بلوچ کا ایک آدمی تیورا کر گرا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا' وہ ہر قسم کی مدد سے بے نیاز ہو چکا تھا' گولی اس کی پیشانی میں لگی تھی۔

دوسری گولی سنسناتی ہوئی آئی اور میں نے شبو کو تڑپتے دیکھا۔ وہ اٹھ کر بوٹ کی دیوار کے سہارے بیٹھ گیا تھا۔

"تم لوگ ہتھیار ڈال دو۔" پھر اعلان ہوا۔

میں نے آرٹمد کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میگا فون پر ایک کرب ناک چیخ سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

"ابھی ہم لوگ خطرے سے باہر ہے۔" بلوچ نے کہا اور بوٹ کا رخ ایک دم بائیں طرف کی ایک تنگ کھاڑی میں موڑ دیا۔ وہ بہت پتلی سی دراڑ تھی' کوئی عام آدمی تو اس میں بوٹ سمیت جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ بلوچ تھا' سمندر کا کیڑا' وہ ایسے بے شمار مقامات سے واقف تھا۔ اس نے بوٹ کو مزید کچھ آگے بڑھایا اور اس کا انجن بند کر کے ہلکا سا ایک لنگر ڈال دیا۔ بوٹ پانی پر ہچکولے کھاتی رہی۔

اُسی وقت کوسٹ گارڈز کی لانچیں ہمارے سامنے سے گزر گئیں۔

"بلوچ......!" میں نے افسردگی سے کہا۔ "اس آپریشن میں ہمارا ایک ساتھی کام آ گیا ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" بلوچ کے لہجے میں بھی افسردگی تھی۔ "اس کے گھر والوں کو اب زندگی بھر میری طرف سے اتنا وظیفہ ملے گا کہ وہ لوگ آرام سے زندگی گزار سکیں۔"

میں شبو کی بیوی تاج بخت کی چیخیں سن کر چونکا۔ وہ دہاڑیں مار مار کر رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ "آخر تم لوگوں نے میرے شہاب کی جان لے لی......"

"ہم تو اسے مارنا نہیں چاہتے تھے۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "اب تو اس نے سب کچھ سچ بتا دیا تھا پھر بھلا ہم لوگ اسے کیوں مارتے؟ وہ کوسٹ گارڈز کی گولی کا شکار ہوا ہے۔"

"لیکن یہ ہوا تو تمہاری وجہ سے ہے؟" وہ سسکتے ہوئے بولی۔

"اس آپریشن میں ہمارا بھی تو ایک آدمی جان ہار بیٹھا ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ تم لوگوں کا ذاتی معاملہ ہے۔" وہ روتے ہوئے بولی۔ "اب میں کہاں جاؤں گی؟ میرا تو شہاب کے علاوہ اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے؟"

"تم پڑھی لکھی ہو' سمجھ دار ہو' اپنی اور اپنے بچے کی زندگی گزار سکتی ہو۔"

"میرا کوئی بچہ نہیں ہے۔" وہ روتے ہوئے بولی۔ "نہ کوئی بہن ہے نہ بھائی' وہ تو میں نے تمہاری ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے جھوٹ بولا تھا۔"

"اچھا' اب ذرا خاموش رہو۔" بلوچ نے کہا۔ "ہم تمہیں یوں لاوارث نہیں چھوڑیں گے۔ میں مانتا ہوں کہ شہاب کی جان ہماری وجہ سے گئی ہے لیکن یہ بھی مانتا ہوں کہ موت کا ایک دن معین ہے۔ اگر شہاب کی موت آج ہی لکھی تھی تو وہ اپنے اسٹیمر پر بھی ہلاک ہو سکتا تھا۔"

پھر وہ کان لگا کر کچھ سننے لگا۔

"والجہ! مجھے کچھ بوٹس کے انجن کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ لگتا ہے' کوسٹ گارڈز والوں نے اب تک ہم لوگ کا پیچھا نہیں چھوڑا ہے؟"

تھوڑی دیر بعد واقعی اس کی بات سچ ثابت ہو گئی۔ وہاں کوسٹ گارڈز کی ایک نہیں بلکہ چار لانچیں تھیں۔ ان پہ بہت

تیز روشنی والی سرچ لائٹس لگی تھیں۔ اتنی روشنی تھی کہ دن کا گمان ہو رہا تھا۔ وہ لوگ سمندر کا چپہ چپہ چھان رہے تھے۔

ہم لوگ دم سادھے بیٹھے تھے۔

ایک لانچ تو بالکل اس کھاڑی کے عین منہ پر آ کر ٹھہر گئی جہاں ہماری بوٹ چھپی ہوئی تھی۔ وہ لوگ وہاں سے اتنے نزدیک تھے کہ مجھے ان کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

"یار' مجھے لگتا ہے کہ ہماری فائرنگ سے اس بوٹ کے انجن کو نقصان نہیں ہوگا اور وہ سمندر میں ہی کہیں غرق ہو گئی ہوگی۔" ایک آواز سنائی دی۔

"غرق ہونے کے بھی کچھ آثار ہوتے ہیں؟" دوسری آواز سنائی دی۔ "بوٹ کا سامان وغیرہ پانی کے اوپر آ جاتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ سمندر اس وقت بہت بپھرا ہوا ہے لیکن کچھ تو نظر آئے۔"

"کچھ بھی کیسے نظر آئے گا؟ جو کچھ بھی ہوگا' وہ پانی کی لہروں میں بہہ گیا ہوگا یا پھر وہ لوگ انڈیا کی سرحد میں داخل ہو گئے ہوں گے۔"

"تو پھر وہ وہاں کی کوسٹ گارڈز کے ہتھے چڑھ جائیں گے؟"

"یار' ہماری طرف سے وہ جہنم میں جائیں......" پہلی آواز سنائی دی۔ "ہم لوگ اپنی رات کیوں کالی کر رہے ہیں؟"

"یہاں ارد گرد بے شمار کھاڑیاں ہیں۔ ممکن ہے' ان کی بوٹ ان میں ہی کسی کھاڑی میں موجود ہو؟"

"یار' مشاہد اس علاقے کا ماہر ہے۔ وہ ایک ایک کھاڑی کا جائزہ لے چکا ہے۔ وہاں ان کی بوٹ نہیں ہے۔ کچھ کھاڑیاں ضرور ایسی ہیں جو بہت تنگ ہیں۔ اس میں بوٹ تو دور کی بات ہے' کوئی انسان بھی مشکل سے تیر کر جا سکے گا۔"

"اب اس کھاڑی کو دیکھو۔" ایک دوسرے آدمی کی آواز سنائی دی۔ اس کا اشارہ یقیناً ہماری کھاڑی کی طرف تھا۔ "کیا اس کھاڑی میں کسی بوٹ کا چھپانا ممکن ہے؟"

پھر کوئی بلند آواز میں میگافون پر بولا۔ "تم لوگوں کو دیکھا جا چکا ہے۔" اس کے ساتھ ہی تیز روشنی ہماری کھاڑی میں آ گئی لیکن ہم لوگ کھاڑی میں کافی اندر تھے اس لیے اس روشنی سے محفوظ تھے۔

"اگر تم لوگ دس تک گنتی گننے کے بعد بھی باہر نہ نکلے تو ہم اس کھاڑی کو بم سے اڑا دیں گے۔"

"شاید ان لوگوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔" تاج بخت نے کہا۔ وہ حیرت انگیز طور پر پرسکون ہو گئی تھی۔

"وہ لوگ بلف کرتا ہے۔" بلوچ نے پریقین لہجے میں کہا۔ "ہم لوگ ادھر پہلی دفعہ نہیں آیا ہے۔ یہ لوگ تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ ہم لوگ اس کھاڑی میں ہیں۔"

"ایک......" میگافون پر گنتی شروع ہو گئی۔ "دو...... تین......"

"ان لوگوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے' کھاڑی میں مسلسل روشنی آ رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"آرام سے بیٹھو واجہ......!" بلوچ نے کہا۔ "ان لوگوں کو گنتی پوری کرنے دو۔"

"چار...... پانچ...... چھ......"

"یار' کہیں یہ لوگ اس کھاڑی میں تو نہیں ہیں جس کے دہانے پر ہم کھڑے ہیں؟" ایک آواز سنائی دی۔

"تم موٹر بوٹ لے کر اس کھاڑی میں جانے کی جرأت کر سکتے ہو؟" دوسرے آدمی نے کہا۔

"میں اس کھاڑی میں تیر کر جاؤں گا۔" پہلی آواز آئی۔ "چاہے میری جان کیوں نہ چلی جائے......"

میں نے بلوچ کی طرف دیکھا' اس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار تھے پھر پانی میں ایک چھپاکا ہوا اور کوئی تیرتا ہوا اُس کھاڑی میں داخل ہو گیا۔

یہ پُرتجسس' سنسنی خیز اور لہو رنگ آپ بیتی ابھی جاری ہے
بقیہ واقعات ماہِ جنوری میں ملاحظہ فرمائیں۔

زنِ خانہ برباد

فرینک مولنار

امریکہ عظیم سے ایک خطرناک شوخ
اور عیار عورت کی عیاریاں، گلکاریاں

فرانس کے عروس البلاد پیرس میں شہر سے باہر ایک کلب ہے جس سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ یہ کلب فرانس کے بیس بڑے دولت مندوں نے مل کر قائم کیا تھا۔ آج بھی اس کے ارکان کی تعداد ساٹھ سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کلب کی رکنیت ہر مال دار آدمی حاصل نہیں کرسکتا بلکہ صرف انہی مال برداروں کو اس کا رکن بنایا جاتا ہے جن کی بے پناہ دولت کا کسی کو صحیح اندازہ نہ ہو۔ ان میں صنعت کار، بینکار، جہاز راں کمپنیوں کے مالک، زمیں دار اور پشتینی رئیس شامل ہیں۔ ان کی دولت و امارت پر جنگ، معاشی بحران، سیاسی تبدیلی، ہڑتالیں، غرض کوئی بڑے سے بڑا واقعہ اثر انداز نہیں ہوتا۔ ان کے انتظامی ڈھانچے اس قدر عمدہ اور مضبوط بنیادوں پر استوار ہوتے ہیں کہ اگر وہ مہینوں بھی اپنے کاروبار پر توجہ نہ دیں تو آمدنی کی شرح میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوگا۔

ایک روز کلب کے چند رکن جمع تھے اور وقت گزاری کے لیے مختلف موضوعات پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ان میں سے ایک بولا۔

''مجھے کسی چیز، کسی بات کا خوف نہیں ہے۔ میں نے اپنی دولت کی سرمایہ کاری اس طرح کی ہے کہ مجھے کبھی کبھی کنکھجورے کا خیال آجاتا ہے کہ اگر اس کے بیس پیر کاٹ بھی دیے جائیں تو وہ اپنے باقی اسی پیروں سے اتنی ہی آسانی اور پھرتی سے چل پھر سکتا ہے جتنا بیس پیر کٹنے سے پہلے چلتا تھا۔

دوسروں نے اثبات میں سر ہلایا۔ یہ اس امر کی علامت تھی کہ انہوں نے بھی اپنی دولت ایسی ہی دانش مندی سے مختلف صنعتوں اور تجارتوں میں لگا رکھی ہے۔ ایک اور رکن نے کہا۔ ''لیکن یاد رکھیے، ایک عورت کسی ایسے شخص کو بھی تباہ کرسکتی ہے جسے کوئی دوسری چیز کبھی تباہ نہ کرسکے۔ میرا مطلب معاشی تباہی سے ہے۔''

ایک مرتبہ پھر سب نے دانش مندانہ انداز میں سر ہلائے یعنی انہیں بولنے والے سے پورا اتفاق تھا۔ دنیا میں عورت ہی ایسی چیز ہے جس سے کسی مرد کی دولت کو ہر وقت خطرہ لاحق رہتا ہے اور اس خطرے کے خلاف کوئی احتیاطی تدبیر اختیار نہیں کی جاسکتی۔ ایک اور رکن نے کہا۔

''کیوں نا ہم لوگ آج اس بات کا فیصلہ کرلیں کہ مرد کی دولت کے لیے کس قسم کی عورت خطرناک ثابت ہوسکتی ہے؟''



''اس کا فیصلہ کس طرح کیا جائے؟'' کسی نے پوچھا۔

''بہت آسانی سے۔ ہم میں سے جس جس کو اس قسم کی عورت سے سابقہ پڑا ہو، وہ برابر والے کمرے میں چلا جائے۔ میں خود بھی ان میں سے ایک ہوں پھر ہم ایک دوسرے کے سامنے اپنے اپنے تجربات بیان کریں گے اور ہم میں سے جو شخص دولت کے لیے خطرناک ترین عورت کی نشان دہی کرے گا، اسے انعام دیا جائے گا۔''

تمام ارکان اپنی نشستوں پر پہلو بدلنے لگے۔ چھ آدمی اٹھ کر برابر کے کمرے میں چلے گئے۔ کمرے کے درمیان رکھی ہوئی میز پر مقابلہ جیتنے والے کے لیے انعام رکھ دیا گیا۔ عمدہ ترین سگاروں کا ایک ڈبا۔

مباحثے میں شریک پہلے آدمی نے اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

''میں جس عورت کا ذکر کر رہا ہوں، میں اسے روزانہ صبح خاصے پیسے دیتا تھا اور رات کو وہ یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ اس نے ان پیسوں کا کیا کیا؟ وہ مختلف چیزیں خریدتی اور انہیں کہیں بھی بھول جاتی تھی۔ وہ اپنے ہر جان پہچان والے کو زبردستی قرض دیتی پھرتی تھی۔ وہ ہوٹلوں کے بیروں اور ٹیکسی ڈرائیوروں اور ملازموں کو موٹی موٹی رقمیں بخشش کے طور پر دینے کی عادی تھی۔ اسے اگر سڑک پر کوئی لاوارث بچہ نظر آجاتا تو وہ اسے کھانا کھلانے کے لیے گھر لے آتی۔ وہ خیراتی اداروں کو چندے میں بڑی بڑی رقمیں یک مشت دے ڈالتی تھی اور کسی فقیر کو کچھ نہ کچھ دیے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔ وہ جب اپنے پرس سے رومال یا کوئی دوسری چیز نکالتی تو پرس سے کرکسی نوٹ نکل کر اس کے قدموں میں گر جاتے جن کا اسے پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ وہ روزانہ ایک غریب گھرانے کے مہینے بھر کے خرچ کے برابر رقم سڑکوں پر گرا دیتی تھی۔ رات کو جب وہ واپس گھر آتی تو اس کے پرس میں ایک دھیلا بھی نہیں ہوتا تھا اور جب وہ ذہن پر زور دے کر یہ یاد کرنے کی کوشش کرتی کہ آج اس نے کن کن چیزوں پر رقم خرچ کی ہے تو اسے بھی ایک چوتھائی سے زیادہ اخراجات یاد نہیں آتے تھے۔ ایک سال بعد جب میں نے حساب لگایا تو مجھے احساس ہوا کہ اس عورت نے ایک ہی سال میں میرے مضبوط

معاشی قلعے کی بنیادیں ہلا کے رکھ دی ہیں۔"

پستہ قد کے ایک عمر رسیدہ شخص نے بڑی مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔ وہ گنجا تھا اور اس نے اپنے بیٹھنے کے لیے کمرے کا ایک الگ تھلگ کونا منتخب کیا تھا۔

"یہ کوئی بات نہیں ہوئی۔" اس نے بلند آواز میں کہا۔ "بہت سے مرد اس قدر دولت مند ہوتے ہیں کہ ایسی عورت کو برداشت کرنا ان کے لیے قطعاً مشکل نہیں ہے۔"

دوسرے آدمی نے اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے کہا۔ "میں جس عورت سے محبت کرتا تھا، اسے دنیا کے ہر خوبصورت لباس سے دیوانہ وار عشق تھا۔ گاؤن، شالیں، ہیٹ، فر کے کوٹ، جوتے اور خدا جانے، کیا کیا؟ مجھے تو ان سب چیزوں کے نام بھی نہیں معلوم۔ پیرس کے مہنگے سے مہنگے درزی، نقاش اور ہنر مند کاری گر، دن رات اس کے لیے کام کرتے رہتے تھے۔ وہ اپنے لباس تیار کروانے کے لیے اس قدر خطوط لکھواتی تھی اور اس قدر ہدایتیں دیتی تھی کہ مجھے محض خط و کتابت کے لیے ایک پورا عملہ ملازم رکھنا پڑا تھا نیز کپڑوں، درزیوں اور کاریگروں کے بل ادا کرنے کے لیے مجھے ایک علیحدہ خزانچی رکھنا پڑا تھا۔ وہ اپنے ملبوسات پر اس قدر رقم خرچ کرتی تھی کہ میں اعصابی درد کا شکار ہو گیا تھا اور مجھے کچھ عرصے تک مجبوراً سینی ٹوریم میں علاج کرانا پڑا تھا۔

پستہ قد گنجا ایک مرتبہ پھر بلند آواز میں بولا۔ "ایسی عورت بھی کچھ زیادہ خطرناک ثابت نہیں ہو سکتی کیوں کہ اس قسم کے اخراجات کی بہر حال ایک حد ہوتی ہے جو آپ جیسے دولت مند کے لیے بڑی بات نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ایک دن میں اگر تین گاؤن سلے تو ایک سال میں ایک ہزار پچانوے گاؤن ہوئے۔ اسی طرح اگر اس نے روزانہ موزوں کے تین جوڑے خریدے تو سال بھر میں ایک ہزار پچانوے جوڑے ہوئے اور ایک دن میں تین شالیں، جوتوں کے تین جوڑے، تین عدد ہیٹ۔ میرا خیال ہے دنیا کی کوئی عورت اس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ایک سال میں ایک ہزار پچانوے گاؤن، ایک ہزار پچانوے کوٹ، ایک ہزار پچانوے موزے۔ ہم اس عورت کی عادت کو دیکھتے ہوئے اُس کی خریداری کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کر سکتے ہیں اور اس کا تخمینہ لگا کے اپنا سالانہ بجٹ تیار کر سکتے ہیں۔ اس لیے ایک ہوشیار آدمی کو اس قسم کی عورت سے جسے ملبوسات سے دیوانہ وار عشق ہو، زیادہ خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے۔"

"اور اُس عورت کے بارے میں کیا خیال ہے جو ملبوسات کی جگہ سچے موتیوں، ہیروں، جواہر اور قیمتی پتھروں کے زیورات سے عشق کرتی ہو؟" تیسرے آدمی نے مباحثے میں شرکت کرتے ہوئے کہا۔

"مثال کے طور پر......"

لیکن پستہ قد گنجے نے فضا میں ہاتھ لہرا کر اس کی بات کاٹ دی۔ "اس قسم کی عورت سے بھی نباہ کیا جا سکتا ہے۔" اُس نے کہا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ایسی عورت ان عورتوں سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے جن کا ذکر اس سے پہلے کیا گیا ہے لیکن ایسی عورت بھی آپ جیسے دولت مند کی کتنی دولت خرچ کر سکتی ہے؟ ان اخراجات کی بھی ایک آخری حد ہوتی ہے اور وہ حد نسوانی بدن ہے۔ ایک عورت چاہے نیکلس اور ہاروں کی کتنی ہی شوقین کیوں نہ ہو لیکن اُس کے بدن پر صرف ایک گردن ہوتی ہے۔ بُندوں اور آویزوں کے لیے قسمت نے عورت کو صرف دو کان عطا کیے ہیں۔ اسی طرح جڑاؤ کنگن پہننے کے لیے اُس کے پاس صرف دو کلائیاں ہوتی ہیں جن میں صرف دس اُنگلیاں ہوتی ہیں اور وہ دس انگلیاں اتنی لمبی نہیں ہوتیں کہ ایک دولت مند آدمی انھیں انگوٹھیوں میں نہ ڈھانپ سکے۔ اسی طرح ایک عورت کی گردن اتنی لمبی نہیں ہوتی کہ اُسے اُوپر تک نیکلسوں سے نہ ڈھکا جا سکے۔ ہمارے ہاں کی عورتوں میں چوں کہ ابھی تک افریقہ کی عورتوں کی طرح ناک چھدوا کر ان میں بالیاں پہننے اور ہونٹوں میں سُوراخ کر کے زیورات لٹکانے کا رواج نہیں ہے اس لیے میری نظر میں ایسی عورت کے اخراجات کی بھی ایک حد مقرر کی جا سکتی ہے۔ میں اس امکان سے انکار نہیں کروں گا کہ ایسی عورت واقعی کسی مرد کی دولت کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتی ہے۔ پھر بھی یہ ضرور کہوں گا کہ اگر اُسے ایک مرتبہ سر سے پاؤں تک زیورات میں ڈھانپ دیا جائے تو یقیناً اُس کا یہ جذبہ سرد پڑ جائے گا۔ پھر ان اخراجات سے عہدہ برآ ہو کر مرد دوبارہ اپنی دولت بڑھانے پر توجہ دے سکتا ہے۔"

چوتھے آدمی نے مباحثے میں شریک ہوتے ہوئے کہا۔ "میری بیوی کو دنیا میں جُوا کھیلنے کے سوا اور کوئی کام نہیں......"

"بس جناب کافی ہے۔" اُسی پستہ قد کے عمر رسیدہ شخص نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "اس قسم کی عورت کو بھی کسی امیر مرد کی دولت کے لیے خطرناک ترین قرار نہیں دیا جا سکتا کیوں کہ وہ عورت کتنا ہی جُوا کیوں نہ کھیلے، کتنی ہی بڑی بڑی رقمیں داؤ پر کیوں نہ لگائے اور کتنی ہی بدنصیب کیوں نہ ہو، ایک آدھ بار جوئے میں جیتے گی ضرور۔ کوئی بھی جواری ہفتوں، مہینوں، برسوں میں ایک آدھ بار جیتے بغیر مسلسل نہیں ہار سکتا اور یہی حقیقت اس بات کی تردید کرتی ہے کہ اس عورت کو کسی مرد کے لیے خطرناک ترین قرار نہیں دیا جا سکتا۔"

پانچویں شخص نے اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے جس عورت کی محبت میں گرفتار ہو کر اُس سے شادی کی تھی، وہ ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئی تھی۔ اُس نے غربت ہی میں پرورش پائی تھی۔ اُسے اپنے رشتے داروں سے بہت محبت تھی جو سب کے سب مفلس تھے۔ وہ ان سب کو دولت مند بنا کر خوش دیکھنا چاہتی تھی۔ میری دولت دے کر چنانچہ......"

پستہ قد گنجے نے ایک مرتبہ پھر مداخلت کرتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کی بیوی کے رشتے داروں کی کل تعداد؟"

"چھیاسٹھ۔"

"دیکھا۔" پستہ قد آدمی چلایا۔ "میں نہ کہتا تھا۔ اس کی بھی ایک حد نکلی۔ مجھے اُمید ہے کہ جب آپ کی بیوی کے چھیاسٹھ اعزا دولت مند ہو کر ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے ہوں گے تو اُس نے آپ کی دولت لٹانی بند کر دی ہوگی اور خود بھی مطمئن ہو کر بیٹھ گئی ہوگی۔ میں نے غلط اندازہ لگایا ہے؟"

"جی نہیں۔ آپ کا اندازہ درست ہے۔ جب اُس کے ہر عزیز کا ایک عمدہ ذاتی مکان بن گیا اور اطمینان بخش آمدنی کا وسیلہ قائم ہو گیا تو میری بیوی نے تشکر کے طور پر میرے گلے میں باہیں ڈال کر میرا ایک طویل بوسہ لیا۔ اس بوسے نے میری رگوں میں نئی قوت بھر دی اور میں

پہلے سے زیادہ لگن اور محنت سے دولت کمانے لگا۔ اس طرح میں نے صرف چند سال میں وہ تمام اخراجات پورے کرلیے۔“

پستہ قد گنجا زور سے ہنسا۔ ”اور آپ اس عورت کو ایک متمول مرد کی دولت کے لیے خطرناک ترین عورت قرار دینا چاہتے ہیں؟ کمال ہے!“

گہرا سکوت طاری ہوگیا۔ مباحثے میں حصہ لینے والے پانچوں آدمی پستہ قد شخص کو دیکھنے لگے۔ ”محترم! آپ نے ہم پانچوں کی بیان کردہ عورتوں کو کسی نہ کسی بنا پر خطرناک ترین عورت ہونے کے لیے ناموزوں ثابت کردیا ہے۔“ مقابلے میں حصہ لینے والے ایک شخص نے کہا۔ ”کیا آپ ہمیں یہ بتانے کی زحمت گوارا کریں گے کہ آخر کس قسم کی عورت کو کسی مرد کی دولت کے لیے خطرناک ترین قرار دیا جاسکتا ہے؟“

پستہ قد گنجا اپنی کونے کی نشست سے کھڑا ہوکر کمرے کے درمیان میں رکھی ہوئی میز تک آیا اور اُس نے سگار کا ڈبا کھول کر پانچوں آدمیوں کو فرداً فرداً ڈبا پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”معزز حاضرین! میری طرف سے ایک سگار قبول فرمائیے۔ میں یہ مقابلہ جیت گیا ہوں! کس طرح؟ آپ میرا گنجا سر ملاحظہ فرمارہے ہیں؟ میرے بال اُڑنے کا سبب ایک عورت تھی۔ آپ سب میرے ماضی سے واقف ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ میرا شمار دنیا کے امیر ترین آدمیوں میں ہوتا تھا مگر دس سال پہلے میں کوڑی کوڑی کو محتاج ہوگیا۔ آخر کیوں؟ صرف ایک عورت کی وجہ سے۔ مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ کا تعارف دنیا کی خطرناک ترین عورت سے کراؤں۔ ایسی عورت جو امیر سے امیر مرد کی دولت کے لیے خطرناک ترین ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے میں ایک ایسی عورت کا شکار ہوگیا تھا وہ میری بیوی تھی۔“

”آخر آپ کی بیوی کس شوق کی مریض تھی جناب؟“ دوسروں نے بڑی حیرانی سے پوچھا اور بے تابی سے اُس کے جواب کا انتظار کرنے لگے۔

”کفایت شعاری۔“ پستہ قد آدمی نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”کفایت شعاری میرے دوستو! اُسے کفایت شعاری کا مرض لاحق تھا۔ ایسی عورت جو حد درجے کفایت شعار ہو، وہ مال دار سے مال دار مرد کی دولت کے لیے خطرناک ترین ہوتی ہے۔ ایسی عورت اپنی تحویل میں آنے والی ایک ایک پائی بینک میں جمع کرادیتی ہے۔ میں اسے لباس خریدنے کے لیے پیسے دیتا، وہ سیدھی بینک کا رُخ کرتی اور گھریلو اخراجات میں سے پیسے بچانے کے لیے وہ بسا اوقات چوبیس چوبیس گھنٹے کچھ کھائے پیے بغیر گزار دیا کرتی تھی، ایک وقت کا فاقہ اُس کا معمول تھا۔ وہ روز صبح بینک کھلنے سے پہلے بینک کے دروازے پر وہ رقم جمع کرانے کے لیے موجود ہوتی تھی جو اُس نے گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں جمع کی تھی۔“

پستہ قد گنجے کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ”عزیز ساتھیو! ایسی عورت جو دولت لٹاتی پھرے، وہ قابلِ برداشت ہے، ایسی عورت جسے نئے لباس خریدنے کا جنون ہو وہ سال بھر میں مختلف لباسوں کے ایک ہزار جوڑے خرید کر مطمئن ہوسکتی ہے۔ ایسی عورت جسے زیورات پہننے کا شوق ہو، سر سے پیر تک زیوروں سے لادی جاسکتی ہے، ایسی عورت جو جواری ہو، ایک آدھ بار ضرور جیتتی ہے، ایسی عورت جو اپنے شوہر کی دولت سے اپنے عزیز و اقارب کو دولت مند بنانے کی خواہش رکھتی ہو، اُسے بھی مطمئن کیا جاسکتا ہے لیکن دوستو! مجھے بتاؤ کیا بینک میں رقم جمع کرنے کی بھی کوئی حد ہوسکتی ہے؟ کیا دنیا کا کوئی بینک اپنے کھاتے دار کو کبھی رقم جمع کرانے سے روکتا ہے؟ کیا بینک میں رقم جمع کرانے کی کوئی قانونی یا اخلاقی حد ہوتی ہے؟ ایک چمچے کی مدد سے پورا سمندر خالی کیا جاسکتا ہے، ایک روز سمندر بھی خشک ہوجائے گا لیکن کیا کوئی شخص کسی بینک کا پیٹ بھر سکتا ہے؟ ان حالات میں کوئی کیا کرسکتا ہے؟ مجھے دیکھو، میں دس سال پہلے پائی پائی کو محتاج ہوگیا، پھر کہیں میری جان اس عورت سے چھوٹی۔ تقدیر دنیا کے ہر مرد کو کفایت شعار عورت کے شر سے محفوظ رکھے۔ ایک کفایت شعار بیوی بڑے سے بڑے دولت مند شوہر کی سب سے بڑی دشمن ہوتی ہے۔“

وہ خاموش ہوگیا۔ پانچوں آدمی اُس کا پیش کیا ہوا سگار سلگانے لگے۔ یہ اس امر کی علامت تھی کہ انھوں نے متفقہ طور پر اُسے انعام کا مستحق تسلیم کرلیا ہے۔

☆......☆

سات سمندر پار سے زندگی کی دوسری تصویر

گئودان

اے پی ہربرٹ

امریکہ عظیم سے درآمدہ ایک چبھتی چٹکتی انوکھی، اچھوتی تحریر

شہر میں ایک گائے گفتگو کا موضوع بنی ہوئی تھی۔ لوگ ہنس رہے تھے اور قہقہے لگارہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ ”آج تک دنیا کی کسی عدالت میں ایسا مقدمہ نہیں چلا ہوگا۔“

کوئی بولا۔ ”قانون و انصاف کی تاریخ میں یہ گائے ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔“

کسی نے کہا۔ ”بڑی خوش نصیب گائے ہے۔ آج تک کسی لیڈر کو بھی یہ عزت نہ ملی ہوگی۔“



شہری عدالت ایک دلچسپ مقدمے کی سماعت میں مصروف تھی، اُس کا نام گائے چیک کا مقدمہ پڑگیا تھا۔ جی ہاں، وہی گائے جس کا ہم دودھ پیتے ہیں اور وہی چیک جسے بھُنا کر ہم رقم حاصل کرتے ہیں۔

عدالتی کارروائی کا ذکر کرتے ہوئے ایک راہ گیر نے دوسرے سے کہا۔ ''کیا گائے کراسڈ تھی؟''

''نہیں۔ بیررتھی، اوپن۔''

آج فاضل عدالت نے گائے چیک کے مقدمے کا فیصلہ سُنا دیا تھا۔ عدالت بھری ہوئی تھی۔ استغاثے کے وکیل نے معزز جج کو مخاطب کیا۔ ''می لارڈ! آپ کی اجازت سے چند استغاثے سماعت کے لیے حاضر ہیں۔ یہ بظاہر غیر متعلق معلوم ہوں گے لیکن مقدمے کی نوعیت اور آپ کی سہولت کے پیشِ نظر اکٹھے پیش کیے جارہے ہیں۔''

''می لارڈ! مقدمے کے ملزم مسٹر البرٹ ہیں۔ ان پر انکم ٹیکس کی چوری کا الزام ہے۔ کلکٹر انکم ٹیکس نے مسٹر البرٹ کو نوٹس دیا تھا کہ اُن پر جو انکم ٹیکس واجب ہے، وہ ادا کردیا جائے۔ مسٹر البرٹ نے ٹیکس ادا نہیں کیا اور یہ موقف اختیار کیا کہ حکومت کی طرف سے فراہم کی ہوئی سہولتیں اُن کے لیے ناقص اور نامکمل ثابت ہوئی ہیں لہٰذا وہ اپنی آمدنی کا ایک بڑا حصہ ٹیکس کے نام پر قربان نہیں کرسکتے۔ کلکٹر انکم ٹیکس نے انہیں انکم ٹیکس کے قوانین سے آگاہ کیا اور مختلف دلیلوں سے قائل کرنے کی کوشش کی مگر مسٹر البرٹ اپنے موقف پر اڑے رہے۔ بہت بحث و تمحیص ہوئی لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا، کلکٹر انکم ٹیکس اور مسٹر البرٹ کسی سمجھوتے تک نہ پہنچ سکے۔ بے شمار خطوں اور ٹیلی فونوں کا تبادلہ ہوا، آخر کلکٹر انکم ٹیکس کو مجبور ہو کے ٹیکس کی رقم میں کمی کرنی پڑی، اُنہوں نے صرف ستاون پونڈ تجویز کیے، اِس پر بھی فریقین میں خطوط کا سلسلہ چلتا رہا تاہم خاصی ردّ وقدح کے بعد مسٹر البرٹ نے ستاون پونڈ دینا منظور کرلیا۔ اب میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں می لارڈ!'' استغاثے کے وکیل نے چاروں طرف نظر ڈالی۔

عدالت میں خاموشی تھی ہر شخص نہایت توجہ سے کارروائی سن رہا تھا۔ ''31 مئی کو کلکٹر انکم ٹیکس اپنے دفتر میں اہم سرکاری فرائض انجام دے رہے تھے۔ اچانک دفتر کے اطراف میں شور وغوغا کا طوفان اٹھا۔ کلکٹر کے انہماک میں خلل پڑا، انہوں نے اُٹھ کر کھڑکی سے جھانک کر باہر کا جائزہ لیا۔ سڑک پر ہجوم جمع تھا۔ ہر شخص کی توجہ ایک سفید گائے کی طرف تھی۔ یہ گائے مسٹر البرٹ لیے چلے آرہے تھے۔ اُن کے چہرے سے بدخواہی اور بدنیتی کا اظہار ہورہا تھا۔ گائے کی پشت اور پہلوؤں پر سرخ روشنائی سے یہ عبارت بہت نمایاں تحریر تھی۔

بنام لندن اینڈ لٹریری بینک لمیٹڈ!

میری طرف سے کلکٹر انکم ٹیکس کو ستاون پونڈ ادا کردیے جائیں (اُن پر تباہی نازل ہو) وہ شریف آدمی کہلانے کے ہرگز مستحق نہیں ہیں۔

البرٹ ہیڈوک   57/= پونڈ

مسٹر البرٹ گائے سمیت کلکٹر انکم ٹیکس کے دفتر میں گھس گئے اور اس سے پہلے کہ حیران و پریشان کلکٹر، اُن سے کچھ پوچھتے، اُنہوں نے کہا کہ میں ٹیکس ادا کرنے آیا ہوں، یہ گائے دراصل ستاون پونڈ کا چیک ہے۔ براہِ کرم چیک وصول کر کے رسید دے دیجیے۔''

معزز جج نے سوال کیا۔ ''کیا گائے پر عدالتی محصول کا ٹکٹ چسپاں کیا گیا تھا؟''

''جی ہاں جناب والا! گائے کے سینگ پر دو پینی کا ایک ٹکٹ چپکا ہوا تھا۔'' استغاثے نے بتایا۔ ''کلکٹر انکم ٹیکس نے گائے کو چیک کے طور پر قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اُن کا اعتراض یہ تھا کہ کوئی بینک گائے کے عوض رقم ادا کرنے پر آمادہ نہیں ہوسکتا۔''

مسٹر البرٹ نے دوستانہ اور ہمدردانہ انداز میں کلکٹر سے کہا۔

''اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی بینک اس گائے کو چیک نہیں مان سکتا تو ایسا کیجیے، اِس پر دستخط فرما کر مہر ثبت کردیجیے۔ پھر یہ گائے کسی ایسے شخص کے حوالے کردیجیے گا جس کے آپ مقروض ہوں۔ اِس وقت ٹیکس کی رقم آپ اپنی جیب سے دے دیجیے، مہربانی ہوگی۔''

مسٹر البرٹ نے کلکٹر صاحب سے یہ بھی کہا کہ ''آپ کے کچھ نہ کچھ قرض خواہ ضرور ہوں گے۔ کلکٹر صاحب نے نیک دلی اور خوش خلقی کے سبب مسٹر البرٹ کو کچھ کہنے کے بجائے اُن کی تجویز قبول کرلی یعنی گائے پر دستخط کرنے اور مہر لگانے پر آمادہ ہوگئے۔''

جج نے سوال کیا۔ ''گائے کے کس حصے پر مہر لگائی گئی۔''

وکیل نے بتایا۔ ''چیک کے پیچھے مہر لگانے کی کوشش کی گئی تھی می لارڈ! یعنی گائے کے پیٹ پر، لیکن گائے نے اس کارروائی پر سخت ناپسندیدگی ظاہر کی اور یہ عمل روکنے کے لیے دفتر میں تباہی مچادی۔ کلکٹر نے تدبر کا ثبوت دیا، فوراً کارروائی رکوادی اور مسٹر البرٹ سے دو ٹوک الفاظ میں انکار کردیا۔''

''ناچار مسٹر البرٹ گائے کو لے کر دفتر سے چلے گئے۔ بعد میں انہیں ٹریفالگر اسکوائر پر گرفتار کرلیا گیا۔ اُن پر امنِ عامہ میں خلل ڈالنے اور افراتفری پھیلانے کا الزام عائد کیا گیا تھا۔''

''اس کے علاوہ می لارڈ! مسٹر البرٹ داخلی محصولات کی وزارت کو بھی ٹیکس کی عدم ادائیگی کے سلسلے میں مطلوب ہیں۔'' وکیل استغاثہ خاموش ہوگیا۔ عدالت میں سرسراہٹ دوڑ گئی، ایک کونے سے دوسرے کونے تک چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

''آرڈر! آرڈر!''

مسٹر البرٹ نے کٹہرے میں کھڑے ہو کے صفائی پیش کی۔

''جناب والا! میں ایک پُر امن اور قانون پسند شہری ہوں۔ میرا مقصد ٹیکس کی ادائیگی کے لیے محض چیک پیش کرنا تھا۔ اگر انکم ٹیکس کے حکام کو چیک پسند نہیں آیا تو میرا کیا قصور، میں کیا کرسکتا ہوں۔ چیک ایک حکم نامے کا محض تکنیکی نام ہے۔ اس کا مقصد بینک کو صرف یہ ہدایت دینا ہوتا ہے کہ چیک لانے والے کو اتنی رقم ادا کردی جائے۔ ایسا کوئی ضابطہ میرے علم میں نہیں کہ یہ ہدایت ایک مخصوص کاغذی ٹکڑے ہی پر لکھی جاسکتی ہے۔ چیک ڈائری کے سادہ کاغذوں اور دوسری چیزوں پر بھی لکھے گئے ہیں اور بینکوں نے اُنھیں قبول کیا ہے۔ میں خود اپنی مثال پیش کرتا ہوں۔ ضرورت پڑنے پر میں نے مختلف چیزوں پر چیک لکھے ہیں۔ ہوٹل کی میز کے پیچھے، نیپکن پر، رومال پر، حتیٰ کہ شراب کی بوتل کے لیبل پر بھی۔ بینک نے میرا ہر چیک قبول کیا اور رقم ادا کی۔ میرے ایسے چیک بینکوں کے کلیئرنگ ہاؤس سے بھی گزر چکے ہیں۔ مجھے ایک نیپکن پر لکھے ہوئے اور ایک گائے پر لکھے ہوئے چیک میں کوئی قانونی فرق نظر نہیں آیا۔ اہم چیز وہ نہیں ہوتی جس پر کچھ تحریر کیا جائے، اصل چیز خود تحریر ہوتی ہے۔ میری تحریر بھی بینک کے نام قواعد کے مطابق لکھی ہوئی ایک ہدایت تھی اور اُس پر عدالتی ٹکٹ بھی چپکا ہوا تھا۔ عام استعمال ہونے والے چیک اپنی ساخت کی وجہ سے مقررہ نہیں کہلائے جبکہ عام استعمال کی وجہ سے مقررہ ساخت کے محسوس ہوتے ہیں۔ میرے کھاتے میں اتنی رقم موجود ہے کہ گائے چیک بھُنوایا جاسکتا تھا۔ حکام گائے کو لاکھ ناپسند کرتے ہوں۔ قانونی اعتبار سے وہ اسے مسترد نہیں کرسکتے۔'' مسٹر البرٹ نے اپنے نکات کی تائید میں چند پرانے مقدموں کے حوالے بھی دیے پھر کہا۔ ''مجھے ٹریفالگر اسکوائر سے اپنی گرفتاری کا سخت افسوس ہے اور میں اس زیادتی پر زوردار احتجاج کرتا ہوں۔ یہ جان کر مجھے صدمہ ہوا کہ دنیا کے ایک بڑے تجارتی شہر میں کسی معزز شہری کا اپنی قانونی ملکیت کے ساتھ چلنا پھرنا ایک قابلِ سزا جرم ہے۔ مجھے جس کانسٹیبل نے گرفتار کیا ہے، میں اُس کے خلاف عزت ہتک اور اختیارات کے ناجائز استعمال کے مقدمے دائر کروں گا۔''

مسٹر البرٹ پر استغاثے کی طرف سے جرح کی گئی۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ ''میرے پاس چیک بک نہیں تھی مجھے احساس ہوگیا تھا کہ حکومت مجھ سے ستاون پونڈ طلب کرنے میں حق بجانب ہے اور یہ رقم ادا کرنا میرا قومی فرض ہے اور میں تاخیر سے بچنا چاہتا تھا۔ اپنے فرض سے سبک دوش ہونے کے لیے مجھے فوراً جو چیز دستیاب ہوئی اُسے میں نے چیک کے طور پر استعمال کرلیا۔''

استغاثے نے پوچھا۔ ''کیا آپ کو گائے کے سوا کوئی چیز نہیں ملی تھی؟''

''جی نہیں جناب!''

''کیا ایک بے زبان جانور کو چیک کے طور پر استعمال کرتے وقت آپ کے ذہن میں یہ بات نہیں تھی کہ کلکٹر انکم ٹیکس کے لیے ایک مضحکہ خیز صورتِ حال پیدا کی جائے تاکہ اُن کی بے عزتی ہو؟''

''ہوسکتا ہے، میرے ذہن میں یہ بات ہو۔''

مسٹر البرٹ نے جواب دیا۔ ”لیکن ایسی خواہش پر کوئی پابندی نہیں ہے، ملک میں ایسا کوئی قانون لاگو نہیں جو کسی کو محکمۂ انکم ٹیکس کا مذاق اُڑانے سے روک سکے۔“ مسٹر البرٹ بیٹھ گئے۔

عدالت میں بھی بھناہٹ ہونے لگی۔ سب لوگ جج کی طرف دیکھ رہے تھے کہ دیکھیں، کیا فیصلہ صادر ہوتا ہے۔ جج نے کہنا شروع کیا۔ ”اس مقدمے میں ایک عاقل اور ہوشیار شخصیت عدالت کے سامنے آئی ہے۔ غالباً کوئی شخص انکم ٹیکس کے قوانین کو خوش گوار تسلیم نہیں کرتا۔ سرکاری اخراجات اور مستحقین کی مدد کے لیے انکم ٹیکس ادا کرنا کسی ایسے شخص کے لیے تردّد کا باعث نہیں ہوتا جسے دولت ورثے میں ملی ہو لیکن کیا اُن لوگوں سے بھاری بھاری رقموں کا مطالبہ کرنا زیادتی نہیں ہے جو صرف اپنی اہلیت اور محنت سے گزارے کے لائق پیسے کماتے ہیں؟ ایسے لوگوں سے معقول و مناسب رقم طلب کرنا تو ٹھیک ہے لیکن اُن سے یہ مطالبہ کرنا ظلم ہے کہ وہ اپنی کمائی کا بڑا حصہ ٹیکس کی نذر کردیں۔ ٹیکس کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ شہری اُس کے صلے میں سرکاری خدمات اور سہولتیں حاصل کرسکیں۔ مثلاً روزگار، مکان، تعلیم، صحت اور جان و مال کی حفاظت وغیرہ لیکن اب ایسا نہیں رہا۔ مخیّر شہری دراصل اس پر مجبور ہیں کہ مستحق شہریوں کے لیے اپنی کمائی میں سے حصہ نکالیں یعنی کمانے والے اُنہیں کھلائیں جو نہیں کمارہے۔ آہستہ آہستہ یہ ایک روایت بن چکی ہے اور ہم سب اس کے عادی ہوگئے ہیں۔ ملزم مسٹر البرٹ درحقیقت اس روایت کے خلاف ہیں لیکن قانون کے احترام میں اپنا فرض بھی ادا کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے قانون کا تقاضا جلد از جلد پورا کرنے کے لیے اپنی ملکیت گائے کو استعمال کرلیا۔ قانون کی رُو سے کسی کو گائے پیش کرنا کوئی جارحانہ، ناشائستہ یا ہتک آمیز فعل نہیں ہے بلکہ اپنی سلطنت کے کچھ حصّوں میں گائے ایک متبرک جانور ہے نیز قدیم دَور میں لین دین کا یہ طریقہ عام طور پر رائج رہا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ سیکسن زمانے میں مویشیوں کو زندہ دولت کہا جاتا تھا اور یہ زندہ دولت قیمتوں کی ادائیگی کے لیے استعمال ہوتی تھی لہٰذا یہ متنازعہ چیک اپنی عبارت کے قانونی پہلوؤں سے قابلِ قبول ہو یا نہ ہو، گائے بہر حال قابلِ قبول ہے۔ انکم ٹیکس والوں کو چاہیے تھا کہ گائے قبول کرکے رسید جاری کردیتے۔ جیسا کہ مسٹر البرٹ نے کہا، بینک کو ادائیگی کا حکم ایک جائز اور قابلِ عمل حکم ہے خواہ وہ کسی لفافے کی پشت پر لکھا گیا ہو یا گائے کی پشت پر۔ اِس کی تصدیق کی جاچکی ہے کہ مسٹر البرٹ کے کھاتے میں خاصی رقم تھی اس لیے کلکٹر انکم ٹیکس نے جو کچھ کیا غلط کیا یہ مقدمہ خارج کیا جاتا ہے۔“

”جہاں تک دوسرے الزام کا تعلق ہے، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پولیس نے اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے ایک غلط قدم اٹھایا ہے۔ لندن کی سڑکوں پر کسی گائے کے ساتھ چلنا پھرنا کوئی غیر قانونی کام نہیں ہے۔ انھی سڑکوں پر گھوڑے جیسا نسبتاً کم کارآمد جانور بھی اکثر نظر آتا ہے، اُس کے خلاف کبھی کوئی کارروائی نہیں ہوئی، نہ شہر کی سڑکوں پر گھوڑے دوڑانا غیر قانونی ہے۔ حتیٰ کہ موٹر کاریں ہماری سڑکوں پر جانوروں سے کہیں زیادہ پائی جاتی ہیں جبکہ کار ایک غیر فطری اور غیر پُرکشش چیز ہے۔ لہٰذا گائے کا سڑکوں پر نکلنا قطعاً قانون کے خلاف نہیں ہے، خاص کر ایسی گائے جسے تبادلۂ زر جیسے اہم مقصد کے لیے استعمال کیا جارہا ہو۔ ایسی گائے کی تعظیم کرنی چاہیے، نہ کہ تحقیر۔“

”اگر مسٹر البرٹ کو ایک گائے کے ساتھ دیکھ کے سڑک پر بھیڑ جمع ہوگئی تھی تو پولیس کو چاہیے تھا کہ بھیڑ کو منتشر یا گرفتار کرتی۔ مسٹر البرٹ کو نہیں۔ اگر مسٹر البرٹ کے ہاتھ میں گائے کی رسّی کے بجائے ایک ملین پونڈ کا کاغذی چیک ہوتا تب بھی ممکن تھا کہ لوگ جمع ہوجاتے، کیا اس صورت میں بھی مسٹر البرٹ کو گرفتار کرلیا جاتا؟ نہیں کیوں کہ مسٹر البرٹ نے قانون کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی تھی۔“

”مسٹر البرٹ نے ایک معزز شریف اور برطانیہ کا وفادار شہری ہونے کا ثبوت دیا ہے، یہ بات تعریف کے قابل ہے۔ اُن پر لگائے جانے والے تمام الزامات باطل قرار دیے جاتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ مسٹر البرٹ پولیس کے خلاف مقدمے میں کامیابی سے سرفراز ہوں گے“

”اب اگلا مقدمہ، پیش کیا جائے۔“

☆☆......☆☆

سات سمندر پار سے زندگی کی تیسری تصویر

خاکستر

رشمیل کریمپلین

امریکہ عظیم سے ایک یادگار کہانی
جس میں رشتوں کی خوشبو بھی ہے



وہ اسٹیشن سے نکل کے سڑک پر آ گیا اور بڑے شوق سے اِردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ سب کچھ تقریباً ویسا ہی تھا۔ چند ایک مکانات نئے تھے مگر دوسرے دیہات کی طرح یہاں جدید عمارتوں کا سیلاب نہیں آیا تھا۔ گاؤں کا موڑ موڑ، گلی گلی اُسے یاد تھی مگر چنار کے درختوں سے گھرا ہوا ایک چھوٹا سا مکان اُس کے ذہن سے اُتر گیا تھا۔ مکان کے پیچھے ایک باغ تھا اور باغ کے ساتھ ساتھ دریا بہتا تھا۔ وہ ہولے ہولے آگے بڑھنے لگا۔ تیس سال گزر گئے تھے لیکن اُسے سب کچھ اِس طرح یاد آ گیا جیسے کل کی بات ہو اِن گلیوں میں وہ کلیری کے ساتھ گھوما کرتا تھا، کلیری کے ساتھ پہروں مکان کے پھاٹک پر جھکا لرزتے ہاتھوں سے اُس کا ہاتھ تھامے کھڑا رہتا تھا۔ باغ کے ہر کنج میں اُس نے اُس سے پیار بھری باتیں کی تھیں اور دریا کے قریب ٹہلتے ہوئے قدم قدم پر اُس سے کہا تھا کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، پھر سفیدے کے درخت کے نیچے اُس نے کلیری کو الوداع کہا تھا، وہ چلی گئی تھی۔ اور ساحل کی گیلی ریت پر وہ دیر تک روتا رہا تھا۔

وہ اُس وقت بچہ تھا مگر کلیری کی یاد نے آج تک اُس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ کلیری! وہ تصور میں اُس کا سراپا دیکھنے لگا۔ بڑی بڑی نیلی آنکھیں، رخسار چھوتی ہوئی لمبی اور گھنی پلکیں، معصوم سا چہرہ، سنہرے گھنگریالے بال۔ اُس نے کلیری کو پہلے پہل گرجا میں دیکھا تھا، اتوار کا دن تھا۔ کلیری اُسے بے حد حسین و دل کش لگی، ایک لمحے کے لیے اُس کی سانس رُک گئی۔ کلیری نے جھالردار لباس پہن رکھا تھا، سفید بُراق۔ اُس کی پتلی کمر پر نیلے ربن کا پٹا کسا ہوا تھا، سَر پر تنکوں کا ہیٹ تھا، ہیٹ میں گلِ بہاری سجے ہوئے تھے۔

وہ اِس گاؤں میں اپنے گھر والوں کے ساتھ گرمی کی چھٹیاں گزارنے آیا تھا، اُن کا قیام گرجا کے عین سامنے تھا۔ دوسرے ہی دن پادری اُن سے ملاقات کرنے آ گیا، اُس نے اُن لوگوں کو پسند کیا لہٰذا تیسرے روز اُس کی موٹی سی سیدھی سادی بیوی آ گئی، اُس نے انہیں چائے پر مدعو کیا۔ اِس طرح دونوں خاندانوں کے تعلقات بڑھتے گئے۔

وہ اور کلیری گرجا کے کورٹ میں ٹینس کھیلتے، دریا کی سیر کرتے اور باغ میں گھومتے۔ دونوں کی مائیں ڈرائنگ روم میں بیٹھی چائے پی رہی ہوتیں، اُس کا باپ پادری کے ساتھ گرما گرم بحث میں مصروف رہتا۔

پادری کی ایک لڑکی اور تھی، ایفی۔ وہ کلیری سے بڑی تھی مگر اُس نے ایفی کو کبھی نہیں دیکھا تھا، ایفی کسی دوسرے قصبے میں آیا تھی اور وہ چھٹیاں اپنے مالکوں کے ساتھ گزار رہی تھی۔ ان کے علاوہ وہاں اور لوگ بھی ہوں گے مگر اُسے کوئی یاد نہیں تھا۔ اُس کے لیے تو ساری دنیا کلیری میں سمٹ کے رہ گئی تھی۔ کلیری کے ساتھ وہ بہت سرشار تھا، کلیری کے سوا نہ کچھ سوچتا تھا، نہ کسی اور کے خواب دیکھتا تھا۔ وہ اٹھارہ سال کا تھا اور کلیری سترہ سال کی۔ کلیری ایک لمبی سی چٹیا بنا کر سیاہ ربن سے باندھتی تھی۔ اُسے اپنے گھنگریالے بال سیدھے کرنے کا خبط تھا۔ ایک بار وہ ایفی کے کمرے سے چند ہیئر پنیں چرا لائی تھی۔ باغ میں بہتے ہوئے شفاف چشمے کے کنارے بیٹھ کے اُس نے پنیں لگائیں پھر چشمے کے پانی میں اپنی صورت دیکھی۔ دونوں دیر تک ہنستے رہے۔ بعد میں اُس نے پنیں نکال کر کلیری کے بال بکھیر دیے اور اُس بکھرے ہوئے سنہرے ریشم میں اپنا چہرہ چھپا لیا، اُس کا جسم تھرتھرا گیا، اُسے ایسا لگا تھا جیسے اُس کی ہڈیاں موم کی بنی ہوئی ہیں اور کلیری کے بدن کی گرماہٹ سے پگھل کر ڈھیر ہو جائیں گی۔

وہ کلیری سے محبت کرنے لگا تھا۔ کلیری کے بغیر اُسے جینا ناممکن نظر آتا تھا۔ اُس نے یہ بات کلیری سے کہہ دی تھی، کلیری نے شرماتے ہوئے اقرار کیا تھا کہ وہ بھی اُس سے محبت کرتی ہے اور اُس کے بغیر خوش نہیں رہ سکتی۔

انہوں نے شادی کی ٹھان لی اور اپنے والدین سے رجوع کیا والدین نے اُن کے حسین خواب منتشر کر کے رکھ دیے۔ دونوں کو ایسا معلوم ہوا جیسے انہیں دہکتے الاؤ میں دھکیل دیا گیا ہو۔ وہ بہت چھوٹے تھے ابھی تو اُن کی منگنی کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ”میں اٹھارہ سال کا ہوں۔“ وہ چلّایا تھا۔ ”اگر اب بھی مجھ میں عقل نہیں آئی ہے تو کبھی نہیں آئے گی۔“

”میں جب تک زندہ ہوں، کسی دوسرے سے محبت نہیں کروں گی۔“ کلیری کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا تھا۔

”مجھے اُس سے شادی کی اجازت نہ ملی تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔“

”کیا بے عقلی کی بات کرتے ہو۔“ اُس کے باپ نے کہا تھا۔ ”بالکل بے ہودہ۔“ یہی انداز کلیری کے والدین کا تھا۔

مگر دونوں نے بھی ایک دوسرے سے کوئی عہد کیا تھا آخر بڑی ردّوقدح کے بعد یہ طے ہوا کہ جب تک وہ اکیس سال کا نہیں ہو جاتا، وہ آپس میں نہیں ملیں گے اور نہ خط و کتابت کریں گے۔ ہاں، اگر یہ مدت گزر جانے کے بعد بھی اُن کے جذبات یہی رہے تو انھیں شادی کی اجازت ہو گی۔

کلیری پھوٹ پھوٹ کے روئی تھی۔ اُس کا دل بھی پھٹا جا رہا تھا مگر وہ کلیری کو دلاسا دیتا رہا۔ ”یہ وقت بہت جلدی گزر جائے گا جان! میں ہر دن کا ہر لمحہ تمہاری یاد میں بسر کروں گا اور جب اکیس برس کا ہو جاؤں گا، ہماری شادی ہو جائے گی۔ روؤ مت ڈارلنگ! مت روؤ۔ تین ہی سال تو ہیں، بالکل مختصر ہے۔ اس کے بعد ہم ساری زندگی ساتھ رہیں گے۔ پھر ہم کبھی جدا نہ ہوں گے۔“

کلیری نے کہا کہ ”ہم اگر ایک دوسرے کو خط نہیں بھیج سکتے تو کیا ہوا ہم روزانہ ہر بات لکھ کر اپنے پاس رکھ لیا کریں گے۔ اِس طرح وقت بھی آسانی سے گزر جائے گا اور دل بھی بہل جائے گا۔“

یہ تیس سال پہلے کی بات تھی۔ شروع میں اُس نے ایک ایک دن گن گن کر گزارا وہ مسلسل کلیری کے بارے میں سوچتا رہتا اور اُس کے نام لمبے لمبے خط لکھتا رہتا۔ کلیری نے آتے وقت اُسے ایک تصویر دی تھی، وہ بار بار تصویر چومتا اور دل میں کہتا، بس اب یہ وقت ختم ہونے والا ہے، تھوڑے ہی دن رہ گئے ہیں۔

مگر آخر وہ اُس کے بارے میں کب تک سوچتا رہتا۔ ایسے لمبے لمبے خط لکھنے سے کیا فائدہ جنہیں وہ اُس کے پاس بھیج نہ سکتا ہو، اُسے اور بھی تو بہت سے کام ہیں۔

اُس کی زندگی میں نئے دوست اور نئے مشغلے آ گئے۔ اگلی چھٹیاں اُس نے سوئٹزرلینڈ میں گزاریں اور پوری طرح محظوظ ہوا۔ کالج میں وہ کشتی رانی کی ٹیم کا کپتان بن گیا۔ زندگی بڑی مصروف اور دلچسپ ہو گئی۔ دوسرے سال بھی کلیری اُسے وقفے وقفے سے یاد آئی مگر بتدریج یہ داستان ایک خوش گوار خواب بنتی گئی۔ اُسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ کلیری کی صورت کیسی تھی۔ بدقسمتی سے اُس کی تصویر بھی کھو گئی۔ اب بھی اُس کا عزم یہی تھا کہ اکیس سال کا ہوتے ہی وہ گاؤں جا کے کلیری سے شادی کر لے گا مگر جیسے جیسے وقت قریب آ رہا تھا، ایک اور لڑکی ہلڈا کے بارے میں چہ میگوئیاں بڑھ رہی تھیں۔ سب کا خیال تھا کہ وہ ہلڈا سے شادی کرے گا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتا، اُس کے احباب اور والدین نے اُس کی قسمت کا فیصلہ سنا دیا۔ ہلڈا سے اُس کی منگنی کا اعلان کر دیا گیا۔

ہلڈا بڑی اچھی بیوی ثابت ہوئی۔ وہ اُس کے ساتھ بہت خوش تھا۔ وہ بہت سگھڑ، خوش مزاج اور فیاض عورت تھی۔ وہ کوئی خاص حسین تو نہیں تھی مگر عام زندگی میں یہ ایک ثانوی بات ہوتی ہے۔ وہ اُس سے نہایت خوش اور مطمئن تھا۔

گزشتہ سال اُس کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ تنہائی پھر اُسے ماضی کی طرف گھسیٹنے لگی۔ اُسے بھولی بسری باتیں یاد آنے لگیں، کلیری ایک بار پھر زندہ ہو گئی۔ وہ رات دن اُسی کے خیال میں رہنے لگا بچپن کی یادوں کا ایک ایک منظر اُس کی نظروں میں گھومنے لگا۔

ایک دن اُس نے فیصلہ کر لیا کہ کلیری کے گاؤں جائے گا اور ان خوابوں کے مناظر آنکھوں سے دیکھے گا۔ کہیں اُس کی محبت ایک سہانا خواب ہی تو نہیں تھی؟ شاید پادری نے گاؤں چھوڑ دیا ہو، اگر اُس نے گاؤں نہ بھی چھوڑا ہو گا تو کلیری یقیناً وہاں سے چلی گئی ہو گی۔ اُسے کلیری کی ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ اُس نے یقیناً شادی کر لی ہو گی، شاید آدھے درجن بچوں کی ماں بھی بن گئی ہو اب گاؤں جا کر ہی کچھ معلوم ہو سکے گا۔ وہ کئی ہفتے اُلجھن میں رہا کہ جائے یا نہ جائے۔ آخر ایک رات وہ گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

اب وہ کلیری کے گاؤں میں تھا۔ گلیوں سے گزرتے وقت اُس نے خود پر بڑھاپا طاری کر لیا مگر اُس کا دل بُری طرح مچل رہا تھا یہاں اُس نے اپنی زندگی کے حسین ترین لمحات گزارے تھے۔ وہ صرف اٹھارہ سال کا تھا۔ اُس کی سانس تیز ہونے لگی۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کا شباب لوٹ رہا ہو۔ اُس کی رگوں میں حدت بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ خود کو جذبات کے بھنور میں ڈوبتا محسوس کر رہا تھا۔ اگر وہ وعدے کے مطابق تین سال بعد یہاں آ جاتا اور کلیری سے شادی کر لیتا تو اُس کی زندگی کیسی گزرتی؟ اُس نے شانے اچکائے۔ شاید وہ کسی اور سے شادی کر چکی ہو گی۔ وہ ایک ایسی لڑکی تھی جو نوجوانی میں شادی کرنا پسند

کرتی ہے۔اُس پرشباب بھی تو ٹوٹ کر آیا تھا۔

وہ کیفے بلیو لائن میں داخل ہو گیا۔ ایک میز پر بیٹھ کے اُس نے بڑے جام کا آرڈر دیا۔ ایک موٹا اور گنجا آدمی ویٹر تھا۔ اُس نے ویٹر سے کلیری کے باپ کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ ویٹر نے کہا۔ "بوڑھا پادری؟ اوہ ہاں، وہ یہیں ہے۔ اب تو بہت کمزور ہو گیا ہے، اِس کے باوجود اتوار کا وعظ ضرور دیتا ہے۔"

"اُس کی بیوی؟"

"اُسے تو مرے دس سال ہو چکے ہیں۔"

اُس نے کلیری کے متعلق پوچھنا چاہا مگر منہ سے الفاظ نہ نکل سکے، یہ کلیری کے نام کی بے حرمتی تھی۔ اچانک اُس نے فیصلہ کرلیا کہ اُسے گرجا جا کر بوڑھے پادری سے ملنا چاہیے۔ یہ ایک فطری بات ہے۔ وہ گاؤں آیا تھا، اُس سے بھی ملنے آ گیا۔ پادری سے اُسے کلیری کے بارے میں معلوم ہو جائے گا، شاید وہ یہیں ہو، چھٹیاں گزارنے وہ اپنے باپ کے گھر آ سکتی ہے۔ اُس کا دل اُچھلنے لگا۔ اُسے کلیری کا برسوں پہلے والا دُبلا پتلا نرم و نازک سراپا یاد آ گیا۔ اُس کی نیلی چمکیلی آنکھیں اور سورج کی روشنی میں سونے کی طرح چمکتے ہوئے اُس کے بال اُس کے منہ سے آہ نکل گئی۔ وہ جلدی سے سنبھل گیا۔ یہ تو تیس سال پہلے کی بات ہے، اب وہ بالکل بدل گئی ہو گی۔ نہ جانے کیسی ہو؟ مجھے تو اُس کی ایک ہی صورت یاد ہے، خوب صورت، بھولی بھالی اور نازک اندام۔

گرجا کا پھاٹک زنگ خوردہ قبضوں پر جھول رہا تھا۔ اُس نے اُسے بڑی مشکل سے دھکیل کے کھولا۔ سامنے کا صحن کبھی ٹینس کورٹ تھا مگر شاید یہاں اُن کے بعد کبھی کسی نے ٹینس نہیں کھیلی۔ بجری پر بھی خود رو گھاس اُگ آئی تھی، اُس کے کناروں پر بے ترتیب جھاڑیاں لہرا رہی تھیں۔ مکان کے گرد درختوں کا ہجوم کچھ زیادہ ہو گیا تھا۔ درخت دھوپ روکے کھڑے تھے۔ دیواروں کا رنگ اُڑ گیا تھا، جگہ جگہ دھبے نظر آ رہے تھے۔ ماحول پر مایوسی سی طاری تھی۔ اِس ویرانی نے کلیری کی یاد اور بھڑکا دیا وہ بھی یہاں ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی تھی۔ ہر طرف اُس کے قہقہے گونجتے تھے۔ وہ جان بوجھ کر گیند دور پھینک دیتا۔ کلیری چلا اُٹھتی۔ "جنگلی" پھر جل ترنگ بجاتی گیند کے پیچھے بھاگنے لگتی۔ سفید لباس اور سفید موزوں میں وہ بالکل پَری لگتی، ہوا کے دوش پر اُڑتی ہوئی پَری۔

اب مکان کی کھڑکیوں میں مکڑی کے جالے تنے ہوئے تھے۔ وہ اور کلیری پھاٹک پر جھکے جھکے، ہاتھ تھامے گھنٹوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے رہتے، جیسے وقت ٹھہر گیا ہو پھر جب وہ محویت سے چونکتے تو دنیا انہیں پہلے سے زیادہ نئی اور شاداب نظر آتی۔

اُس نے دروازے پر دستک دی۔ بھورے بالوں والی ایک اُجاڑ عورت نے دروازہ کھولا، وہ ایک بے ڈھنگا چوغہ پہنے ہوئے تھی۔ وہ بے وقوفی سے مُسکرا دیا، اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ "کیا پادری صاحب اندر ہیں؟" آخر وہ بولا۔

"ہاں مگر آرام کر رہے ہیں۔" عورت نے کہا۔ "اُن سے کچھ کہنا ہو تو بتا جایئے۔"

"نہیں، میں تو بس۔" وہ نہ جانے کیوں ہکلا رہا تھا، کاش وہ نہ آیا ہوتا۔ "میں تیس سال پہلے ایک بار یہاں آیا تھا۔ نہ معلوم، اُنہیں یہ بات یاد ہو یا نہیں۔" اُس نے عورت کی طرف دیکھا۔ بھورے بال، تھکا ہوا سا جسم، میلا سا لباس۔ عورت اُسے کچھ مانوس معلوم ہوئی۔

"آپ ایفی ہیں؟ ہیں نا؟"

عورت نے دھیرے سے مسکرا کے دروازہ کھول دیا۔ "اندر نہیں آؤ گے؟" وہ اندر چلا گیا۔ سب کچھ وہی تھا مگر وقت نے ہر چیز پر اپنے نشان ثبت کر دیے تھے۔ تیس سال۔ وہی گھڑیال، وہی کرسیاں اور صوفے ٹھیک اُسی جگہ رکھے ہوئے۔ گلاب کے پھولوں کے ایک مدھم سی تصویر، یہ کلیری کی ماں نے بنائی تھی جب وہ دلہن بن کر آئی تھی۔ اُس وقت کمرے کی ہر شے زندہ اور حسین تھی مگر اب ہر چیز پر مُردنی طاری تھی۔

"بیٹھو۔" عورت بولی۔

وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا، پھر عورت کی طرف دیکھ کے وہ احمقانہ انداز میں مسکرا دیا۔ "نہ جانے میں کیوں چلا آیا۔" وہ بولا۔ "تیس سال ہو گئے۔ اُن دنوں آپ یہاں نہیں تھیں مگر کلیری نے مجھے آپ کا فوٹو دکھایا تھا۔ آپ کو پتا ہو گا کہ کلیری اور میں۔"

عورت گول میز کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"میں جانتی ہوں، کلیری نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔"

اُس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ "اُس نے یقیناً شادی کرلی ہو گی؟"

"ہاں۔" عورت بولی۔

"کہاں رہتی ہے وہ؟"

"شادی کے فوراً بعد وہ اپنے شوہر کے ساتھ کینیڈا چلی گئی تھی۔ اب وہاں اُن کا ایک کھیت ہے۔ دونوں خوش حال زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

اُس نے تصوّر میں کلیری کو دھان کے سنہرے کھیتوں میں کھڑے دیکھا، اُس کی نیلی آنکھیں مسکرا رہی تھیں اور سنہرے بالوں پر دھوپ بکھری ہوئی تھی۔ "اُس کے بچے، کتنے بچے ہیں اُس کے؟"

"دو۔ ایک لڑکا، ایک لڑکی۔"

کلیری ابھی تک کھیت میں تھی لیکن اب اُس کے ساتھ دو بچے بھی تھے۔ ایک بچہ اُس کی گود میں تھا، دوسرا اُس کے پاس کھڑا اُس کا اسکرٹ کھینچ رہا تھا۔ دونوں کلیری کی طرح سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والے صحت مند بچے تھے۔ بڑا فضول سا تصوّر ہے۔ بھلا اتنی مدت بعد وہ اتنی حسین کیسے نظر آ سکتی ہے۔ مگر اُس کے ذہن میں تو کلیری کی ایک ہی تصویر روشن تھی، وہ اُسے کسی اور صورت میں دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ کتنی ہی مدت گزر جائے، کلیری بہر حال کلیری ہی تھی۔ "کیا آپ کے پاس اُس کا کوئی فوٹو ہے؟"

وہ اُٹھ کر پرانی الماری کے پاس گئی اور ایک دراز کھول کے کاغذات اُلٹنے پلٹنے لگی۔ "افسوس، نہیں ہے۔" وہ بولی۔ "اُس نے چند فوٹو بھیجے ضرور تھے مگر ہم اُس کے فوٹو عموماً اپنی ایک پھوپی کو بھیج دیتے ہیں۔" عورت کاغذات دوبارہ ترتیب سے رکھنے لگی۔ وہ اُسے دیکھتا رہا۔ وہ بڑی تھکی ہوئی اور قانع لگ رہی تھی۔ اُسے خوشی ہوئی کہ کلیری اس اُداس اور خستہ و شکستہ ماحول سے نکل گئی ہے۔ عورت بولی۔ "یہ شاید تمہیں یاد ہو۔ یہ مجھے اُس کے جانے کے بعد اُس کی چیزوں میں سے ملا تھا۔"

یہ اُن دونوں کا ایک فوٹو تھا، یہ فوٹو اُنھوں نے تیس سال پہلے کھنچوایا تھا۔ وہ بالکل نوخیز لگ رہا تھا اور کلیری! فوٹو مدھم پڑ جانے کے باوجود کلیری کی دل کشی اور رعنائی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ حسرت سے بولا۔ "کس قدر حسین تھی۔"

"ہاں، بے حد۔ تمہارے پاس بھی اِس فوٹو کی ایک کاپی ہو گی؟"

"میرا خیال ہے، میرے پاس تھی۔" وہ بولا۔ "مگر اب وہ نہیں رہی۔ میرے پاس۔"

"اگر تم چاہو تو یہ رکھ سکتے ہو۔"

"اوہ، بہت بہت شکریہ۔" اُس نے پرس نکال کر فوٹو احتیاط سے رکھ لیا۔ "میں اِس کے لیے آپ کا واقعی بے حد ممنون ہوں۔"

"میں کلیری کو خط لکھوں گی تو اُسے لکھ دوں گی کہ تم آئے تھے۔ وہ بہت خوش ہو گی۔ شادی تو تم نے بھی کرلی ہو گی؟"

"ہاں۔ میری بیوی کا پچھلے سال انتقال ہو گیا۔"

"مجھے افسوس ہے۔"

"شکریہ۔" وہ بولا۔ "ہم نے تیس برس ساتھ گزار دیے تھے۔ اُس کے جانے سے ایک خلا پیدا ہو گیا ہے۔ کلیری کو خط لکھو تو میرا ذکر ضرور کرنا۔"

"ضرور۔"

"اچھا۔" وہ ملول سا کھڑا ہو گیا۔ "اب مجھے اجازت دیجیے۔"

وہ پھاٹک تک ساتھ آئی۔ اُس نے اُس سے ٹھہرنے کے لیے ایک بار بھی نہیں کہا۔ "تمہارے آنے اور یاد کرنے کا انتہائی شکریہ۔ میں کلیری کو ضرور لکھوں گی۔"

"شکریہ۔ خدا حافظ۔" وہ بولا۔

سڑک پر آ کے اُس نے گہری سانس لی شکستہ مکان اور اُجڑے ہوئے باغ میں اُسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا تھا۔ اب اُسے یہاں آنے پر افسوس ہو رہا تھا مگر کچھ اطمینان بھی تھا۔ کلیری نے شادی کرلی تھی، وہ خوش تھی، اُس کے دو بچے تھے۔ یہ خیال اُس کے لیے تسلی بخش تھا۔

عورت نے دروازہ بند کیا اور ایک پرانے سے قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ دیر تک بے حس و حرکت کھڑی اپنا عکس دیکھتی رہی۔ "کلیری!" ایک بوڑھی اور کمزور آواز نے اُسے پکارا۔

وہ چونک اُٹھی اور اُس نے آئینے پر آخری نظر ڈالی۔ "آئی پاپا۔" وہ آہستہ آہستہ زینے کی طرف بڑھ گئی۔

☆......☆



سرحد پار سے
پہلی زندہ کہانی

سٹکی

کرشن چندر

معاشرے کی وہ تصویر، جس کے کردار
آج بھی، اُسی توانائی کے ساتھ زندہ ہیں

اس کا اصل نام رام جی تھا مگر ماروتی روڈ باندرے پر، جہاں اس کا ناجائز شراب بیچنے کا اڈا تھا سب اس کو سٹکی کہتے تھے، کیوں کہ وہ ہر وقت اپنے ہاتھ میں اسٹک رکھتا تھا۔ دو فٹ لمبی اسٹک اور اوپر کو اُٹھی ہوئی خم دار مونچھیں، جن کی باریک نوک بچھو کے ڈنک سے ملتی جلتی تھی۔ وہ کم گو تھا لیکن بے حد صاف گو۔ بڑھیا مال سپلائی کرتا تھا مگر ایک پیسہ اُدھار نہ رکھتا تھا۔ اکڑ فوں جتانے والے بدمعاش یا کم حیثیت کے شرابی اس کے یہاں نہیں جاتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ وہاں اتنا ہی مال ملے گا جتنے جیب میں پیسے ہوں گے۔

ماروتی روڈ پر شراب کا دھندا کرنے سے پہلے رام جی دودھ بیچتا تھا اور جوگیشوری میں اپنی بیوی اور چھ بچوں کے ساتھ کولہا نگر چال میں رہتا تھا جہاں اس کے ساتھ کے دوسرے دودھ بیچنے والے بھیا لوگ بھی رہتے تھے مگر جب آرے ملک کالونی سے گورنمنٹ نے خالص دودھ سستے بھاؤ سپلائی کرنا شروع کیا تو اس کا کام مندا پڑنے لگا اور وہ سوچنے لگا کہ وہ آخر دودھ میں کس حد تک پانی کھپا سکتا ہے۔ کم از کم دودھ کا سفید رنگ تو دکھائی دینا چاہیے، ورنہ گاہک دودھ کے بجائے نل سے پانی پینے کو ترجیح دے گا۔ بہر حال رام کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا کہ کیا کرے اور چھ بچوں اور بیوی کا پیٹ کیسے پالے۔ وہ خود تو پوربیہ کا رہنے والا تھا، مگر اس کی بیوی گوری چٹی نیپالن تھی، اور تین بچیاں جو جوانی کی عمر کو پہنچ رہی تھیں، بے حد نازک اندام اور حسین تھیں اور اسکول میں پڑھنے جاتی تھیں۔ دونوں لڑکے ابھی چھوٹے تھے۔ آخر کچھ نہ کچھ تو اُسے کرنا ہی تھا۔ اب تک دن رات محنت کر کے اس نے تین ہزار روپے جوڑے تھے لیکن اگر کوئی ڈھنگ کا کام نہ ملا تو وہ ساری رقم کچھ ہی دن میں برابر ہو جائے گی۔ یہی سوچ سوچ کر اس کی راتوں کی نیند حرام ہوئی جاتی تھی۔

پھر ایک دن اسے لوکل گاڑی میں میکر مل گیا۔ ولیم میکر کو وہ ان دنوں سے جانتا تھا جب وہ جوگیشوری میں پولیس کا حوالدار تھا۔ لوگ اس کے نام سے ڈرتے لرزتے تھے کیوں کہ وہ بظاہر بہت سخت گیر اور ایمان دار حوالدار تھا قد پانچ فٹ گیارہ انچ قوی ہیکل جثہ، بڑی بڑی گھنی مونچھیں اور چوڑے چوڑے گل مچھے اور سرخ سرخ آنکھیں۔ بالکل قاتل معلوم ہوتا تھا پھر وہ ایک دم جوگیشوری سے غائب ہو گیا۔

اتنے برس کے بعد جو وہ رام جی کو ملا تو بے حد

تپاک سے پیش آیا مگر اس وقت وہ پولیس کی وردی میں نہیں تھا۔ ایک عمدہ بش شرٹ اور ٹیریلین کی پتلون ڈالے ہوئے تھا اور اس کے ہاتھ میں سونے کی تین انگوٹھیاں تھیں۔

رام جی نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھ کر کہا ''کیا بات ہے حوالدار جی؟ ایک دم ہمارے علاقے سے غائب ہوگئے۔ ایسے کہ پرانے دوست بھی یاد نہ رہے! آج کل کہاں کی ڈیوٹی ہے؟''

''میکر بولا ''میں نے پولیس کی نوکری چھوڑ دی ہے۔''

''چھوڑ دی ہے؟ کیوں؟'' رام جی نے حیرت سے پوچھا۔

''ایسے ہی۔ کسی دشمن نے مجھ پر رشوت کا الزام لگایا اور کچھ ایسا چکر چلایا کہ اگر میں نوکری نہ چھوڑ دیتا تو ڈسمس ہو جاتا۔''

''تو اب کیا کر رہے ہو؟''

''ایک نیا دھندا شروع کیا ہے۔''

''کیا دھندا ہے، کچھ کام کا ہو تو مجھے بھی بتاؤ۔ دودھ بیچنے میں آج کل کچھ رکھا نہیں ہے۔''

''کتنے روپے لگا سکتے ہو؟''

''ڈھائی تین ہزار تک لگا دوں گا۔''

''تو چلو میرے ساتھ باندرے، وہیں چل کے سب کچھ سمجھا دوں گا۔''

میکر اسے ماروتی روڈ، باندرے لے گیا، جہاں ناریل کے ایک جھنڈ میں اس کے دو چھپر تھے۔ ایک میں وہ اپنی بیوی میرینا اور اپنی لڑکی ڈیزی اور سات سال کے لڑکے بولو کے ساتھ رہتا تھا۔ (جانے اس لڑکے کا اصل نام کیا تھا، مگر سب اسے بولو کہتے تھے) دوسرے چھپر میں وہ شراب بیچتا تھا۔ لمبے مستطیل نما چھپر میں چھ بینچ پڑے ہوئے تھے، ایک طرف لکڑی کی باڑ تھی، جس پر ایک کونے میں کانچ کے تین بڑے بڑے مرتبانوں میں گاٹھیاں، چیوڑا، ملا جلا سنگ دانہ اور چنے رکھے تھے۔ دوسری طرف ایک ٹونٹی والے اسٹین لیس اسٹیل کے ڈرم میں ٹھرا بھرا ہوا رکھا تھا اور پیچھے دیوار پر لکڑی کے تختے لگا کر ان پر خالی بوتلیں رکھی تھیں۔

میکر کی بیوی میرینا اور اس کی لڑکی ڈیزی اور اس کا لڑکا بولو بیروں کا کام کرتے تھے۔ عام طور پر میرینا اور ڈیزی گاہکوں تک شراب پہنچاتی تھیں اور بولو گاٹھیا چنے وغیرہ لے کر جاتا تھا۔ بولو کے ذمے باہر کا کام بھی تھا۔ آس پاس کے بنگلوں میں بولو ہی ٹھرے کی بوتلیں پہنچاتا تھا۔

میکر نے اسے بتایا، گاٹھیا، چیوڑا، سنگ دانے میں کچھ نہیں بچتا۔ اصل نفع ٹھرے میں ہے، ایک بوتل کے پیچھے ایک روپیہ مل جاتا ہے۔ چار روپے بوتل کے دام ہیں اور ڈانڈے کی ڈسٹلری والا مجھے تین روپے بوتل کے بھاؤ سے ٹھرا دیتا ہے۔ فی بوتل ایک روپیہ مل جاتا ہے۔''

''اور کتنی بوتلیں رات بھر میں بیچ لیتے ہو؟''

''تیس چالیس بیچ لیتا ہوں، اور چھٹی والے دن پچاس بوتل تک بک جاتی ہیں۔''

رام جی نے اندازہ لگایا تیس روپے روز کے حساب سے بچتے ہیں تو مہینے میں نو سو ہوئے، چالیس کے حساب سے بارہ سو ہوئے پچاس کے حساب سے پندرہ سو روپے ہوئے، یہ تو بہت ہی بڑھیا دھندا ہے مگر...... ایک خیال رام جی کے دل میں آیا اور یکا یک وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

''ہاں، ہاں کہو۔'' میکر نے کہا۔

''مگر یہ تو غیر قانونی دھندا ہے۔'' رام جی رُک رُک کر بولا۔

''تو کیا ہوا؟ حاکم لوگ کو ہفتہ دیتا ہوں، چار، چھ مہینے میں دھاڑ پڑتی ہے، حاکم لوگ پہلے سے بتا دیتے ہیں۔ دھولکر دادا اپنے گرگوں میں سے ایک غنڈہ سپلائی کرتا ہے، اس کو پکڑوا دیتا ہوں، تین چار مہینے کی اس کو جیل ہو جاتی ہے۔ اس کے گھر بھر کا خرچ میں چلاتا ہوں۔ بس چھٹی۔''

''تو ہاتھ ملاؤ۔'' رام جی خوش ہو کر بولا۔ ''کل میں روپیہ لے کر آتا ہوں۔ آدھا آدھا منافع بانٹ لیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میکر نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ پھر اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مگر یہ نام بدلنا پڑے گا۔ ادھر کرسچین لوگ کا علاقہ ہے، رام جی نام نہیں چلے گا، یہ دھوتی کرتا بھی چھوڑنا پڑے گا۔''

''چھوڑ دیں گے، شرٹ پینٹ پہن لیں گے۔''

شرٹ پینٹ پہن کر اور ہاتھ میں ایک اسٹک لے کر رام جی، رام جی سے سنگی کہلانے لگا۔

سنگی اور میکر کی خوب جمی، ان کا دھندا بھی اچھا چل نکلا۔ پہلے انہوں نے ایک چھپر اور بڑھا لیا۔ جس میں گرما گرم بھجیا کے ساتھ کباب اور تلی ہوئی مچھلی بھی ملنے لگی۔ یہ سنگی کا آئیڈیا تھا۔ اس چھپر میں ذرا ہائی کلاس لوگ آتے تھے۔ ان کے آنے سے رام جی کو ایک اور دھندا سوجھا کباب کھانے اور شراب پینے کے بعد نفس کو عورت کی سوجھتی ہے، اس لیے میکر اور سنگی نے اپنا دھندا پھیلا کر اس میں ایک قحبہ خانے کو بھی شامل کر لیا۔ ایک لمبا چھپر ڈال کر اس میں آٹھ کیبن بنا دیے اور چھوکریاں سپلائی کرنے لگے۔ حاکموں کا منہ بند کرنے کے لیے ان کا ہفتہ بھی بڑھا دیا گیا، بس اب کیا تھا میکر اور سنگی دونوں ہاتھوں سے چاندی بٹورنے لگے۔

ایک روز میکر نے سنگی سے کہا ''میں کل پن ویل جاتا ہوں۔''

''کیوں''

''مجھے ایک دوست نے بتایا ہے، ادھر ایک بوٹ میکر نے نوا مال تیار کیا ہے ایس دھانسو مکسچر ہے کہ پوچھو نہیں۔ ایک ہی پیگ میں اتنا کِک دیتا ہے کہ اپنی ٹھرے کی پوری بوتل سے وہ نشہ نہیں ہوتا۔ میں اس مکسچر کو ادھر باندرے میں لانا چاہتا ہوں۔ جو لوگ زیادہ پیسے خرچ نہیں کر سکتے، وہ سب کے سب ہمارے اڈے پر کھنچے چلے آئیں گے، اور گراہکی ایک دم ڈبل ہو جائے گی۔''

''مگر آج رات کیا کر رہے ہو؟'' سنگی نے آنکھ مار کر اس سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں ایک خاص اشارہ تھا جسے میکر فوراً بھانپ گیا۔ ان دونوں کی عورتیں جب بے کار ہوتی تھیں تو وہ اکثر کولابہ میں رانی بائی کے اڈے کا رُخ کرتے تھے، جہاں شہر کی سب سے خوبصورت چھوکریاں سپلائی ہوتی تھیں۔ میکر ہی پہلے پہل سنگی کو اس اڈے پر لے گیا تھا۔

''سب سے اچھی بات یہ ہے۔'' میکر نے اسے بتایا تھا۔ ''کہ اس اڈے پر بیماری کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ رانی بائی نے ایک ڈاکٹر بھی رکھا ہوا ہے جو روج ریگولر لی چھوکری لوگ کو دیکھتا ہے۔''

''اصل بات یہ ہے۔'' سنگی نے کچھ جھینپتے ہوئے کہا تھا ''میری بیوی ان دنوں پیٹ سے ہے۔''

''تو تم رانی بائی کے اڈے کے پرمانینٹ گراہک بن جاؤ، رانی بائی ایسے گراہکوں کو پندرہ پرسنٹ ری بیٹ بھی دیتی ہے۔'' اور دونوں زور زور سے ہنسنے لگے تھے۔

دوسرے دن میکر پن ویل گیا تو پھر لوٹ نہیں سکا۔ اس دن ''نوا مکسچر'' بنانے والے کے اڈے پر جتنے لوگوں نے اس مکسچر کو پیا۔ وہ اسی رات تڑپ تڑپ کر مر گئے، ان میں میکر بھی تھا۔ اس نے صرف ایک پیگ پیا تھا مگر اس کا کام تمام کرنے کے لیے وہی کافی نکلا۔ دراصل غلطی ''نوا مکسچر'' بنانے والے کی بھی نہیں تھی۔ اب تک وہ ٹھرے میں فرنچ پالش ملا کر بیچتا تھا۔ اسے ایک دوست نے مشورہ دیا کہ فرنچ پالش کے ساتھ ساتھ اگر بار کائیل املشن بھی ملا لو تو غضب کی کِک دے گا مگر اس نے کِک بڑھانے کے لیے بار کائیل املشن کی مقدار ذرا اور بڑھا دی۔ اس تجربے میں ایک رات میں ستر آدمی مر گئے مگر تجربے میں اتنا خطرہ تو مول لینا ہی پڑتا ہے، اگر انسان تجربے نہ کرتا تو آج تک اتنی ترقی نہ کرتا۔

میکر کے مرنے کے بعد سارا دھندا سنگی کے ہاتھ میں آ گیا۔

میرینا اپنی بیٹی ڈیزی کو لے کر اور اپنے بزنس کا حصہ بیس ہزار میں بیچ کر گوا چلی گئی مگر دو سال کے بعد ہی واپس آ گئی۔ روپیہ سب ختم ہو گیا تھا۔ بولو پھر بیرا گیری کرنے لگا اور سنگی کے مشورے سے میرینا اور اس کی بیٹی ڈیزی چیمبر نمبر چار میں دھندا کرنے لگیں کیوں کہ ڈیزی تو بالکل جوان تھی اور میرینا کے جسم میں ابھی خاصی دلکشی باقی تھی۔ وہ پرانے زمانے والی بات تو خیر نہ تھی مگر پھر بھی ان دونوں کا اچھا گزارہ ہو جاتا تھا۔

پھر ایک دن سنگی اور دھولکر دادا میں ایک ذرا سی بات پر تو تو میں میں ہو گئی۔ بات صرف اتنی تھی کہ حاکموں کا ہفتہ بڑھا دینے کے بعد دھولکر دادا نے بھی اپنا ہفتہ بڑھا دینے کا مطالبہ کیا۔ وہ سو روپے ہفتے کا ایگریمنٹ چاہتا تھا مگر سنگی صرف تیس روپے دینے پر راضی ہوا۔ دھولکر دادا نے مان تو لیا مگر اندر ہی اندر وہ سنگی سے خار رکھنے لگا۔

پھر ایک روز موقع دیکھ کر دھولکر دادا باندرے

پولیس اسٹیشن جانے کے بجائے سیدھا سینٹرل وائس اسکواڈ کے دفتر پہنچا۔ اور وہاں سے دھاڑ اُٹھالایا۔ چھ چھوکریاں موقع پر گرفتار ہوئیں، سنگی بھی پکڑا گیا، اسے آٹھ مہینے کی جیل ہوئی۔

جیل کی ڈنڈا بیڑی اور کڑی زندگی جھیل کر سنگی بہت کم زور ہوگیا، خوش حالی نے اسے بہت ہی نرم اور پلپلی زندگی کا عادی بنادیا تھا۔ اس لیے جیل کی سختیاں جھیل کر جب وہ باہر نکل تو عجیب تذبذب میں تھا کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔

جیل سے چھٹی ملی تو وہ سیدھا اپنے چھپروں میں گیا اور انہیں ویران اور اُجڑا ہوا دیکھ کر دیر تک روتا رہا پھر وہ جوگیشوری میں اپنے گھر گیا جو ابھی تک کولہا نگر چال میں تھا۔ اس نے اپنے گھر کے ماحول کو ابھی تک پورے طور پر باندرے کے چیمبروں کے ماحول سے الگ رکھا تھا۔ بچے سب انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھتے تھے۔ سنگی کے پکڑے جانے سے کولہا نگر چال میں بہت بم چخ مچی تھی۔ اسکولوں میں لڑکے لڑکیوں نے سنگی کے بچوں پر بہت آوازے کسے تھے اور گلی محلے والوں نے خوب تھوتھو کی تھی۔

اب سنگی نے کافی پیسہ بھی جمع کرلیا تھا، اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ سیدھے راستے چلے گا اور بُرے دھندے کی طرف آنکھ اُٹھا کے بھی نہیں دیکھے گا۔ اس کا فیصلہ سُن کر حاکموں کی طرف سے بھیجے گئے ایک دلاّل نے اس سے پوچھا۔

"پھر ہمارے کمیشن کا کیا ہوگا۔"

"جہنم میں جاؤ۔" سنگی بڑی سختی سے بولا۔

"اور حاکموں کا ہفتہ؟"

"وہ بھی وہیں سے وصول کرو۔"

دلاّل دیر تک غور سے سنگی کی طرف دیکھتا رہا پھر اُٹھ کر چلا گیا۔ اس کے بعد اسے کئی آفر دیے گئے۔ اگر اب وہ اپنا بزنس شروع کرے گا تو اس کے ساتھ ایسا دھوکا کبھی نہیں ہوگا، اب وہ کبھی نہیں پکڑا جائے گا۔ اس کے لیے یہ اسپیشل رعایت رکھی جائے گی کہ وہ اپنے چھپروں میں رات کے دو بجے تک ٹھرا سپلائی کرسکتا ہے اور اگر وہ حاکموں کو تھوڑا سا مہنگائی کا الاؤنس بھی دینے پر تیار ہوجائے تو دھاڑ سال میں صرف ایک بار پڑا کرے گی۔ اس طرح اسے راہ پر لانے کے لیے بہت سے آفر دیے گئے مگر سنگی اپنی ضد پر اڑا رہا کہ اب وہ دھندا کبھی نہیں کرے گا۔ پھر ایک روز اسے ایک رشوت خور نے بلا کر دھمکایا "دیکھو اگر تم اپنا دھندا چالو کرنا نہیں چاہتے تو مت کرو مگر ہمیں ہمارا ہفتہ دیے جاؤ۔"

"واہ صاحب!" سنگی نے اکڑ کر کہا۔ "دھندا نہیں ہوگا تو ہفتہ کیسے چالو ہوگا؟"

وہ حاکم بولا۔ "اگر تم دھندا نہیں کرتے تو اس میں ہمارا کیا قصور؟ ہمارا ہفتہ کیوں بند ہو؟"

"میں ہفتہ نہیں دوں گا۔"

وہ رشوت خور مسکرایا۔ بولا "میرے پاس شکایتیں پہنچی ہیں کہ تم اپنی دونوں جوان لڑکیوں، کرنی اور بلہاری سے پیشہ کراتے ہو۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" سنگی طیش میں آکر بولا۔ اس کی مٹھیاں کس گئیں اور آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ "وہ میری نہیں دوسروں کی لڑکیاں ہوتی ہیں۔"

حاکم نے اپنے قریب کھڑے ہوئے دو آدمیوں کی طرف اشارہ کیا جنہیں سنگی پہچانتا تھا۔ دونوں دھولکر دادا کے گرگے تھے۔

"ان دونوں کے پاس سب شہادتیں اور ثبوت موجود ہیں۔" حاکم نے اپنی میز پر ایک فائل کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ "سب فائل تیار ہوچکی ہے۔ تمہیں سوچنے کے لیے سات دن دیے جاتے ہیں۔"

سات دن بعد باندرے مارولی روڈ کے چھپروں میں وہی رونق، وہی چہل پہل تھی۔ شرابیوں کی پاٹ دار شیخیاں اور لڑکیوں کے روپہلی قہقہے، اور بولو کی تیز تیز آوازیں۔

"چھ نمبر، ایک پاؤ مچھلی فرائی، ایک باٹلی ٹھرا، چار آنے کی بھجیا۔"

"سات نمبر دو باٹلی ٹھرا، چھ سیخ کباب ایک پلیٹ سنگ دانہ۔"

لکڑی کے بار کے قریب جاکر سنگی کے پُرانے گاہک نے آنکھ مار کر اس سے پوچھا، "کیا ہوا سنگی؟ تم نے تو اس بُرے دھندے میں نہ آنے کی قسم کھائی تھی؟"

سنگی نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بُرا دھندا پھر سے شروع نہ کرتا تو حاکموں کو ان کا ہفتہ کیسے ملتا؟"

☆......☆

سرحد پار سے

دوسری سچی کہانی

آرسی مصحف

ہیرانند سوز

سرحد پار سے ایک ایسی یادگار کہانی
جس کا انجام...... یقیناً آپ کو چونکائے گا

بینڈ باجے والے جوکروں کی سی وردیوں میں ملبوس کوٹھی کے برآمدے میں اکتائے ہوئے سے بیٹھے بیڑیاں پی رہے تھے۔ ان کی نفیری اور شہنائیاں دیوار کے ساتھ لگی ہوئی ایک قطار میں پڑی تھیں۔ بینڈ ماسٹر



تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد شاید گھر والوں کو اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے اپنے نقارے پر ایک ہلکی سی چوٹ لگا دیتا تھا، مگر اندر تو عورت ابھی پورے جوبن پر تھی۔ مہمان ڈٹ کر کھا رہے تھے اور ان کی پلیٹیں بار بار مٹھائیوں سے بھر دی جاتی تھیں اور ہر مہمان سے تھوڑا سا اور کھا لینے کے لیے بار بار اصرار کیا جا رہا تھا۔ جیسے دعوت نہیں، کھانے کھلانے کی کوئی جنگ ہو رہی ہو۔ مٹھائیوں کے علاوہ سب کے سامنے گرم گرم دُودھ کے گلاس بھی بھرے رکھے تھے، وہ بھی ابھی اُن سب کو پینے تھے۔ ریت ہی ایسی تھی۔ لڑکے کا بڑا بھائی اور چچا دونوں گلابی رنگ میں نہائے بیٹھے تھے۔ باقی مہمانوں پر بھی گلابی رنگ بڑی فراخ دلی سے چھڑکا گیا تھا۔ خاطر مدارت کے ساتھ ساتھ اُن سب سے مذاق بھی ہو رہا تھا۔ چنانچہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کسی برجستہ فقرے پر صحن کی فضا قہقہوں سے گونج اُٹھتی تھی۔

سوما اپنے کمرے میں بیٹھی کھڑکی کی جالی سے یہ سب تماشا دیکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ والے کمرے میں مٹھائیوں اور خشک میووں سے بھرے ہوئے چالیس تھال رنگ برنگ کاغذوں سے ڈھکے تخت پر رکھے تھے، ادھر ایک کونے میں تپائی پر پڑا ہوا اکتالیسواں تھال کرنسی نوٹوں سے لدا رہا تھا۔ دس دس روپے کے نئے نوٹوں کے تین بنڈل اُس میں بڑے قرینے سے دَھرے تھے۔ اس کا چھوٹا بھائی مدن ابھی منڈی سے پھلوں کے ٹوکرے لے کر نہیں لوٹا تھا۔ اس کے آنے پر ہی اس کا شگن یہاں سے روانہ ہونا تھا۔

سوما کے لیے یہ تماشا نیا نہیں تھا۔ ایسا پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا۔ کتنی ہی دفعہ اس کی منگنی کا جلوس اسی طرح شان و شوکت سے نکالا گیا تھا لیکن یہ بیل اب تک منڈھے نہیں چڑھ سکی تھی۔ جیسے ہی اس کی شکل و صورت کے بارے میں کچھ چرچا ہونے لگتا، منگنی کا شگن واپس آ جاتا۔ سوما کی زندگی کا یہ سب سے بڑا المیہ تھا کہ وہ بدصورت تھی۔ بھدّے نقوش اور گہرے سانولے رنگ والی یہ لڑکی اپنے خوب صورت دل اور روشن دماغ کے باوجود ابھی تک کسی کو پسند نہیں آئی تھی۔ اوّل تو لڑکے والے اُسے دیکھتے ہی رشتے سے کنّی کترا جاتے یا پھر اگر کسی جگہ اس کی بدصُورتی کی طرف سے آنکھیں بند کروا کر یا اپنی امارت کے بل بوتے پر اس کا رشتہ کر بھی دیا جاتا تو بھید کھلتے ہی اس کی سُسرال میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا، لڑکا باغی ہو کر گھر سے بھاگ نکلتا اور رشتہ ٹوٹ جاتا۔ ایسا تین بار ہو چکا تھا۔ اس کا باپ اچھا کھاتا پیتا اور حوصلہ مند آدمی تھا۔ اس نے ہر چند اُسے سونے اور چاندی میں مڑھ کر دینا چاہا مگر اس پر بھی سب کو یہ سودا گھاٹے کا معلوم ہوا۔ خوبصورتی کی اپنی جو ایک الگ قیمت ہے، وہ کسی طرح بھی مال و زر سے چُکائی نہ جا سکی۔ اس لیے پچیس سال کی ہو چکنے پر بھی سوما ابھی تک بن بیاہی تھی۔ وہ پہاڑ گنج کے ایک پرائیویٹ گرلز ہائی اسکول میں اسکول مسٹریس بن کر اپنی جوانی کاٹ رہی تھی۔ تین سو روپے مہینہ تنخواہ پاتی تھی اور اپنے والدین پر کسی طرح کا بوجھ نہیں تھی لیکن اس کی شادی کر دینا تو ان کا ایک سماجی اور اخلاقی فرض تھا۔ وہ اُس سے سبک دوش ہونا چاہتے تھے۔ اس لیے اس سلسلے میں سر توڑ کوشش کر رہے تھے۔ اس نئے رشتے کی بات ابھی پچھلے ہفتے ہی اُن کے گھر میں چلی تھی۔ لڑکے کی دونوں بھاوجیں شگن سے پہلے اُسے آ کر دیکھ بھی گئی تھیں، اس کے باوجود اُن کی طرف سے ''ہاں'' ہو گئی تھی اور آج دھوم دھام سے اس کی منگنی کا شگن دیا جا رہا تھا۔

سوما حیران تھی کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟ اسے دیکھ لینے کے بعد بھی ان لوگوں نے ہاں کیوں کر دی؟ کہیں وہ بھاوجیں ہی تو گھر میں اپنی برتری قائم رکھنے کے لیے اسے اپنے چھوٹے دیور کے سر نہیں منڈھ رہیں؟ ممکن ہے اُنھوں نے گھر جا کر اس کی جھوٹی تعریف کی ہو اور اس گھر سے اچھا جہیز ملنے کے لالچ میں اپنے گھر والوں کو یہ رشتہ لینے پر راضی کر لیا ہو؟

احساسِ کمتری نے سوما کے دل میں کئی وسوسے پیدا کر دیے تھے۔ اس کا دل ایک انجانے خوف سے دھڑک رہا تھا۔ بار بار کے انکار نے اس کے اندر اس مسئلے کا روشن پہلو دیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں رہنے دی۔ بدصُورتی کے منحوس سائے اس کی سوچوں پر بہت گہرے ہو چکے تھے اس لیے اس کا دماغ ہمیشہ اندھیرے ہی کی طرف لپکا

تھا۔ روشنی میں اس کے خیالات کی آنکھیں چندھیا جاتی تھیں۔ اس وقت بھی جب کہ سب کچھ ٹھیک طرح ہو رہا تھا، اسے حالات کی مخالف لہر ہوا بن کر ڈرا رہی تھی اور وہ اپنے غیر یقینی مستقبل سے خوف زدہ ایک کونے میں دبکی بیٹھی تھی۔

مہمان دعوت اُڑا کر اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ مدن بھی پھلوں کے ٹوکرے لے کر پہنچ گیا تھا اور شگن کے تھال دیکھ کر اب لڑکے والوں کو سنبھلوائے جا رہے تھے۔ اتنا بھاری شگن دیکھ کر سب کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں، مگر اس کا باپ اب بھی سب کے سامنے اپنی عاجزی اور کم مائیگی کا اظہار کر رہا تھا۔ اسے اپنے بوڑھے باپ پر رحم آنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور اپنے لیے اس کے اندر نفرت کا جذبہ جاگ اُٹھا۔ وہ اپنے آپ کو مجرم تصور کرنے لگی۔ جیسے بدصورتی اس کا اپنا ہی گناہ تھا جس کی وجہ سے اس کے باپ کی بار بار ہیٹی ہو رہی تھی۔ کاش! وہ یہ سب کچھ دیکھنے سے پہلے ہی مر جاتی۔

باہر بینڈ والوں نے اپنے باجے سنبھال لیے تھے۔ کرائے کے مزدور شگن کے تھال سروں پر رکھے ایک قطار میں باہر نکل رہے تھے۔ پھر سمدھیوں نے بڑے تپاک سے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور ایک ایک کر کے باہر جانے لگے۔ باجوں کا شور بلند ہوا اور ایک بار پھر اس کا شگن جلوس کی صورت میں ان کے گھر سے سڑک کی طرف ہو لیا۔

گھر والے اب اپنے برتن بھانڈے سنبھالنے میں مصروف تھے۔ پلیٹوں، گلاسوں اور چمچوں کی گنتی ہو رہی تھی۔ سب لوگ مسرور اور مطمئن نظر آ رہے تھے۔ جیسے سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا ہو اور اب خطرے کی کوئی بات باقی نہ رہی ہو۔ مگر سوما کو خطرہ اب بھی سر پر کھڑا نظر آتا تھا۔ اس کا یقین اب بھی متزلزل تھا۔ یہ بات اس کے دل میں بیٹھ چکی تھی کہ لڑکے کی بھاوجوں نے گھر جا کر اس کی شکل و صورت کے بارے میں جھوٹ بولا ہے اور جیسے ہی اس جھوٹ کا پول کھل گیا، بات پھر وہیں آ جائے گی۔

وہ خود تو اپنے منگیتر کو ایک بار دیکھ چکی تھی۔ گھر میں بڑوں کے درمیان کچھ ذکر و اذکار سے اُسے پتہ لگ گیا تھا کہ اس کا نام گلشن ہے اور وہ نئی دہلی ریلوے اسٹیشن پر ریزرویشن کلرک ہے اور پھر یہ بھی محض ایک اتفاق تھا کہ ایک دن اسے فوارے سے پہاڑ گنج کی بس بروقت نہ ملنے کے باعث دہلی مین اسٹیشن سے ٹرین کے ذریعے اسکول جانا پڑا اور نئی دہلی ریلوے اسٹیشن کی ڈیوڑھی سے گزرتے ہوئے اس کی نظریں لاشعوری طور پر ریزرویشن آفس کی طرف اُٹھ گئی تھیں۔ بابو صاحب اس وقت کسی مسافر سے باتوں میں مصروف تھے، خاصے قبول صورت تھے۔ سوما نے محسوس کیا کہ وہ ان کے لیے بالکل موزوں نہیں ہے۔ اس کی صورت دیکھ کر وہ یقیناً اس رشتے سے انکار کر سکتے تھے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ شگن گئے ہوئے ایک مہینہ گزر گیا تھا، مگر کسی رُخ سے کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی تھی۔ لڑکے والوں کے ہاں سے اس کے لیے سونے کی انگوٹھی بھی آ گئی تھی اور اب شادی کی تاریخ پکی کرنے کے لیے خط و کتابت ہو رہی تھی، مگر سوما بدستور خوف زدہ تھی اُسے یہ سلسلہ ریت کی ایک دیوار نظر آ رہا تھا اور شادی کی تیاریوں کے ساتھ ساتھ اس کی گھبراہٹ برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو صلیب پر چڑھا ہوا محسوس کرتی۔ ہر گزرتا ہوا دن اس کے ذہن میں ایک نئی کیل ٹھونک جاتا۔ ہر روز اسکول سے واپس آتے ہوئے اسے ایک بار ضرور خیال آتا کہ آج اس کا شگن واپس آ گیا ہوگا، مگر گھر پہنچ کر جب اسے یہ پتا لگتا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تو وہ اُداس ہو کر فکر مند ہو جاتی۔ شگن کی واپسی کا انتظار وہ بالکل ایک متوقع جوابی خط کی طرح کر رہی تھی جس میں اس کی سزا کی منسوخی کا حکم آنے والا ہو۔ گھر میں بھی وہ جتنی دیر رہتی اُس کے کان ہر وقت صدر دروازے پر کسی دستک کے منتظر رہتے۔ اس وقت اگر گھر کا کوئی اپنا آدمی بھی اچانک اندر داخل ہوتا تو وہ دروازے کی طرف یوں چونک کر دیکھتی جیسے اس کا شگن واپس آ گیا ہو۔ وہ خود بھی حیران تھی کہ ایسی اُلٹی سیدھی باتیں کیوں اس کے ذہن میں اُبھر آتی ہیں؟ وہ تو شادی کی بڑی خواہش مند تھی۔ برسوں سے اس مقدس موقع کا انتظار کر رہی تھی۔ ازدواجی زندگی کے

بارے میں اس نے کیسے کیسے سپنوں کے جال بُن رکھے تھے، مگر اب جب کہ سب کچھ ٹھیک طرح ہو رہا تھا، وہ کیوں بُرے امکانات کے بارے میں سوچتی تھی؟ کیوں ان خوش آئند حقائق سے پہلو بچانا چاہتی تھی جو اس کی زندگی کے لیے ایک سیدھا راستہ مقرر کر رہے تھے؟ شاید اس کا اپنا ہی کوئی چور اس کے دل میں ڈر بن کر چھپ گیا تھا اور وہ ہزار کوشش کے باوجود اپنے ذہن میں ایک خوشگوار گرہستی زندگی کا تصور نہیں لا پاتی تھی۔ ہمیشہ اُس کے گھناؤنے پہلو ہی اس کے خیالات پر حاوی ہو جاتے تھے۔ گھر میں شادی کا ذکر ہوتے ہی اُسے یُوں لگتا جیسے اسے کسی بہت بڑے آپریشن کے لیے اسپتال میں داخل کرانے کی تیاریاں ہو رہی ہوں۔ دہشت سے اس کا رُواں رُواں کانپ جاتا۔ مذبح میں لے جانے والی کسی بکری کی طرح اُس کی روح سہم جاتی اور وہ سارا سارا دن پریشان خیالات کے تانوں بانوں میں اُلجھی رہتی اور پھر یہی دبے گھٹے ہوئے خیالات ڈراؤنے خواب بن کر سیاہ آوارہ بادلوں کی طرح اس کے ذہن پر چھا جاتے، وہ دیکھتی کہ وہ سب لوگ جو شگن کے موقع پر اُن کے ہاں دعوت کھانے آئے تھے، اب تیزاب سے اُس کے چہرے کی سیاہی دھو رہے ہیں۔ اُس کا جسم شکنجوں میں کس کر اُسے دُبلا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کی کھال اُدھیڑ کر اُس کے ڈھانچے پر نئی سفید کھال چڑھائی جا رہی ہے۔ وہ سخت اذیت محسوس کرتی، چیخنا چاہتی مگر ہر بار اس کی آواز گلے میں گھٹ کر رہ جاتی اور وہ کسمسا کر جاگ پڑتی۔ اپنے ہونے والے شوہر کو اس نے کئی بار دوسری شادی رچاتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ اپنی سوتنوں سے تو وہ اکثر خواب میں جھگڑا کرتی تھی لیکن اس کی اس ذہنی کشمکش اور اپنے مقدر کے متعلق مکمل بے اعتمادی کے باوجود اس کی شادی کی تاریخ دسہرے کے دن کے لیے پکّی ہو گئی۔ جس دن اُن کا پروہت شادی کا مہورت لے کر اُن کے گھر آیا، وہ دن اُس پر قیامت کی طرح گزرا۔ دو دھاری تلوار کی سی سوچوں نے اس کے دل و دماغ چھلنی کر ڈالے۔ اُس رات اُسے ایک نہایت بھیانک خواب دکھائی دیا کہ وہ عدالت کے کٹہرے میں کھڑی ہے۔ سب لوگ حقارت سے اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ جج اس کی طرف پیٹھ کیے بیٹھا ہے۔ وکیلوں کے ہاتھ اس کے سامنے ہوا میں لہرا رہے ہیں اور چاروں طرف سے بپھری ہوئی آوازیں بلند ہو رہی ہیں! ”طلاق۔ طلاق۔“

وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے بعد نیند اس کی آنکھوں سے غائب ہو گئی۔ خیالات کے مُتند ریلے اس کے ذہن کو شدت سے ہلورے دینے لگے۔ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر اور پھر صبح جب وہ گھر سے تیار ہو کر اسکول روانہ ہوئی تو اس کے قدم بس اسٹینڈ کے بجائے آپ ہی آپ اسٹیشن کی طرف اُٹھنے لگے اور اُسی دن کی طرح وہ ایک بار پھر گاڑی پر سوار ہو کر نئی دہلی ریلوے اسٹیشن پر جا اُتری اور ڈیوڑھی کے گیٹ سے گزر کر چپ چاپ ریزرویشن کاؤنٹر کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ ڈیوٹی پر بیٹھے ہوئے گلشن نے اس کی طرف دیکھ کر عام سے دفتری لہجے میں کہا۔

”کیا چاہیے آپ کو؟“

”مجھے؟ نہیں چاہیے تو کچھ بھی نہیں۔ میں۔ میں تو آپ کو صرف یہ بتانے آئی ہوں کہ جس لڑکی سے آپ کی منگنی ہوئی ہے۔ وہ۔ وہ۔ وہ میں ہوں۔ یہ دیکھیے آپ کے گھر کی انگوٹھی۔ میرا مطلب ہے، شادی سے پہلے آپ لوگ پھر اپنے فیصلے پر غور کر لیجیے۔ ایسا نہ ہو کہ۔“ اس سے آگے سوما کچھ نہ کہہ سکی۔ گلشن کے جواب کا بھی اس نے انتظار نہیں کیا۔ بس فوراً وہاں سے چل پڑی اور تیزی سے قدم اُٹھاتی ہوئی اسکول کی جانب روانہ ہو گئی۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا محسوس کر رہی تھی۔ اپنے پکے ہوئے پھوڑے کا مواد آج اس نے نکال دیا تھا۔

تیسرے دن اس کا شگن واپس آ گیا۔ سارے گھر میں کھلبلی مچ گئی لیکن سوما اطمینان کا ایک گہرا سانس لے کر اندر اپنے پلنگ پر دراز ہو گئی جیسے ایک بہت بڑا بوجھ اُس کے سر سے اُتر گیا ہو۔

☆......☆



ناگن

اعجاز احمد نواب

> زندگی صرف وہی تو نہیں جو ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ زندگی تو وہ بھی ہے جسے ہم صرف سوچتے ہیں۔ نیا سلسلہ "ناگن۔" آپ کو یقیناً ایک نئی دنیا' نئی زندگی میں قدم رکھنے پر مجبور کردے گا۔ ہزاروں سال کی تپسیا پر پھیلا' زندگی کا نیا رنگ۔ ناگن کے روپ میں' آپ کو ضرور تسخیر کرے گا

قسط نمبر: 1

"ہٹو بچو!...... مہارانی کی سواری آ رہی ہے۔ ہٹ جاؤ...... راستہ چھوڑ دو تابانہ کی ملکہ تشریف لا رہی ہیں۔" شاہی اہلکار زور زور سے کوڑے برسا رہے تھے اور لوگوں سے راستہ خالی کرا رہے تھے۔

ہجوم کائی کی طرح پھٹنے لگا۔ لوگ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ تھوڑی دیر میں رستے اور بازار غریب کی جیب کی طرح خالی ہوگئے۔ کوڑا بردار ہرکاروں کے بعد مسلح سپاہیوں کا ہراول پیدل دستہ گزرنے لگا! جس کے پیچھے گھڑسوار تھے۔

اردگرد کی تمام عمارتوں سے لوگ کھڑکیوں اور بالکونیوں سے لگے ملکہ کی ایک جھلک کے منتظر تھے۔

مشتاقانِ دید کو بالآخر مہارانی کی بگھی نظر آئی...... آٹھ پہیوں والی اس بگھی پر مخمل کے پردے تھے جو سمٹے ہوئے تھے اور اس کے اندر تقریباً اٹھارہ سالہ انتہائی خوبصورت گوری رنگت اور سیاہ لانبے والوں والی حسین و جمیل دوشیزہ انتہائی قیمتی لباس زیب تن کیے پورے طمطراق کے ساتھ صوفہ نما گدے میں دھنس کر بیٹھی تھی جس کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ اور آنکھوں میں ذہانت اور غرور کی چمک تھی! ملکہ کے دونوں طرف دو کنیزیں دوزانو ہو کر باادب بیٹھی تھیں۔ بگھی کے پچھلے حصے میں ملکہ کے خدمت گار چند غلام اور کنیزیں چاق چوبند بیٹھے تھے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ بگھی کے آگے گھوڑوں کی جگہ انسان جتے ہوئے تھے چار مرد اور چار خوبصورت لڑکیاں۔ سب کے پاؤں میں لوہے کی بیڑیاں اور گردنوں میں طوق تھے۔ دو حبشی جلادان کو وقفے وقفے سے کوڑے مار کر مسلسل بگھی کھینچنے پر مجبور کر رہے تھے۔

شڑاپ شڑاپ کی ہر آواز کے ساتھ ان چیخیں بلند ہوتیں' تمام قیدی مرد اور لڑکیاں مسلسل کوڑا زنی' بیڑیوں' طوق اور شاہی بگھی کھینچنے کی تکلیف سے نڈھال ہو رہے تھے اور کربناک انداز سے کراہ رہے تھے۔ یہ منظر اس قدر تکلیف دہ تھا کہ اس کی تاب نہ لا کر کئی لوگوں نے اپنے گھروں کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر لیے۔

لیکن بگھی میں سوار خوبصورت کم سن ملکہ اس منظر سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھی۔ قیدیوں کی آہوں' سسکیوں اور کراہوں کو دیکھ اور سُن کر ملکہ تابانہ شکنتلا اپنی آنکھیں سرشاری سے بار بار بند کر کے کھول رہی تھی اور اس کے سرخ مخروطی اور یاقوتی لبوں پر کھیلتی مسکراہٹ گہری سے گہری ہوتی چلی جا رہی تھی اور آنکھوں میں پُراسرار چمک بڑھتی جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

''جوگی مہاراج آج آپ صبح سے ان سانپوں کی مسلسل سیوا میں مصروف ہیں۔ کیا کوئی خاص وجہ ہے؟'' صابو کوٹھڑی میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

''بتاتا ہوں صابو بتاتا ہوں۔'' جوگی مہاراج نے شیش ناگ کے جوڑے پر پیار بھری نظریں جماتے ہوئے جواب دیا۔

''گرو مہاراج میں کئی دنوں سے آپ کو بے چین دیکھ رہا ہوں۔'' صابو نے ایک چوکی کھینچ کر جوگی مہاراج کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

''صابو! تم نے برسوں میری سیوا کی ہے۔ میں نے بھی تمہیں اپنا چیلا نہیں بیٹا سمجھا ہے۔'' کسرتی بدن والے ادھیڑ عمر جوگی مہاراج نے خشخشی داڑھی میں انگلیوں سے خلال کرتے ہوئے کہا۔

''بیٹا تو تم مجھے کہتے ہو لیکن مہاراج میں دیکھ رہا ہوں کہ شیش ناگ کے اس جوڑے کے بارے میں تم ضرور کچھ چھپا رہے ہو۔'' صابو نے روٹھنے کے انداز میں جوگی مہاراج کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''چھپاتا تھا...... صابو چھپاتا تھا۔ پرنتو اب بات چھپانے کا کوئی کارن نہیں ہے۔ اب سمے آ گیا ہے کہ تمہیں میں اپنا مکمل رازدار بنا لوں ذرا میرے اور قریب آؤ اور سنو پرنتو پہلے تمہیں یہ وچن دینا ہوگا کہ یہ بات تم اپنے تک ہی رکھو گے۔''

''چنتا کرنے کی ضرورت نہیں جوگی مہاراج۔ صابو نے تمہیں گرو کہا ہے۔ تمہارا ہر راز صابو کے ساتھ ہی چتا کی راکھ بن جائے گا۔''

''تو ذرا باہر جا کر چاروں اور نظر دوڑاؤ' دیکھو کوئی ہماری بات سُن تو نہیں رہا۔'' مہاراج نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔
صابو فوراً اُٹھ کر باہر نکلا اور چند ساعتوں کے بعد کوٹھڑی کے اندر آیا اور بولا۔

''گورو جی چاروں اور ویرانوں کے ڈیرے ہیں۔ ان سنگلاخ چٹانوں میں ہمارے علاوہ صرف اُلّو بولتے ہیں۔ جوگیوں کے اس استھان کی طرف تو وہی آئے گا جس کے جیون کے دن پورے ہو چکے ہوں گے۔''

''صابو تم گزشتہ بیس سال سے میرے ساتھ ہو...... تم جانتے ہو کہ میں ہر سال ساون کے مہینے میں اماوس کی رات ناگ دیوتا کے حضور دو انسانوں کا بلیدان (قربانی) کرتا ہوں! نوجوان مرد اور نوجوان عورت! پوچھو کیوں؟'' جوگی مہاراج نے شیش ناگ کے جوڑے کو پٹاری میں بند کرتے ہوئے سرسراتے لہجے میں کہا۔

''دھرم کے معاملات میں بحث اچھی نہیں ہوتی مہاراج اس لیے بلیدان کرتے وقت تو میں آپ کا ساتھ دیتا ہوں لیکن وجہ پوچھنے کی مجھے کبھی جرأت نہیں ہوئی۔'' صابو نے مؤدبانہ لہجے میں جواب دیا۔

''سنو صابو! یہ واقعہ جو میں تمہیں سُنانے جا رہا ہوں اس کا ایک ایک لفظ حقیقت پر مبنی ہے۔ آج سے ٹھیک ایک سو برس قبل میرے پردادا کو اس کے گرو نے مرتے سمے شیش ناگ کا ایک جوڑا دان کیا اور بتایا کہ ان ناگوں کے سر پر تاج کے نشان ہیں اور آنکھوں میں سُنہری روشنی۔ آنکھوں کی سُنہری روشنی سے یہ بات ثابت ہے کہ یہ بادشاہ سانپ ہیں اور ان کی عمر عام سانپوں کے مقابلے میں خاصی زیادہ ہے۔ اور اگر یہ سو سال تک زندہ رہ گئے ...... تو یہ نہ صرف انسان کے روپ میں آ جائیں گے بلکہ ہر جاندار کا روپ دھار سکیں گے زمین کی تہوں میں چھپے ہوئے خزانے بھی ان کی دسترس میں ہوں گے اور اس وقت یہ جس کے قبضے میں ہوں گے یہ اسی کے حکم کے غلام ہوں گے۔ پرنتو اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر ساون میں اماوس کی رات ناگ دیوتا کے حضور ایک مرد اور عورت کی بلی (قربانی) دی جائے۔ اٹھائیس برس میرے پردادا نے ہر سال یہ رسم نبھائی اس کے بعد شیش ناگ کا یہ جوڑا میرے دادا کے سپرد کر کے ملک عدم سدھار گئے۔ پینتیس برس تک اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر میرے دادا نے ہر سال دو انسانوں کا بلیدان جاری رکھا...... اور پھر ان کا دھیانت ہو گیا۔ میرے پتا کو یقین تھا کہ ان کی زندگی میں یہ انسانی روپ میں آ جائیں گے۔ لیکن یہ حسرت ان کے دل میں رہی اور آج سے بائیس برس پہلے وہ دمے کے جان لیوا مرض کا شکار ہو گئے۔ اس وقت سے لے کر آج تک میں نے اپنے پرکھوں کی نشانی کو ناز و نعم سے پالا اور ہر برس بلیدان کی رسم بھی جاری رکھی۔''

''لیکن گرو مہاراج......'' صابو نے گرو کے دم لیتے ہی کہا۔ ''انسانی روپ میں یہ کب آئیں گے؟ اور اس امر کی کیا کوئی نشانیاں بھی ظہور میں آئیں گی؟''

''آئیں گی کیا! آ چکی ہیں مورکھ! میرے پردادا کو ان کے گرو نے مرنے سے پہلے بتایا تھا کہ ننانوے برس بیت جانے کے بعد آخری سال میں ان ناگوں کے سر کے تاج مزید واضح ہو جائیں گے اور ان کی آنکھوں سے نکلنے والی سُنہری روشنی سبز روشنی میں تبدیل ہو جائے گی۔'' گرو مہاراج بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔
پچھلے سال میں نے دو جوان بہن بھائیوں کو جنگل میں سفر کرتے ہوئے اپنے کوبرا ناگوں سے ڈرا کر اغواء کر لیا تھا اور ساون کی حبس زدہ اماوس کی رات (وہ رات جب چاند بالکل غائب اور رات مکمل اندھیری ہوتی ہے) میں نے اسی پہاڑ کی چوٹی پر بنے ہوئے ہزار سالہ قدیم ناگ دیوتا کے مندر میں دیوتا کے بت کے نیچے ان کے خون سے غسل دیا اور انہیں ان کا خون پلایا...... تو دوسرے ہی دن میں نے دیکھا کہ ان کے سروں پر تاج کے نشان مکمل طور پر واضح ہو گئے اور آنکھوں کی سُنہری روشنی تیز سبز روشنی میں تبدیل ہو گئی میں اسی سمے سمجھ گیا کہ ننانوے سال پورے ہو گئے اور ان کے روپ دھارن بننے کو صرف آخری سال رہ گیا ہے۔ اسی لیے گزشتہ تمام سال میں نے شیش ناگ کے اس جوڑے کو تمہاری نظروں سے بھی دور رکھا...... لیکن آج تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ ساون کی آج کی رات بھی اماوس کی رات ہوگی اور آج آدھی رات کے بعد شیش ناگ کا یہ جوڑا انسانی روپ میں آ جائے گا۔ سُنا تم نے صابو! آج میں دنیا کا سب سے خوش قسمت اور طاقتور انسان بن جاؤں گا' یہ ناگ میرے غلام ہوں گے' دنیا بھر کے خزانے میری دسترس میں آ جائیں گے اور میں اپنی باقی زندگی شاہانہ ٹھاٹھ سے گزاروں گا۔''

''لیکن صابو......'' اس کا منہ حیرت اور خوشی سے کھلا کا کھلا رہ گیا تھا...... شیش ناگ کے اس جوڑے کے بارے میں یہ انکشافات اس کے لیے زندگی کی سب سے بڑی خبر تھے۔ جوگی مہاراج اسے کہیں دور سے بولتے محسوس ہو رہے تھے۔ اس کے کانوں میں تو جوگی مہاراج کا صرف ایک ہی جملہ بار بار گونج رہا تھا کہ انسانی روپ میں آتے وقت یہ ناگ جس



کے قبضے میں ہوں گے اسی کے غلام رہیں گے۔

صابو جوگی مہاراج کا گزشتہ بیس برس سے غلام بے دام، چیلا اور نمک خوار تھا...... اس کی نیت میں کھوٹ آنے لگا...... وہ سوچنے لگا کہ مہاراج کو ٹھکانے لگا دیا جائے تاکہ یہ بادشاہت اس کے حصے میں آئے لیکن اس سے پہلے چند ضروری معلومات گرو سے لینا ضروری تھیں۔ لہٰذا ارات تک گرو کا زندہ رہنا بہت ضروری تھا۔

"کس وچار میں گم ہو بالک......؟" گرو مہاراج کی تیز آواز سے صابو گڑبڑا کر رہ گیا اور کہنے لگا...... "گرو میں سوچ رہا ہوں کہ تم واقعی گرو ہو! اور ہر گر سے واقف ہو! پرنتو ایک بات مجھے سمجھ میں نہیں آتی سو سال سے ہر سال ان سانپوں کے لیے قربانی دی جا رہی ہے تو کیا انسان بن جانے کے بعد یہ سلسلہ بند ہو جائے گا؟"

"نہیں......" گرو نے جواب دیا...... "بلکہ انسانی شکل میں آنے کے بعد ان کو مہینے میں کم از کم ایک انسان کے خون سے غسل کرنا یا اس کا خون پینا پڑے گا ورنہ ان کی جوانی کو بڑھاپے کا گھن لگنا شروع ہو جائے گا۔"

"لیکن کیا یہ انسانیت پر ظلم نہ ہو گا کہ صرف دو سانپوں کی زندگی بچانے کے لیے سینکڑوں انسانوں کا بلیدان کیا جا چکا ہے اور ہزاروں کا مزید ہو گا۔"

"اپرادھی......" گرو مہاراج کڑک کر بولے اور ایک دم غصے میں آ کر کھڑے ہو گئے۔ "ناگ دیوتا کی شان میں گستاخی کرتا ہے۔ دیوتاؤں کی پسندیدہ رسم کو ظلم کہتا ہے؟" گرو مہاراج کے منہ سے مارے غصے کے جھاگ نکلنے لگے۔

"م...... میرا مطلب یہ نہیں تھا مہاراج...... میں تو خود ناگ دیوتا کو پوجنے والا ہوں۔ میں دیوتا کی شان میں گستاخی کا تصور بھی نہیں کر سکتا......" صابو نے ہاتھ جوڑ دیے۔

"آج کے بعد اگر ایسے منحوس شبد زبان پر لایا تو زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔" مہاراج نے قدرے نرم پڑتے ہوئے کہا...... وہ خود بھی اس مبارک موقع پر کوئی جھگڑا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ پھر واپس اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے بولے...... "ناگ دیوتا کے دھرم میں کوئی بات ظلم نہیں ہوتی صابو۔ سانپ تو علامت ہی دہشت کی ہے۔ آستین کا سانپ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ سانپ ہمیشہ دھوکہ دیتا ہے۔ یہ بھی کہاوت ہے کہ سانپ کو چاہے کتنا ہی دودھ پلاؤ پھر بھی وہ ڈسنے سے باز نہ آئے گا...... ناگن جو اپنے بچوں تک کو کھا جاتی ہے دوسرے انسانوں پر کیسے دیا کر سکتی ہے۔ ناگ ہو یا پجاری سب ایک ہی بات ذہن نشین رکھتے ہیں اور وہ ہے اپنا مفاد......"

"میں بھی تو یہی سوچ رہا ہوں مہاراج کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔" صابو دل ہی دل میں بولا۔

"اوہ......" اچانک گرو مہاراج چونک پڑے اور ایک دم اُٹھتے ہوئے بولے "آؤ صابو جلدی آؤ...... اوہو ہو یہ کیا ہو گیا؟ اب کیا ہو گا؟" کہتے ہوئے تیزی سے کوٹھڑی کے دروازے سے باہر نکل گئے۔ صابو بھی ان کے پیچھے حیرت بھرے انداز میں لپکا۔

☆......☆......☆

"مہاراج کچھ بتائیں خیر تو ہے؟" صابو تیز تیز قدموں سے ان کے برابر آتا ہوا بولا۔

"صابو پرسوں جب تو ناگوں کے لیے دودھ لینے گیا تھا تو کسی قافلے سے بچھڑ کر دو پتی پتنی جن کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اس طرف آ نکلے۔ راستہ بھول چکے تھے اور بھوک پیاس سے نڈھال تھے۔ میں نے انہیں چالاکی سے تسلی تشفی دی اور کہا کہ رات یہاں ٹھہر جاؤ کھانے پینے کی کوئی فکر نہ کرو صبح میں تمہیں آبادی میں پہنچا دوں گا اور ان کو ناگ مندر کے ایک کمرے میں لے گیا لیکن کھانے میں بے ہوشی کی دوا ملا دی یوں وہ کھانا کھاتے ہی بے ہوش ہو گئے۔ میں نے سوچا چلو آخری بلیدان کا بندوبست بھی ہو گیا۔ ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اور گلے میں لوہے کے کڑے ڈال کر ایک کھونٹی سے باندھ دیا اور کمرے کا دروازہ بند کر دیا تھا اور پھر ناگوں کے انسان بننے کی خوشی میں ان کا خیال ذہن سے نکل گیا، اور ابھی مجھے خیال آیا ہے کہ تین دنوں سے وہ وہاں بھوکے پیاسے قید ہیں۔ اگر وہ مر چکے ہوئے تو بہت بُرا ہو گا بلیدان کے کارن ایک کنیا اور ایک بالک کا بندوبست اس ویرانے میں کہاں سے ہو گا ہماری برسوں کی تپسیا نشٹ ہو جائے گی۔" دونوں گرو چیلا تیزی سے پہاڑی پر چڑھتے چلے گئے۔

☆......☆......☆

"مہاراج یہ دونوں نیم بے جان ہیں مگر زندہ ہیں۔"

"جلدی سے پانی اور کھانے کو کچھ لے آؤ صابو"...... اور مہاراج خود ان کے ہاتھ پاؤں کے بند ڈھیلے کرنے لگے۔

تھوڑی سی جدوجہد کے بعد دونوں میاں بیوی آہستہ آہستہ ہوش میں آنے لگے۔ دونوں بھوک پیاس اور حبس سے نڈھال تھے۔ صابو نے پانی کی ایک ایک بالٹی ان کے چہرے سمیت پورے جسم پر انڈیل دی۔ وہ مکمل ہوش میں آ کر کراہنے لگے! صابو نے جلدی سے دودھ کے پیالے ان کے آگے رکھ دیے دونوں میاں بیوی ندیدوں کی طرح دودھ پر جھپٹ پڑے دودھ پی کر ان کی جان میں جان آئی۔

"ہمیں یہاں کیوں قید کر رکھا ہے ظالمو! لڑکی نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"پہلے کچھ کھا پی لو کنیا...... باقی باتیں بھی ہو جائیں گی۔" گرو مہاراج اس کے گیلے جسم کو سلگتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے۔ ان کے ہونٹوں پر مکارانہ مسکراہٹ تھی۔

جب تک دونوں میاں بیوی کھاتے پیتے رہے دونوں گرو چیلا عورت کو دیکھ دیکھ کر آپس میں باہم کھسر پھسر کرتے رہے۔ گرو نے کہا صابو جب یہ کھا پی لیں تو اس کے مرد کے ہاتھ پاؤں پھر سے باندھ کر اسے کھونٹی سے کھول کر دوسرے کمرے میں لے جا کر باندھ دینا اس کنیا کے کومل شریر سے میں اپنے تن کی پیاس بجھاؤں گا۔ ایک سال بعد یہ موقع ہاتھ آیا ہے۔

"گرو جی ایک بات پوچھنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ میں ناگ دیوتا کے دھرم میں دخل اندازی نہیں بلکہ اپنے علم میں اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"جلدی بول۔" مہاراج لڑکی کو دیکھ کر ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولے۔

"اس لڑکی کی عزت داغدار کرنے کے بعد بھی دیوتا ہمارا بلیدان قبول کر لیں گے۔" صابو ڈرتے ڈرتے بولا......

"مورکھ...... ناریاں تو ہوتی ہی بدن کی پیاس بجھانے کے لیے ہیں۔ دیوتا کے حضور بلیدان صرف خون کا ہوتا ہے۔ باقی شریر سے دیوتاؤں کو کوئی سروکار نہیں سندر کنیائیں آکاش سے کیول اسی کارن دھرتی پر اُتاری جاتی ہیں کہ ان کے کومل شریر سے منش کو آتشی پہنچے، اسی لیے اگر پتی کا دیہانت ہو تو ہم لوگ اس کی پتنی کو اس کی چتا کی آگ میں ستی کر دیتے ہیں۔ جو ناری منگل سوتر سے بچ کر ہر مرد کا ساتھ دے وہ ستی ہونے سے بچ جاتی ہے اور جیون کے مزے لوٹتی ہے۔"

مہاراج نے تفصیل بتائی اور صابو سب کچھ سمجھنے والے انداز میں گردن ہلانے لگا اور فوری طور پر اُٹھ کر لڑکی کے خاوند کے ہاتھ پاؤں تیزی سے باندھنے لگا۔ لڑکی کے خاوند نے احتجاج کی کوشش کی لیکن موٹے تازے صابو کے آگے اس کی ایک نہ چلی اور صابو اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اور کندھے پر اٹھا کر اسے مندر کے ہال میں ناگ دیوتا کے بت کے نیچے رکھ کر ایک کھونٹی سے اس کے گلے کی زنجیر کو باندھ دیا اب ایک دفعہ پھر وہ مرد مکمل طور پر شکنجے میں تھا اس کام سے فارغ ہو کر صابو پہلے کمرے میں آیا جہاں وہ لڑکی اور مہاراج کو چھوڑ گیا تھا...... تو ٹھٹک کر رک گیا!

خوبصورت لڑکی ہاتھ جوڑ رہی تھی۔ لیکن مہاراج اپنے گر آزمائے جا رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں مہاراج ایک طرف کو لڑھک کر کتے کی طرح ہانپنے لگے اور صابو ندیدوں کی طرح ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے لڑکی کی طرف بڑھنے لگا اور نا کافی لباس کو سنبھالتی ہوئی لڑکی کی آنکھوں میں ایک بار پھر خوف کے سائے لہرانے لگے۔

☆......☆......☆

سات سروں والے ناگ دیوتا کا بت پھن پھیلائے کھڑا تھا۔

اس کے نیچے تین فٹ بلند پتھر کا چبوترا تھا جس پر دونوں پتی پتنی عریاں حالت میں پشت کے بل بندھے ہوئے تھے۔ دونوں کے ہاتھ اور پاؤں مضبوط ڈوریوں سے کس کر باندھے گئے تھے اور ڈوریوں کے سرے فرش پر ایک دوسرے کی

مخالف سمت گڑے کنڈوں سے باندھ دیے گئے تھے...... اب ان کی زیادہ حرکت ناممکن تھی۔ مندر کے تیس فٹ لمبے ہال میں صرف ایک دیا ٹمٹما رہا تھا...... جس کی مدھم روشنی میں مندر کی دیواروں پر اُبھرے ہوئے سانپوں کے نقش ونگار انتہائی پُراسرار منظر پیش کر رہے تھے۔ باہر ساون کی سیاہ کالی رات میں بادلوں کی گھن گرج سُنائی دے رہی تھی۔ گرو مہاراج تخت پوش سے پانچ فٹ دور سانپوں کی پٹاری آگے رکھے دوزانو بیٹھ کر ہاتھ میں خنجر تھامے ناگ منتر کا جاپ کر رہے تھے اور صابو ان کے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑا انہیں طنزیہ نظروں سے دیکھ کر زیر لب مسکرا رہا تھا۔ بُری طرح کس کر بندھے پتی پتنی کی آنکھیں خوف سے پھٹ رہی تھیں۔ اب انہیں اپنی موت کا یقین ہو چلا تھا۔ ان کے جسم ہولے ہولے لرز رہے تھے۔ جاپ مکمل کر کے جوگی مہاراج سیدھے ہاتھ میں خنجر تھامے نپے تلے قدموں سے چبوترے کی طرف بڑھنے لگے اور پھر قریب پہنچ کر ایک ساعت رک کر خنجر عورت کی شہ رگ پر رکھ دیا اس سے قبل کہ عورت چیختی مہاراج نے انتہائی بے رحمی سے خنجر تیزی سے چلا کر اس کی شہ رگ کاٹ دی صابو نے برق رفتاری سے شیش ناگوں کی پٹاری سے ڈھکن اٹھا کر اسے خون کے نیچے رکھ دیا گرم اُبلتا خون جب پٹاری کے اندر ناگوں پر گرا تو وہ پھن اٹھانے لگے صابو نے پٹاری زمین پر گرتے خون کے عین نیچے رکھ دی چند ہی ساعتوں میں مہاراج نے مرد کی گردن بھی کاٹ دی۔ دونوں میاں بیوی کے نرخرے سے نکلنے والی خرخر کی آوازیں مندر کے پُراسرار ماحول کو مزید خوفناک بنا رہی تھیں' لیکن صابو اور مہاراج کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ دونوں ناگ اور ناگن انسانی خون میں اشنان کر رہے تھے اور سرخ زبانیں نکال نکال کر خون چاٹ رہے تھے۔ جوگی مہاراج ایک بار پھر دوزانو ہو کر بیٹھ گئے اور نظریں شیش ناگ کے اٹھکیلیاں کرتے جوڑے پر جما دیں۔ صابو مہاراج کے پیچھے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

اچانک مہیب انداز سے بجلی چمکی اور بادلوں سے گڑگڑاہٹ کے ساتھ خوفناک کڑک سنائی دی اور بارش کی رفتار ایک دم بہت تیز ہو گئی اور ساتھ ہی زوردار ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگے۔ پھر یوں محسوس ہوا جیسے زلزلہ آ رہا ہو اور پورا مندر دائیں بائیں ہلنے لگا۔ پہاڑ سے پتھر لڑھکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ جوگی مہاراج دوزانو بیٹھے آنکھیں بند کیے تیزی سے اشلوک پڑھنے میں مصروف تھے۔ یہ تمام مظاہر فطرت اس کی توجہ منقسم نہ کر سکے البتہ صابو خوفزدہ ہو گیا اور مہاراج کے قریب آ کر تیزی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ کہیں کوئی چیز اوپر نہ آ گرے لیکن مندر کے اندر یں حالات ٹھیک تھے۔ شاید ناگ دیوتا کی آمد تھی اچانک زلزلہ یکدم رُک گیا اور اس کے ساتھ ہی بارش اور گرج چمک کی آوازیں بھی دم توڑ گئیں۔ یکا یک خاموشی چھا گئی دیئے کی لو بھی ایک جگہ ٹھہر گئی۔ دونوں لاشیں مکمل طور پر ٹھنڈی ہو چکی تھیں۔ ہر طرف موت کی سی خاموشی چھا گئی صابو کی آنکھوں میں مکارانہ چمک بڑھی اور اس کا ہاتھ دھوتی کے ڈب میں اڑسے ہوئے خنجر کی طرف بڑھنے لگا۔ اچانک بین کی مدھم آواز سُنائی دینے لگی جیسے کوئی جوگی انتہائی مہارت سے بین بجا رہا ہو۔

آواز بتدریج تیز ہو رہی تھی۔ پھر یوں محسوس ہوا جیسے ایک سے زیادہ بینیں ایک ہی لے پر بجائی جا رہی ہوں...... آہستہ آہستہ بینوں کی آواز اُونچی ہوتی چلی جا رہی تھیں گرو مہاراج بھی بین بجانے میں کمال رکھتے تھے مگر اس آواز اور لے کے سامنے خود کو طفلِ مکتب سمجھنے لگے صابو پر تو ان آوازوں کا نشہ چھانے لگا اس نے بڑی مشکل سے سر جھٹک جھٹک کر اپنے اعصاب پر قابو رکھا۔ شیش ناگوں کا جوڑا بھی بین کی لے پر ہولے ہولے جھوم رہا تھا۔

معاً سرسراتی ہوئی آواز کے ساتھ ہوا کا ایک جھونکا کمرے کے اندر داخل ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایک بگولے کی شکل اختیار کر لی۔ اس بگولے نے آہستہ آہستہ پٹاری کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔

ہوا کا بگولہ اپنے محور کے گرد تیز رفتاری سے گھومنے لگا' ناگ نظروں سے اوجھل ہو گئے اور ہوا کا غبار پنکھے کی صورت چلتا نظر آنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی ناگ دیوتا کے بت کے درمیان والے سر سے سبز رنگ کی روشنی لیزر لائٹ کی شکل میں اس بگولے پر پڑنے لگی۔ مہاراج کی تمام تر توجہ بگولے پر تھی۔ یہی وہ لمحہ تھا جس کا صابو کو انتظار تھا۔ اس نے پلک جھپکنے میں خنجر سیدھے ہاتھ میں پکڑ کر مہاراج کی گردن کے عین اوپر وار کیا اور اس سے قبل کہ گرو مہاراج کو کچھ سمجھنے کا موقع ملتا یکے بعد دیگرے اس نے تین چار وار گردن پر کیے مہاراج تیورا کر پشت کے بل گرے اور پتھرائی آنکھوں سے صابو کو دیکھتے

ہوئے بمشکل اتنا ہی کہہ سکے۔ مں...... مں...... صابو تم...... اور ان کی گردن ایک طرف لڑھک گئی۔ صابو نے بجلی کی سی تیزی سے مہاراج کی لاش کو پاؤں سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا کمرے سے باہر لے گیا۔

جب وہ واپس مندر ہال میں آیا تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ ناگ دیوتا کی آنکھوں سے روشنی نکلنی بند ہو چکی تھی۔ ہوا کے بگولے پٹاری اور شیش ناگوں کا نشان تک نہ تھا اور پورا کمرہ نجانے کہاں سے آنے والی دودھیا رنگ کی روشنی سے مکمل طور پر منور تھا۔ پٹاری والی جگہ پر ایک خوبصورت نوجوان مرد اور سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی ایک دوسرے سے جُڑے بیٹھے تھے۔ صابو کی آمد کا انہوں نے چنداں کوئی نوٹس نہ لیا۔ صابو سکتے کی حالت میں دونوں کو دیکھنے لگا۔ ناگ اب چھ فٹ سے نکلتے ہوئے قد' کسرتی جسم' گھنگھریالے بالوں' صاف گوری رنگت کے دراز قد صحت مند نوجوان میں تبدیل ہو چکا تھا اور ناگن تو کسی ریاست کی شہزادی یا آکاش کی اپسرا معلوم ہو رہی تھی۔ چہرے پر معصومیت' بھرے بھرے گال' گلاب کی پنکھڑی جیسے ہونٹ کمر تک لمبی کشمیری زلفیں اور یہ بڑی بڑی غزالی آنکھیں جنہیں وہ جھپک نہیں رہی تھی۔ رنگ ایسا کہ چاند بھی شرمائے۔

دونوں شاہی لباس میں ملبوس تھے اور پاؤں میں منقش زرتار کھسے تھے۔

''شیش ناگ کے جوڑے کو انسانی روپ مبارک ہو۔'' صابو نے آواز کو رعب دار بناتے ہوئے با آواز بلند کہا۔

لڑکا اور لڑکی آہستگی کے ساتھ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ وہ عجیب سی نظروں سے صابو کو دیکھ رہے تھے۔ صابو ان سے آنکھیں نہ ملا سکا۔ اس نے اپنی نگاہیں نیچی کر لیں اور بولا۔

''سو سالوں سے میرے آباء نے تمہاری خدمت کی ہے۔ تمہیں دودھ پلایا اور ہر سال ساون کی اماوس رات ناگ دیوتا کے حضور انسانی بلیدان کیے اور تمہیں انسان کے خون سے غسل دیا گیا اور خون چٹوایا گیا۔ یہ سارے عوامل مکمل سو برس تک بغیر کسی وقفے سے کیے گئے۔ جب تم دونوں کی عمریں چند سال تھیں تو میرے پردادا کے گرو نے تمہیں میرے پردادا کو بخش دیا تھا ان کی موت کے بعد میرے دادا نے اور اس کے بعد میرے پتا اور پھر میں نے تمہاری حفاظت کی آج سو دیں بلیدان اور عمر کی صدی طے کر لینے کے بعد تمہیں ناگ دیوتا نے انسانی روپ بخش دیا ہے لیکن چند باتوں کا تم دونوں کو خیال رکھنا ضروری ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہر ماہ تمہیں انسانی خون کی ضرورت ہو گی ورنہ تمہاری جوانی قائم نہ رہ سکے گی۔ دوسری بات یاد رکھنے والی یہ ہے کہ آگ سے بچ کر رہنا ورنہ مر جاؤ گے اور یہ بات تو تم دونوں کے علم میں ہو گی کہ تم میرے غلام ہو اور میرا ہر حکم ماننے کے پابند ہو۔ آج سے تمہارا نام ارجن (ناگ کی طرف اشارہ کرنے کے بعد وہ ناگن کو دیکھ کر بولا) اور تمہارا شکنتلا ہے۔'' اتنا کہتے ہوئے اس نے ناگ اور ناگن سے جیسے ہی نظریں ملائیں۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے دونوں کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہوں۔ ارجن اور شکنتلا اسے انتہائی غصے سے دیکھ رہے تھے ارجن یعنی ناگ کے ہونٹ ہلے اور گونج دار آواز سنائی دی......

''صابو...... گرو مہاراج کہاں ہیں؟''

صابو گڑبڑا کر رہ گیا...... مگر سنبھل کر تیزی سے بولا۔ ''میں نے تمہیں پالا پوسا ہے۔ میں ہی گرو ہوں تمہیں میرا احترام کرنا چاہیے۔'' ''گزشتہ کئی سالوں سے ہمارے اندر کئی انسانی خصوصیات پیدا ہو گئی تھیں ہم انسانوں کی طرح دیکھ سن اور سمجھ سکتے تھے۔ ہم نے گرو مہاراج اور تمہارے درمیان ہونے والی گفتگو بھی سنی۔ تم اس کے چیلے ہو ہم تمہارے نہیں گرو مہاراج کے غلام ہیں۔ جن کی نسلوں نے ہمیں حفاظت میں رکھا......'' ناگن جس کو صابو نے شکنتلا کا نام دیا تھا اور جواب تک خاموش کھڑی تھی بولی۔ ''صابو جلدی سے بتاؤ مہاراج کہاں ہیں ورنہ ہم تمہارا خون پی کر ہی اپنی انسانی زندگی کا آغاز کریں گے۔''

''تم یقین کرو میں ہی گرو ہوں۔'' صابو ایک دم تیزی سے بولا لیکن اب اس کی آواز میں لرزش تھی اور اسے یقین ہو چلا تھا کہ اس کا راز فاش ہو گیا ہے ناگ اور ناگن اس کی سوچ سے بھی زیادہ اعلیٰ صفات اور صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان سے کچھ بھی پوشیدہ نہ تھا۔

اب صابو کو موت سر پر نظر آنے لگی وہ اچانک موت کے خوف سے بدحواس ہو کر دروازے کی طرف بھاگا۔ لیکن چند

ہی قدم چلا ہوگا کہ ارجن نے قلابازی کھائی اور چشم زدن میں ناگ کی شکل اختیار کر لی۔ صابو کے دروازے سے باہر نکلنے سے پیشتر ہی ناگ نے اسے جالیا اور اس کی گردن کے گرد لپٹ گیا سرخ زبان نکال کر انسانی آواز میں بولا۔ ”واپس چلو۔“ صابو اس دہشت ناک صورت حال سے سنبھل نہ سکا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا، اس کے گرنے سے پہلے ناگ اس کی گردن سے علیحدہ ہو چکا تھا۔

☆......☆......☆

ہوش میں آنے کے بعد صابو نے اپنے آپ کو مضبوط رسیوں میں جکڑا ہوا پایا اس کے دونوں ہاتھ کلائیوں میں رسی ڈال کر اوپر کی جانب کر کے چھت کے اندر لگے کنڈوں کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ اسی طرح پاؤں زمین کے ساتھ بندھے تھے رسی اتنی کس کر باندھی گئی تھی کہ اس کا سارا جسم تنا ہوا تھا اور کوئی حرکت ممکن نہ تھی، کمرے کے بیچوں بیچ شکنتلا ناگن انسانی روپ دھارے اپنے حسن و جمال کی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ کمرے پر ہاتھ رکھے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ بہت دل آویز تھی۔ مسکرانے سے اس کے گالوں پر گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ اس کے سیاہ کالے بال کمر سے نیچے تک جھول رہے تھے وہ پلکیں جھپکے بغیر اس کو دیکھ رہی تھی۔ ارجن نظر نہیں آ رہا تھا۔ شکنتلا بولی تم نے گرو مہاراج کو قتل کر دیا ہے۔ تمہارا جرم ناقابل معافی ہے اب تم اس وقت تک یہاں بندھے رہو گے جب تک ہمیں پہلی بار انسانی خون کی طلب نہیں ہوتی ہم تمہارے خون سے سیراب ہو کر ہی دنیا کو دیکھنے نکلیں گے۔

”مجھے معاف کر دو!“ صابو گھگھیایا۔

”گرو مہاراج نے تمہیں بتایا نہیں کہ سانپ کی فطرت میں رحم نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ کیا گرو مہاراج نے بلیدان کرتے وقت کسی پر رحم کیا؟ اور تم نے گرو کو قتل کرتے وقت رحم کیا اور ہم تو ہیں ہی ناگ ہم تو زندہ ہی انسانی خون پر رہیں گے اور اگر انسانوں پر ہم نے ابھی سے رحم کرنا شروع کر دیا تو ہماری جوانی کیسے قائم رہے گی؟ گھوڑا اگر گھاس کے ساتھ دوستی کرے گا تو کھائے گا کیا؟ بے وقوف اب یہاں قید رہ کر صرف موت کا انتظار کر......“ اسی اثناء میں ارجن کمرے میں داخل ہوا اور کہنے لگا۔

”شکنتلا میں نے مندر کے گنبد کے اوپر چڑھ کر چاروں اور نظر دوڑائی مجھے دور دور تک کسی انسانی بستی کے آثار نظر نہیں آئے۔“

”ابھی تو جناب ہم چند دن یہاں رہیں گے تاکہ انسانی روپ سے مکمل مانوس ہو جائیں پھر کہیں جانے کی سوچیں گے۔“ شکنتلا نے ارجن کے سینے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

”سو سالوں سے تمہارا ساتھ ہے شکنتلا تمہاری خواہش میں کیسے رد کر سکتا ہوں۔“ ارجن نے اپنائیت سے شکنتلا کی پتلی کمر اپنے مضبوط بازوؤں کے حصار میں قید کرتے ہوئے کہا۔

”ویسے صابو نے ہمیں نام خوب دیے ہیں۔“ شکنتلا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یہ ہمارے محسن کا قاتل ہے لہٰذا ہم اسے انجام بھی خوب دیں گے۔“ ارجن نے صابو کو گہری نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”چھوڑو یار دفعہ کرو صابو کو، اپنی بات کرو نئی زندگی کی بات کرو۔“ شکنتلا نے اپنا سارا وزن ارجن پر ڈال دیا۔

☆......☆......☆

صابو رات بھر رسیوں میں جکڑا کھڑا رہا۔ اب دروازے کی درزوں سے صبح کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ ارجن اور شکنتلا گھاس کے بستر پر بے ترتیب ہو کر بے سدھ سو رہے تھے۔ صابو کا انگ انگ درد کر رہا تھا اور بھوک پیاس سے بھی وہ بے حال تھا۔ ارجن اور شکنتلا دن چڑھے تک سوئے رہے۔ صابو کی ان کو جگانے کی ہمت نہ ہوئی اسے اب جیون اور رحم کی کوئی توقع نہ تھی۔ پہلے ارجن نے آنکھ کھولی اور پھر شکنتلا کو بھی اس نے جگا دیا۔ شکنتلا نے اٹھ کر مسکراتے ہوئے دونوں ہاتھ اٹھا کر ایک توبہ شکن انگڑائی لی اور ارجن کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

”نئی زندگی کی پہلی صبح مبارک ہو۔“ پھر بولی۔ ”ارجن چلو باہر چل کر کہیں پیٹ بھرنے کا بندوبست کرتے ہیں۔“

صابو کو امید ہوئی کہ اب کچھ کھانے کو ملے گا۔ ارجن اور شکنتلا صابو کو چھوڑ کر کمرے سے باہر آ گئے باہر لمبی راہداری تھی۔ جس سے گزر کر برآمدہ آیا۔ آگے ناگ مندر کا وسیع صحن تھا۔ یہ ناگ مندر پہاڑ کے اوپر جگہ ہموار کر کے بنایا گیا تھا اور تقریباً ایک ہزار سال سے قائم تھا اب چونکہ بڑی خستہ حالت میں ہو چکا تھا اور آبادی سے خاصی دور ہونے کی وجہ سے یہاں نہ تو پوجا ہوتی اور نہ کسی انسان کا گزر کیونکہ ایک طرف ہمالیہ کا پہاڑی سلسلہ تھا اور دوسری طرف وسیع جنگل تھا جو سانپوں سے بھرا ہوا تھا۔ لہٰذا یہاں ویرانیاں ہی ویرانیاں تھیں۔

ارجن اور شکنتلا مندر سے باہر آ گئے اور پہاڑی سے نیچے اترنے لگے جس کے دامن میں گرو مہاراج کی کٹیا تھی۔ وہ اندر داخل ہو گئے ایک طرف ٹوکرے میں کچھ باسی پھل رکھے تھے وہ دونوں پھل کھانے لگے۔ کچھ باسی روٹیوں کے ٹکڑے بھی نظر آئے مارے بھوک کے وہ انہیں بھی کھا گئے۔ کٹیا کے ایک کونے میں ایک مٹکا بھی رکھا تھا جس میں پانی موجود تھا۔ دونوں نے باری باری پانی پیا۔

”پیٹ بھرنے کا مسئلہ تو حل ہو گیا شکنتلا۔“ ارجن نے ٹانگیں پسار کر زمین پر پڑی چٹائی پر بیٹھتے ہوئے کہا...... ”لیکن مزا نہیں آیا۔“ شکنتلا نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”کیا ہم انسان اس لیے بنے ہیں کہ باسی پھل اور سوکھی روٹیوں کے ٹکڑے کھائیں۔ اس سے تو ہم ناگ ہی بھلے تھے۔ پیٹ بھر کر دودھ تو ملتا تھا۔

”لیکن اب دودھ لائیں کہاں سے؟“ ارجن نے پوچھا۔

”ہمارے ذہن میں ڈالے گئے علم کے مطابق ہم ہر روپ دھار سکتے ہیں۔ صرف اس جاندار کا ذہن میں خیال لانا ہوگا۔“ شکنتلا نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

”تو پھر دیر کاہے کی۔“ ارجن ایکدم اٹھتے ہوئے بولا۔ ”ایسا کرتے ہیں کسی ایسے پرندے کا خیال ذہن میں لاتے ہیں جو بڑا بھی ہو اور تیز اڑنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو، اڑتے ہوئے دنیا بھی دیکھیں گے اور خوراک بھی تلاش کریں گے۔“ ابھی ارجن نے اتنا ہی کہا تھا کہ دونوں کو ایک دم اپنی جسامت میں تبدیلیاں محسوس ہوئیں اور وہ چشم زدن میں عقابوں کی شکل اختیار کر گئے۔

”واہ اب مزا آئے گا۔“ شکنتلا نے اپنے پر پھیلا کر انسانی آواز میں کہا اور پھر چند لمحوں بعد وہ دونوں آسمان کی وسعتوں کا سینہ چاک کرتے ہوئے جنگل کے اوپر پرواز کر رہے تھے۔ یہ خاصا بڑا اور گھنا جنگل تھا۔ دن کے وقت بھی سورج کی روشنی کو زمین تک پہنچنے کے لیے خاصی تگ و دو کرنا پڑتی تھی۔

اس وقت موسم بالکل صاف، دھوپ چمکدار اور خاصی گرمی تھی۔ جنگل بہت طویل تھا ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ خاصی دیر پرواز کے بعد انہیں میدانی علاقہ نظر آیا جس میں فاصلے فاصلے پر اکا دکا مکان تھے۔

”شکنتلا۔“ ارجن نے پکارا......

”کیا ہے۔“ شکنتلا سر اٹھا کر بولی۔

”اگر خوراک تلاش کرنی ہے تو ہمیں کم بلندی پر اڑنا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے۔“ شکنتلا نے اتفاق کیا۔

اور اب دونوں نے اپنی بلندی کم کرنا شروع کر دی۔ خاصا نیچے آ کر انہوں نے دیکھا کہ چند بھینسیں گھاس چر رہی ہیں۔

”چلو ارجن ان کا دودھ پیتے ہیں۔ لیکن دودھ پینے کے لیے ہمیں سانپ بننا ہوگا۔“

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دونوں اژدھوں کی شکل اختیار کر گئے ان کی لمبائی سات آٹھ فٹ کی تھی۔ تمام بھینسیں انہیں سامنے دیکھ کر خوفزدہ آوازیں نکالنے لگیں۔ ارجن نے فوراً ایک بھینس کی پچھلی ٹانگوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا دوسری بھینس کے ساتھ یہی سلوک شکنتلا نے بھی کیا۔ دونوں بھینس اژدھوں سے اس قدر خوف زدہ ہوئیں کہ ان کے پاؤں مارے خوف کے زمین پر جم گئے اور وہ کوئی حرکت نہ کر سکیں۔ ارجن اور شکنتلا مزے سے تھنوں کے ساتھ منہ لگا کر دودھ پینے لگے وہ

باری باری تھن کے ساتھ منہ لگا لیتے اور اس وقت چھوڑتے جب دودھ کا آخری قطرہ بھی ان کے حلق میں اتر جاتا۔ جب دونوں سیر ہو گئے تو پھر عقاب بن کر واپس ناگ مندر کی طرف پرواز کر گئے۔ اس وقت شام ہو رہی تھی اور درختوں کے سائے لمبے ہونے شروع ہو گئے تھے۔ جب وہ مندر کے صحن میں اتر کر انسانی روپ میں واپس آئے تو سورج غروب ہونے والا تھا۔

''آج بہت مزا آیا ارجن! ہم نے ناگ سے انسان بننے کے بعد پہلی کامیابی حاصل کی۔'' شکنتلا نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔

''اب ہر دن اس سے بھی زیادہ مزے سے گزرا کرے گا شکنتلا......'' باتیں کرتے ہوئے وہ اس کمرے میں داخل ہوئے جہاں صابو رات سے بے بسی کی تصویر بنا تھا۔ ارجن نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سر پر ہاتھ مارا اور کہا...... ''افوہ۔''

''صابو کے لیے کھانے پینے کو کچھ لانا تو ہمیں یاد ہی نہ رہا شکنتلا۔''

''تو کیا ہوا۔'' شکنتلا لاپروائی سے بولی۔ ''گرو مہاراج کی کوٹھڑی میں جو بچے کھچے پھل اور پانی ہے وہ اسے دے دیتے ہیں بس زندگی کی آخری رات ہی تو اس نے نکالنی ہے۔'' شکنتلا نے بے بس صابو کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ جس کے ہونٹوں پر اب بھوک اور پیاس سے پپڑیاں جما اور چہرے پر موت کی مردنی چھانی شروع ہو چکی تھی۔ ''اچھا تو میں گرو کی کٹیا سے کھانے پینے کا سامان لاتا ہوں۔'' ارجن یہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا اور شکنتلا مسکراتی ہوئی صابو کے قریب آ گئی...... ''پانی...... پانی۔'' صابو بمشکل بولا۔

''ہر سال خوبصورت لڑکیوں کی جوانی سے کھیلتے تھے اب زندگی کی آخری چند سانسیں مشکل سے گزر رہی ہیں تو گھبرا گئے؟''

''تمہیں ناگ دیوتا کا واسطہ مجھے آزاد کر دو میرا انگ انگ دُکھ رہا ہے۔ مجھ پر دیا کرو۔ میں سارا جیون تم دونوں کی سیوا کرتا رہوں گا۔'' صابو کی فریاد جاری تھی کہ ارجن پھل اور پانی کا مٹکا اٹھائے کمرے میں داخل ہوا...... ''میرا خیال ہے شکنتلا اس کے ہاتھ پاؤں کھول دیتے ہیں اب یہ بھاگ نہیں سکتا۔'' یہ کہہ کر ارجن نے کھانے کا سامان فرش پر رکھا اور صابو کی رسیاں ڈھیلی کرنے لگا۔

چند لمحوں بعد صابو گلے سڑے پھلوں کو مرغ پلاؤ سمجھ کر کھا رہا تھا اور بار بار مٹکے سے منہ لگا کر پانی پیے جا رہا تھا۔ چھلکوں سمیت پھل کھا کر اور پانی کا آخری قطرہ حلق سے نیچے اتارنے کے بعد صابو ارجن کی طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ''ناگ بادشاہ میری دعا ہے کہ تمہیں سارا جیون کامیابیاں ملیں، میں تمام جیون تمہاری سیوا کرنے کو تیار ہوں۔ مجھے زندہ رہنے دو۔''

''چلو اٹھو......'' ارجن نے گردن سے پکڑ کر اس کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ پھر کھینچ کھانچ کر دوبارہ اُس کی مُشکیں کس دیں اب پھر صابو رسیوں سے جکڑا جا چکا تھا۔ شکنتلا اس سارے عمل کے دوران ٹھوڑی ہتھیلیوں پر ٹکائے زیرِ لب مسکان بکھیرتی رہی۔ ارجن جیسے ہی صابو سے فارغ ہو کر شکنتلا کے قریب آ کر بیٹھا تو وہ اس کی گود میں سر رکھ کر نیم دراز ہو گئی۔ اور بولی ''ارجن میرا خیال ہے کل ہم دوپہر ڈھلنے کے بعد یہاں سے نکل چلیں گے ہم انسانی صورت میں ہی سفر کریں گے۔'' ارجن شکنتلا کی زلفوں سے کھیلتے ہوئے بولا...... ''لیکن جنگل خاصا بڑا ہے انسانی روپ میں چلتے ہوئے پار کرنا ایک مشکل کام ہوگا۔''

''تمہاری بات ٹھیک ہے ارجن لیکن اس طرح ہمیں انسان کو پیش آنے والی مشکلات کا پتا تو چلے گا۔''

''تو پھر ٹھیک ہے ہم صبح سویرے اپنی تیاری مکمل کریں گے اور دوپہر کے وقت نکل پڑیں گے تاکہ اگلی صبح تک جنگل پار کر کے کسی آبادی میں داخل ہو جائیں۔'' ارجن نے شکنتلا کا سر گود سے ہٹا کر سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

''تیاری ہم نے ایک ہی کرنی ہے ارجن۔'' شکنتلا بھوکی نظروں سے صابو کو دیکھ کر بولی۔ ''صبح سویرے صابو کے خون سے بھوجن کریں گے اور بس......''

☆......☆......☆

تکلیف کی شدت سے صابو کی آنکھ کھلی تو...... شکنتلا ہاتھ میں خون آلود خنجر لیے کھڑی تھی جو اس نے بے دردی سے صابو کی کلائی پر چلایا تھا اور اب دوسری کلائی کی رگوں پر چلانے والی تھی۔ ''ارجن تم یہاں سے خون پی لو میں دوسری کلائی سے پیوں گی۔'' اور ارجن نے بائیں کلائی سے بہتے خون پر منہ رکھ دیا۔ ''نہ مارو...... دیا کرو...... سارا جیون تمہارے کام آؤں گا۔'' صابو نے آخری فریاد کی۔ تکلیف سے اس کی آنکھیں باہر نکل رہی تھیں۔

''تمہارا کام اب دنیا سے ختم ہو چکا صابو...... اب یہ دنیا ہماری ہے۔ رحم کی صدائیں بے سود ہیں۔ ہمارے دلوں پر تمہاری فریادوں کا کوئی اثر نہیں...... ہم ناگ ہیں اپنی زندگی اپنی جوانی سے ہمیں کوئی شے پیاری نہیں...... اس کے لیے تم تو کیا ہم ہزاروں انسانوں کا خون بھی کر سکتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے شکنتلا نے تیزی سے خنجر صابو کی کلائی پر چلایا۔ کلائی آدھی سے زیادہ کٹ کر جھولنے لگی۔ شکنتلا چند لمحے ابلتے ہوئے خون کو وحشی نظروں سے دیکھتی رہی پھر انسانی روپ میں پہلی دفعہ اپنا منہ اُبلتے گرم گرم انسانی خون سے لگا دیا...... صابو کی چیخیں در و دیوار ہلا رہی تھیں لیکن شیش ناگ کا جوڑا...... شڑپ شڑپ لپ لپ کی آوازوں سے خون پی رہا تھا۔ ارجن نے شکنتلا کے ہاتھ سے خنجر لے کر صابو کی شہ رگ پر چلایا تو خون کا فوارہ ابلنے لگا۔ دونوں وحشی انداز میں خون پینے لگے۔

☆......☆......☆

ارجن اور شکنتلا کو مندر سے نکلے ہوئے کئی گھنٹے ہو چلے تھے وہ جنگل میں چلے جا رہے تھے۔ صابو کا خون پینے کے بعد وہ پھر ناگ بنے اور جب دوبارہ انسانی روپ اختیار کیا تو صاف ستھرے اور خوش لباس مرد اور عورت بن گئے۔ خون کا اب نام و نشان تک نہ تھا۔ شکنتلا اس وقت چولی اور گھاگرے میں تھی اور ارجن دھوتی کرتے میں ملبوس تھا۔ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے گھنے جنگل میں چلے جا رہے تھے یہ جنگل سانپوں سے اٹا پڑا تھا لیکن ارجن اور شکنتلا سانپوں کے بادشاہ اور ملکہ تھے انہیں اپنی عوام سے کیا ڈر تھا۔ سورج کی روشنی کم ہوتے ہوتے اندھیرا چھانے لگا سارا جنگل سنسان لیکن سانپوں کی پھنکاروں سے گونج رہا تھا سانپوں کو بھی بادشاہ اور ملکہ کی خوشبو آ رہی تھی اس لیے وہ ان کے گرد گھیرا ڈال کر لیکن معقول فاصلہ رکھ کر ان کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے شاید انہیں بہ حفاظت جنگل پار کرانا اور مکمل پروٹوکول دینا چاہتے تھے۔ اچانک ایک بہت بڑا اژدھا آگے بڑھا اور اس کی خاموش آواز کے لہروں کی شکل میں ارجن اور شکنتلا کے دماغ میں سگنل موصول ہونے لگے وہ کہہ رہا تھا مہاراج اتنا بڑا جنگل پار کرنے کے لیے آپ میرے اوپر سوار ہو جائیں۔ انسانی وجود میں جنگل پار کرنا آپ کے لیے خاصا دشوار ہوگا۔

شکنتلا اور ارجن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلا کر اس کے اوپر سوار ہو گئے۔ اژدھا تیزی سے ایک جانب رینگنے لگا اور تھوڑی ہی دیر میں وہ خاصی رفتار پکڑ چکا تھا۔ ارجن اور شکنتلا کو کسی قسم کے جھٹکے محسوس نہ ہو رہے تھے نہ جانے کتنی دیر اژدھا چلتا رہا۔ جنگل میں ہر طرف سانپ ہی سانپ تھے جو راستے میں جا بجا دائیں بائیں کھڑے اپنی ملکہ اور بادشاہ کا دیدار کر رہے تھے۔

غالباً رات کا آخری پہر تھا جب اژدھا رُک گیا اور بولا۔ ''مہاراج اب آگے آبادی زیادہ دور نہیں اگر آپ اجازت دیں تو میں واپس چلا جاؤں۔'' دونوں نیچے اتر گئے ارجن بولا۔ ''تم واپس جا سکتے ہو۔'' اژدھے نے سر جھکا کر ان کے چاروں طرف احترام سے چکر مکمل کیا اور واپس چلا گیا۔

رات آخری سانسیں لے رہی تھی۔ آسمان پر بادلوں کے آوارہ ٹکڑے تیر رہے تھے۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا اور خاموشی کا راج تھا۔ ٹمٹماتے ستارے زمین کا اندھیرا دور کرنے سے قاصر تھے دور تک آبادی کے آثار نہ تھے۔ ارجن اور شکنتلا ناک کی سیدھ میں چلے جا رہے تھے اب قدرے بہتر جگہ تھی کہیں کہیں کھیت تھے کافی دیر چلتے رہنے کے بعد اب انہوں نے محسوس کیا کہ علاقہ سرسبز ہو رہا ہے۔ دور کہیں سے مرغ کی بانگ بھی سنائی دی۔ صبح کا سپیدہ مشرق سے نمودار

ہونے لگا۔ آبادی ان کے قریب تھی۔ اچانک کسی بیل کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی۔

☆......☆......☆

''شکنتلا میرا خیال ہے کوئی بیل گاڑی آ رہی ہے۔'' وہ آواز کی سمت تیزی سے چلنے لگے اب آواز انہیں قریب محسوس ہو رہی تھی۔ دور درختوں کا جھنڈ تھا آواز شاید ادھر سے ہی آ رہی تھی۔

''ارجن ہمیں یہ آواز محسوس ہوتی ہے جیسے پہلے بھی سنی ہو۔ ہر چیز ہماری دیکھی بھالی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم پہلے بھی انسان رہ چکے ہوں۔ اب جیسے اس آواز سے ہمیں کیا معلوم کہ بیل گاڑی ہے یا درختوں کا جھنڈ؟ اس کے بارے میں ہم کیسے جان سکتے تھے؟''

''اری پاگل ناگ دیوتا نے ہمیں انسانی روپ دیتے وقت ہمارے ذہن بھی بدل ڈالے ہیں ہم مکمل باشعور انسانوں کی طرح ہر چیز کو دیکھتے ہی جان جائیں گے کہ یہ کیا ہے۔ ہم اپنے ماحول کی ہر شے سے آگاہ ہیں۔'' دونوں باتیں کرتے کرتے درختوں کے پاس پہنچ گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بیل گاڑی جس پر سبزیاں وغیرہ لدی ہوئی ہیں ان کے دائیں جانب سے چلی آ رہی ہے۔ گاڑی بان ایک ہاتھ سے راسیں تھامے اور دوسرے سے حقہ پی رہا تھا۔ گاڑی بان نے انہیں دیکھ لیا اور گاڑی روک لی۔ صبح صادق کے اس ملگجے سویرے میں وہ نوجوان جوڑے کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔

''کہاں سے آئے ہو...... اور کہاں جانا ہے بھیا!'' اس نے ارجن کو مخاطب کیا۔

''ہمیں شہر تک لے چلو بھائی ہم مصیبت کے مارے ہیں۔''

''آؤ آؤ بیٹھ جاؤ پھر باتیں کرنا۔''

ارجن نے شکنتلا کو کمر سے اٹھا کر بیل گاڑی پر پھینکا اور خود بھی چھلانگ لگا کر سبزی پر چڑھ گیا بیل گاڑی پھر چل پڑی۔ دور مشرق سے اجالا پھوٹ رہا تھا۔ تاہم اب بھی ہر طرف نیم اندھیرا تھا...... ہوا میں خنکی تھی۔

''تم اس رات میں کہاں سے آئے ہو؟'' گاڑی بان، جو تقریباً پچیس سال عمر درمیانے قد اور صحت کا مالک تھا، ارجن سے مخاطب ہوا۔

''بھائی ہم قافلے کے ساتھ جا رہے تھے۔ ہماری نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ راستے میں ڈاکوؤں نے ہمارے قافلے کو لوٹ لیا۔ عورتوں اور مردوں کو غلام اور بچوں بوڑھوں کو قتل کر دیا۔ میں اپنی پتنی کے ساتھ اندھیرے میں کسی طرح بچ نکلا۔ زندگی بھی سو جان بچ گئی۔ تمام مال متاع تو گیا۔ اب آدھی رات سے پتا نہیں چلتے چلتے کہاں پہنچ گئے ہیں۔''

''شکر کرو جان بچ گئی تمہاری۔ مال و زر تو پھر بھی مل جائے گا اور تو اور تمہاری پتنی کی عزت بچ گئی...... کام کیا کرتے ہو؟''

''میں بنیادی طور پر سپیرا ہوں سانپ کے کاٹے کا علاج بھی کر لیتا ہوں...... میری پتنی بھی سپیرن ہے۔ ہم نینی تال سے آئے ہیں اور دلی جانا ہے۔''

''پھر تو صحیح راستے پر جا رہے ہو۔'' گاڑی بان نے بیلوں کو ہانکتے ہوئے پیچھے مڑ کر شکنتلا کو ایک سرسری نظر دیکھتے ہوئے کہا۔ شکنتلا شرمیلی لڑکیوں کی طرح سر جھکائے معصوم بنی بیٹھی تھی۔

اب صبح کا اُجالا رات کا کالا پیٹ پھاڑ کے چار سُو پھیلنے لگا تھا۔ طلوع آفتاب سے قبل وہ ایک گاؤں میں پہنچ گئے۔

''اس گاؤں سے دو گاؤں چھوڑ کر میرا گاؤں ہے۔''

''کہاں سے آئے ہو؟'' ارجن نے استفسار کیا۔ اب وہ ذرا آگے آ کر اس کے قریب بیٹھ گیا تھا اور تکلف بھی کچھ کم ہو چکا تھا۔

''میں دوسرے دیہاتوں سے سبزیاں لے کر آیا ہوں۔ اپنے گاؤں تک انہیں میں لے کر جاؤں گا وہاں سے میرا ایک نوکر انہیں لے کر منسوری قصبے میں بیچنے کے لیے جائے گا۔ میں بھوجن وغیرہ کر کے اور گھر میں دم لے کر تھوڑی دیر منسوری چلا جاتا ہوں اتنے میں میرا ملازم وہاں خاصا کام کر چکا ہوتا ہے۔''

''گھر میں بیوی بچے بھی ہوں گے؟'' ارجن نے پوچھا۔

''کہاں یار۔ ابھی تو میری بھی نہیں ہوئی۔ گھر میں صرف میں ہوں اور ماتا جی۔''

''تم نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔'' ارجن نے بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''میرا نام رندھیر ہے اور تم لوگوں کے کیا نام ہیں؟''

''میرا نام ارجن اور یہ میری پتنی شکنتلا ہے۔''

بیل گاڑی اب رندھیر کے گاؤں میں داخل ہو چکی تھی۔ رندھیر کا گھر بڑا لیکن کچا تھا۔ عام آبادی سے ذرا سا ہٹ کر تقریباً بارہ تیرہ مرلے پر مشتمل تھا۔ بڑے دروازے سے گزرنے کے بعد خاصا کھلا صحن جس میں ایک طرف کیکر اور بیری کے دو درخت اور کنواں تھا۔ کنویں کے پاس ہی رسی اور ڈول پڑے ہوئے تھے۔ جبکہ دوسری طرف تندوری تھی جس کے پاس ہی کیکر اور بیری کی ٹہنیاں پڑی ہوئی تھیں۔ صحن کے سامنے برآمدہ اور پھر تین کمرے تھے۔ ایک جانب رسوئی تھی وہ صحن میں موجود بڑی چارپائی پر ہی بیٹھ گئے تھوڑی دیر کے بعد رندھیر کی ماتا جی بھی رسوئی سے باہر نکلیں اپنے بیٹے کے ساتھ اس جوان جوڑے کو دیکھ کر حیران ہوتی ہوئی رندھیر سے مخاطب ہوئیں۔

''یہ کون لوگ ہیں پتر؟''

''ماتا جی یہ بے چارے لٹے پٹے مسافر ہیں یہ ایک قافلے کے ساتھ دلی جا رہے تھے کہ قافلے کو ڈاکوؤں نے لوٹ لیا اور یہ مجھے جنگل کے کنارے بھٹکتے ہوئے مل گئے۔''

''بھگوان ستیاناس کرے ان ڈاکوؤں کا جو شریف جنتا کا جیون اجیرن کرتے ہیں۔'' پھر شکنتلا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔ ''بیٹا دل چھوٹا نہ کرو۔ کچھ دن یہاں آرام سے رہو پھر رندھیر تمہیں دلی پہنچانے کا بندوبست بھی کر دے گا۔''

رندھیر کی ماں شکنتلا سے باتیں کر رہی تھی اور رندھیر ٹکٹکی باندھے اس کا حسن و جمال دیکھے جا رہا تھا۔ اس سے پہلے اندھیرے کی وجہ سے وہ شکنتلا کو صحیح طریقے سے دیکھ نہ پایا تھا۔

اب جو ماں سے باتیں کرتے وقت شکنتلا پر بھرپور نظر پڑی تو انگشت بدنداں رہ گیا۔ اتنی سندر کنیا...... اس کی محویت کو ارجن نے بھی بھانپ لیا۔

کچھ دیر بعد رندھیر کی ماں ناشتا تیار کر کے لے آئی۔ ناشتے کے بعد رندھیر حقہ پینے لگا۔ شکنتلا اس کی ماتا جی کے پاس چلی گئی اور کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔ جبکہ ارجن رندھیر سے باتیں کرنے لگا۔ رندھیر نے اسے بتایا کہ یہاں سے دو رات کی مسافت پر دیرہ دون کا شہر ہے اس سے آگے ساٹھ کوس دور سہارن پور آتا ہے۔''

''دلی کتنی دور ہے؟'' ارجن نے پوچھا۔ ''بھیا دلی تو سہارن پور سے بھی خاصی دور ہے۔ دیرہ دون سے اگر تمہیں کوئی ایسا قافلہ مل جائے جو بیل گاڑیوں پر ہو تو ایک ہفتے میں تمہیں سہارن پور پہنچا دے گا۔ ایک دو دن کسی سرائے میں قیام کرنے کے بعد وہاں سے تمہیں دوسرا قافلہ پکڑنا ہوگا جو دلی جاتا ہو۔''

''ارجن بھیا میری مانو تو ابھی کچھ دن ہمارے ہاں ٹھہر جاؤ۔ یہیں میرے ساتھ کچھ کام وغیرہ کرو تاکہ کچھ زاد راہ اکٹھا ہو جائے پھر چلے جانا۔''

رندھیر باتیں تو ارجن سے کر رہا تھا۔ لیکن اس کے ذہن میں صورت شکنتلا کی گھوم رہی تھی۔ اس نے پوری زندگی میں ایسی سندر ناری نہ دیکھی تھی۔ سوچ رہا تھا ارجن بڑا بھاگوان ہے جسے ایسی کنیا کا جیون ساتھ ملا انہیں کسی طور پر یہاں روک لوں اب اس نے کام پر بھی جانا تھا۔ لیکن چاہتا تھا کہ جانے سے پہلے شکنتلا کو ایک بار پھر دیکھ لے۔ ارجن سے یہ کہتے ہوئے کہ بھائی تم ذرا بیٹھو میں ماتا جی کو بتا کر آتا ہوں کہ میں دکان پر جا رہا ہوں۔ اور پھر ارجن کا جواب سنے بغیر اندر کمرے میں چلا گیا۔ جہاں شکنتلا اور اس کی ماتا جی کام کر رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ شکنتلا قافلے لٹنے کی جھوٹی داستان گھڑ کر سنا رہی تھی۔

''ماتا جی میں دکان پر جا رہا ہوں۔ شام کو جلدی آ جاؤں گا۔ ذرا مہمانوں کا خیال رکھنا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے شکنتلا کو سر سے پاؤں تک بھرپور نظروں سے ناپا......

”اے ہے بیٹا یہ بھلا کوئی کہنے کی بات ہے۔ شکنتلا بیٹی کا یہ اپنا گھر ہے۔ یہ تو اتنی پیاری بچی ہے کہ اگر اس کی شادی نہ ہوئی ہوتو......؟“ ماتا جی نے فقرہ جان بوجھ کر ادھورا چھوڑ دیا۔ کاش ماتا جی ایسا ہوتا۔ رندھیر نے ذہن میں سوچا اور بے دلی سے باہر آ گیا۔ ”اچھا ارجن بھائی، تم یہاں آرام کرو میں جلد ہی آ جاؤں گا۔ شام کا بھوجن اکٹھے ہی کریں گے۔“ یہ کہہ کر وہ گھر سے باہر نکل گیا۔ دھوپ خاصی تیز ہو رہی تھی۔ ارجن نے چارپائی کیکر کے سائے تلے گھسیٹ لی اور پشت کے بل دونوں ہتھیلیاں سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا اور آئندہ کا لائحہ عمل سوچنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد شکنتلا بھی اس کے پاس آ گئی اور پائنتی پر بیٹھ گئی۔

”دیکھی انسانوں کی زندگی شکنتلا......“

”خاصی دلچسپ ہے۔“ وہ بولی۔ ”رندھیر کی ماتا جی کہاں ہیں؟“ ارجن نے پوچھا۔ ”وہ دوپہر کے لیے سبزی کاٹ رہی ہیں۔“

”ارجن......“ شکنتلا مسکراتے ہوئے بولی۔ ”رندھیر مجھے ہوس ناک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔“

”لیکن اگر اسے یہ پتا چل جائے کہ تم انسان نہیں سانپ ہوتو اس کا سارا عشق ہوا ہو جائے۔“ ارجن نے جواب دیا اور وہ دونوں کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

”اب کیا ارادہ ہے شکنتو۔“ ارجن نے پیار سے کہا۔ ”جب تک صورت حال مناسب ہے یہاں رہیں گے۔ جب حالات نے ساتھ نہ دیا چل پڑیں گے۔ ہمارا کیا ہے، ہم تو سانپ ہیں راتیں کسی درخت کی کھوہ میں بھی گزار سکتے ہیں۔“

☆......☆......☆

چند دن یونہی گزر گئے۔ شکنتلا گھر کے کام کرتی صبح کا ناشتا اور بھوجن، جھاڑ پونچھ کا کام بڑی خوشی خوشی کرتی اسے یہ سب کچھ اور انسانی روپ بے حد دلچسپ لگ رہا تھا۔

رندھیر کو شکنتلا بڑی اچھی لگتی تھی۔ اسے علم تھا کہ وہ ارجن کی پتنی ہے لیکن اس کا دل اس کے اختیار میں نہ تھا۔ وہ بہانے بہانے سے اس کے ساتھ باتیں کرتا اور وہ مسکراتی رہتی۔ شکنتلا کے مسکرانے سے اس کے گالوں پر گڑھے پڑ جاتے تو رندھیر کا من چاہتا کہ اس کو بوچ لے لیکن پھر ارجن کا خیال آتا تو دل مسوس کر رہ جاتا اس نے سوچ لیا تھا کہ کسی دن موقع پا کر اس سے اپنا حال دل بیان کر ہی دے گا پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ ارجن اور شکنتلا کو وہاں رہتے ہوئے کئی دن گزر گئے ایک دن صبح صبح رندھیر نے ماں کو جلدی جلدی تیار ہوتے دیکھا تو بولا۔

”کہاں جا رہی ہیں ماتا جی؟“

”پتر ساتھ والے گاؤں کریالہ میں ایک جاننے والے کا دھیانت ہو گیا ہے۔ میں وہاں جا رہی ہوں۔ شام تک لوٹ آؤں گی۔“ یہ بات سن کر رندھیر کے ذہن میں اچانک بجلی کوندی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ شکنتلا کو حال دل آج ہی سنائے گا اور اگر وہ نہ مانی تو پھر زبردستی بھی کر گزروں گا۔ پھر بھی نہ مانی تو ماں کی غیر موجودگی میں چوری کرنے کا الزام لگا دوں گا کیا کر لیں گے یہ اور ارجن میں کوئی ان سے کرایہ تھوڑا لیتا ہوں۔

ماتا جی چلی گئیں تو وہ ارجن کے ساتھ گھر سے دور دوسرے قصبے میں کام کرنے چلا گیا۔ اب شکنتلا گھر میں اکیلی تھی۔ ارجن کو بھی رندھیر پر پہلے سے شک تھا اور پھر اس وقت تو شک یقین میں بدل گیا جب رندھیر نے ارجن سے طبیعت خراب کا بہانہ کیا اور کہا۔ ”ارجن بھیا آج سر میں شدید درد ہے اور کچھ جسم بھی ٹوٹ رہا ہے۔ میں جا کر آرام کرتا ہوں تم ذرا دکان پر بیٹھ جاؤ......“ رندھیر نے بظاہر خوشی سے اس کی بات مان لی مگر دل میں تہیہ کر لیا کہ وہ بھی اس کے پیچھے گھر جائے گا اور ناگ کے روپ میں رہ کر اس کی نگرانی کرے گا۔ ارجن کے جانے کے تھوڑی دیر بعد اس نے بھی گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

☆......☆......☆

شکنتلا جھاڑو اٹھانے کے لیے جھکی ہی تھی کہ پیچھے سے کسی نے اس کی آنکھیں بند کر لیں۔

”کون......کون ہے بھئی؟......اچھا ارجن چھوڑ دو نا۔“ شکنتلا نے ایک جھٹکے سے خود کو آزاد کروا لیا۔ پلٹ کر دیکھا تو

رندھیر کو سامنے پا کر حیران رہ گئی۔

”رندھیر بھیا کیا کرتے ہو؟“

”دیکھو شکنتلا......“ رندھیر ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ”تو مجھے بھیا نہ کہا کر!“

”کیوں......؟“ شکنتلا نے کیوں کو لمبا کر کے اور براہ راست آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ ”کیا تو میرا بھائی نہیں؟“

”کیا میں نے کبھی تمہیں بہن کہا ہے؟ میں نے تو جس دن سے تمہیں دیکھا ہے میری نیند اُڑ گئی ہے شکنتلا!“ رندھیر نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو رندھیر۔“ شکنتلا دو قدم پیچھے ہٹ کر بولی۔ ”میں نے تمہیں ہمیشہ اپنا بھائی سمجھا ہے اور تم جیسے ہو ارجن میرا پتی ہے۔“

”مجھے کچھ نہیں پتا شکنتلا......“ وہ جذبات کی شدت سے لرزتے ہوئے بولا۔ ”میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تم میرے خوابوں کی ملکہ ہو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے شکنتلا کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا۔

”ہوش میں آؤ رندھیر یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے تمہارے گھر میں کچھ دن رہ لیا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم مہمانوں سے یہ سلوک کرو۔“

”میں کچھ نہیں جانتا شکنتلا......تم مجھے اچھی لگتی ہو میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تمہارا حسن میری رگ رگ میں سما گیا ہے۔ چھوڑ دو ارجن کو اور میرے ساتھ بیاہ کر لو وہ کنگلا تمہیں کیا دے گا......؟ میرے اپنے کھیت ہیں۔ بیل گاڑی ہے اپنی دکان اپنا مکان ہر چیز ہے میں تمہارے لیے آسمان سے تارے بھی توڑ کر لا سکتا ہوں۔“ رندھیر نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال لیا۔ شکنتلا اب جھلا چکی تھی۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے زوردار طمانچہ رندھیر کے بائیں گال پر رسید کیا۔ ”اب اگر تم نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔“

”تم جیسا تو دنیا میں کوئی ہو بھی نہیں سکتا۔ شکنتلا تم تو حسن کی ملکہ ہو میرے دل کی رانی ہو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے شکنتلا کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر چارپائی کے اوپر پھینکا اور خود بھی اس کے اوپر گر گیا۔ اب بات شکنتلا کے بس سے باہر ہونے لگی تھی، اس نے فیصلہ کر لیا کہ یہاں سے بھاگ جائے کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے یا ارجن کے ہاتھوں رندھیر کو نقصان پہنچے۔ شکنتلا نے پورا زور لگا کر رندھیر کو چارپائی سے نیچے پھینکا اور دروازے کی طرف بھاگی لیکن دروازے سے ٹکرا کر گر گئی کیونکہ رندھیر نے دروازہ آتے وقت آہستگی سے بند کر دیا تھا۔ شکنتلا ابھی اٹھ نہ پائی تھی کہ رندھیر اس کے سر پر پہنچ گیا اور ایک بار پھر اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا لیکن شکنتلا کسمسا کر اس کی گرفت سے نکل گئی۔

”رک جاؤ رندھیر......“ شکنتلا کی آواز ایک دم بدل گئی۔ اس کی چمک دار آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ رندھیر اس کی بدلی ہوئی کڑک دار آواز سن کر ٹھٹک گیا۔

”شکنتلا اتنی کمزور نہیں کہ دو آنکھیں، دو ہاتھ اور ایک سر رکھنے والا کوئی عام سا انسان اس پر قابو پا سکے۔ تم جانتے نہیں میں کون ہوں۔ میں تمہارے جیسی انسان نہیں ہوں۔“

”شکنتلا......“ رندھیر نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر آواز گلے میں جیسے گھٹ گئی۔

”بکواس بند کرو۔“ غصے کی شدت سے شکنتلا کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ”اب اگر تم نے میرے قریب آنے کی کوشش کی تو میرے زہر سے اور ناگ دیوتا کے قہر سے تمہیں کوئی نہ بچا سکے گا۔ سنو رندھیر میں انسان نہیں ناگن ہوں اور سو سال کی عمر پا کر انسانی روپ دھار چکی ہوں۔ تمہیں تمہاری گستاخیوں کے باوجود صرف اس لیے زندہ چھوڑ کر جا رہی ہوں کہ تم نے چند دن ہماری خدمت کی ہے۔“

یہ کہہ کر شکنتلا ایک ایڑی پر زور سے گھومی اور ایک زبردست پھنکار کے ساتھ شیش ناگ کا روپ دھار گئی اور نکاسی آب کے راستے کی طرف بڑھ گئی۔

رندھیر پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا اور پھر وہ جلدی سے باہر نکلنے کے لیے دروازے کی طرف لپکا۔

☆......☆......☆

رندھیر کی ماں کو چارپائی پر ڈالے ایک ہجوم رندھیر کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ وہ صبح سویرے ساتھ والے گاؤں کی مرگ پر جا رہی تھی کہ ایک موڑ پر مخالف سمت سے آنے والی بگھی کی زد میں آ گئی اور دماغ پر چوٹ لگنے کی وجہ سے موقع پر ہی دم توڑ گئی۔ کچھ لوگوں نے اس کو پہچان لیا اور اب چارپائی پر اس کی لاش اس کے گھر لے جا رہے تھے۔ رندھیر کا گھر سامنے ہی تھا۔ گلی کا دروازہ کھلا تھا اس لیے لوگ چارپائی اٹھائے صحن میں ہی آ گئے۔ انہوں نے چارپائی زمین پر رکھی ہی تھی کہ سامنے والے کمرے کی نالی کے راستے سے ایک سانپ باہر نکلا ارزور سے پھنکارا۔

ٹھیک اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلا رندھیر بدحواس دوڑتا ہوا باہر آیا اور سانپ سانپ چلانے لگا۔ اس نے چارپائی کی طرف بالکل نہ دھیان دیا۔ لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی اور کئی لوگ واپس باہر بھاگے۔ اتنے بہت سے لوگوں کو دیکھ کر شکنتلا جو ناگن کے روپ میں موری سے باہر آئی تھی فوراً دیوار پر چڑھ کر گلی کی طرف بھاگ گئی۔ لوگ بھی ناگ سانپ کی آوازیں لگانے لگے۔ رندھیر کے منہ سے الفاظ بے ربط نکل رہے تھے وہ بری طرح خوفزدہ تھا۔ لوگوں نے سمجھا کمرے میں سانپ دیکھ کر ڈر گیا ہوگا۔ گاؤں کے ایک معتبر شخص نے سب کو آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا کہ ابھی رندھیر کو ماں کے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے۔ تھوڑی دیر بعد اس کے حواس بحال ہونے شروع ہوئے تو گاؤں کا نمبردار آگے بڑھا اور پوچھنے لگا۔

”رندھیر کیا ہوا؟...... کیوں اتنے خوفزدہ ہو کچھ ہمیں بھی بتاؤ۔ یہ کیا چکر ہے سانپ کہاں سے آیا تھا؟“

”یہ...... یہ عام سانپ نہیں ناگن تھی جو میرے سامنے عورت سے سانپ بنی ہے۔“ وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ ایک دم بہت سی آوازیں ابھریں۔ اور پھر چہ مگوئیوں کی مختلف آوازیں بلند ہوئیں۔ ”چپ کرو بھئی خاموش رہو بات تو سُننے دو۔“ نمبردار بلند آواز سے بولا تو سب لوگ خاموش ہو گئے۔

”ہو سکتا ہے تم نے کوئی خواب دیکھا ہو؟“

”نہیں، نہیں میں جاگ رہا ہوں۔ ابھی تو اپنی دکان سے آیا ہوں۔“

”بھئی چکر کیا ہے۔ پوری بات تو سناؤ۔“ ایک بزرگ آدمی بولا۔

”کچھ دن پہلے میں منہ اندھیرے کھیتوں سے سبزی بیل گاڑی پر لادے آ رہا تھا کہ ایک عورت اور مرد مجھے ملے اور قافلہ لٹنے کی جھوٹی داستان سُنائی میں ان کو بیل گاڑی پر بٹھا کر گھر لے آیا۔ آج میں ابھی گھر میں آیا اور کمرے میں گیا تو وہ لڑکی میرے سامنے سانپ بن رہی تھی۔ اس کو پتا نہ چلا کہ میں کمرے میں آ گیا ہوں۔“ رندھیر بات کو گول کر کے بولا۔

”مرد کہاں ہے؟“ کوئی بولا ”وہ میری دکان پر ہے۔ میری طبیعت خراب تھی میں اس لیے گھر آیا تھا۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی سانپ ہی ہوگا۔“ سرپنچ نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”ناگن...... ناگن“ اچانک کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔

☆......☆......☆

رندھیر کے گھر جانے کے بعد ارجن کو یقین ہو چلا تھا کہ رندھیر اس کی پتنی پر بُری نظر رکھتا ہے۔ آج چونکہ ماتا جی بھی گھر نہیں تھیں لہٰذا ہو سکتا ہے رندھیر کوئی ایسی حرکت کر جائے جسے شکنتلا اچھا نہ سمجھے اور کوئی ناخوشگوار واقعہ جنم لے لے۔

لہٰذا رندھیر کے نکلنے کے کچھ وقفے بعد سارا کام دکان کے ملازم پر چھوڑ کر ارجن بھی گھر کی طرف چلا۔ گو اسے یقین تھا کہ رندھیر شکنتلا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ لیکن شکنتلا کے ہاتھوں اسے تو نقصان پہنچ سکتا تھا یا پھر کسی بھی واقعہ کو روکنے کے لیے اس نے فوری گھر پہنچنا ضروری سمجھا۔ گھر کے قریب پہنچ کر اس نے سوچا انسانی حالت میں اندر گیا تو رندھیر اگر واقعی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے لیٹا ہوا پایا اور کوئی بھی وہ بات جو اس کے ذہن میں ہے نہ رونما ہوئی تو رندھیر کو کیا جواب دوں گا کہ میں گھر کیوں آیا ہوں! یہ سوچ کر ارجن نے فیصلہ کیا کہ میں ناگ کے روپ میں اندر جاؤں گا اگر گھر کی صورتحال تسلی بخش نظر آئی تو واپس دکان پر چلا جاؤں گا۔ لہٰذا اس نے مکان کی پچھلی طرف سے اندر جانے کا فیصلہ کیا اس

گھر کی دیوار کے پاس آ کر اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ قرب و جوار میں اسے کوئی نظر نہ آیا لیکن اس نے محسوس کیا کہ گھر کے اندر کئی لوگوں کی ملی جلی آوازیں آ رہی ہیں اب ارجن نے ناگ کے روپ میں گھر کے اندر جانے کا فوری فیصلہ کر لیا اور پھنکار مار کر شیش ناگ کا روپ اختیار کیا اور پچھلی دیوار سے چھت پر آ کر صحن میں اترنے لگا کہ ”ناگن ناگن“...... اچانک کئی آوازیں ایک ساتھ اُبھریں۔

”مارو بھئی اس کو......“ نمبردار بڑی بڑی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔

کئی لوگ جن کے ہاتھوں میں ڈنڈا یا چھڑی وغیرہ تھی سانپ کو مارنے کو دوڑے۔ لیکن شیش ناگ پھرتی سے ایک طرف ہو جاتا ایک جوشیلے نوجوان نے اپنی چادر ایک طرف سے ہو کر ناگ کے اوپر پھینکی اور پھر تیزی سے ایک لاٹھی چادر کے اوپر مارنے کے لیے آگے بڑھا لیکن شیش ناگ خطرے کو محسوس کرتے ہی پوری قوت سے چادر سمیت اس نوجوان کے منہ پر آ کر لگا...... اور نوجوان فلک شگاف چیخ کے ساتھ صحن میں گر پڑا اور پلک جھپکنے میں اس کا رنگ نیلا پڑ گیا اور منہ سے جھاگ نکلنے لگے۔ اگلے ہی لمحے وہ ساکت ہو چکا تھا۔

اس وقت رندھیر سمیت تمام لوگوں کی توجہ اس نوجوان کی طرف ہو چکی تھی۔ لہٰذا ناگ تیزی کے ساتھ چادر سے نکل کر کمرے میں جا گھسا۔ وہ شکنتلا کو تلاش کر رہا تھا اسے یقین تھا کہ وہ کمرے میں ہی ہوگی...... اور کوئی ایسی بات ضرور ہو چکی ہے جو وہ ناگن بن کر روپوش ہو گئی ہے کمرے کے اندر آ کر زور سے پھنکار ماری لیکن کہیں سے شکنتلا کی صدا آئی اور نہ جواب......

”ناگن کہاں گئی......؟“

”وہ کمرے میں گئی ہے، بہت زہریلی ہے اس کا خاتمہ بہت ضروری ہے ورنہ کسی کو زندہ نہ چھوڑے گی۔“ صحن میں سب لوگ افراتفری کے عالم میں بول رہے تھے۔ ”ٹھہرو میری بات سنو۔“ چھوٹی چھوٹی داڑھی والا وہ آدمی جو سرپنچ نظر آتا تھا۔ دونوں ہاتھ بلند کر کے زور سے بولا سب لوگ خاموش ہو گئے۔

”جلدی بتاؤ! ناگن کسی وقت بھی کمرے سے باہر آ سکتی ہے۔“ نمبردار کرم سنگھ نے کہا۔ ”یہ ناگن چونکہ انسان بن کر رہتی ہے لہٰذا انسانی بات بھی سمجھ سکتی ہے۔“ تلک رائے آہستگی سے بولا۔

”پھر......؟“

”پھر یہ کہ کمرے کے پاس نالی کی موری بند کر دی جائے تاکہ سوائے دروازے کے اس کے لیے باہر آنے کا راستہ بند ہو جائے کھڑکی ویسے بھی بند ہے روشن دان بھی اس کمرے کے نظر نہیں آ رہے۔ باہر کا دروازہ فی الحال بند کر دو۔ کیوں رندھیر پچھلی دیوار سے کوئی راستہ تو نہیں؟“

”نہیں وہاں دیوار ہے۔“ رندھیر گھٹے گھٹے لہجے میں بولا۔ ”اوئے جلدی کرو تندوری کے پاس سے کیکر اور بیری کی ٹہنیاں اور چھانگے اُٹھا کر لاؤ۔“ چار آدمی فوری طور پر گئے اور کیکر اور بیری کی ٹہنیاں جو جلانے کے لیے رکھی تھیں اٹھا لائے۔ ”اور تم دونوں فوراً کہیں سے جلانے کا تیل لاؤ۔“ کرم سنگھ نے دو بندے جلانے کا تیل لینے کو دوڑائے نالی کی موری بند کر دی گئی۔ چند ہی منٹوں میں سارے کام مکمل کر لیے گئے۔ چار آدمیوں کو کیکر کی ایک ایک ٹہنی دے دی گئی۔ اور انہیں دروازے پر گھیرا دے کر کھڑا کر دیا گیا۔ دیہاتوں میں سانپ وغیرہ مارنے کے لیے کیکر کی ٹہنی اس لیے استعمال کی جاتی ہے کہ سانپ اتنا پھرتیلا ہوتا ہے کہ عام ڈنڈے یا لاٹھی کی زد میں اس کا آنا ناممکن ہوتا ہے کیکر کی ٹہنی اگر آپ توڑ کر دیکھیں تو آپ کو پتا چلے گا کہ اس پر بے شمار چھوٹی چھوٹی ٹہنیاں لگی ہوتی ہیں اور سرکنڈے بھی۔ لہٰذا سانپ جیسے ہی آپ پر حملہ آور ہوگا تو آپ اس چھاتہ نما ٹہنی جسے چھانگا کہا جاتا ہے کو آگے کر دیں سانپ اتنی طاقت سے حملہ آور ہوتا ہے کہ الٹے قدموں واپس پلٹنا اس کے لیے ناممکن ہوتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا پھن ان چھوٹی ٹہنیوں سے اُلجھ کر زخمی ہو جاتا ہے اور وہ اس میں پھنس جاتا ہے۔

”اب دروازہ کھول دو۔“ تلک رائے زور سے بولا۔

ناگ ارجن جو باہر نکلنے کے لیے دروازے کے پاس ہی کھڑا کوئی درز یا سوراخ وغیرہ تلاش کر رہا تھا اچانک دروازہ کھلنے سے سب کے سامنے آ گیا ایک لمحے کے اندر اس نے سوچا کہ اگر کمرے کے اندر واپس چلا تو یہ لوگ گھیرا ڈال کر مارنے کی کوشش کریں گے لہٰذا تیزی سے باہر نکل کر کسی دیوار پر چڑھ کر بھاگ کر چھپ جاؤں اور یہی فیصلہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی اور آخری غلطی بن گیا وہ جیسے ہی باہر نکلا چار کیکر بیری کے چھاتہ بردار ٹہنیوں سے لیس آدمیوں نے فوراً اسے نشانہ پر لیا...... اس نے زور سے پھنکار ماری اور اچھل کر ایک آدمی کے ماتھے کا نشانہ لے کر جمپ کیا تو اس آدمی نے ایک دم کیکر کی ٹہنی آگے کر دی...... اور اس سے پہلے کہ ارجن سنبھلتا اس کا پھن ٹہنی کے پر کنڈوں کے اندر پھنس چکا تھا۔ ٹہنی کے کانٹے اس کے جسم میں اُترنے لگے۔ نمبردار کرم سنگھ نے آگے بڑھ کر فوراً ٹہنی اس شخص سے لے لی کیونکہ وہ شخص کچھ خوفزدہ نظر آ رہا تھا کرم سنگھ نے ٹہنی ہاتھ میں پکڑتے ہی زور زور سے زمین پر مارنی شروع کر دی ارجن بری طرح زخمی ہونے لگا اور حواس اس کا ساتھ چھوڑنے لگے۔ ارجن کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبنے لگا۔ نمبردار تلک رائے نے بغیر کسی تاخیر کے جلانے کا تیل اس کے اوپر انڈیل دیا اور تیزی سے اسے آگ دکھا دی۔ ایک شعلہ لپکا اور ارجن کا جسم آگ میں بری طرح جلنے لگا......

ادھر شکنتلا جو کمرے سے باہر نکل کر باہر گلی کی طرف کسی دیوار کے اوپر سے باہر نکل گئی تھی اور ارجن کا انتظار کر رہی تھی اور اسے جب رندھیر کے مکان کے اندر سے ناگ سانپ کا شور شرابہ سنائی دیا تو چھپتی چھپاتی دیوار پر چڑھ کر سیڑھی کی اوٹ میں سے صحن میں جھانکنے لگی...... یہ عین وہی لمحہ تھا جب ناگ پر تیل انڈیل کر اسے آگ لگائی جا رہی تھی۔ شکنتلا ارجن کا دردناک انجام دیکھ کر آپ سے باہر ہو گئی ناگ ارجن صحن میں تڑپ رہا تھا ایک جھٹکے سے وہ انسان بن جاتا اور دوسرے جھٹکے سے پھر ناگ نظر آتا۔ یہ منظر درجنوں لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کئی ایک تو مارے خوف کے بے ہوش ہو گئے اور اکثر وہاں سے بھاگنے لگے شکنتلا ایک زوردار پھنکار کے ساتھ بہت بڑے اژدھے میں تبدیل ہو گئی اور دیوار سے صحن میں اترنے لگی اب تو رہے سہے لوگوں کے اوسان بھی خطا ہو گئے کیونکہ شکنتلا اژدھے کے روپ میں دروازے کے سامنے کھڑی تھی لہٰذا لوگوں کے بھاگنے کا راستہ بھی بند ہو چکا تھا۔ سارے آدمی اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔

شکنتلا تیزی سے ہجوم کی طرف مڑی اور زور سے سانس پھنکار کی صورت میں خارج کی تو اس کے منہ سے گرم سانوں کی شکل میں اُبلتی بھاپ سی نکلی۔ دو تین آدمی اس کی زد میں آ کر زور سے چیخنے لگے۔ باقی لوگ پیچھے ہٹ کر دیواروں کے ساتھ لگ گئے۔

"اس کے اوپر تیل چھڑک کر اسے بھی آگ لگا دو۔" نمبردار کرم سنگھ نے زور سے کہا تو تلک رائے نے فوراً تیل والے کنستر کی مدد سے شکنتلا پر دور سے تیل پھینکا۔ کچھ تیل اس کے اوپر گرا اژدھا تلک رائے کی طرف مڑا لیکن پیچھے سے کرم سنگھ نمبردار نے ایک آدمی سے تیل کا کنستر لے کر اژدھے کی پشت پر تیل پھینک دیا۔ اس دوران شکنتلا مسلسل گرم ترین سانسیں لوگوں پر پھینکتی رہی جس سے کئی جھلس گئے لیکن اب شکنتلا نے خطرے کی بو محسوس کر لی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اب اس کے جسم پر تیل گر چکا ہے آگ کی ہلکی سی چنگاری بھی اس کے لیے موت کا پیغام ثابت ہو گی چنانچہ اس نے ایک لمحے کے اندر فرار کا فیصلہ کر لیا اور ہجوم کی طرف رُخ کر کے پورے زور سے پھنکار ماری تو تمام لوگ ڈر کر پیچھے ہٹ گئے اور وہ تیزی سے گلی والی دیوار کے اوپر چڑھ گئی وہاں پہنچ کر زوردار پھنکار ماری اور اب لوگوں نے دیکھا کہ سانپ غائب ہو گیا اور اب وہاں ایک خوبصورت لڑکی دونوں ہاتھ کولہوں پر جمائے شعلہ بار نظروں سے ہجوم کو دیکھ رہی تھی اس کی گھنی کھلی زلفیں کمر سے نیچے تک جھول رہی تھیں اس کی بڑی بڑی قاتلانہ آنکھیں سب لوگوں پر جمی ہوئی تھیں ساڑھی تیل سے بھیگی ہوئی تھی۔

"ارجن کے قاتلو! تم نے میرے ناگ کی ہتھیا کر کے بڑا انیائے کیا! تم ناگن کی طاقت اور انتقام سے واقف نہیں۔ شکنتلا تمہاری زندگیوں میں زہر گھول دے گی۔ میں اس گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی' تم موت مانگو گے لیکن موت بھی تم سے روٹھ جائے گی۔ ایک ایک کو تڑپا تڑپا کر ماروں گی میں پھر آؤں گی اور تمہارے لیے قیامت بن کر آؤں گی۔"

اسی اثناء میں تلک رائے دھیرے دھیرے تندوری کے قریب ہو گیا اور پھر اچانک ایک جلتی لکڑی اٹھا کر پوری طاقت

شکنتلا کا نشانہ باندھ کر پھینکی لیکن شکنتلا اس کو تاڑ چکی تھی۔ وہ فوراً گلی کی طرف کود گئی۔ "چلو بھائیو! ناگن کا پیچھا کریں۔ وہ تیل میں بھیگی ہوئی ہے یہی وقت ہے کہ اس کو آگ میں جلا دیا جائے ورنہ بڑی تباہی برپا کرے گی۔" نمبردار کرم سنگھ نے کہا اور پھر سب لوگ باہر کی طرف دوڑے۔

اب شکنتلا گاؤں کے کھیتوں میں دوڑ رہی تھی اور اس سے کافی فاصلے پر تلک رائے' رندھیر' کرم سنگھ اور گاؤں کے بہت سے لوگ دیوانہ وار دستی ہتھیار اور جلتی لکڑیاں اٹھائے اس کے تعاقب میں تھے۔

آہستہ آہستہ گاؤں کی حد ختم ہو رہی تھی اور سرسبز وادی شروع ہو گئی تھی۔ ناگن شکنتلا جان بوجھ کر انسانی روپ میں بھاگ رہی تھی۔ اس کی کوشش تھی کہ دوڑتے دوڑتے جب خاصے لوگ پیچھے رہ جائیں گے اور جو دوڑ رہے ہوں گے وہ بھی تھک چکے ہوں گے تو ان سے دو دو ہاتھ کروں گی تاکہ ناگ کا کچھ بدلہ تو لے سکوں۔ وہ تو ناگن تھی۔ تھکنا اس کی فطرت میں نہ تھا اور نہ وہ لوگ اس کے قریب آ سکتے تھے۔ شکنتلا جیسے ہی محسوس کرتی کہ لوگ کچھ قریب آ رہے ہیں تو وہ زیادہ تیز دوڑ کر درمیانہ فاصلہ بڑھا دیتی۔

کئی لوگ بہت پیچھے رہ گئے اب تقریباً سات آٹھ افراد جن میں کرم سنگھ' تلک رائے' رندھیر شامل تھے اس کے تعاقب میں تھے اب مزید خوبصورت علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ ایک طرف سے آ کر دریا بھی وادی کی خوبصورتی بڑھانے لگا تھا۔

چاروں طرف پہاڑ اور درمیان میں دریا اور ہر طرف ہریالی ہی ہریالی وہ لوگ گاؤں سے خاصے دور آ گئے تھے اب شکنتلا ان لوگوں کو گھیرنے کا سوچ رہی تھی۔ تھوڑا سا مزید بھاگنے کے بعد اسے چند خیمے نظر آنے لگے۔ وہ ان خیموں کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ اسے چند سرکاری اہلکار دکھائی دیے۔ گاؤں کے لوگ اب بھی پکڑو بھاگو جانے نہ پائے۔ ناگن ہے کی آوازیں لگاتے اس کے پیچھے آ رہے تھے۔

☆......☆......☆

ریاست تابانہ کے مہاراجہ رام ناتھ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے قالین پر بیٹھے تھے اور حسین وجمیل کنیزیں انہیں مورچھل جھل رہی تھیں۔ پہرے دار نیزے تھامے اور تلواریں نیام میں لٹکائے خیمے کے دروازے پر مستعد کھڑے تھے۔ مہاراجہ حقہ پی رہے تھے اور ایک کنیز حقے کی نے سنبھالے باادب بیٹھی تھی۔ مہاراجہ کی طلب پر فوراً نے آگے کر دیتی دائیں ہاتھ سے مہاراج دیدہ زیب منقش آب خورے سے کچھ پی بھی رہے تھے اور گھونٹ لیتے ہی آب خورہ بھی دوسری کنیز تھام لیتی۔ خیمے کے اندر چار کنیزوں کے علاوہ اور کوئی نہ تھا مہاراجہ کی آنکھوں میں نشہ تھا غالباً شراب نما کوئی شے نوش فرما رہے تھے۔

تمام کنیزیں انتہائی خوبصورت لباسوں میں تھیں یہ چاروں کنیزیں ہر سفر میں مہاراجہ کے ہمراہ ہوتیں...... آج بھی ریاست تابانہ کے مہاراجہ ہمسایہ ریاست کے نئے راجہ کی رسم تاج پوشی میں شرکت کے بعد اپنے محل میں واپس جا رہے تھے گزشتہ شام شب بسری کے لیے ان کا قافلہ یہاں رک گیا تھا علاقے کے حسن کو دیکھتے ہوئے مہاراجہ نے ایک دن مزید قیام کا حکم نامہ جاری فرمایا تھا مصاحبین کے خیموں نے چاروں طرف سے شاہی خیمے کو اپنے جلو میں لے رکھا تھا باہر جا بجا سپاہی گشت کر رہے تھے وادی کے چاروں طرف خوبصورت پہاڑ درمیان میں ہریالی اور بہتا دریا قابل دید منظر تھا۔ خیمے کے اندر خاموشی تھی اور مہاراجہ مے نوشی اور تمباکو نوشی میں مصروف تھے۔ خیمے کے اندر کا یہ سکون اس وقت غارت ہو گیا جب باہر سے بھاگو پکڑو جانے نہ پائے ناگن ہے کا شور بلند ہوا اور پھر باہر بہت سے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔

"کون بدتمیز ہیں باہر جو ہمارے آرام میں مخل ہو رہے ہیں۔" مہاراجہ رام ناتھ ماتھے پر بل ڈال کر بولے۔ اس اثناء میں ایک سپاہی خیمے کے اندر داخل ہوا...... اور کورنش بجا لا کر بولا۔ "مہاراج ایک لڑکی اور چند آدمیوں کو گرفتار کیا گیا ہے۔ آدمیوں کا کہنا ہے کہ یہ لڑکی ناگن ہے اور انسانی روپ اختیار کیے ہوئے ہے۔"

"فوراً پیش کرو۔" مہاراج نے شراب کا گھونٹ لے کر جام کنیز کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

چند ہی لمحوں میں ایک لڑکی اور چار مرد نیزوں اور تلواروں کے گھیرے میں مہاراجہ کے خیمے میں داخل ہوئے۔ مہاراجہ نے آنکھ اُٹھا کر ان کو دیکھا اور انتہائی کرخت لہجے میں بولے۔

”کیا تم کو شاہی قافلے کا احترام نہیں آتا...... تم لوگوں کو یہاں غل غپاڑہ کرنے کی جرأت کیسے ہوئی۔“
”سرکار......“ رندھیر بولا......”اس لڑکی کو فوراً آگ میں جلا دیجیے۔ یہ ناگن ہے اس کے ناگ کو ہم نے آگ میں جلا دیا ہے۔“
”اس کی موت بہت ضروری ہے مہاراج......“ تلک رائے نے ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر لگا کر پرنام کرتے ہوئے کہا۔
”عالی جاہ یہ بڑی خطرناک ہے اور ناگن ہے میں گاؤں کا سرپنچ تلک رائے ہوں۔ میں اس بات کا گواہ ہوں......!“
”بکواس بند کرو...... تم بتاؤ لڑکی! مہاراجہ نے پہلی بار شکنتلا کو بھرپور نظروں سے دیکھا......اور ایک لمحے کو ساکت رہ گئے! بھرا بھرا جسم، دراز قد، کھلی زلفیں، سفید باریک ساڑھی، تیل گرنے سے ساڑھی جسم سے چپک کر رہ گئی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں جن سے آنسو رواں تھے۔ لڑکی ہاتھ جوڑے کھڑی تھی مہاراجہ کے مخاطب ہوتے ہی فوراً آگے بڑھی اور مہاراج کے قدموں کو چھو کر زاروقطار روتے ہوئے کہنے لگی۔
شکنتلا زور زور سے رو رہی تھی اور اس کی خوبصورت آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی رواں تھی۔
”مجھے اپنی پناہ میں لے لیجیے مہاراج یہ ظالم لٹیرے ہیں۔ نجانے ہم جیسے کتنے لوگوں کو لوٹ چکے ہیں انہیں پھانسی دے دیجیے مہاراج میں سارا جیون آپ کی باندی بن کر رہ جاؤں گی۔ مہاراج اس حسن کی مورتی کو یک ٹک دیکھے جا رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ میں نے نہ معلوم کتنی کلیوں کا رس چوسا ہے لیکن اس لڑکی کا حسن تو سب سے جدا ہے پھر رندھیر وغیرہ کی طرف منہ کر کے بولے......
”خبیثو!...... ایک معصوم کنیا پر اتنا بڑا الزام لگاتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔“
”مہاراج!“ رام تلک تھر تھر کانپتے ہوئے بولا......
”ہم سچ کہہ رہے ہیں ہمارے گاؤں کے لوگوں سے پوچھ لیجیے۔ یہ واقعی ناگن ہے۔“
”چپ کتے، آگے سے زبان چلاتا ہے۔ تجھے معلوم نہیں کہ تو اس سے کس کے سامنے کھڑا ہے؟“ مہاراج غصے سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ تمام کنیزیں بھی اپنے باریک لباس سنبھالتی ہوئی تیزی سے کھڑی ہو گئیں۔
”لے جاؤ ان بدمعاشوں کو...... اور اس لڑکی کو بھی الگ بند کر دو ہم اپنے محل میں جا کر ان کا فیصلہ کریں گے۔“ اور پھر سپاہی شکنتلا، رندھیر، تلک رائے، کرم سنگھ اور ایک اور نوجوان کو گھسیٹتے ہوئے لے گئے اور مہاراج رام ناتھ ایک گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئے۔

☆......☆......☆

مہاراج کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ آدھی رات ہونے والی تھی۔ ان کی سب سے خوبصورت کنیز کوشیلیا ان کے پہلو میں دراز تھی لیکن مہاراجہ ابھی تک باوجود کوشش کے سو نہ سکے تھے۔ انہیں رہ رہ کر وہ لڑکی یاد آ رہی تھی جس کو کچھ دیہاتیوں نے ناگن قرار دیا تھا حالانکہ مہاراجہ رام ناتھ کے پاس سینکڑوں حسین کنیزیں تھیں جو کہ حسن میں ثانی نہ رکھتی تھیں مگر اس لڑکی جیسی ایک بھی نہ تھی۔
”پونم پہرے دار کو بلاؤ......“
”جی اچھا۔“ پونم سر تسلیم خم کرتے ہوئے خیمے سے باہر چلی گئی اور چند ہی لمحوں بعد پہرے دار حاضر ہو گیا۔
”جی مہاراج......؟“ قدرے جھکتے ہوئے اس نے سوالیہ نگاہوں سے پوچھا۔ مہاراج نے اسے قریب بلاتے ہوئے کہا۔
”آج دن کو چند دیہاتیوں کے ساتھ ایک لڑکی بھی گرفتار کی گئی تھی۔“ ”جی سرکار......“ پہرے دار نے مؤدب ہو کر کہا۔
”اس لڑکی کو ہمارے حضور پیش کیا جائے۔“ مہاراج نے بے نیازی سے کہا اور پہرے دار کورنش بجالاتے ہوئے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

شکنتلا کے ہاتھ اور پاؤں رسیوں سے کس کر اسے ایک خیمے میں پھینک دیا گیا تھا جہاں بندھے ہوئے اب اسے

رات ہوگئی تھی وہ چاہتی تو اب تک فرار ہوچکی ہوتی وہ سانپ بن کر نکل سکتی تھی لیکن اس کا ذہن کچھ اور منصوبہ بنا رہا تھا۔ ارجن کی موت کا منظر اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کتنی بے بسی کی موت مرا تھا ارجن...... اسے تو شکنتلا کے دھوکے میں قتل کردیا گیا تھا...... شکنتلا خود بھی بڑی مشکل سے اپنی جان بچا پائی تھی...... ابھی تو ارجن نے انسانی زندگی کا صحیح مزہ بھی نہ چکھا تھا کہ ظالم انسانوں نے اسے مجھ سے چھین لیا۔ پورے گاؤں کے لوگ اس کے قتل میں ملوث تھے۔ یہ لوگ معافی کے قابل نہ تھے شکنتلا جان بوجھ کر ان کو آبادی سے دور لا رہی تھی تاکہ ان سے اپنا انتقام پورا کرسکے لیکن اب اس نے اپنی سوچ تبدیل کرلی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ناگ تو مر گیا اب اس کا انتقام اور اپنی آئندہ زندگی کے بہترین نتائج کے لیے اس کا کسی شاہی محل میں ہونا ضروری ہے۔ شاہی زندگی آرام دہ اور پرتعیش ہوگی اور وہ ناگ کا انتقام اور اپنے لیے انسانی خون حاصل کر کے بھی مکمل طور پر محفوظ رہے گی۔ یہی سب باتیں سوچ کر وہ قید سے فرار نہ ہوئی تھی تاکہ مہاراجہ کو اپنے مظلوم اور ناگن نہ ہونے کا یقین دلا کر اس کے دل میں اپنا گھر بنا سکے اسے یقین تھا کہ اس کا حسن اس قدر سحر انگیز ہے کہ مہاراجہ اسے نظر انداز نہ کرسکیں گے اس وقت رات آدھی ہوچکی تھی اور وہ خاموشی سے خیمے کے اندر مستول کے ساتھ بری طرح جکڑی ہوئی تھی تاکہ مہاراجہ اپنے محل میں جاکر اسے طلب کریں اور وہ انہیں اپنے حسن کے جال میں جکڑ کر اپنی بے گناہی کا یقین دلا سکے۔ اسی وقت قدموں کی چاپ ابھری اور دو سرکاری اہلکار تلواریں سونتے اندر داخل ہوئے اور اسے کھولنے لگے۔ اس کی رسیاں کھولنے کے بعد اسے آگے کو دھکا دیا۔ بھاگنے کی کوشش کی تو سر تن سے جدا کردیا جائے گا۔ ایک سپاہی نے اسے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا اور شکنتلا اپنی کلائیاں سہلاتے ہوئے ان کے آگے آگے چل پڑی۔

☆......☆......☆

دونوں سپاہی شکنتلا کو مہاراجہ کے خیمے میں چھوڑ کر جاچکے تھے! خیمے کے اندر تین مشعلیں جل رہی تھیں۔ مہاراجہ خوبصورت ریشمی بستر پر دراز تھے۔ کوشلیا بھی پہلو میں لیٹی سو رہی تھی باقی کنیزیں باادب کھڑی مہاراجہ کی طرف سے اجازت پاکر جانے کے انتظار میں تھیں۔

شکنتلا مہاراجہ کے پائنتی نظریں جھکائے الٹے ہاتھ کے ناخن دانتوں سے آہستہ آہستہ کتر رہی تھی۔

''سنو لڑکی...... کیا یہ بات سچ ہے کہ تم ناگن ہو؟'' مہاراجہ گمبھیر لہجے میں بولے......

''جہاں پناہ یہ سب جھوٹ ہے میں تو ایک مظلوم لڑکی ہوں...... ان لٹیروں نے میری عزت لوٹنے کی کوشش کی تھی...... اور مزاحمت کرنے پر میرے پتی کو مار ڈالا اور مجھے بھی تعاون نہ کرنے کی پاداش میں زندہ جلا دینا چاہتے تھے۔ اگر میں ناگن ہوتی تو کیا اب تک سانپ بن کر فرار نہ ہوچکی ہوتی؟'' شکنتلا نے آنکھوں میں آنسو بھر کر مہاراجہ کی طرف دیکھا...... اور ملتجی لہجے میں پھر بولی...... ''میں آپ سے انصاف چاہتی ہوں سرکار...... ماتا پتا پہلے ہی فوت ہوچکے ہیں اب پتی بھی قتل ہوگیا ہے۔ میں اب دنیا میں بے سہارا ہوں ایک بھائی تھا وہ بھی شادی کر کے پتنی کو لے کر پتا نہیں کہاں چلا گیا۔''

''کوئی بچہ وغیرہ نہیں ہے تمہارا......''

''نہیں مہاراج ابھی تو میری شادی کو چند روز ہی ہوئے تھے اور میں اپنے پتی کے ساتھ دیرہ دون جارہی تھی۔''

''اگر تمہیں آزاد کردیا جائے تو کہاں جاؤ گی؟''

''اب میں کہیں جاکر کیا کروں گی جہاں پناہ؟ اب تو میری اچھا ہے کہ آپ مجھے اپنی داسی بنا لیں! اپنے چرنوں میں جگہ دان کردیں! میں سارا جیون آپ کی سیوا کروں گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' مہاراجہ رام ناتھ اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے...... یہ لڑکی انہیں پہلی نظر میں ہی بھا گئی تھی اور وہ اسے اپنی کنیز بنانے کا فیصلہ کرچکے تھے۔ اب تو یہ لڑکی خود بھی یہی چاہتی تھی...... رام ناتھ اس پر دل و جان سے فدا ہوچکے تھے ساتھ لیٹی کوشلیا جو کہ ان کی باتوں سے جاگ چکی تھی کو حکم دیا کہ دوسرے خیمے میں جاکر دوسری کنیزوں کے ساتھ سو جائے اور باقی کنیزوں کو بھی وہاں سے جانے کا حکم دیا۔

(حیرت کے نئے رنگوں سے آباد اس سلسلے وار ناول کی دوسری قسط ماہ جنوری میں ملاحظہ کیجیے)

محبت اور نفرت کی دھیمی دھیمی آنچ

میں لو دیتی ہوئی، شعلہ ساماں تحریریں

پہلا خاکستر کردینے والا شعلہ

کُتے کا پِلّا

ہنری سلاسر

ہنری سلاسر کے جادوگر قلم سے، وہ تحریر جو اپنے اندر قاری کو خاکستر کردینے کی صلاحیت رکھتی ہے

لڑکے کی عمر سولہ سال تھی۔ اس کے بڑے بڑے ہاتھ کلائیوں کے پاس اس طرح لٹکے ہوئے تھے جیسے ان میں بالکل جان نہ ہو۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور نچلا جبڑا ایک بے جان لوتھڑے کی طرح لٹکا ہوا تھا۔ اس کی پیلی



پیلی آنکھیں ہر وقت متحرک رہتی تھیں اور وہ اپنے سر کے بالوں کی لٹ بنا کر اسے بار بار مروڑتا تھا۔ سولہ سال ہی کی عمر میں اس کے بال اُڑنے شروع ہوگئے تھے۔ فرینک نے سوچا کہ اگر یہ چند سال اور زندہ رہا تو بالکل گنجا ہوجائے گا۔

فرینک کو عدالت نے اس لڑکے کے دفاع میں مقدمہ لڑنے کا حکم دیا تھا۔ اس نے تھانے میں داخل ہوکر سارجنٹ ایڈ کو اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ سارجنٹ نے اس کے مؤکل سے تنہائی میں ملاقات کرنے کی اجازت دے دی۔ پندرہ منٹ بعد جب وہ باہر نکلا تو کچھ اُداس اور پریشان نظر آرہا تھا۔ وہ سارجنٹ کے کمرے میں داخل ہوا۔

''آؤ فرینک! بیٹھو۔'' سارجنٹ نے وکیل کے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ ''تمہاری پریشانی بجا ہے مگر ہمارا کیس بہت مضبوط ہے۔ مجھے امید نہیں ہے کہ عدالت اسے سزائے موت سے کم کوئی سزا دے گی۔''

''ہاں، یہی نظر آتا ہے۔'' نوجوان وکیل نے کہا۔ ''مجھے حیرت یہ ہے کہ اسے حوالات میں بند کیا گیا ہے۔ اسے تو پاگل خانے میں داخل کرنا چاہیے تھا کیوں کہ اسے وکیل کی نہیں، ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ میں نے پندرہ منٹ کی گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس لڑکے کا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ بالکل پاگل ہے لیکن اس کے دماغ میں کوئی خرابی ضرور پیدا ہوگئی ہے اور اسی خرابی نے اسے یہ سارے قتل کرنے پر مجبور کیا۔ ہاں کورمے کے بارے میں کیا اطلاع ہے؟''

کورمے کے بارے میں ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ وہ زندہ بچ جائے گا۔ چاقو پسلیوں میں گھس کر اگرچہ سیدھا دل کی طرف گیا تھا لیکن دل بال بال بچ گیا۔ خیر، اگر کورمے زندہ بچ بھی گیا تو اس سے ہمارے کیس پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ تم جانتے ہو، رابرٹ پر مزید تین آدمیوں کو قتل کرنے کا الزام بھی ہے۔''

''ہاں۔'' نوجوان وکیل نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''کورمے کے حالات کے متعلق کچھ معلوم ہوا؟''

سارجنٹ نے میز پر پڑی ہوئی ایک فائل کھولی۔ ''تمہیں اس سے بھی کوئی مدد نہیں ملے گی فرینک! اس کا پورا نام جیمس ایل کورمے ہے۔ عمر اڑتیس سال، ایک تجارتی اور صنعتی رسالے کا مدیر، شادی شدہ ہے اور دو بچوں کا باپ بھی ہے۔ کوریا کے محاذ پر بے جگری سے لڑنے پر اسے بہت سے تمغے بھی ملے ہیں۔ اس کی بائیں ٹانگ کا نچلا حصہ مصنوعی ہے۔'' سارجنٹ نے فائل بند کردی۔ ''اگر تم کسی طرح یہ ثابت کردو کہ لڑکے کا ذہنی توازن درست نہیں ہے تو ممکن ہے......'' اس نے اپنا جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

''سوال یہ ہے کہ رابرٹ نے اس پر حملہ کیوں کیا؟'' نوجوان وکیل نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔ ''اس سے اسے کیا دشمنی تھی؟ کورمے آخر اُسے کیا نقصان پہنچا رہا تھا؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں فرینک!'' سارجنٹ نے بے بسی سے کہا۔ ''جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، تمہارے مؤکل نے پہلے بھی تین آدمیوں کو بھی بے وجہ ہلاک کیا تھا۔ انہیں قتل کرنے کی بھی اس کے پاس کوئی وجہ نہیں تھی۔''

''اسی لیے تو میں نے کہا کہ اسے وکیل کی نہیں، ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ اسے اپنے تمام جرائم کا اعتراف بھی ہے لیکن جب اس سے ان بے گناہ لوگوں کو قتل کرنے کی وجہ دریافت کی جاتی ہے تو وہ بے بسی سے کاندھے اُچکا کر کہتا ہے، مجھے معلوم نہیں۔ ہاں، میں نے انہیں قتل کیا ہے لیکن کیوں؟ اس کا مجھے علم نہیں لیکن سارجنٹ میرا دعویٰ ہے کہ قتل جیسا بڑا جرم کبھی بے وجہ نہیں ہوتا۔ مجھے پچھلے تین مقتولوں کے بارے میں بھی کچھ بتاؤ۔''

''ضرور فرینک!'' سارجنٹ نے ایک مرتبہ پھر فائل کھولی۔ ''پہلے مقتول کا نام جان مسکیلن تھا۔ وہ پیشے کے اعتبار سے ایک ٹرک ڈرائیور تھا۔ پانچ اگست کو جب وہ گلی پار کرکے اخبار خریدنے جا رہا تھا تو اسے گولی مار کر ہلاک کردیا گیا۔ گولی ایک رائفل سے چلائی گئی تھی اور گولی جس زاویے سے اندر گھسی تھی، اُس سے ظاہر ہوتا تھا کہ گولی اُوپر سے کسی مکان کی چھت سے چلائی گئی ہے۔ گولی گردن میں داخل ہوکر کولہے سے باہر نکلی تھی لیکن تمہارا مؤکل اپنے مقتول جان مسکیلن سے بھی واقف نہیں تھا۔''

''کیا تم یہ بات یقین سے کہہ سکتے ہو سارجنٹ؟''

''میں عدالت میں حلف تو نہیں اُٹھا سکتا لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ پولیس نے قاتل اور مقتول کے درمیان کسی قسم کے تعلقات معلوم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاتل نے جان مسکیلن کو دیکھا، دیکھتے ہی رائفل اٹھائی اور اسے گولی ماردی۔''

''ہوسکتا ہے یہی ہوا ہو۔'' نوجوان وکیل نے سگریٹ نکال کے سارجنٹ کو پیش کی پھر اس نے لائٹر سے اپنی اور سارجنٹ کی سگریٹیں جلائیں۔

''لیکن رابرٹ نے دوسرا قتل رائفل سے نہیں کیا تھا بلکہ اس کے لیے چاقو استعمال کیا تھا جبکہ اس قسم کے جنونی قاتل قتل کرنے کا عموماً ایک ہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔''

''درست ہے۔'' سارجنٹ نے سگریٹ کا گہرا کش لے کر آہستہ آہستہ دھواں نکالا۔ ''دوسرے مقتول کا نام والٹر کیمپ تھا۔ اس کی عمر پچپن سال تھی۔ وہ زمینوں کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتا تھا۔ اس کی بیوی چھ مہینے پہلے مری تھی پھر تین ماہ بعد موٹر کے ایک حادثے میں وہ اپاہج ہوگیا تھا اور اس کے دو ماہ بعد رابرٹ نے اس کی پشت میں چاقو گھونپ کر اسے قتل کردیا۔''

وکیل نے کچھ یاد آنے پر کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا۔ ''اوہ تین بج گئے۔ تم کہہ رہے تھے کہ تم نے رابرٹ کے والدین کو گفتگو کے لیے یہاں بلایا ہے؟''

''ہاں! آج صبح میں نے ایک گاڑی اور ٹنگٹن بھیجی تھی۔ اب وہ واپس آنے والی ہوگی۔ آج کل ہائی وے پر ٹریفک بہت ہوتا ہے اور اور ٹنگٹن یہاں سے کافی فاصلے پر ہے۔''

''اگر وہ میری موجودگی میں یہاں آجاتے تو مجھے بڑی سہولت ہوجاتی۔'' وکیل نے کہا۔ ''رابرٹ کے والدین سے ملاقات کرنا اب بہت ضروری ہوگیا ہے۔ میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ ان کا لڑکا آخر گھر سے کیوں فرار ہوا تھا؟ ممکن ہے اس سوال کے جواب سے مجھے کوئی مدد مل سکے۔''

''ہوسکتا ہے گھر سے بھی وہ کوئی جُرم کر کے بھاگا ہو۔'' سارجنٹ آسودگی سے سگریٹ کے کش لینے لگا۔

''اب مجھے تیسرے مقتول کے بارے میں کچھ بتاؤ!''

''تیسرے مقتول کا نام لوئیس ویپ تھا۔ اس کی عمر ستر سال تھی۔ اس کا اپنے محلّے میں اخبار فروخت کرنے کا ایک

کیبن تھا۔ محلے کے تمام بچے اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ اسے اُس وقت ہلاک کیا گیا جب وہ اپنے گھر واپس جا رہا تھا۔ اس مرتبہ قتل چاقو یا رائفل سے نہیں کیا گیا تھا بلکہ قتل کا آلہ ایک لاٹھی تھی جس کے سہارے سے مقتول چلتا تھا۔ وہ لاٹھی مسلسل اس کے سر پر ماری گئی۔ یہاں تک کہ اس کا سر پھٹ گیا اور بھیجا باہر نکل آیا۔"

نوجوان وکیل کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ "اور اس کے بعد کورے کا نمبر آیا؟" اس نے تصدیق چاہنے کے انداز میں کہا۔ "ایک شراب خانے کے باہر اسے چاقو مار کر ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی؟"

"ہاں، یہ واقعہ کئی لوگوں نے دیکھا۔" سارجنٹ نے کہا۔

ایک کانسٹیبل نے اندر جھانک کر کہا۔ "رابرٹ کے والد مسٹر برٹن آگئے ہیں جناب! کیا میں انہیں اندر لے آؤں؟"

سارجنٹ نے سوالیہ نظروں سے وکیل کی طرف دیکھا اور کہا "ٹھیک ہے، لے آؤ!"

رابرٹ کے باپ کا لباس فیشن کے مطابق نہیں تھا لیکن صاف ستھرا اور عمدہ سلا ہوا تھا۔ اس کے جوتے پالش کی وجہ سے چمک رہے تھے۔ اس نے ٹائی بھی باندھ رکھی تھی۔ وہ پستہ قد تھا اور اس کا چہرہ اس کے جسم پر کچھ بڑا نظر آتا تھا۔ اس وقت وہ شرمندگی اور غصے کے ملے جلے جذبات میں مبتلا نظر آ رہا تھا۔ سارجنٹ نے اسے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کچھ سوالات کیے جن کے جوابات سے معلوم ہوا کہ وہ اور ٹلٹن میں سیمنٹ فروخت کرنے کا کاروبار کرتا ہے۔ اس کی بیوی اپاہج ہے اور رابرٹ ان کی واحد اولاد ہے۔

"وہ گھر سے کب فرار ہوا تھا؟" سارجنٹ نے پوچھا۔

"چھ ہفتے قبل۔" برٹن نے جواب دیا۔ اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ "میں نے اسے تلاش کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی مسٹر! یہ میں اس لیے بتا رہا ہوں کہ تمہیں بھی اندازہ ہو جائے کہ وہ کس قماش کا لڑکا ہے۔ وہ اپنے والدین کو پریشان کر کے خوش ہونے والے لڑکوں میں سے ہے۔ اس کے اس طرح فرار ہونے پر مجھے ایک طرح خوشی بھی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ اب جب وہ بھوکا مرے گا تو اسے اپنے گھر اور اپنے باپ کی قدر معلوم ہو گی اور چند روز بعد وہ خود واپس آ جائے گا۔ مجھے اس کی واپسی کی کوئی جلدی نہیں تھی۔"

"آپ کو معلوم ہے کہ اب وہ کس مشکل میں گرفتار ہے؟" نوجوان وکیل نے کہا۔

"ہاں مجھے معلوم ہو گیا ہے مگر مجھے ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی۔" برٹن نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس موذی سے ایسی ہی توقع تھی۔ یہ خبر کم از کم میرے لیے حیرت کا باعث نہیں ہوئی۔ ہاں، جب اُس کی ماں کو پتہ چلے گا تو شاید وہ حیرت سے بے ہوش ہو جائے۔ وہ اپنے لڑکے کو کسی فرشتے سے کم نہیں سمجھتی۔"

سارجنٹ نے اس سے کچھ اور سوالات کیے۔ کچھ نازک قسم کے سوالات جن سے برٹن کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا۔ "نہیں!" اس نے چلا کر جواب دیا۔ "وہ غبی یا کند ذہن نہیں ہے۔ بے شک وہ ہر بات دیر میں سمجھتا ہے مگر اس کے استادوں سے پوچھو، ان کا کہنا ہے کہ وہ احمق یا بے وقوف ہرگز نہیں ہے۔ وہ ناسمجھ بچہ بھی نہیں ہے۔ دراصل اسے بے جا لاڈ پیار نے بگاڑ دیا ہے اور یہ سب اس کی ماں کا کیا دھرا ہے۔ میں اسے سمجھاتا تھا اور اس سے لڑتا بھی تھا مگر وہ نہیں مانتی تھی۔ اچھا ہے، اب اسے یہ پتا چل جائے گا کہ لاڈ پیار کا کیا نتیجہ ہوتا ہے؟ رابرٹ بچپن ہی سے ضدی اور خود سر تھا۔"

سارجنٹ اسے مقتولوں کی تصویریں دکھانے لگا۔ ہر تصویر پر برٹن نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "نہیں، میں ان میں سے کسی سے بھی واقف نہیں ہوں۔ یہ چاروں میرے لیے قطعاً اجنبی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ رابرٹ کو آخر ان سے کیا دشمنی ہو گئی تھی یا کیا دشمنی ہو سکتی تھی؟"

"جیمس کورے ابھی اسپتال میں زیرِ علاج ہے۔" سارجنٹ نے کہا۔ "وہ کوریا کے محاذ پر لڑ چکا ہے، اسے بے جگری اور بہادری کے کئی تمغے ملے ہیں۔ جنگ میں اس کی ایک ٹانگ بھی ضائع ہو گئی تھی۔ کیا آپ کو پورا یقین ہے کہ آپ اسے بالکل نہیں جانتے؟ ذرا اپنی یادداشت پر زور دیجیے۔ ممکن ہے آپ کو کچھ یاد آ جائے؟"

"نہیں۔ میں اس شخص سے کبھی نہیں ملا۔"

"مسکیلن۔ جان مسکیلن۔" سارجنٹ نے کہا۔

"یہ نام بھی میں پہلی بار سُن رہا ہوں۔" اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

نوجوان وکیل تمام گفتگو میں ایک آدھ بار ہی بولا تھا۔ وہ چونک کر سیدھا ہو گیا۔ "ٹھہرو، سارجنٹ! ایک منٹ۔ کورے کی ایک ٹانگ مصنوعی ہے جو جنگ میں ضائع ہو گئی تھی اور مقتول نمبر دو جس کا نام والٹر کیمپ تھا، اس کے متعلق تم نے بتایا تھا کہ اسے بھی کسی قسم کا حادثہ پیش آیا تھا۔ اس حادثے کی وجہ سے اسے کیا نقصان پہنچا تھا سارجنٹ؟"

سارجنٹ چند لمحوں تک وکیل کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر اس نے فائل کھولی۔ "سر پر چوٹ آئی تھی۔ دو پسلیاں ٹوٹی تھیں اور ٹانگ کی ہڈی ٹوٹی تھی۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ والٹر کیمپ بھی لنگڑا تھا۔ کیا یہ محض اتفاق ہے؟"

"سمجھ میں نہیں آتا۔" سارجنٹ نے کھلی ہوئی فائل پر نظریں دوڑائیں۔ "تیسرے مقتول کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ستر سالہ بوڑھا بھی ایک سال پہلے سیڑھیوں سے گر کر کولہے کی ہڈی تڑوا بیٹھا تھا۔ یعنی وہ بھی لنگڑاتا ہو گا۔ اسی لیے تو وہ لاٹھی کا سہارا لے کر چلتا تھا۔"

"اور پہلے مقتول کے بارے میں کیا اطلاع ہے؟" وکیل نے پوچھا۔ "میری مراد ٹرک ڈرائیور مسکیلن سے ہے۔"

"اس کے بارے میں بھی مجھے معلومات حاصل کرنی ہوں گی۔" سارجنٹ نے جواب دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ برٹن اپنا غصہ نوجوان وکیل پر اتارنے لگا۔ "سنو مسٹر! میں یہاں اس کمینے کے بچے کے لیے رحم کی بھیک مانگنے نہیں آیا ہوں۔ سمجھ میں آیا تمہاری؟"

"میں سمجھ گیا مسٹر برٹن! آپ ذرا صبر سے کام لیجیے۔"

"میں تنگ آ گیا ہوں تمہارے سوالات سے۔ میں سارا دن یہاں نہیں بیٹھ سکتا۔ مجھے اور بھی بہت سے کام ہیں۔ گھر پر میری بیوی بیمار پڑی ہے اور میرے کاروبار کو میری نگرانی کی ضرورت ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں اجازت دیتا ہوں کہ تم اس خبیث کے ساتھ جو چاہو کر سکتے ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

"میں سمجھ گیا مسٹر برٹن! لیکن آپ بھی حالات کی نزاکت سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ کے لڑکے پر فی الحال تین انسانوں کو ہلاک کرنے کا الزام ہے۔ اگر کورے اسپتال میں چل بسا تو یہ تعداد چار ہو جائے گی۔ اب ہمارے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ یا تو اس کا ذہنی توازن درست نہیں ہے اور اُس نے یہ تمام قتل جان بوجھ کر اپنے ہوش و حواس میں نہیں کیے ہیں یا پھر وہ ایک ایسا قاتل ہے جو لطف اندوزی کے لیے انسانوں کو قتل کرتا پھرتا ہے کیوں کہ پولیس کی تحقیقات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ تمام مقتول اس کے لیے اجنبی تھے اور وہ خود بھی تمام مقتولوں کے لیے اجنبی تھا۔ ان کے درمیان کسی قسم کی کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اب آپ کچھ سمجھے کہ حالات کتنے نازک ہیں؟ کیا آپ اس صورتِ حال سے پریشان نہیں ہیں؟"

"نہیں۔" برٹن نے دانت پر دانت جماتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر شدید نفرت کی ایک لہر آ کر گزر گئی۔ "اس کے متعلق مجھے کوئی بات پریشان نہیں کرتی۔ اگر اس نے کوئی جرم کیا ہے تو اسے اس کی سزا بھی بھگتنی پڑے گی۔ بس میں یہ چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں مجھے پریشان نہ کیا جائے۔ مجھے تنہا چھوڑ دیا جائے۔"

نوجوان وکیل کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ وہ حیرت بھری نظروں سے اپنے سولہ سالہ مؤکل کے باپ کو دیکھ رہا تھا۔ سارجنٹ اندر داخل ہوا۔ "تمہارا خیال درست نکلا فرینک۔" سارجنٹ کی آواز میں جوش کا عنصر نمایاں تھا۔ "پہلا مقتول مسکیلن بھی لنگڑا تھا۔ اس کا ایک پیر کٹا ہوا تھا۔"

برٹن نے گھوم کر سارجنٹ کا سامنا کیا۔ "مجھے کوئی پروا نہیں ہے کہ وہ کیا کرتا پھرتا ہے۔ میری طرف سے وہ جہنم میں جائے۔ مجھے اس امر کی بھی پروا نہیں ہے کہ تم اس کے ساتھ کیا کرو گے؟ بس مجھے جانے دو۔ مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

برٹن پاگلوں کی طرح کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے لات مار کر کرسی ایک طرف کھسکائی اور باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کے کاندھے غیر معمولی طور پر اُوپر اُٹھے ہوئے تھے اور اس کی گردن کا پچھلا حصہ سُرخ ہو رہا تھا۔ سارجنٹ ایڈ اور نوجوان وکیل نے پہلی مرتبہ برٹن کو لنگڑاتے ہوئے دیکھا۔

☆......☆

وارے کی عورت

محمد الیاس

ایک ایسی شعلہ بیاں تحریر جس میں برہنہ سچائیوں کے ساتھ زندگی نئی زندگی کو ترستی ہے۔ محمد الیاس کے سرجن قلم سے معاشرے کا آپریشن

دور کہیں سے مرغ کی پہلی بانگ سنائی دی تو بھاگ بھری کے دل میں یہ خیال آیا، نہ جانے رات کا پہلا پہر کب کا ڈھل چکا لیکن نیند اب بھی اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بستر پر کروٹیں بدل بدل کر اس کے سارے جوڑ بند دکھنے لگے تھے۔ سوچ سوچ کر اس کے دماغ کی چولیں ڈھیلی ہوگئی تھیں۔ اسے اپنے بچپن کے سارے دُکھ یاد آگئے۔ غربت کے عفریت نے اس کی چڑھتی جوانی کی اُمنگیں اور سارے شوق نگل لیے اور آنکھوں کے سہانے سپنے پتھرا گئے۔ وہ سوچتی، اس کی ماں نے نہ جانے اس کا نام بھاگ بھری کیا سوچ کر رکھا تھا۔ اس کا جی چاہتا کہ لوگ اسے حسب حال بھاگ سڑی یا لیکھ جلی کہہ کر پکاریں تو زیادہ مناسب ہو۔ جتنی عمر اس نے اب تک گزاری تھی، ہر آنے والے دن نے اس کے ارمانوں کا خون ہی کیا تھا۔ اپنی بے بسی پر اسے رہ رہ کر رونا آجاتا۔ یوں لگتا جیسے آج اس کی آنکھوں سے اُمڈے سیلاب میں اس کی مسمار ہستی ذرہ ذرہ بہہ جائے گی۔

جب سے اس نے ہوش سنبھالا، اپنے گھر میں بھوک، ننگ کا راج دیکھا، پیٹ بھر کھانا کبھی میسر ہوا جب گاؤں میں کوئی مرنا ہوگیا یا شادی بیاہ۔ ہر لمحے اس کے دل میں یہ خواہش انگڑائیاں لیتی رہتی کہ آس پاس کہیں کوئی بیاہ ہو، کسی کی منگنی ہی ہوجائے، کسی بڑے گھر کی لڑکی یا لڑکا کسی بڑے امتحان میں پاس ہو، کسی کا برسوں سے بچھڑا کوئی سجن پیارا اچانک گھر لوٹ آئے، کوئی خوشی منائے، ختم دلائے، نیاز بانٹے، کسی پیر فقیر کے نام کی دیگ دے یا کسی کی کوئی منت پوری ہوجائے۔ کوئی بڑا مرنا ہوتا کہ وہ خوب سیر ہوکر کھائے۔

جب اسے کچھ سُوجھ بُوجھ ہوگئی تو وہ خود ہی خاص خاص دنوں کا حساب رکھنے لگی۔ اسے گاؤں کے لڑکوں لڑکیوں کے منتھے ہوئے دنوں کا حساب زبانی یاد رہتا۔ وہ بڑے دنوں کا حساب بھی رکھنے لگی۔ اگر کبھی مغالطے کا شبہ ہوجاتا یا بے قراری بڑھ جاتی تو اپنی ماں سے خاص خاص دنوں کے مابین وقت کے فاصلوں کی طوالت کے بارے میں تسلسل سے تکرار کرنے لگتی۔ وہ زیادہ ضعیف عورتوں اور مردوں کو ذہن میں رکھتی اور اندازے لگاتی رہتی کہ اِن میں سے کون گور کنارے پہنچ گیا ہے اور کس کی صحت ابھی اچھی بھلی ہے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ اتنی سمجھ دار ہوگئی تھی کہ اسے اپنی سوچیں اور خواہشیں اپنی ذات تک محدود رکھنے کی اہمیت کا احساس ہوگیا تھا ورنہ جب وہ بہت چھوٹی تھی تو کسی ماتم پر اپنی خوشی کا اظہار برملا کردیا کرتی۔ داروں کا بابا مرا تو اس نے پرجوش ہوکر اپنی ہی دُھن میں گلی گلی شور مچایا تھا۔ وہ دو قدم دوڑتی، ایک پاؤں پر اچھلتی، ساتھ ہی اپنا دایاں بازو پوری لمبائی سے ہوا میں لہراتی اور بلند آواز میں نعرہ لگاتی۔ ”او بابا مر گیا...... میٹھے چاول کھائیں گے۔“ وہ تب چپ ہوئی جب اسے ایک طمانچہ پڑ گیا، تاہم وہ چاولوں کی پلیٹ میں اپنے آنسو ڈال کر کھا گئی اور مطمئن ہوگئی۔

ماتم والے گھر میں جب تک سوم نہ ہوجاتا، وہ وہاں سے نکلنے کا نام نہ لیتی۔ اس عمر میں اس کے سارے کھیل بھی ایسے ہی نرالے تھے۔ چودھری غلام محمد پٹواری کی بیوی زیادہ بیمار ہوگئی تو گاؤں کے واحد تانگے بان شفیع مصلی کے سے انداز میں فرضی گھوڑے کو پچکارتے ہوئے اس نے آواز لگائی۔ ”چلو، شہر چلو، اسپتال چلو، چلو اسپتال۔“ اسی شام مائی چودھرانی کو تانگے میں ڈال کر شہر کے اسپتال لے جانا پڑا۔

دوسری صبح اس نے گھر سے باہر گلی میں اپنی ننھی ننھی ہتھیلیوں سے مٹی اکٹھی کرکے قبر بنائی، اس پر پانی چھڑکا اور کسی پودے کی سبز ٹہنیاں پتوں سمیت سرہانے گاڑ دیں۔ دیگر بچوں کے ہم راہ دعا مانگی پھر اس کی ہدایت کے مطابق سارے بچے فرضی قبر کے قریب حلقہ بنا کر بیٹھ گئے اور جھوٹ موٹ کے ختم کی روٹی کھانے لگ گئے۔ وہ خود ہپ ہپ کرکے کھاتی رہی پھر آخر بناوٹی ڈکار لے کر بولی۔ ”شکر الحمدللہ۔“ ماں نے اسے ہاتھوں کا پیالہ بنا کر پیٹ پر مارا جس سے دھم دھم کی آواز تو پیدا ہوئی لیکن اس پر مار کا اثر خاک نہ ہوا۔

اسی روز مائی چودھرانی کی میت گاؤں پہنچ گئی۔ وہ تجہیز و تکفین کے تمام مراحل میں موجود رہی، جب لوگ قبر پر مٹی ڈال رہے تھے تو بے ساختہ بول پڑی۔ ”تھوڑی سی مٹی بچا رکھو، ایک بندہ اور آنے والا ہے۔“ کچھ لوگوں نے اسے جھڑک دیا جب کہ چند نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی۔

دوسری رات عشا کے وقت احمد دین گجر کو اس کے اتھرے بیل نے اپنے سینگ پر اس طرح اٹھایا کہ نوک ٹھوڑی کے نیچے سے کھبی اور تالو میں ترازو ہوگئی۔ چاچا احمد دین ہوا میں معلق ہوگیا۔

گاؤں کے لوگوں کے دلوں پر بھاگ بھری کی پیش گوئیوں کا اثر تھا یا ویسے ہی اُس کی کسمپرسی مدِ نظر رکھتے



ہوئے وہ اُسے اپنی خوشیوں اور غموں میں برابر شریک کرتے، بلکہ حصے سے بڑھ کر دیتے۔

جب وہ ذرا بڑی ہوئی تو اپنی گوناگوں خوبیوں کے باعث ہر گھر کی ضرورت بن گئی۔ وہ ہر کسی کے کام آتی۔ کوئی مرجاتا تو گلا پھاڑ کر روتی جیسے اس موت کے صدمے نے اس کا جگر چیر کے رکھ دیا ہو۔

اگر بیاہ ہوتا تو گھر والوں سے بڑھ کر خوشی مناتی۔ ساری ساری رات ڈھولک پر گیت گاتی اور ناچتی، گویا اس کے اپنے بھائی یا بہن کی شادی ہو۔ جس لڑکی کی منگنی ہوجاتی، وہ فوراً اس کی کسی نہ کسی چیز پر ہاتھ رکھ لیتی۔ جوتوں یا کپڑوں کا کوئی جوڑا، چوڑیاں، چھلا یا ناک کا کوکا۔ لڑکیاں اسے مایوس نہیں کرتی تھیں۔ وہ بھی کے لیے نیک تمنائیں دل میں رکھتی اور دعائیں کرتی۔ لوگ بھی اس سے دعا کی فرمائش کرتے۔ اس نے اپنے لیے کبھی دعا نہیں کی۔ شاید اسے یقین تھا کہ خود اس کے بھاگ کبھی نہیں جاگیں گے۔ وہ اپنی دعائیں اپنی ذات پر غارت نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اس کی زندگی میں جتنے دن اور راتیں، صبح اور شامیں یا سردیوں اور گرمیوں کی رُتیں آئیں، وہ اندھی، گونگی اور بہری تھیں۔ کسی بھی دن دہاڑے یا وقت ویلے نے اس کی جھولی میں سکھ کا کوئی ایک لمحہ نہ ڈالا۔ کبھی کسی اَن جانی خوشی نے اس کے گھر کی دہلیز پہ پاؤں نہ رکھا۔ کسی میٹھے سندیسے نے بھی کنڈی نہیں کھڑکائی، نہ ہی کسی بڑے دکھ یا غم نے بھی رات کے پچھلے پہر اُس کے ہاں نقب لگائی۔ بھوک کے سوا اُسے کوئی غم نہیں تھا لیکن بھوک سے بڑا کوئی اور عذاب ہوتا بھی نہیں۔

سردیوں کی راتیں تو اُس کے لیے اَزلوں کی تاریکیاں لے کر آتیں۔ گھڑی دو گھڑی دیا (دِیوا) جلتا بھی تو اس کی روشنی اتنی نحیف ہوتی کہ وہ سانس بھی آہستہ لیتی اور اگر اتفاق سے کپڑے کا پلو ذرا زور سے لہرا جاتا تو دِیا بجھ جاتا۔ آگ جلانے کے لیے کبھی بھی اُس کے گھر میں دیا سلائی نہیں ہوتی تھی۔ ایک جلتا سلگتا اُپلا راکھ میں دبا دیا جاتا، جب اُسے آگ جلانی ہوتی، اسے پھونکیں مار مار کر شعلہ پیدا کر لیتی۔ پھونکیں مار مار کر اسے یوں محسوس ہونے لگتا جیسے مغز کے بغیر خالی کھوکھا

اس کے کندھوں پر پڑا ڈول رہا ہو۔ کڑوا دھواں اس کی آنکھوں، نتھنوں اور حلق میں گھس جاتا۔ آنکھیں پانی میں ڈوبی لال بوٹیاں بن جاتیں۔ کھانس کھانس کر پسلیاں اپنی جگہ سے کھسک جاتیں۔

جس ایک کمرے میں وہ سوتی، اسی میں گھر کا کل اثاثہ پڑا ہوتا۔ صدقے خیرات میں ملی ہوئی کوئی مرغی یا بکری بھی اُس کے مقدر کا عذاب اسی کمرے میں جھیلتی۔ دونوں ماں بیٹی جھلنگا چارپائی میں اپنا آدھا آدھا دھڑ ایک دوسرے کے اُوپر یا نیچے دبا کر سوتیں۔ بوٹی بوٹی لحاف میں سے ٹھنڈک کے نیزے ان کے جسموں سے پار ہوتے رہتے۔ اس کی ماں رات بھر جوڑوں کے درد سے ہائے ہائے کرتی۔ باپ کھانستا رہتا اور اپنی چارپائی کے نیچے راکھ کی ڈھیری پر بلغم کے وار کر کے ادھ مُوا ہوجاتا۔ سرکنڈوں سے بنے کھڑک میں اتنی درزیں تھیں کہ اُنہیں پھٹی پرانی بوریوں اور کپڑوں کے چیتھڑوں سے بند کرنے کی پوری کوشش کی گئی تھی لیکن سرد ہوا یوں اندر گھسی چلی آتی جیسے کسی اور رُخ چلنے سے اس کے پاؤں جل جاتے ہوں۔ وہ تمام رات سورج طلوع ہونے کی دعائیں مانگتے۔

ان کی زندگیاں دعاؤں اور التجاؤں کے سہارے بسر ہو رہی تھیں۔ سردیوں میں وہ گرمیوں کے لیے اور گرمیوں میں سردیوں کے لیے ترستے رہتے۔ وقت پر بارشیں نہ ہوتیں تو فاقوں کے خوف سے لرز جاتے اور بارانِ رحمت کے لیے گڑگڑا کر دعائیں مانگتے۔ وہ سوچتے کہ سوکا پڑ گیا اور فصلیں نہ ہوئیں تو مسکین مرجائیں گے۔ لوگوں کا اپنا ہی گھر پورا نہ ہو تو وہ کسی کو کیا دیں گے؟ بھاگ بھری اٹھتے بیٹھتے گنگناتی۔ ''تر پا سوہنیاں مینہ وسا، سَیاں دی کوٹھی دانے پا۔'' اُس نے بھی بھول کر بھی اپنی کوٹھی دانے ڈالنے کے لیے خدا سے دعا نہیں کی۔ کوٹھی تھی ہی نہیں تو خدا دانے کہاں ڈالتا۔ جھڑی لگ جاتی، ان کی چھت جابجا ٹپکنے لگتی، گھر کے سارے برتن ٹپکتی چھت کے نیچے بکھیر دیے جاتے، کچا فرش کیچڑ بن جاتا تو ماں اسے جی بھر کے کوسنے دیتی۔ ''کالی جیبھ والی کتی، اٹھتے بیٹھتے بھونکتی تھی، اور مانگ بارش رب سے۔'' جیسے موسمی تبدیلیوں کا انحصار اس کی دعاؤں کی قبولیت پر ہو۔ جب

آل انڈیا مسلم لیگ

30 دسمبر 1906ء کو نواب سر سلیم اللہ خان کی دعوت پر نواب وقار الملک کی صدارت میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ڈھاکہ میں منعقد ہوا۔ جس میں ہندوستان بھر کے مسلمان رہنما شریک ہوئے ان میں نواب سلیم اللہ کے علاوہ حکیم اجمل خاں، سر محمد شفیع، شاہ دین ہمایوں، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا محمد علی جوہر شامل تھے۔ اس اجلاس میں متفقہ طور پر ایک ایسی جماعت کی تشکیل کا فیصلہ کیا گیا جو مسلمانانِ ہند کے حقوق کی حفاظت کرے اور انہیں منوانے کی کوشش کرے۔ سر محمد شفیع نے اس جماعت کا نام آل انڈیا مسلم لیگ تجویز کیا جس کی تائید حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خاں نے کی، یوں مسلمانانِ برصغیر کی نمائندہ جماعت آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آ گیا۔

ان کے کوٹھے کی دیواروں پر سے لیپ اُترنے لگتے اور مٹی کھلنے لگتی تو وہ استغفار پڑھنے لگتے۔ سچے دل سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے اور ہاتھ جوڑ کر مطلع صاف ہونے کی دعائیں کرنے لگتے۔

موسم گرما ان پر اور طرح کا عذاب نازل کرتا۔ دن کو جھلسا دیتی اور راتوں کو پسینے اور حبس سے بدن گلنے لگتے۔ مچھر زمانے بھر کا غیظ و غضب اکٹھا کر کے ان پر حملہ آور ہوتے۔ رات بھر وہ پلک پلک سوتے اور جاگتے۔ جب مچھر تھک ہار کر خود کہیں ستانے چلے جاتے تو ان کی آنکھ لگ جاتی۔ دن چڑھے سایوں کے ساتھ ساتھ چارپائیاں گھسیٹتے، پناہیں تلاش کرتے رہتے۔ وہ ایک دوسرے سے کہتے کہ اس عذاب سے تو سردیاں ہی اچھی تھیں۔ وہ پھر خدا سے موسم کی تبدیلی کے لیے دعا کرنے لگتے۔ اس کی ماں کہتی۔ ''خدا ہماری کون کون سی سنے، ہم نے تو ہر وقت اپنے منہ بھاڑ کی طرح کھول رکھے ہوتے ہیں۔''

نبی محمد جتنا بدشکل تھا، اتنا ہی میلا اور پرلے درجے کا کنجوس بھی تھا۔ زیادہ تر ننگے پنڈے رہتا۔ صرف ایک میلے تہبند کے ساتھ، وہ بھی اتنا گندہ، جیسے بھینس نے جگالی کرتے ہوئے منہ سے اُگلا ہو۔ پاؤں کی ایڑیاں گوبر سے بھری رہتیں، کھنگر کے مانند، جن میں اتنی بڑی بڑی جوف کہ انگلیوں کی پوریں گھس جائیں۔ داڑھی بڑھی ہوئی، آنکھوں کے گوشوں میں سُوکھی ہوئی چیپڑ کے کھرنڈ، دانت ایسے پیلے جیسے یخ بستہ سالن پر جمی ہوئی تری کی موٹی تہہ، ذرا نزدیک ہونے پر گوبر اور باسی لسی کی کھٹی باس آتی اور ہنستا تو سانس کے ساتھ بدبو کا بھبکا اُٹھتا۔ چاروں بھینسوں اور ایک بوڑھی گائے کا قطرہ قطرہ دودھ شہر لے جا کر بیچ آتا۔ کوئی کھانے والا بھی نہیں تھا لیکن پیسہ جوڑنے کا ایسا جنون اس پر سوار تھا کہ گاؤں کے سارے لوگ لعنتیں بھیجتے۔ غلام محمد پٹواری کا دور پار سے رشتے میں نواسا لگتا تھا۔

سردیوں کی ایک اندھی گونگی اور بہری رات کا آغاز ہوا ہی تھا کہ آٹھ دس عورتیں اور لڑکیاں اس کے گھر پہنچیں۔ رابعہ گجری اپنے گھر سے بڑی سی لالٹین جلا کر لے آئی۔ بھاگ بھری نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، اپنے گھر میں اتنی روشنی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ سیّدوں کی ثمر بتول نے اسے اپنا نیا جوڑا پہنایا اور ہار سنگھار کیا۔ چودھری غلام محمد کے گھرانے سے آلو گوشت اور روٹیاں

آ ئیں۔ تھوڑی دیر ڈھولک بجی اور اسے بخی کے ساتھ رخصت کردیا گیا۔

دوسری صبح اس نے دیکھا کہ بخی کی چوچڑ گائے اس کی اماں کے صحن میں بندھی بین کررہی ہے۔ اس کے سینے پر ایک گھونسا پڑا، پھر وہ خود ہی مطمئن ہوگئی، اس خیال سے کہ گائے قصائی بھی خریدے تو روپے ادا کرے گا، وہ کس کام کی تھی۔ شکر ہے، اس کا باپ بھی ایک دودھیل والا ہوا۔ دونوں چائے کے لیے ترستے رہتے تھے، اب گڑ اور پتی مل جائے تو بھلے تین وقت چائے پیتے رہیں۔ جس گھر میں دو اڑھائی کلو دودھ روزانہ ہوا کرے گا وہاں بن چراغ جلے لَو ہو جایا کرے گی۔ پھر وہ سوچنے لگی کہ وہ خود جس کی گھر والی بنی ہے، خواہ جتنا بھی کنجوس ہے، روٹی تو پیٹ بھر دے گا۔ اب اسے سردیوں میں منہ اندھیرے اُٹھ کر شلجم مولیاں کھانے کے لیے پالے سے ڈھکی پگ ڈنڈیوں پر ننگے پاؤں نہیں چلنا ہوگا اور گرمیوں میں بیر یا سوڑے چننے کی حاجت نہیں رہے گی۔

بخی صرف اتنا کنجوس نہیں تھا، جتنا مشہور تھا۔ وہ اس قدر کنجوس تھا کہ گوبر سے اناج کے دانے ہونٹوں سے چننے میں بھی شرم محسوس نہ کرتا۔ اُپلے بھی گن گن کر شہر لے جاتا اور ایک ایک پیسہ کہیں چھپا آتا۔ بیوی کو کوئی شوق اس نے پورا نہیں کیا۔ جب وہ آٹا گوندھنے بیٹھتی تو سر پہ کھڑا ہوتا اور کہتا کہ وہ صرف اپنے لیے دو روٹیوں کا آٹا گوندھ لے، اسے آج بھوک نہیں ہے۔ وہ ڈھیٹوں کی طرح دو کے بجائے تین روٹیوں کا آٹا ڈال لیتی۔ کھانے بیٹھتی تو بخی شریک ہو جاتا اور بولتا۔ ”بھوک تو نہیں، ایسے ہی تجھے دیکھ کر دل کر آیا ہے، دو نوالے میں بھی کھالوں۔“ دو نوالوں کے بجائے وہ دو روٹیاں کھا جاتا۔ بھاگ بھری خون کے گھونٹ پی کر گزارا کرلیتی۔ سالن بخی نے شاید ہی کبھی پکانے دیا ہو۔ کبھی ایک گھر سے سالن کا پیالہ تو دوسرے سے اچار لانے بھی اُسی کو بھیجتا۔

اُسے ٹوکروں کے حساب سے گوبر سمیٹنا اور تھاپنا پڑتا۔ سردیوں میں بھینسیں ہرا چارا کھاتیں تو ایسے گوبر کرتیں جیسے جلاب لگے ہوئے ہوں۔ رات بھر چھل چھل پیشاب بہتا۔ جس چھپر میں وہ بندھی رہتیں وہاں گوبر اور پیشاب کے آمیزے کی برف جیسی ٹھنڈی چھپڑیاں لگ جاتیں۔ اس کے ہاتھ نیلے ہو جاتے۔ وہ دل میں دعائیں کرتی کہ خدا کرے کوئی ترسا گیر جلد ادھر کا رُخ کرے۔

بھاگ بھری کے مقدر میں لکھی بھوک ایک چڑیل کی طرح اس سے چمٹی رہی۔ وہ رو رو کر خدا سے فریاد کرتی۔ ”ربا! تو نے مجھے دنیا میں لاکر کیا سنوار لیا؟ کون سے تیرے کام تھے جو میرے بن ادھورے رہ گئے ہوتے؟“

تین سال روتے پیٹتے گزر گئے تو بخی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ اس نے گاؤں کے لوگ اکٹھے کرلیے اور دہائی دی کہ یہ عورت اسے لوٹ کر کھا گئی ہے۔ جب وہ شہر چلا جاتا ہے تو پراٹھے بنا کر کھاتی ہے اور دودھ پی کر پانی بھی ملا دیتی ہے۔ اب اسے اس عورت سے اولاد کی آس بھی نہیں رہی۔ بن پھل پھول بھی کوئی رُکھ (درخت) کسی کام کا ہوا ہے؟ آک کو بھی ڈوڈیاں لگتی ہیں۔ اُس نے مزید کہا۔ ”اگر یہ کچھ عرصے اور میرے گھر میں رہ گئی تو مجھے اُجاڑ کر رکھ دے گی۔ یارو! کچھ تو انصاف کرو، اس کے باپ سے کہو کہ اسے لے جائے اور میری گائے مجھے لوٹا دے۔“

بخی کو پھوپیوں اور ماسیوں نے اسے دو ہتھڑوں سے مارا پیٹا اور کوسنے دیے لیکن وہ بولتا گیا۔ ”طلاق، طلاق، طلاق۔“ اس کی برادری کے نوجوانوں نے اسے زمین پر گرا کر گھونسے اور ٹھڈے مارے مگر وہ بولتا رہا۔ ”طلاق بے اوئے پنڈ والو۔ تین طلاق...... سَو طلاق اکٹھی میری طرف سے۔ اسے آج سے میری ماں بہن سمجھو، یہ بانجھ میرے وارے میں نہیں۔“

تین چار ماہ بعد چودھری غلام محمد پٹواری اپنے بھکر والے مربعوں سے آیا تو اس نے بھی بخی کو دو تین تھپڑ مارے اور صلواتیں سنائیں۔ اس کی عمر پینسٹھ سال ہوگی۔ رکھ رکھاؤ اور چھب ڈھب سے پچاس پچپن کا لگتا۔ اچکن، شلوار، زری کا کھسا اور سنہرے کلے پر اُونچے طرے والی کلف لگی پگڑی کے ساتھ خوب جچتا۔ سال میں ایک آدھ بار اولاد سے ملنے گاؤں آتا۔

اس مرتبہ وہ دو ہفتے رہ کر واپس گیا۔ تیسرے روز بھاگ بھری کو اس کی اماں اور ابا ساتھ لے کر منہ اندھیرے گھر سے نکل گئے۔ تمام دن سفر کرکے شام کو چودھری غلام محمد کے ڈیرے پر پہنچے، اُن کی خوب خاطر مدارت ہوئی۔ رات ماں نے بیٹی کو سینے سے لگایا تو ایسے پھوٹ پھوٹ کر روئی جیسے زمین کا کلیجا اُچھل کر باہر آنے لگا ہو۔ باپ بھی خود پہ قابو نہ رکھ سکا۔ آنکھوں پہ پگڑی کا پلو رکھ کر یوں لرزنے لگا گویا زلزلوں کی زد پہ ہو۔ ”میرے جیسا کھوٹے مقدروں والا باپ شاید دنیا میں کبھی نہ ہو۔“

چودھری غلام محمد سے اُس کا نکاح ہوا تو وہ دھک سے رہ گئی۔ جس شخص کو کبھی وہ دادا دادا کہہ کر پکارتی تھی، اب اسے کس رشتے سے بلائے گی؟ ماں باپ رخصت ہوگئے تو وہ کسی سوچ اور احساس کے بغیر کسی بُت کے مانند کھڑی رہ گئی۔

یہاں اُسے کرنے کو رتی بھر کام بھی نہیں تھا۔ کھیت میں مزدوروں کی عورتیں ہر کام کرتیں۔ وہ ٹیوب ویل پہ، کھیتوں میں اور باغ کے اندر چُپ چاپ گھومتی رہتی۔ کبھی ٹہلتی ٹہلتی ڈیرے سے ذرا زیادہ دُور نکل جاتی تو ماسی فیروزاں اسے باتوں میں لگا کر واپس لے آتی۔ اسے سمجھ تھی کہ سارے کامے اس پر نگاہ رکھتے ہیں۔ وہ دھیرے سے بولتی۔ ”ماسی تو چنتا نہ کیا کر، میں نے کہاں جانا ہے؟“

ماسی اُس کا سر چوم کر کہتی۔ ”نی بھولی! ماسی جند گھولی، میں تو اس لیے کہتی ہوں کہ چودھرانی تھک نہ جائے۔“ وہ یہاں سچ مچ کی چودھرانی تھی۔ اتنے شان دار لباس، زیور اور قیمتی جوتیوں کے جوڑے اُسے ملے کہ وہ کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ ہر روز مرغ پلاؤ اور حلوہ پکتا، ڈھیروں پھل آتے، وہ حیران ہو جاتی اور سوچتی کہ یہ کوئی پٹواری ہے یا کوہِ قاف کا جن جو اتنی ڈھیر ساری چیزیں نہ جانے کہاں سے اُٹھا لاتا ہے۔

ابھی اُسے یہاں آئے اڑھائی ماہ کا عرصہ ہوا ہوگا۔ آج صبح صبح اس کی طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ چودھری نے فوراً جیپ بھجوا کر لیڈی ڈاکٹر کو بلوالیا۔ ڈاکٹر نے اچھی طرح اُس کا معائنہ کرلیا تو اُسے ہدایت کی کہ وہ احتیاط کرے، خوش رہا کرے، اپنا خاص خیال رکھے کیوں کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ پہلے تو کچھ دیر لیڈی ڈاکٹر کی باتیں اُس کے پلے ہی نہ پڑیں، جب کچھ سمجھی تو اُسے یقین نہ آیا کہ جو کچھ وہ کہہ رہی ہے، حقیقت ہے یا خواب، لیکن ڈاکٹر نے پھر یقین دہانی کرائی تو اُسے ایسا لگا جیسے صدیوں پہ محیط برف زاروں کے ایک یخ بستہ سفر میں بھٹکا ہوا عرصے سے بھوکا مسافر اچانک منزل پہ جا پہنچے، جہاں آگ کا الاؤ روشن ہو۔ وہ اس کی حیات افروز حرارت میں نرم دبیز بستر پہ کورا لحاف اوڑھ کر بیٹھ جائے اور گرم گرم میٹھا دودھ چسکیوں سے پینے لگے۔ زندگی کی رو اُس کی منجمد رگوں میں دوڑ جائے اور اس کے دل میں لگے زخموں کو انگور ہونے لگے۔ وہ خود سے کہنے لگی۔ ”بھاگ بھری! تُو تو سچ مچ بھاگوں بھری ہے۔“

پھر وہ سوچنے لگی کہ اُس کے وجود میں جو ننھی جان پَل رہی ہے، وہ کیسی ہوگی؟ لڑکی یا لڑکا؟ اس سے کیا فرق پڑتا ہے، وہ میری جند جان ہے، دل کا ٹکڑا۔ خدا کرے اس کا مقدر اچھا ہو۔ وہ طمانیت کے ایک کامل احساس سے نہال ہوگئی اور خود سے کہنے لگی۔ ”وہ خوب صورت مکھڑا کوئی ایرا غیرا نہیں، چودھری غلام محمد پٹواری کی اولاد ہے۔ مربعوں کی وارث۔“

شام چودھری گھر لوٹا تو حسبِ معمول اُس نے میلی اچکن اُتار کر کھونٹی سے لٹکائی۔ اُس کی قمیص کے بٹن کھلے تو بھاگ بھری کو آج اُس کے سینے سے جھانکتے سفید چاندی بال بہت اچھے لگے لیکن چودھری چُپ چُپ تھا۔ چند لمحوں بعد اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ”بھاگ بھری! میں آج بہت پریشان ہوں۔ میرے تو پہلے ہی چھ بیٹے، پانچ بیٹیاں، پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں ہیں۔ دراصل میرا یہ خیال تھا کہ تم سے ایسا نہیں ہوگا۔ میرے بیٹے، تمہاری اور میری بوٹیاں کردیں گے۔ میں نے لیڈی ڈاکٹر سے معاملہ طے کرلیا ہے۔ آج ہی ہم اس سے جان چھڑا لیں۔“

بھاگ بھری لرز گئی اور پھر یوں تن کر کھڑی ہوگئی جیسے کسی پہاڑ سے ٹکرا جائے گی۔ چودھری نے اُسے دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ تاہم وہ قدرے توقف سے بولا۔ ”ٹھیک ہے، اگر میری تجویز قبول نہیں تو مجھ سے طلاق لے لو۔ میں تمہارے بچے کو اپنی اولاد تسلیم نہیں کروں گا۔ یہ کسی بھی طرح میرے وارے میں نہیں۔“

☆☆......☆☆

تیسرا شعلہ

نفسِ امّارہ

علی عباس حسینی

تاریخ کے جھروکوں سے، ایک خاص شعلہ جوالا تحریر

شیخ علیم نمازِ عشاء سے فارغ ہو کر فرش پر بچھے ہوئے ایرانی قالین پر لیٹا بو علی سینا کے ''قانون'' کا مطالعہ کر رہا تھا۔ سرہانے سلطان کا عطا کردہ تین شمعوں والا گنگا جمنی شمع دان روشن تھا۔ شمعوں کی روشنی اس کے چہرے اور سینے کے گرد ہالہ سا بنا رہی تھی۔ اس کے سر کے چھوٹے بال ایک گول سیاہ مخمل ٹوپی نے چھپا رکھے تھے۔ اس کی چوڑی پیشانی چمک رہی تھی۔ اس کی پتلی لمبی ناک کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں نیم وا سی تھیں۔ جیسے وہ شیخ الرئیس کے کسی خاص نظریے سے پُرزور اتفاق یا اختلاف رکھتا ہے اور اپنی رائے کی موافقت میں دلیلیں تلاش کر رہا ہے۔ اس کے پتلے ہونٹ پر کبھی کبھی ایک ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ جاتی اور اس کا ایک ہاتھ گردن چھپائے ہوئے کھچڑی داڑھی کے بال سلجھانے لگتا تھا۔ اس نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی اور قالین پر کہنیاں ٹیک کر اُٹھنے کا قصد کیا ہی تھا کہ دروازہ آہستہ سے کھلا اور اس کے ملازم موسیٰ نے اندر داخل ہو کر اطلاع دی۔ شہر کے تاجروں کا ایک وفد آیا ہے جو شیخ سے اسی وقت ملنا چاہتا ہے، شیخ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا ''کوئی ایسا ضروری کام ہی ہوگا جو یہ لوگ اتنی رات گئے آئے ہیں۔ اُنہیں اندر بلا لو۔''

وفد پانچ اراکین پر مشتمل تھا۔ وہ اندر آئے، شیخ نے سروقد تعظیم کی، ہر ایک سے مصافحہ کیا اور اُنہیں اپنے پاس بٹھا کر ملازم کو قہوہ اور میوے لانے کا حکم دیا۔ ملازم جب دروازہ بند کر کے باہر جا چکا تو اس نے پوچھا۔ ''آپ حضرات نے کیسے زحمت کی؟''

وفد کے ایک رُکن نے جو جسامت اور لباس دونوں کے لحاظ سے وفد کا قائد معلوم ہوتا تھا، اِدھر اُدھر سہمی ہوئی نظر ڈالی ''جی ہم آپ کے پاس فریاد لے کر آئے ہیں مگر ڈرتے ہیں کہ......''

شیخ نے کہا۔ ''آپ اطمینان سے اپنا مقصد بیان کریں۔ میرا غلام میرا معتمد ہے، اس کمرے کی گفتگو کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی!''

دوسرے نمائندے نے پہلے کی بات دُہرائی ''جی اب ہم آپس میں بھی گفتگو کرتے ڈرنے لگے ہیں۔ اسی کی تو فریاد لے کر آئے ہیں!''

شیخ نے کہا۔ ''تو ایسی فریاد کا سننے والا تو صرف خدا ہے، یا کسی حد تک ملک کا بادشاہ''

تیسرے نے عرض کیا۔ ''بادشاہ تک اپنی فریاد پہنچانے ہی کی غرض سے تو ہم آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں۔''

شیخ نے سر ہلا کر کہا۔ ''جی اس کے لیے حکومت کی طرف سے افسر مقرر ہیں۔ پرچہ نویس، عرائض نویس، منشی، صدی، وزراء۔''

چوتھے نے جلدی سے کہا۔ ''قبلہ انہی افسروں کے مظالم کے خلاف تو فریاد ہے۔ وہ بھلا اپنے ظلم و ستم کی داستان بادشاہ کے کانوں تک کیوں پہنچنے دیں گے؟''

شیخ کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اس کی آواز میں جھنجلاہٹ کی جھنکار سی پیدا ہوگئی۔ ''جی، بادشاہ کی اتالیقی کا مجھے دس برس شرف حاصل رہا ہے، میں اُس کے مزاج اور طبیعت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ بڑا کریم النفس اور رعیت پرور ہے، وہ یقیناً اپنے عاملوں کے کرتوتوں سے بے خبر نہ ہوگا!''

پانچویں نے دست بستہ التماس کیا۔ ''وہ اگر باخبر ہے تو ظلم پرستی کرتا ہے اور اگر بے خبر ہے تو اسے ہوشیار کرنا آپ کا فرض ہے۔''

شیخ نے قدرے خشک لہجے میں کہا۔ ''جی میں اپنی ذمے داریاں اچھی طرح سمجھتا ہوں، مگر مجھے اپنے بادشاہ سے تعجب ضرور ہے کہ وہ دو برس کے اندر ساری تعلیمات بھول کر اپنے فرائض سے غافل ہوگیا!''

پہلے نے ہنس کر کہا۔ ''جی ظلِ اللہ جوان بھی تو ہیں اور جوانی دیوانی آپ نے سُنا ہی ہے'' اور وہ کھی کھی کر کے اس طرح ہنسا کہ اس کی توند ہلنے لگی۔



دوسرے نے خالی لمحے بیکار نہ جانے دیے۔ وہ بولا۔ ”وہ اس وقت بادشاہ نہیں، عاشق ہیں، ہمہ تن فرہاد و مجنوں!“ اور اس نے اپنی پھیکی ہنسی بھی پہلے قہقہوں میں شریک کردی۔

شیخ نے بھی مسکرا کر پوچھا۔ ”اور لیلیٰ کون ہے؟“

تیسرا بولا۔ ”حکومت کے راز بادشاہ ہی جانے، لیکن اُڑتی ہوئی خبر ہے۔“

چوتھے نے بات کاٹی۔ ”اُڑتی ہوئی کیوں؟ مصدّق کہیے مصدّق!“

شیخ نے کہا۔ ”ہاں تو وہ آپ کی مصدّق اطلاع کیا ہے؟ کس شیریں نے ہمارے اس خسرو کو اپنا اس درجہ والہ شیدا بنا رکھا ہے کہ وہ منصبی فرائض بھول گیا؟“

پہلے نے قیامت کا حق ادا کیا۔ جواب میں سبقت کی۔ ”سُنا ہے قاف کی رہنے والی کوئی کنیز ہے، گلگونہ نام......“ وہ دم لینے کے لیے ذرا رُکا تو دوسرے نے بات کا سلسلہ نہ ٹوٹنے دیا۔ ”خوب صورتی میں چاند سورج کو ماند کرتی ہے۔“

تیسرے نے جھوم کر اضافہ کیا۔ ”عورتیں کہتی ہیں، نور کا گلا پایا ہے، حضرتِ داؤدؑ کی خوش نوائی کی داستان کانوں کان سُنی تھی، اس کی خوش گوئی اپنے کانوں سنی......“

چوتھے نے ٹکڑا لگایا۔ ”بلبلِ ہزار داستاں کی طرح آواز میں شیرینی ہے......“

پانچویں نے اپنی دانست میں نئی تشبیہ پیش کی۔ ”اور دلوں میں گونجنے والی کوئل جیسی لے۔“

پہلے نے سانس برابر کرلی تھی، اس لیے غزل تمام کرنے کی کوشش کی۔ ”اور پپیہے جیسی، بادشاہ کو اپنی آغوش میں بلانے والی تانیں!“

دوسرے کا جی نہ بھرا، اس نے دوغزلہ چھیڑ دیا۔ ”اور سُنا ہے کہ وہ تلواروں کی دھار پر ناچتی ہے!......“

تیسرے نے مصرع لگایا۔ ”جی نہیں، وہ سلطان کے دل کے تار پر رقص کرتی ہے۔“

چوتھے نے دوسرے شعر کا آغاز کیا۔ ”اور ہمارا بادشاہ اس گل کے گرد بھونرے کی طرح گھومتا ہے، اس کے اشاروں پر ناچتا ہے......“

پانچویں نے غزل سرائی ختم کرنا چاہی۔ ”اور اسی کے گلستانِ آغوش میں کھو جاتا ہے۔“

لیکن قائد نے مقطع والی بات کہہ کر نظم یوں تمام کی۔ ”سلطان اسی گلگونہ کی نرم و نازک باہوں پر تکیہ کیے حکومت اور رعیّت سے غافل رات دن سوتا رہتا ہے! اس کے ہاں ہر وقت بہار ہی بہار ہے اور ملک میں خزاں ہی خزاں!“

شیخ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے تالی بجائی ملازم دو خوانوں میں خشک و تازہ میوے اور قہوہ لا کر رکھ گیا۔ جب مہمانوں کی ضیافت سے فراغت ہوئی تو شیخ نے کھڑے ہو کر کہا۔ ”اب آپ حضرات تشریف لے جائیں۔ میں شب میں خُدا سے اپنی ہدایت کی دعا کروں گا، ممکن ہے کہ سب کا فریاد رس یہ گتھی سلجھانے کا کوئی طریقہ مجھے سمجھا دے!“

وفد کے جانے کے بعد شیخ نے تھوڑی دیر آرام کیا، پھر نماز تہجد میں مشغول رہا۔ صبح وہ نماز اور مقررہ وظائف سے جلدی فراغت کر کے اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنا درباری لباس پہن کر محل سرا میں حاضر ہوا۔ پہرے کے سپاہی دربان و حاجب بھی اسے پہچانتے تھے۔ وہ بادشاہ کا اُستاد تھا۔ اس کے آنے کی اطلاع نیم بیدار بادشاہ تک فوراً پہنچائی گئی۔ سُلطان نے دو برس بعد اُستاد کے اچانک تشریف لانے کی جو خبر پائی تو گھبرا گیا۔ اس نے نہ غسل کیا، نہ لباسِ فاخرہ پہنا، بس شب خوابی کے کپڑوں پر ایک مخملی لبادہ ڈال کر نکل آیا۔ اس نے شیخ کا سلام اس سے بھی زیادہ جھک کر قبول کیا اور اس کے ہاتھ لے کر آنکھوں سے لگائے اور اُنھیں بوسہ دیا۔ شیخ نے اس کی سعادت کو سراہا۔ ترقی اقبال و سلطنت و عمر کی دعائیں دیں اور خاموش ہو رہا۔ سُلطان نے گھبرا کر پوچھا۔ ”قبلۂ عالم نے اتنے سویرے کیسے زحمت کی؟“

شیخ نے مسکرا کر کہا۔ ”آج میں اپنے سُلطان سے اپنا حقِ اُستادی مانگنے آیا ہوں!“

بادشاہ نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سَر جھکا کر کہا۔ ”میں دل و جان سے حاضر ہوں، میری پوری سلطنت حاضر ہے، اس لیے کہ آپ نے مجھے وہ دولتِ علم عطا کی ہے جس کی قیمت دُنیا کی بڑی سے بڑی سلطنت بھی ادا نہیں کر سکتی!“

شیخ نے مسکرا کر کہا۔ ”نہیں، سلطنت آپ کو مبارک! آپ کے لیے بنی ہے اور آپ اس کے لیے، مجھے تو ایک رفیقۂ حیات چاہیے۔ میری حیات کی ایک شریک۔ میں نے پورا شباب آپ کی خدمت اور تعلیم میں صَرف کر دیا، مگر اب جب کہ وہ کام انجام پا چکا ہے تو مجھے تنہائی محسوس ہوتی ہے......“

سلطان نے کہا۔ ”تو اس مملکت کی جس شہزادی، امیر زادی کو آپ پسند فرمائیں......“

شیخ نے ہاتھ کے اشارے سے شاگرد کو روکا۔ ”نہیں، مجھے تو ظلِ اللہ کی محل سرا سے صرف ایک کنیز چاہیے!“

بادشاہ نے جوش سے کہا۔ ”حرم سرا میں ایک ہزار سے زائد کنیزیں موجود ہیں۔ آپ جسے پسند فرمائیں، وہ حاضر کی جائے!“

شیخ نے سلطان کو بہ نظرِ تشکّر دیکھ کر کہا۔ ”مجھے بادشاہ سے یہی اُمید تھی! حکم دے دیا جائے کہ گلگونہ میرے ساتھ کر دی جائے!“

بادشاہ نے استعجاب اور اضطراب سے پوچھا۔ ”گل؟ گل...... گونہ؟“ آواز حلق سے پھنسی پھنسی سی نکلی۔

شیخ نے ایک انجان کی سی سادگی سے کہا۔ ”جی ہاں، سُنا ہے کہ وہ موسیقی کی ماہر ہے، مجھے بھی تو سماع سے شوق ہے!“

بادشاہ نے دوبارہ کانپتے ہونٹوں پر زبان پھرائی، پیشانی سے پسینہ پونچھا اور گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ”بہت خوب“

شیخ نے پھر دعائیں دیں اور کہا۔ ”تو پھر حکم صادر فرما دیا جائے۔“

بادشاہ نے تالی بجائی۔ حبشی غلام حاضر ہوا۔ اس نے حکم دیا۔ ”گلگونہ کو میں نے آج سے اُستادِ محترم کی کنیزی میں دے دیا۔ اسے عزت و احترام سے آپ کے دولت کدے پر پہنچا دو۔“ غلام سلام کر کے پیچھے ہٹنے لگا تو سلطان نے کہا۔ ”اور دیکھو، اس کے محل کا سارا سامان بھی اونٹوں، خچروں، ٹھیلوں پر لاد کر وہیں پہنچا دینا۔“

شیخ نے کہا۔ ”میں ظلِ اللہ کی اجازت سے حکم کے اس آخری جزو میں ترمیم کا طالب ہوں، گلگونہ کا سارا سامان صدر الصدور کی خدمت میں ارسال کر دیا جائے تاکہ وہ بیواؤں اور یتیموں میں تقسیم کر دیا جائے!“

بادشاہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھے اس پر فخر ہے کہ مجھے اخلاق کی تعلیم آپ جیسے مردِ سخی نے دی ہے!“

شیخ نے سینے پر ہاتھ رکھ کر اور سَر جُھکا کر بادشاہ کا شکریہ ادا کیا۔ سُلطان نے درد سے مسکرا کر پوچھا۔ ”لیکن اس کے رقص و نغمہ کے ساز و سامان؟“

شیخ نے کہا۔ ”ظلِ اللہ ان کی بھی ضرورت نہیں! اب گلگونہ نئے ساز پر گائے گی!“

حبشی کے جاتے ہی شیخ نے زحمت دہی کی معافی چاہی اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سلطان نے اُستاد کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر پوچھا۔ ”کوئی اور خدمت؟“

وہ بولا ”نہیں، مجھے میرا حق مل گیا!“

نوجوان بادشاہ نے گلگونہ کو تو دے ڈالا مگر اس کی جان پر بن گئی۔ اس کے دل میں غموں کا جوار بھاٹا اُٹھ رہا تھا۔ چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ ہاتھ پاؤں بے قابو ہو رہے تھے۔ وہ شیخ کے سامنے سیدھا کھڑا تو ہو گیا مگر سارے جسم سے کانپنے لگا۔ شیخ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”میرے بیٹے مجنوں و فرہاد بننا آسان ہے مگر بادشاہ بننا بہت مشکل ہے! اس کے لیے ایک کی جگہ کروڑوں سے محبت کرنا ضروری ہے!“ اور وہ متانت سے قدم رکھتا ہوا باہر نکل گیا اور نوجوان بادشاہ لبِ فرش تک اُستاد کو پہنچا کر پلٹا اور مسند پر جھوم کر گرا اور سسکنے لگا۔

☆......☆

شیخ کو گھر پر ایک بھری ہوئی شیرنی سے مقابلہ کرنا پڑا۔ وہ اپنی بوٹیاں نوچ رہی تھی اور شیخ کے ملازموں پہ بجلیاں گرا رہی تھی، وہ بادشاہ کی محبوبہ تھی، وہ محل کی رانی تھی، اس کے ابرو کے اشاروں پر سلطنت کا نظم و نسق درہم برہم ہو جاتا تھا۔ اس کے زبان ہلانے پر بے قصوروں کو پھانسی دی جاتی تھی اور مجرموں کا خون معاف کیا جاتا تھا۔ اس کی خوشی کے لیے جاگیریں عطا ہوتیں، اس کی چتون پر بل آتے ہی خاندانی اُمراء خانماں برباد کر دیے جاتے تھے۔ وہ جدھر جاتی، نظریں بچھائی جاتیں۔ کنیزیں آگے پیچھے دوڑتیں، شہزادیاں مجرے کے لیے کھڑی رہتیں اور آج وہ اپنے سجے سجائے محل سے اُٹھا کر مویشی کی طرح اس مختصر سادہ کمرے یا باڑے میں پہنچا دی گئی تھی، نہ یہاں جھاڑ فانوس تھے، نہ قاقم و سنجاب کے پردے، نہ جواہر جڑے ہوئے ظروف، نہ سونے کی پلنگڑی، نہ حریر و دیبا کے گدّے، غیر منقّش چھت، بے

تصویر کی ننگی دیواریں، ناہموار فرش پر موٹی سی چٹائی، بس ایک کونے میں ایک ایرانی قالین، گلگونہ کو اس کی ایک ایک چیز کاٹے کھاتی تھی، اس لیے اور بھی کہ وہ کنیز تھی، ایک غریب کسان کی لڑکی جس کے گھر میں اتنا سامان بھی نہیں تھا جتنا اس سادگی میں یہاں موجود تھا۔ وہ قزاقوں کے ہاتھ گرفتار ہوکر بازار میں بیچی گئی۔ سلطان کے سامنے پیش کرنے کے لیے اسے موسیقی اور رقص کی تعلیم دی گئی اور اپنی خوش گلوئی اور خوش ادائی کی بدولت وہ شاہی گردن کا ہار بنی۔ اس کا غصہ اور اس کی جھلاہٹ اس لیے رہ رہ کر بھڑک اُٹھتی کہ وہ جو ابتدا بھول چکی تھی، شیخ کے ہاتھوں پھر وہ نظروں کے سامنے تھی۔ خاندانی، نہ عروج پر اُبلتا ہے، نہ زوال پر بسورتا ہے، وہ جانتا ہے یہ دُنیا کے نشیب و فراز ہیں، مگر نو دولتا چھوٹی ہانڈی ہے، جلدی اُبلتا بھی ہے جلد ہی بیٹھ بھی جاتا ہے۔

گلگونہ اس لیے آپے سے باہر تھی۔ اس نے غصے میں قمیص کا گریبان اس طرح نوچا تھا کہ ہیرے کے بٹن فرش پر بکھر گئے تھے۔ دوپٹا دھجیاں بنا ایک گوشے میں پڑا تھا اور وہ اب کمرے کی ہر شے پر قہر کی نظریں ڈال رہی تھی کہ کیا توڑے، کیا پھاڑے؟ شیخ اسی وقت اندر داخل ہوا۔ بے مقنع و چادر، پھٹی ہوئی قمیص میں اس نے مجاز میں وہ جلوہ دیکھا کہ آنکھیں خیرہ کرنے لگیں۔ اس نے اپنا دھڑکتا دل قابو میں لانے کے لیے داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ کھانس کر گلگونہ کو مخاطب کرنے کی کوشش کی۔ گلگونہ نے شیخ پر سَر سے پاؤں تک نظر ڈالی۔ سوکھا چہرہ، لاغر جسم، چالیس پینتالیس برس کا مرد، سَر پر عمامہ، سپید عبا پر کالی حبا، لمبی ناک، لمبا ڈیل، کھچڑی داڑھی، پوری صورت میں دو بڑی بڑی چمکتی آنکھوں کے سوا کوئی جذب نہیں، گلگونہ نے لمبی لمبی سانسیں لے کر کہا۔ ”یہ آپ ہی کی کارستانی ہے کہ میں محل سرا سے نکال کر اس پاپوش خانے میں بھیجی گئی؟“

شیخ نے کہا۔ ”نہیں، اس میں مجھ سے زیادہ کاتبِ تقدیر کو دخل ہے، وہی جھونپڑے سے نکال کر محل میں لے گیا، اسی نے شاہی محل سے ایک درویش کے گھر بھیج دیا!“

گلگونہ غصے میں تھرا کر اکڑوں بیٹھ گئی۔ اس نے دونوں گھٹنوں پر سَر رکھ لیا۔ مگر میرے معاملے میں تو کاتبِ تقدیر آپ ہی بنے! نہ جانے میں نے آپ کا کیا بگاڑا تھا!“

شیخ نے کہا۔ ”تم اپنی ہی نہیں، سارے ملک کی قسمت بگاڑ رہی تھیں، میں تمہیں ایک بُری زندگی سے نکال کر ایک اچھی زندگی کی طرف لایا ہوں!“

اس نے سر اُٹھا کر طنز سے پوچھا۔ ”آخر میرے حال پر یہ کرمِ خاص کیوں؟“

شیخ نے مسکرا کر کہا۔ ”اس لیے کہ تم اس ملک کی سب سے بڑی حسینہ ہو!“

اس نے پھر طنز سے کہا۔ ”تو خیر سے آپ حسن و جمال کے پرکھنے کی تمیز بھی رکھتے ہیں!“

شیخ نے بڑی متانت سے کہا۔ ”میں نے ساری عمر جمال ہی کی تلاش میں صرف کی ہے!“

اس نے پھر وار کیا۔ ”اور اس ساری عمر کی تلاش کے بعد آپ کو نظر آئی تو میں ہی!“ مگر لہجے میں اب تلخی کم تھی۔

شیخ نے پھر مسکرا کر کہا۔ ”ہاں، مجاز میں تو تم کسی حد تک اس جمال کا نمونہ کہی جاسکتی ہو مگر ابھی بڑا نقص ہے۔ جیسا ظاہر ہے، ویسا باطن نہیں!“

گلگونہ بولی۔ ”مجھے پہیلیاں بوجھنے کا دماغ نہیں!“

شیخ نے کہا۔ ”دماغ تو ہے مگر دھیان دینے کی، خود پرستی اجازت نہیں دیتی!“

گلگونہ جھلا کر کھڑی ہوگئی۔ وہ دانت پیس کر بولی۔ ”خود پرستی! سوپ کو ہنسے چھلنی جس میں بہتر چھید! یہ آپ کی خود پرستی و نفس پرستی نہیں تو اور کیا ہے کہ آپ نے بادشاہ سے اس کی چہیتی کنیز، اور مجھ سے دولت و ثروت، عیش و نشاط کی زندگی چھین لی تاکہ آپ اپنا کرم خوردہ، خشک و بے آب جسم میرے لمس کی حرارت سے تر و تازہ بنائیں!“ اور اس نے جھٹکا دے کر قمیص کا چاک بڑھا دیا۔ شیخ نے نظریں نیچی کرلیں، وہ آہستہ آہستہ بولا۔ ”تم نے میری غرض غلط سمجھی، میرا مقصد واقعی رعیت کی، بادشاہ کی اور تمہاری بھلائی ہے، خیر، میں تمہارے لیے بازار سے کچھ سلے سلائے کپڑے لایا ہوں،“ وہ خادمہ سے بھیج دیتا ہوں، منہ ہاتھ اور دھو ڈالو، کپڑے بدل لو پھر تھوڑا آرام کرکے مجھ سے گفتگو کرنا، وہ دروازے سے نکلتے نکلتے پھر بولا۔ ”دو چار دن میں تم مجھے پہچان لوگی۔ میں برابر تمہارے لیے توفیقِ نیک کی دُعا کرتا رہوں گا!...... اور سنو، یہ ہیرے کے بٹن ہیں، انہیں بھی اصدر الصدور کو بطورِ صدقہ بھیج دو!“

دو گھنٹے بعد وہ اپنے کمرے میں بیٹھا تفسیر کا مطالعہ کررہا تھا کہ وہ دروازہ تڑاق پھڑاق کھولتی بند کرتی، بڑبڑاتی داخل ہوئی۔ ”میں اس بالشت بھر کے گھر میں کہاں جاؤں؟ کہاں گھوموں پھروں؟ کس سے باتیں کروں؟ مجھے تو اس میں قبر جیسی تنہائی محسوس ہوتی ہے!“

شیخ نے اپنے پہلو میں قالین تھپک کر کہا۔ ”آؤ میرے پاس بیٹھو۔“ اور اس نے مصری لحن سے چند آیتیں پڑھیں، پھر گلگونہ سے پوچھا۔ ”تم قرأت جانتی ہو؟“ اس نے نفی میں سَر ہلایا تو اُسے مخارج بتاتا اور ان کی مشق کراتا رہا۔ موسیقی سے واقف ہونے کی وجہ سے گلگونہ کو یہ فن سیکھنے میں بڑا لطف آیا، وہ اپنا غم بھول گئی جب وہ اس مشق سے تھک چکی تو شیخ نے اس کے سَر پر چادر ڈال کر تالی بجائی۔ غلام کشتی میں انگور دانا اور ایک کیتلی میں چائے اور دو استکان لا کر رکھ گیا۔ شیخ نے ایک میزبان کی طرح اصرار کرکے اسے میوے بھی کھلائے اور چائے بھی پلائی۔ پھر کہا۔ ”معاف کرنا، میں نے ابھی عصر نہیں پڑھی ہے، اب میں آٹھ بجے کھانے پر ملوں گا!“

اور جب وہ گردن جھکائے اپنے کمرے کی طرف چلی تو شیخ نے مسکرا کر کہا۔ ”تم اپنا دل بہلانے کے لیے باورچن کو بلا لو۔ اس کے ساتھ جا کر گھر کے سارے اثاثے کا جائزہ لے لو۔ کیا چیز ہے؟ کیا نہیں ہے؟ کیا کیا ہونا چاہیے؟ کیا کیا منگانا ہے، اِن سب کی فہرست بنا ڈالو۔ تمہی کو اب اس گھر کا انتظام کرنا ہے۔ تمہی اس کی مالکہ ہو!“ اور اس نے اس کے ہاتھ میں اشرفیوں کی ایک تھیلی دے دی۔ گلگونہ نے بند مٹھی دانت کے نیچے دبا کر کہا۔ ”مگر میں نے تو آج تک کسی گھر کا انتظام نہیں کیا، میں کیا جانوں؟“

شیخ نرمی سے بولا۔ ”تو تم نے عورت کا سب سے بڑا قرض اب تک ادا نہیں کیا۔ خیر، جاؤ۔ آج سے بسم اللہ کرو، کرنے ہی سے سب کچھ آتا ہے۔“

اور وہ مصلے پر کھڑا ہوگیا۔

اور یوں ہی دن گزرنے لگے۔ شیخ کبھی گلگونہ کے ساتھ چائے پی لیتا۔ کبھی اس سے خُدا اور رسول ﷺ کی باتیں کرتا، کبھی اسے تفسیر سناتا، کبھی حدیثوں کے معنی و مطلب بیان کرتا اور کبھی اس سے مصری و عراقی لہجوں میں تلاوت کرا کے اس کی قرأت درست کرتا لیکن پہلے دن کے بعد اس نے کبھی نہ تو اس کے حسن کی تعریف کی، نہ اُسے یاد دلایا کہ وہ اس کی کنیز ہے اور وہ اس کا آقا اور نہ کسی موقع پر اپنے حقوق جتائے۔ اِن دونوں کے درمیان اُستاد و شاگرد کا رشتہ تھا یا مالک مکان اور گھر کی منتظمہ کا اور بس۔

شیخ کی اس بے پروائی سے گلگونہ کے اندر والی عورت جاگ پڑی، اسے ایک زاہدِ خشک کا اپنی جنس کی طرف سے یوں بے حس ہونا اپنی پوری صنف کی توہین محسوس ہوئی۔ اس کی خودی مجروح ہوئی اور وہ شیخ میں سوئے ہوئے مرد کو جگانے پر آمادہ ہوگئی۔ اب وہ جب بھی شیخ کے پہلو میں بیٹھتی تو وہ ایک بار اس کے خشک و سرد ہاتھوں پر اپنا نرم و گرم ہاتھ ضرور رکھ دیتی۔ وہ اس طرح اس کے قریب آ کر بیٹھتی کہ جسم سے جسم ضرور مس ہوجاتا

برصغیر میں ریل گاڑی کی آمد

16 اپریل 1853ء کو برصغیر میں پہلی ریل گاڑی چلی تھی۔ جو دوپہر ساڑھے تین بجے، چار سو مسافروں کو لے کر بمبئی کے بوری بندر اسٹیشن سے (موجودہ نام وکٹوریہ ٹرمنل) 21 میل آگے واقع اگلے اسٹیشن کے لیے روانہ ہوئی۔ اس ریل گاڑی نے یہ فاصلہ 57 منٹ میں طے کیا تھا۔

اور اب وہ جب بھی نیا لباس بدلتی تو شیخ کے کمرے میں کسی نہ کسی بہانے سے آ کر ضرور ہو جاتی اور آتی تو گنگناتی ہوئی آتی اور جاتی تو گنگناتی ہوئی جاتی۔

شیخ کوئی پتھر نہیں تھا، اس نے اپنی جنس اپنی کتابوں میں بُھلا رکھی تھی، مگر اس روز روز کے وار نے اس کی سپر کاٹنی شروع کر دی۔ اس کی زرہ کی زنجیریں ٹوٹنے لگیں، اسے گلگونہ کی شرارتوں پر جتنا پیار آتا، اتنا ہی اس کا غصہ بڑھنے لگا۔

ایک دن شیخ اپنے دارالمطالعہ میں بیٹھا کتاب بند کیے اپنے ہاں جذبے اور عقل کی جنگ پر غور کر رہا تھا کہ اس کے کانوں میں خلخال کی آواز آئی۔ اس چھن چھن میں کچھ ایسی دلکشی تھی کہ وہ بے ساختہ اس پردے کی طرف دیکھنے لگا جو اس کے اور گلگونہ کے کمرے کے درمیانی دروازے پر پڑا تھا۔ وہ اسی طرح دیکھ رہا تھا کہ پردہ ہٹا اور گلگونہ ایک تتلی کی سبکی سے ناچتی اس کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ نیم عریاں تھی۔ جو لباس جسم پر تھا وہ اتنا باریک اور نازک تھا کہ جسم کا رُواں رُواں دکھائی دیتا تھا۔ لباس نہ تھا گویا فانوس تھا کہ ایک جلتی شمع آغوش میں لیے ہوئے تھا۔ اس کے پاؤں پھرکی کی تیزی سے چل رہے تھے اور اس کی پور پور حُسن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی دعوتِ نظارہ دے رہی تھی۔

شیخ کے دل میں وہی تھرتھراہٹ پیدا ہو گئی جو نسیم کے جھونکوں سے وقتِ سحر گلوں کی کھلتی پنکھڑیوں میں دکھائی دیتی ہے۔ شیخ نے گھبرا کر آنکھیں جُھکا لیں۔ اس کی زبان پر بے ساختہ وہ آیت جاری ہو گئی جو بجلی چمکتے وقت تلاوت کرنے کا حکم ہے۔ پھر اسے اچانک یہ محسوس ہوا جیسے سارے جسم کا خون تیزی سے سَر کی جانب چڑھتا چلا جا رہا ہے۔ کنپٹیاں دھکنے لگیں، تالو چٹخنے لگا۔ سانس لینے میں وقت ہونے لگی۔ وہ دفعتہً گرج اُٹھا۔ ”تمہیں میرے کمرے میں اس طرح ناچتے ہوئے آنے کی کس نے اجازت دی؟“

گویا بجلی گرانے والی پر بجلی گری۔ گلگونہ کچھ لمحے تو بُت بنی کھڑی رہی، پھر سسکتی ہوئی اپنے کمرے میں بھاگ گئی۔

شیخ کو فوراً محسوس ہوا کہ اس نے گلگونہ کے ساتھ ناروا سلوک کیا۔ اپنے بے قابو نفس پر آنے والا غصہ اس حسینۂ دل نواز پر بے جا اتارا۔ وہ اپنے اس ظلم پر منفعل و شرمسار اپنی جگہ سے اُٹھا۔ قصد تھا کہ گلگونہ سے چل کر ابھی معافی مانگے۔ اس نے تیزی سے قدم بڑھا کر پردہ ہٹایا۔ بیچ کے دروازے کے دونوں پٹ کھلے تھے۔ سامنے ہی گلگونہ نظر آئی۔ وہ سسکتی جاتی تھی، اپنے کپڑے نوچ کر پھینکتی جاتی تھی اور پاؤں پٹختی جاتی تھی۔ گھنگرو اب بھی پاؤں میں بندھے تھے اور جسم کی غیر شعوری حرکت میں رقص کا پورا کیف تھا۔ شیخ کا عزم پائمال ہونے لگا۔ اس کے قدم رُکنے لگے اسے اپنے جسم میں جلتی چنگاریاں سی اُڑتی محسوس ہونے لگیں۔ وہ اس نئی کیفیت سے اور بھی گھبرا اُٹھا۔ اس نے اپنے نفس کو ملامت کی اور آہستہ آہستہ قدم رکھتا۔ اپنے کمرے میں پلٹ آیا اور فلسفے کا ایک نہایت ہی پیچیدہ مسئلہ حل کرنے میں مشغول ہو گیا۔

دو گھنٹے بعد اس نے گلگونہ کو آواز دی۔ جب وہ سَر جھکائے آئی تو شیخ نے اظہارِ ندامت کرتے ہوئے کہا۔ ”تم میرے سامنے نیم برہنہ چہکتی ہوئی چلی آئیں، اس میں تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میں تمہارا آقا اور تم میری کنیز ہو لیکن تمہارا یہ فعل میری اجازت کے بغیر تھا اس لیے مجھے غصہ آ گیا اور میرے مشرب میں غصہ حرام ہے، اس لیے میں نے اپنے کو خود سزا دی۔ میں تین روزے بطور کفارہ رکھوں گا!“

ابتدائے گفتگو میں جو گلگونہ کی آس بندھی تھی، وہ ختمِ کلام پر ٹوٹ گئی۔ اپنی شکست کا احساس اس کے ہاں تیز تر ہو گیا۔ وہ عورت تھی جو کبھی اپنی شکست نہیں مانتی اس لیے اس نے پرانے حربے بدل ڈالے، اس نے روزوں میں بھی شیخ کا ساتھ دیا اور وہ پنج وقتہ اس کے پیچھے آ کر نماز پڑھنے لگی، اس نے شیخ سے پوچھ پوچھ کر اس کے سارے اوراد و وظائف بھی یاد کر ڈالے اور وہ صبح و شام انہیں جھوم جھوم کر خوش گوئی سے پڑھنے لگی۔ ریاضت و عبادت کی اس رفاقت نے شیخ کی جنسی آگ اور بھڑکائی۔ زاہد زاہدہ کو چھپ چھپ کر للچائی نظروں سے دیکھنے لگا مگر جب بھی نفس کا شیطان اس حد سے زیادہ ستاتا، وہ روزوں کی تعداد میں اضافہ کر دیتا۔ نمازیں بڑھا دیتا۔ تلاوت کے گھنٹوں میں اضافہ کر دیتا لیکن جذبے اور عقل کی اس کشمکش میں اس سے تصنیف و تالیف کا کوئی کام نہ بن پڑتا۔ گلگونہ کے سوا کسی موضوع پر دماغ غور و فکر کے لیے تیار نہیں تھا۔

ادھر گلگونہ نے بھی اپنا رنگ روپ کھونا شروع کر دیا۔ روزوں پر روزے، نمازوں پر نمازیں، روح کی طاقت جتنی بھی بڑھائیں، جسم سے ساری حیوانی کشش چھین لیتی ہیں، گلگونہ کے گلابی گال اب کندنی بن گئے تھے۔ ہونٹوں سے تازگی، آنکھوں سے نشیلا پن غائب ہونے لگا تھا۔ اسے یہ احساس مارے ڈالتا تھا کہ جس کے کارن یہ سارے پاپڑ بیلے، وہ اب بھی بے پرواہ ہے۔ ایک دن وہ اپنے کمرے میں جانماز پہ بیٹھی ہاتھ اُٹھائے احسن الخالقین سے یہی شکایت کر رہی تھی اور اس کے گال آنسوؤں سے تر تھے کہ شیخ کسی کام سے اندر داخل ہوا۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے دل پر آرے چلنے لگے۔ وہ جھپٹتا ہوا اپنے کمرے میں آیا، اس نے درباری لباس پہنا اور شاہی محل کی طرف لپکتا ہوا روانہ ہو گیا۔

☆......☆

سلطان کی خدمت میں وہ اسی طرح ایک حد تک بدحواس باریاب ہوا۔ حسبِ معمول مصافحے اور معانقے کے بعد سلطان نے خیریت پوچھنے کے بعد دریافت کیا۔ ”کیسے سرفراز فرمایا؟“

شیخ نے کہا۔ ”جو کنیز ظلِ اللہ سے مانگ کر لے گیا تھا، اُسے پلٹانے آیا ہوں۔“

سلطان نے کہا۔ ”آپ ہی کی تعلیم ہے کہ بادشاہ دی ہوئی چیز واپس نہیں لیتا۔“

شیخ نے کہا ”مگر میں نے یہ چیز عارتیاً لی تھی، محض اپنے سلطان کو سلطنت کی حالت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے۔ وہ ایک پردہ تھی جس کا ہٹانا ضروری تھا۔“

سلطان نے مسکرا کر پوچھا۔ ”اور جو وہ واپس ہو کر پھر پردہ بن جائے؟“

شیخ نے کہا ”مجھے سلطان پر اعتماد ہے کہ وہ کروڑوں کا دلدار بننے کے فوائد سے آگاہ ہو کر پھر صرف ایک کا ہو کر نہ رہے گا۔“

سلطان نے کہا۔ ”آپ کچھ اس سے بیزار سے معلوم ہوتے ہیں۔“

شیخ نے سَر جھکا کر کہا۔ ”ہاں جو شاہ کی امانت میں خیانت کی رغبت دلائے، اس سے بیزاری ضروری ہے۔“

سلطان نے مسکرا کر پوچھا۔ ”تو آپ نے امانت، امانت کی طرح رکھی؟“

شیخ نے سَر جھکا کر کہا۔ ”یہ ظلِ اللہ اس سے بھی دریافت کر سکتے ہیں۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”اچھا تو آپ اسے آج شام یہاں بھیج دیں، مگر واپس لینے کا مسئلہ اس سے گفتگو کے بعد ہی طے ہو گا!“

اور اسی دن شام کو جب گلگونہ اپنے پچھلے محل سرا میں آئی تو ایک خواص زرتار خلعت لائی کہ اسے زیبِ جسم کیجیے۔ سلطان بہ نفسِ نفیس شب میں تشریف لائیں گے اور آپ کا رقص دیکھیں گے۔

اور سلطان آیا اور گلگونہ نے اسے اپنے رقص سے اس قدر مسرور کیا کہ اس نے اس شعلۂ جوالا کو اپنے قریب بلا کر کہا۔ ”مانگ کیا مانگتی ہے کنیزِ خاص!“ اور وہ اسے بڑے یقین کی نظروں سے دیکھنے لگا کہ وہ سلطان کے پہلو کے سوا اور کچھ مانگ ہی نہیں سکتی مگر گلگونہ نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ ”اپنا گھر اور شیخ کی کنیزی!“

سلطان کو محسوس ہوا جیسے گلگونہ نے اس کے شاہی گال پر طمانچہ مار دیا۔ وہ تلملا گیا، مگر وہ بادشاہوں جیسا دل بھی رکھتا تھا اور شیخ سے معلمِ اخلاق کا شاگرد بھی تھا۔ اس نے کہا۔ ”جا وہیں چلی جا! تجھ پر بھی میرے استاد کا جادو چل گیا!“

اور گلگونہ جب شیخ کے کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے دیکھا کہ وہ سجدے میں سر رکھے ہوئے کہہ رہا ہے۔ ”میرے رب! مجھے قوتِ صبر عطا کر! گلگونہ کی جُدائی مجھے بہت شاق ہے! میرے رحیم! صبر! صبر!“

گلگونہ نے جھک کر شیخ کے گال سے گال ملا کر کہا۔ ”اور صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے!“ شیخ نے سجدے سے سَر اُٹھایا، دوزانو بیٹھ کر تین بار ”شکر! شکر! شکر!“ کہا اور دونوں ہاتھ گلگونہ کی گردن کی طرف بڑھا دیے اور خزاں کی آغوش میں بہار آ گئی۔

☆......☆

کراچی سے انڈونیشیا تک پھیلے ہوئے ایک رنگین و سنگین سفر کی رُوداد

بارشوں کے شہر میں

اختر شہاب

انڈونیشیا کی مہکتی شاموں اور چمکتی راتوں کا احوال
بارشوں میں چہکتی انڈونیشی حسیناؤں کا مآل

میں نے مڑ کر دیکھا' وہ مجھے دیکھنے کے بجائے قہر آلود نظروں سے مہناز کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں رقابت تھی۔

''لیس ایڈنا......!'' میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"nothing." وہ بولی۔ اس کی آواز میں گھبراہٹ آگئی تھی۔ "You go with her."

مجھے ایسا لگا کہ وہ نہیں چاہتی کہ میں مہناز کی مدد کروں۔ پتا نہیں' اس نے کیا محسوس کیا تھا جبکہ میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ میں تو محض اس کے آدھی پاکستانی ہونے کے ناتے اس کی مدد کر رہا تھا۔ وہ مجھے بھائی کہتی تھی تو میرے دل میں اس کے لیے برا خیال کیسے آسکتا تھا؟

'بھاڑ میں جائے ایڈنا......' میں نے سوچا اور پھر اس دکان کی طرف چل دیا جہاں مہناز موجود تھی۔ دکان پر پہنچ کر میں نے مڑ کر دیکھا تو ایڈنا غائب تھی۔ میں حیران ہوا کہ یہاں مڑنے اور چھپنے کی کوئی جگہ نہیں' یہ کہاں چلی گئی؟ شاید کسی دکان میں گھس گئی۔ میں نے اسے اِدھر اُدھر ڈھونڈا مگر وہ کہیں نظر نہ آئی۔

ایک دکان سے کچھ جیولری اور ایک دو زنانہ سوٹ خریدنے کے بعد بالآخر ہم اس شاپنگ مال کی سب سے مشہور دکان ''باتک شاپ'' پر آگئے جہاں اور بھی لوگ موجود تھے۔ وہاں ہماری پسند کی کافی چیزیں تھیں۔ باتک شرٹ بھی مل گئیں' سووینیئر بھی مل گئے اور لنگی کا کپڑا بھی۔ یہ الگ بات ہے' چیزیں انتہائی مہنگی تھیں مگر ہماری مجبوری یہ تھی کہ شاید ہمیں شاپنگ کا دوبارہ چانس نہ ملے لہٰذا ہمیں ہر ایک کے لیے کچھ نہ کچھ تو لینا تھا۔

''اوہ مسٹر کھان......! آپ نے بہت کچھ خرید لیا۔ وہ بھی باتک سے۔'' حیرت اور تعجب کی نظروں نے میرا احاطہ کیا ہوا تھا۔

''مجبوری ہے۔'' ہم بولے۔ ''پر پرنس صوفیانہ کے تھیلے تو ہم سے بہت بھاری ہیں۔''

''ہاں بھئی......!'' گووندا بولا۔ ''امیر ملک کے لوگ ہیں' اتنی خریداری تو ہوگی۔''

''نو نو......'' صوفیانہ بولی۔ ''امیر تو صرف گورنمنٹ ہے' عوام غریب ہی ہیں۔''

'یہ المیہ تو دنیا بھر کا ہے۔' ہم نے سوچا۔ 'گنتی کے چند لوگ ہی دوسروں کا خون چوستے ہیں اور اکثریت بے

بسی پستی ہی رہتی ہے۔'

باتک شاپ سے نکل کر شاپنگ مال کے بیرونی دروازے پر پہنچے تو وہاں اور بھی لوگ جمع تھے۔ ہم نے گھڑی دیکھی' سوا پانچ بج رہے ہیں۔

''تم نے کچھ نہیں لیا؟'' تم نے دیکھا' ایڈنا ایک طرف چھوٹا سا شاپنگ بیگ لیے بیٹھی ہے تو اس سے پوچھا۔

''نہیں......''

''کیوں؟''

اس نے جواب میں زخمی نظروں سے ہماری طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ آپ تو کسی اور کو شاپنگ کرانے



میں مصروف تھے' مجھے کون کراتا اور بولی۔ ''کچھ پسند نہیں آیا؟''

''چلو' کوئی بات نہیں۔'' ہم نے دلاسا دیا۔ ''ممتن کو کہہ کر ایک بار پھر شاپنگ پر آنے کی کوشش کریں گے۔''

''شاید......'' اس نے منہ موڑ لیا۔ وہ ہم سے ناراض تھی۔

............*......*

شاپنگ مال سے نکل کر کوچ میں بیٹھے اور مین روڈ تک پہنچتے پہنچتے 6 بج گئے اور مین روڈ پر چڑھنے کے تھوڑی دیر بعد ہی ٹریفک جام ہوگیا۔ ہم انتظار کرنے لگے کہ تھوڑی دیر بعد ٹریفک کھل جائے گا۔ جب کافی دیر ٹریفک جام رہا تو میزبانوں سے معلوم کیا کہ ٹریفک کب تک کھلے گا؟

بولے۔ ''یہی وہ وجہ تھی جس کی وجہ سے ہم جلدی واپس آنا چاہ رہے تھے۔ اب چونکہ ٹریفک کے رش کی وجہ سے ایک طرف کی ٹریفک بند کر کے دوسری طرف کی کھول دی گئی ہے لہٰذا جب تک ہماری طرف کی ٹریفک نہیں کھل جاتی' ہم چل نہیں سکتے۔

''ہماری طرف کی ٹریفک کب کھلے گی؟'' ہم نے پوچھا۔

''ساڑھے سات بجے۔''

ہم نے گھڑی دیکھی' ابھی تو چھ بیس ہوئے تھے۔

شاپنگ کی تھکن اور انتظار کی کوفت نے بیک وقت ہم پر حملہ کر دیا۔ ہم آنکھیں بند کر کے اپنی سیٹ پر ڈھیر ہوگئے۔ کچھ دیر بعد کانوں میں گٹار کی آواز آئی تو آنکھیں کھولیں اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔

دو ننھے منے بچے کوچ میں چڑھے' بڑی مہارت سے گٹار بجا کر کوئی انڈونیشی گانا گا رہے تھے۔ یہ بچے یہ تفریح ہمیں اس امید پر مہیا کر رہے تھے کہ جواب میں ہم انہیں انعام سے نوازیں گے' ہم سب نے انہیں نوازا بلکہ ان کی توقعات سے زیادہ نوازا۔

''یہاں مزہ نہیں آرہا بھئی!'' کسی کی آواز آئی۔

''نیچے اترو۔''

ہم لوگ نیچے اتر آئے' کچھ گاڑی میں ہی بیٹھے رہے۔ نیچے اتر کے ہم نے دیکھا کہ ہماری طرف آگے

پیچھے گاڑیوں کی لائنیں لگی ہوئی ہیں جبکہ دوسری طرف سے ٹریفک چل رہا ہے۔ ہم سب سائیڈ پر بنی ہوئی گرین بیلٹ پر چڑھ گئے۔ بچوں نے دوبارہ گانا شروع کردیا اور ہم لوگوں نے تال دیتے ہوئے رقص کرنا شروع کردیا۔ آخر کو وقت بھی گزارنا تھا۔

کچھ دیر بعد ہم سڑک کے کنارے لگی ریلنگ پر کمر ٹکا کر کھڑے ہوگئے۔ دل اور دم بھی کوچ سے اتر کر سگریٹ پینے ہمارے قریب کھڑی ہوگئی۔

''تم شاید سیمینار کے آخری دن جارہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔ وہ جب سے آئی تھی' سلام دُعا کے علاوہ اس کے ساتھ یہ پہلی گفتگو تھی۔

''ہاں......''

''کس وقت ہے تمہاری فلائٹ؟'' ہم نے پوچھا۔

''شام سات بجے۔''

''تو تم صبح 10 بجے نکلنے کی کوشش کرنا۔'' ہم نے اسے نصیحت کی۔

''کیوں؟'' وہ حیران ہوئی۔

''یہ ٹریفک جام دیکھ رہی ہو' صبح اس سے بھی زیادہ رش ہوتا ہے اور تمہیں جکارتا جانا ہے جہاں دنیا کا بدترین ٹریفک جام ہوتا ہے؟''

''پر میرے سرٹیفکیٹ کا کیا ہوگا؟'' وہ روہانسی ہوگئی۔

''یا تو سرٹیفکیٹ دیکھ لو یا فلائٹ دیکھ لو۔'' ہم بولے اور اسے سمجھایا۔ ''سرٹیفکیٹ تو بعد میں ڈاک کے ذریعے بھی آجائے گا یا نتالیہ لے آئے گی۔ تم فلائٹ کی فکر کرو۔''

''میں کیا کروں؟'' وہ روہانسی ہوگئی۔

''تم ممتن یارورو سے بات کرو۔ وہ انتظام کریں گے۔''

''میں چلی گئی تو نتالیہ کا کیا ہوگا؟'' وہ فکرمند تھی۔

''کیا مطلب؟'' ہم نے پوچھا۔

''اس کی فلائٹ سیمینار ختم ہونے کے 2 دن بعد ہے۔ وہ بہت پریشان ہے کہ سب چلے گئے تو وہ اکیلی کیا کرے گی؟ اسے ویسے بھی انگلش بہت کم آتی ہے۔''

''میرا خیال ہے' یہ لوگ اس کا بھی کوئی انتظام کر دیں گے۔'' ہم بولے۔ ''یہ بتاؤ' تمہیں انگلش آتی ہے؟'' ہم نے پوچھا۔

''مجھے تین زبانیں آتی ہیں' رشین' تاجک اور انگلش۔''

''اچھا تبھی نتالیہ تمہارے ساتھ رہتی ہے تاکہ تم اسے رشین سمجھادو۔''

''جی......'' وہ بولی۔ ''آپ پاکستان میں کیا کرتے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''میں پڑھاتا ہوں' ٹریننگ دیتا ہوں۔''

''میرا اندازہ ہے کہ آپ صرف عام استاد نہیں ہیں' کوئی ڈین وغیرہ ٹائپ کی چیز ہیں۔''

''تمہیں کیسے اندازہ ہوا؟'' ہم نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ کا اسٹائل' آپ کا اعتماد' آپ کی بات چیت سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔''

'تو صرف ہم ہی نہیں اندازے لگا رہے تھے' لوگ بھی اندازے لگا رہے تھے۔' ہم نے سوچا۔ 'بلکہ لوگوں نے نہ جانے کیا کیا اندازے لگائے ہوں گے۔'

''تمہارا اندازہ درست ہے۔'' ہم بولے اور ہم نے اسے تفصیل زبانی بتانے کے بجائے اپنا وزیٹنگ کارڈ اسے دے دیا۔

''ضرور......سو بسم اللہ!'' ہم نے کہا۔

"What?" وہ پریشان ہوئی۔

"It means, you are most welcome."

''او کے' اب میں کوچ میں جا کے بیٹھوں گی۔ نتالیہ پریشان ہو رہی ہوگی۔'' وہ بولی۔ ویسے بھی اس کی سگریٹ ختم ہوچکی تھی۔

''جاؤ......'' ہم بولے۔ ''مگر فلائٹ کا مت بھولنا۔''

"O.K. my friend! you are really loving." یہ کہتی ہوئی وہ کوچ میں چڑھ گئی۔ دل اور دم کے جانے کے بعد ہم نے گھڑی دیکھی' سات بجے تھے۔

'ابھی آدھا گھنٹا باقی ہے۔' ہم نے سوچا۔ 'پتا نہیں کہ آدھا گھنٹا ہے یا پھر اور زیادہ' کون جانے؟'

''مسز کھان!'' گوونda کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔

''یس۔'' ہم نے اس کی طرف دیکھا' وہ کچھ بے چین سا تھا۔ ''کیا مسئلہ ہے؟'' ہم نے پوچھا۔

''میں......'' اس نے اپنی بات آدھی چھوڑ کر اپنی

ہتی اٹھائی۔

اس عالمی اشارے کو دیکھ کر ہم اس کی بے چینی کی وجہ سمجھ گئے۔ ویسے بھی وہ شوگر کا مریض تھا تو اسے پیشاب روکنا برا تھا۔ ہم نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی' کچھ دور آگے ایک اوور ہیڈ برج تھا جو سڑک سے بیس' تیس گز دور سے شروع ہو رہا تھا اور جہاں سے برج شروع ہو رہا تھا اس طرف سے ایک سروس روڈ بھی گزر رہی تھی مگر اس پر اکا دکا ٹریفک تھی۔ برج کے ابتدائی ستون کے ساتھ کچھ جھاڑیاں بھی موجود تھیں۔ ہم نے اسے کہا کہ وہ ان جھاڑیوں کے درمیان جا کر اپنی حاجت پوری کرے۔

''کچھ مناسب نہیں لگتا۔'' وہ ہچکچایا۔

''تم مریض ہو۔'' ہم بولے۔ ''پیشاب روکنا تمہارے لیے مناسب نہیں ہے اس لیے Run for your life.''

''تو......''

"Run, Run for your life." ہم نے اسے دھکا دیا اور اونچی آواز میں بولے۔

''کیا ہوا؟'' ہماری آواز کچھ زیادہ ہی اونچی ہوگئی تھی۔ لوگ باگ چونک کے متوجہ ہوئے۔ ''چلو' چلو بھاگو......'' ہم نے نیچے اترتے ہوئے اسے ایک دھکا اور دیا تو گوونda چلتا ہوا آگے جانے لگا۔

"Run, Run for your life." پیچھے سے لوگوں نے کورس میں گایا۔ وہ بات سمجھ گئے تھے۔

گوونda واپس آیا تو کئی اور لوگوں نے اس کی تقلید کی۔

ساڑھے سات بجے ٹریفک کھل گئی اور ہم واپسی کے لیے روانہ ہوگئے۔ لوٹ کے بدھو طعام گاہ آئے۔ رات کا کھانا کھایا اور سو گئے۔

............*......*

پیر کو اعلان ہوا کہ الوداعی ڈنر جو اتوار کو دیا جانا مگر شاپنگ میں لیٹ ہوجانے کی وجہ سے منسوخ ہوگیا تھا' آج رات دیا جارہا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ پچھلی دفعہ کی طرح اس دفعہ بھی ڈنر آڈیٹوریم میں دیا جائے گا اور حسب معمول اس میں رقص کی محفل بھی ہوگی مگر پچھلی دفعہ کی طرح اس دفعہ بھی ہمارا خیال غلط ہوگیا اور یہ ڈنر ''سمندباد ریسٹورنٹ'' میں دیا گیا جہاں ہم لوگ حسب معمول دو کوچوں میں گئے۔ ریسٹورنٹ میں ہمیں روٹی یا چپاتی تو نہ ملی جس کے لیے ترستے ہوئے ہمیں ہفتہ بھر ہوگیا تھا البتہ افغانی پلاؤ اور عربی پلاؤ کی شکل میں بگھارے ہوئے چاول ملے جو ابلونا سے بہرحال بہتر تھے۔ ہم نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا اور ہماری تفریح کا لطف دوبالا ہوگیا۔

اس ریسٹورنٹ میں لوگوں کا دل بہلانے کے لیے ایک الیکٹرک پیانو بجانے والے اور دو گلوکاروں پر مشتمل بینڈ نے نہ صرف نغمہ سرائی کی بلکہ ان لوگوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے اپنا ساتھی' صوفیانہ بلکہ کھارے اور مہناز نے بھی انڈین گانا سنایا اور حسب روایت ان گانوں کی دھن پر تمام افراد نے رقص کیا۔ اس ڈنر کے رقص میں خاص چیز دل اور دم کا رقص تھا جس نے چند منٹ ہی رقص کیا مگر بہت خوبصورتی اور ردھم سے اسٹیپ لیے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ وہ پہلے بھی رقص کرتی رہی ہے۔

............*......*

لوگ باگ جمنازیم میں ان ڈور گیم کے طور پر ٹیبل ٹینس کھیلنے جایا کرتے تھے۔ وہاں اچانک یہ تجویز پاس ہوگئی کہ ایک ٹورنامنٹ منعقد کرایا جائے' سومنگل کو اعلان ہوا کہ ایک بین الاقوامی ٹیبل ٹینس کا اہتمام کیا جارہا ہے لہٰذا لوگ اپنے اپنے نام لکھوا دیں۔ ہم نے بھی پروگرام میں حصہ لینے کے لیے اپنا نام دے دیا حالانکہ آخری دفعہ ٹیبل ٹینس ہم نے 87ء میں کوئٹہ میں کھیلی تھی۔

ڈرا میں ہمارے مقابل مصطفیٰ تھا۔

''ہم تمہارے لیے آسان حریف ثابت ہوں گے۔'' ہم نے اس سے کہا۔ توقع کے مطابق ہم ہار گئے مگر ہمارے کھیل پر لوگوں نے خوب داد دی۔

''آپ نے تو کہا تھا کہ آپ آسان حریف ثابت ہوں گے؟'' مصطفیٰ نے جیتنے کے بعد شکوہ کیا۔ ''آپ کو ہرانے میں تو مجھے دانتوں پسینے آگئے۔''

''ہم ایسا ہی سمجھتے تھے۔'' ہم نے کہا۔ ''ہم نے آخری دفعہ ریکٹ کو تیس سال پہلے ہاتھ لگایا تھا۔''

''آپ اچھا کھیلتے ہیں۔'' وہ بولا۔ ''میرے خیال میں اگر آپ دو چار روز پریکٹس کر لیتے تو مجھ سے جیت جاتے۔''

''چلو پھر کبھی سہی۔'' ہم بولے۔ ''تم کل کی تیاری

کرو۔"

مختلف مقابلوں کے بعد کوارٹر فائنل میں دو خواتین ایڈنا اور اینا بھی شامل تھے جو اگین اور گووندا کو شکست دے کر کوارٹر فائنل میں پہنچی تھیں۔ ان کے علاوہ باقی افراد میں بیزک' کھارے' بجیوا' مصطفیٰ' سانتی اور ویس شامل تھے۔ سیمی فائنل میں دونوں خواتین نکل گئیں اور بیزک' کھارے' بجیوا' اور سانتی باقی رہ گئے۔ سیمی فائنل اور فائنل اگلے دن کھیلنا قرار پایا۔

............*......*

اگلے دن ممن کی مہربانی سے کلاس ختم ہونے کے بعد 6 بجے' صوفیانہ' کم چونگ' مہناز' ایڈنا اور ہم خاموشی سے شاپنگ کو نکل گئے۔ شاپنگ مال پہنچ کر ہم نے ممن سے درخواست کی کہ ہمیں وہ بوٹانیکل گارڈن والے شاپنگ ایریا میں لے جائے مگر اس کا کہنا تھا کہ اب دیر ہوگئی ہے اور وہ دکانیں بند ہو چکی ہوں گی یا بند ہونے والی ہوں گی لہٰذا وہاں جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ آپ یہاں سے ہی خریداری کر لیں۔

مال کے اندر داخل ہو کر صوفیانہ اور کم چونگ ہم سے علیحدہ ہوگئیں۔ ایڈنا ہم اور مہناز ساتھ ساتھ تھے۔ ایڈنا شروع میں تو ہمارے ساتھ رہی مگر جہاں میں نے اس پر سے توجہ کم کی' وہ خاموشی سے غائب ہوگئی۔ شاپنگ مال میں بھی دکانیں بند کرنے کا وقت تھا لہٰذا کچھ زیادہ خریداری تو نہ کر سکے۔ لے دے کے ایک باتک شاپ ہی تھی جہاں سے انڈونیشی معیشت کو سہارا دینے کے لیے ہم نے بچے کھچے ڈالرز بھی خریداری میں گنوا دیئے۔ جب ہم باتک شاپ پر خریداری کر رہے تھے تو باقی خواتین بھی وہاں آن پہنچیں۔ صوفیانہ نے حسب معمول تھیلا بھرا ہوا تھا بلکہ اس نے بھی باتک سے خریداری کی۔

"تم کہاں غائب ہوگئی تھیں؟" میں نے ایڈنا سے پوچھا۔

"میں شراکت برداشت نہیں کر سکتی۔" وہ کھر کھراتی سی آواز میں بولی۔ غصے میں نہ جانے کیوں اس کی نہ صرف آواز بھی بدل جاتی تھی بلکہ خدوخال میں بھی تبدیلی آجاتی تھی۔ ہم نے بھی اس کی شکل دیکھتے ہوئے زیادہ بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ واپسی پر ہمیں ٹورنامنٹ کے نتائج سے آگاہ کیا گیا جس کے مطابق سیمی فائنل میں کھارے اور بجیوا ہار گئے تھے اور فائنل بیزک اور سانتی کے درمیان ہوا جو سانتی نے جیت لیا جبکہ ہمارے اپنے خیال میں ہمیں کھارے کے فائنل میں پہنچنے کے بعد جیتنے کی امید تھی کیونکہ اس کی گیم بہت اچھی تھی۔

اس ٹیبل ٹینس ٹورنامنٹ کرانے کا خیال چونکہ لوگوں کے ذہن میں اچانک آیا تھا لہٰذا انعام کے طور پر جیتنے والے کے لیے چاکلیٹوں کا ایک ڈبہ رکھا گیا۔ اس کے علاوہ انعام میں ایک رنگین پرنٹڈ کپ بھی دیا گیا جس پر بعد میں تمام شرکاء نے دستخط کر کے اسے یادگار بنا دیا۔

............*......*

جدائی کے لمحات آن پہنچے تھے۔ ہمارے میزبانوں کو ہم سے زیادہ ہماری روانگی کا خیال تھا کہ مبادا کوئی جہاز مس نہ کر دے اور نہ صرف خود بھی خوار ہو بلکہ انہیں بھی خوار کرے لہٰذا ایک دن پہلے صبح ہی ہمیں روانگی کا شیڈول دے دیا گیا تھا جس کے مطابق دل اور رم اور دو استادان کی روانگی 12 بجے تھی۔ ایک گروپ جو اگلے دن صبح 3 بجے جا رہا تھا' اس کی فلائٹ 11 بجے تھی۔ ہم صبح چار بجے نکلتے جبکہ ہماری فلائٹ 1 بجے دوپہر کو تھی۔ ہمارے گروپ میں ہمارے علاوہ ایڈنا' سانتی اور اگین شامل تھے۔ نثالیہ کا بھی مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ اسے آخری گروپ کے ساتھ جا کر جکارتہ میں ایک ہوٹل میں شفٹ ہونا تھا جہاں سے وہ باآسانی فلائٹ پکڑ سکتی تھی۔

ڈپارچر شیڈول کو ہم نے غور سے دیکھا اور آج دل اور وم کا نام غور سے پڑھا پھر اس کے پاس گیا۔

"مبارک ہو۔" میں بولا۔ "تمہیں سرٹیفکیٹ بھی مل رہا ہے اور فلائٹ بھی۔"

"تھینک یو۔" وہ بولی۔ "آپ سے گفتگو کے بعد میں نے ان سے بات کی تھی۔ انہوں نے کہا کہ تم فکر نہ کرو' ہمیں خود اس بات کا خیال ہے۔"

"چلو' یہ بھی اچھا ہوا ورنہ تم بعد میں سرٹیفکیٹ کا انتظار ہی کرتی رہتیں اور اس کے علاوہ نثالیہ کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔"

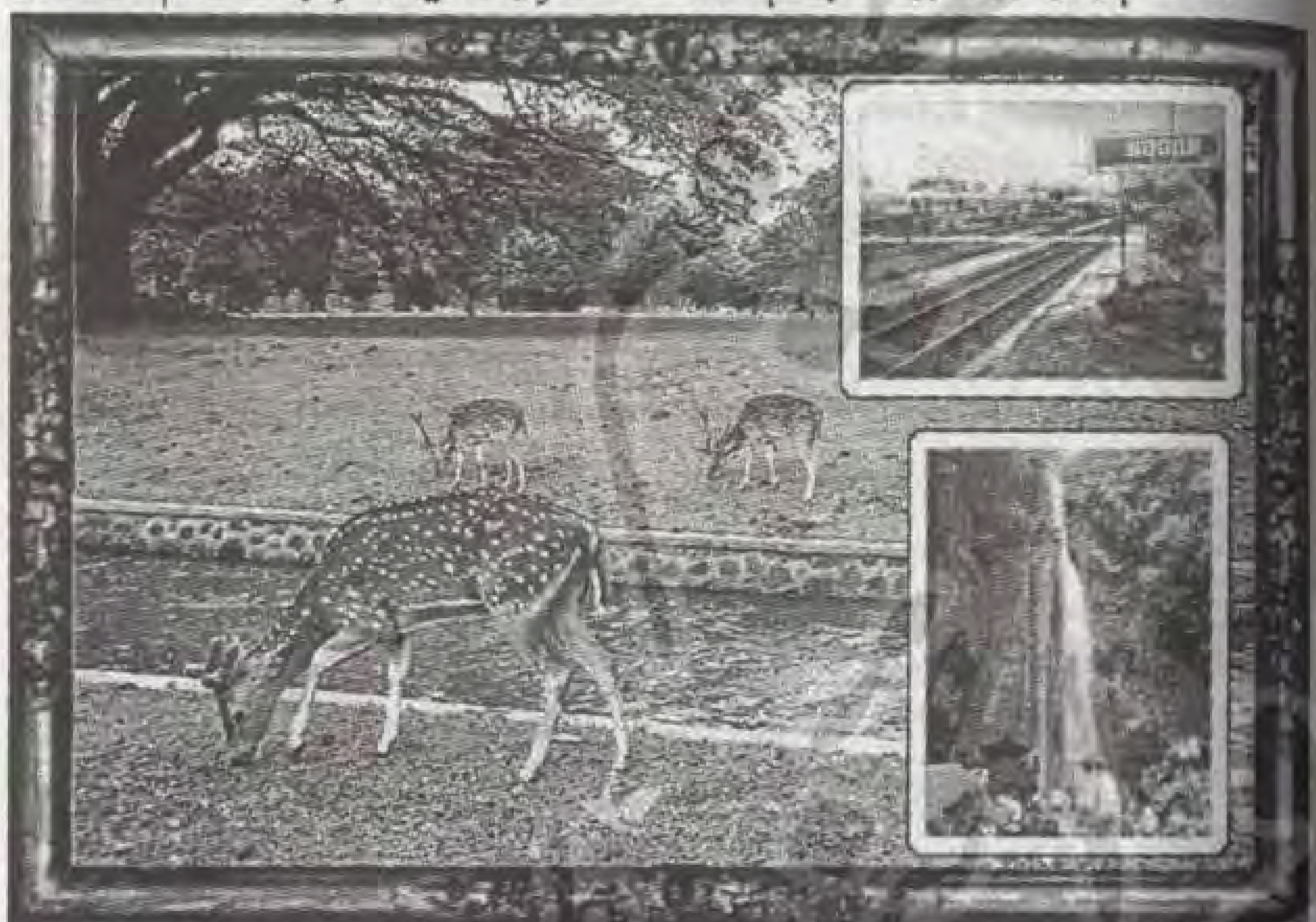
"ہاں' یہ اچھا ہوا۔"

"تمہیں پتا ہے' میں تمہارے پاس کیوں آیا ہوں؟"

"میرا مسئلہ حل ہونے پر مجھے مبارک باد دینے۔"

"نہیں......" ہم بولے۔ "میں تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ تمہارا نام پاکستانیوں جیسا ہے۔ یعنی دل آرام اور ہمارے پاس اس کا مطلب ہے' دل کو راحت پہنچانے والی۔"

"ہمارے ہاں بھی اس کا یہی مطلب ہے۔" وہ



ہنسی۔ "دل کو تسکین دینے والی۔"

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین!" ہماری گفتگو کا سلسلہ اناؤنسمنٹ نے توڑ دیا۔

ہم اس کی طرف متوجہ ہوئے جہاں رورو اعلان کر رہی تھی کہ ڈپارچر لسٹ میں تبدیلی ہوگئی ہے' آپ لوگ نئی لسٹ دیکھ لیں' شکریہ!"

نئی لسٹ کے مطابق ہمارے گروپ میں اب سنتھالی بھی شامل ہوگئی تھی۔ اصل میں اس کی فلائٹ پہ وقت 12:00 لکھا تھا۔ اس سے پہلے یہ سمجھا گیا کہ اس سے مراد رات کے 12 بجے ہے مگر ایئر لائن سے پتا کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ دن کے 12 بجے کا وقت ہے' یوں اب وہ ہمارے ساتھ جا رہی تھی۔

آخری دن کی کارروائی کے درمیان ہی دل آرام اینڈ پارٹی کو سرٹیفکیٹ دے کر روانہ کر دیا گیا۔ جاتے ہوئے وہ سب سے ملتی ہوئی ہمارے پاس بھی آئی۔

"میرے پاس آپ کا کارڈ ہے۔ پاکستان آئی تو آپ سے ضرور ملوں گی۔" وہ بولی۔

"یو آر موسٹ ویلکم!"

............*......*

سرٹیفکیٹ دینے کی تقریب کے اختتام کے ساتھ ہی الوداعی تصویریں کھنچوانے' گلے ملنے اور ایک دوسرے کو اللہ حافظ کہنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ انڈونیشیا کے مقامی شرکاء کو تو آج ہی' سٹی کو' چھوڑ دینا تھا اور واپس اپنی اپنی پوسٹنگ کی جگہوں پر چلے جانا تھا اس لیے وہ تو سب سے مل کر رخصت ہوگئے' بس مقامی آرگنائزنگ کمپنی کے افراد باقی رہ گئے جس میں ممن اور رورو بھی شامل تھے کیونکہ انہوں نے ہاسٹل سے ہماری روانگی کے انتظامات کرنا تھے۔

"صبح چار بجے ہماری روانگی ہے تو صبح کس وقت اٹھیں گے؟" ہم نے رورو سے پوچھا۔

"آپ فکر نہ کریں' ہم صبح 3 بجے آپ کو اٹھا دیں گے۔" وہ بولی۔

"میں تو یہ کہنا چاہ رہا تھا' صبح اٹھنے کے چکر میں نیند کہاں آئے گی؟ ایسا کرتے ہیں کہ سوتے ہی نہیں' رات

کولابی میں ہلا گلا کر کے اس رات کو یادگار بناتے ہیں۔"

"آئیڈیا تو اچھا ہے۔" وہ بولی۔ "مگر زیادہ تر لوگ اس سے اتفاق نہیں کریں گے کیونکہ ابھی لوگوں کو پیکنگ بھی کرنا ہوگی اور کچھ لوگوں کو ہر حال میں نیند آ ہی جاتی ہے۔"

"بات تو ٹھیک ہے۔" ہم بولے۔ "لابی کی رونق اینا تو چلی گئی۔ وہ ہوتی تو شور مچا کے کچھ لوگ ضرور اکٹھے کر لیتی۔"

............*......*

ہم نے احتیاطاً تین بجے کا الارم لگا لیا تھا مگر الارم کے بغیر ہی 3 بجے گاڑیوں کے شور سے ہماری آنکھ کھل گئی۔ ہم نے کھڑکی سے نیچے جھانک کے دیکھا' تین بجے جانے والی پارٹی جس میں دوسرے لوگوں کے علاوہ کھارے اور مہناز بھی تھے' گاڑیوں میں سوار ہو رہی تھی۔ ہم نے آواز دے کر انہیں متوجہ کیا اور کھڑکی سے ہی ہاتھ ہلا کر انہیں اللہ حافظ کیا اور خود بھی جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ نہا دھو کر' کپڑے بدل کر ہم ساڑھے تین بجے ہی کمرے سے باہر نکل آئے۔ سیڑھیاں اتر کر لابی میں پہنچے تو اس وقت صرف رات کا اٹینڈنٹ ہی لابی میں موجود تھا۔ ہم نے سر کے اشارے سے اسے سلام کیا اور باہر نکل آئے۔ لابی کے باہر مصنوعی روشنیوں کے درمیان کھڑی بلڈنگوں اور اردگرد کے پھول' پودوں اور درختوں کو ایک نم آلود اداس سے سناٹے نے اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ ہم کافی دیر وہاں کھڑے رہے اور سوچتے رہے کہ ہم نے یہاں یادگار دس دن گزارے ہیں۔ ہم یہاں آئے' بہت کچھ سیکھا' بہت کچھ پایا' نئے دوست بنے' نئے ساتھی ملے۔ یہاں ہمارے پاس کھونے کو کچھ بھی نہیں تھا مگر ان دس دنوں میں ہی اس قدر شدید رفاقتوں کے بچھڑنے کے خیال سے ملال سا ہو رہا تھا' گو کچھ ہی دیر میں ہم یہ جگہ چھوڑ دیں گے۔ واپسی پر اپنی زندگی کی روٹین میں پھنس جائیں گے مگر اس جگہ سے جڑی ہوئی خوشگوار یادیں ہمیشہ ہمارے دلوں میں محفوظ رہیں گی۔ ہم نہ جانے کتنی دیر وہاں کھڑے رہے پھر بوجھل قدموں سے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے واپس اپنے کمرے میں آ گئے۔

ابھی ہمیں کمرے میں داخل ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ کمرے کے دروازے پر دستک نے سناٹے کو توڑ دیا۔ دروازہ کھولا تو معلوم ہوا' اسٹاف کے لوگ ہمارا سامان لینے کو آ گئے ہیں۔ ہم نے سامان اُن کے حوالے کیا۔ ایک بار پھر کمرے کی تلاشی لی کہ کوئی اہم کاغذ رہ تو نہیں گیا ہو۔ معلوم ہوا کہ ویزا فیس کی رسید کونے میں پڑی تھی۔ وہ ہم نے جیب میں ڈالی۔ باہر نکلتے ہوئے جیب کو تھپتھپا کر پاسپورٹ اور ٹکٹ کے ہونے کا یقین کیا اور دروازے میں چابی لگی چھوڑ کر نیچے لابی میں آ گئے۔ نیچے پہنچے تو باقی افراد بھی آ چکے تھے۔ ایک گاڑی میں سانتی اور سنتھالی بیٹھے۔ دوسری میں ہم' اگین اور ایڈنا۔ گاڑی چل دی۔ خالی سڑک اور صبح کا ڈاس سناٹا' ایسا لگا کہ سبھی اداس ہیں اور کسی کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے۔ خاموشی سے رستہ کٹتا رہا۔

"اتریں جی' ایئرپورٹ آ گیا۔" ڈرائیور کی آواز پر ہم چونکے اور نیچے اترے۔ گھڑی دیکھی تو معلوم ہوا کہ ابھی صرف ساڑھے 5 ہی بجے ہیں۔ جاتے ہوئے جس سفر کو طے کرنے میں تین گھنٹے لگے تھے' واپسی پر وہ صرف ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہو گیا۔ ڈرائیور نے ہمارا سامان اتارا اور سائیڈ پر رکھ دیا۔ اگین سامنے سے ٹرالیاں پکڑ لایا۔ ابھی ہم اپنا سامان ٹرالیوں پر لاد ہی رہے تھے کہ سانتی اور سنتھالی بھی آن پہنچے۔ سامان ٹرالیوں پر لادا۔ لانے والوں کو خدا حافظ کہا تو انہوں نے گن کر سبز رنگ کے 5 بریک فاسٹ بکس ہمارے حوالے کیے۔ ہم مقامی آرگنائزنگ کمیٹی کے حسنِ انتظام کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے کہ انہوں نے ہمارے صبح کے ناشتے کا بھی خیال رکھا تھا۔

............*......*

آپس میں معلومات شیئر کیں تو پتا چلا کہ ہم اور اگین چونکہ تھائی ایئرلائن کی ایک ہی فلائٹ سے آئے تھے لہٰذا ایک ہی فلائٹ میں واپس بنکاک جا رہے ہیں۔ ایڈنا کو فلپائن ایئرلائن سے منیلا جانا تھا اور اگرچہ ایئرلائن الگ الگ تھیں مگر ہم تینوں کی فلائٹ کا وقت ایک ہی تھا یعنی ایک بجے جبکہ سانتی اور سنتھالی انڈونیشیا کی گرینڈا ایئرلائن کی ایک ہی پرواز سے 12 بجے بنکاک جا رہے تھے۔ سو آپس میں مشاورت کے بعد فیصلہ ہوا کہ ابھی سے ایئرپورٹ کے اندر جا کے بندھ جانے کے بجائے باہر ہی وقت گزارا جائے اور کوئی ساڑھے 9 بجے اندر جایا جائے۔

اب بیٹھنے کی جگہ کی تلاش ہوئی۔ ہمیں D2 سے اندر جانا تھا مگر بیٹھنے کی جگہ ہمیں D1 کے پاس ملی جہاں تین بینچ پڑے ہوئے تھے۔ اُن میں ایک خالی تھا۔ اس پر ہم نے ایڈنا اور سنتھالی کو بٹھایا۔ ٹرالیاں ان کے نزدیک کھڑی کیں اور خود کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر بعد بور ہونا شروع ہو گئے تو ہم نے اگین کو ساتھ لے کر ایئرپورٹ کا ایک جائزہ لینے کو پورے ایئرپورٹ کا ایک چکر لگایا اور واپس آ گئے۔

کچھ دیر بعد سانتی کو کافی کی طلب ہوئی تو وہ ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔ کافی دیر بعد وہ واپس آیا تو بولا۔ "ایئرپورٹ پر ایک بینک ہے جو بند ہے۔ ہمیں کرنسی اندر سے ہی جا کر بدلوانا ہوگی۔"

جو دکان ہماری نظروں سے چوک گئی تھی' اسے سنتھالی نے دیکھ لیا۔ اس نے ہمیں متوجہ کر کے منی چینجر کی دکان کے بارے میں بتایا۔ ہم تینوں اس دکان پر پہنچ گئے۔ اندر ایک خاتون بیٹھی تھیں' اس سے ڈالر کا ریٹ معلوم کیا تو اس نے بتایا کہ ایک ڈالر دینے کے عوض وہ ہم سے 9,900 روپیا لے گی جبکہ ہم نے یہاں آ کر ڈالر بدلوائے تھے تو ایک ڈالر کے عوض 9,650 روپیا ملے تھے۔ ہم نے ان سے درخواست کی کہ ڈالر کے ریٹ میں کچھ کمی کریں تاکہ ہم ڈالر خریدنے کی ہمت کریں مگر انہوں نے رُکھائی سے انکار کر دیا۔

"یہ منی چینجر تو بہت بڑے لٹیرے ہیں......" اگین بولا۔ "ایئرپورٹ کے اندر جا کر مقامی کرنسی بدلوائیں گے۔"

"ایسی غلطی مت کرنا۔" ایڈنا بولی۔ "اگر چینج کروانا ہے تو یہیں سے کروالیں۔ ایئرپورٹ کے اندر تو اور لوٹ ہوگی۔ میں ایسے ہی ایک دفعہ چین میں پھنس چکی ہوں۔ ٹیکس کے نام انہوں نے مجھ سے اچھی خاصی رقم کاٹ لی تھی۔"

ایڈنا کی بات سن کر ہم لوگوں نے بغیر مزید چوں چرا کیے ڈالرز خرید لیے۔ سنتھالی کو چونکہ اس چیز سے دلچسپی نہ تھی لہٰذا وہ وہیں بیٹھی رہی۔

نوٹ بدلوانے کے بعد واپس آ کر بینچوں پر بیٹھ گئے کیونکہ اس وقت تک دو بینچیں اور خالی ہو چکی تھیں۔ اگین کو جگہ ملی تو وہ لیٹ گیا اور تھوڑی ہی دیر میں بے خبر سو گیا۔ ہم نے اس خیال سے سونے دیا کہ اس کی فلائٹ بنکاک سے 18 گھنٹے بعد تھی لہٰذا اسے بنکاک پر کافی خوار ہونا تھا۔

بے کار بیٹھے بیٹھے ہم نے ایئرپورٹ پر آنے جانے والے افراد پر غور کیا تو ہمیں تین طرح کے افراد نظر آئے۔ ایک وہ جو کافی مذہبی ہیں۔ وہ جوق در جوق' گروہ در گروہ ایک جیسے لباس پہنے عمرہ کرنے جاتے دکھائی دیے۔ دوسرے وہ جو حجاب میں بھی تھے اور چست پینٹ شرٹ بھی پہنی ہوئی اور تیسرے وہ جو منی اسکرٹ اور جینز میں ملبوس تھے۔ پہلے طرح کے لوگ زیادہ تھے پھر دوسری طرح اور تیسری طرح کے لوگ اگرچہ کم تھے مگر تھے اور ان کی موجودگی پر کسی کو اعتراض بھی نہ تھا۔

ہم بیٹھے بیٹھے تھک گئے تھے کہ اچانک ہمیں ایک خیال آیا اور ہم ایڈنا کے پاس گئے۔

"تم ہمارے ساتھ چلنا پسند کرو گی؟" ہم نے پوچھا۔

"کہاں؟"

"یونہی ذرا ایئرپورٹ گھوم کے آتے ہیں۔"

"چلیں۔" وہ بولی۔

"پتا ہے' ہم نے تمہیں کیوں اٹھایا ہے؟" چلتے چلتے ہم بولے۔

"ہاں! اپنے دل کی بات کہنے کو۔" اس کے لہجے میں تیقن تھا۔

"تمہارا اندازہ غلط ہے۔" ہم بولے۔ "ہم نے تمہارے دل کی بات سننے کو اٹھایا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"تم نے ہم سے ایک وعدہ کیا تھا۔"

"کیا؟"

"اپنی کہانی سنانے کا۔ ابھی ہمارے پاس وقت ہے' بچھڑ گئے تو دل کی بات دل میں رہ جائے گی۔ کیا تم اپنی کہانی سنانا پسند کرو گی؟"

ایڈنا نے تعجب سے ہمیں دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔ کافی شاپ میں ایک میز پر ہم دو خالی کرسیوں پر جا بیٹھے اور کافی کا آرڈر دے دیا۔ جب تک کافی آئی' ایڈنا اپنی کہانی شروع کر چکی تھی۔ یہ داستان اس قدر دلچسپ اور پُراسرار تھی کہ ہمیں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں

چلا۔ وہ تو اگین نے ہمیں آ کر احساس دلایا کہ نو بج چکے ہیں، آ کر ناشتا کر لیں تا کہ پھر ایئر پورٹ کے اندر جانے کی تیاری کریں۔

ناشتا کر کے سیکورٹی چیک اپ کے بعد جب ہم ایئر پورٹ کے اندر داخل ہوئے تو ہماری خوش قسمتی سے تھائی ایئر کا کاؤنٹر سامنے ہی تھا۔ سانتی اور سنتھالی دائیں طرف انڈونیشیا کی گرینڈا ایئر لائن کے کاؤنٹر کی طرف چل دیئے جبکہ ایڈنا بائیں طرف کو فلپائن ایئر کے کاؤنٹر کی تلاش میں نکلی۔

''مسز کھان......!'' تھوڑی دور جا کر وہ رک گئی اور واپس آئی بولی۔ "You are really a nice person. I will miss you and remember you but do not forget your promise."

وہ ہمارے گلے لگ گئی۔ جدا ہوتے وقت اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اگین حیرت سے یہ الوداعی منظر دیکھ رہا تھا۔

''گڈ بائے اگین......!'' وہ اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولی اور چل دی۔ ہم کھڑے اس کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے اور ہاتھ ہلاتے رہے یہاں تک کہ آگے جا کے ایک موڑ پر نظروں سے اوجھل ہونے سے پہلے اس نے الوداعی ہاتھ ہلایا اور پھر غائب ہوگئی جیسے ہمیشہ ہو جاتی تھی۔

''چلیں سر......!'' اگین نے بول کر ہماری محویت کو توڑ دیا۔

....

تھائی ایئر کا کاؤنٹر 10 بجے کھلا۔ بورڈنگ پاس لیتے سامان جمع کرایا۔ ڈیڑھ لاکھ روپیا ایئر پورٹ ٹیکس دیا اور وہاں سے نکل کر خروج کی مہریں لگواتے امیگریشن کی لائن میں کھڑے ہوگئے۔ لائن میں کھڑے کھڑے یونہی میں نے اگین کا پاسپورٹ دیکھا تو علم ہوا کہ یہاں آمد پر ویزا لگوانے پر اسے تین ماہ کا ویزا دیا گیا تھا جبکہ ہمیں انڈونیشیا میں صرف 12 دن رکنے کی اجازت تھی۔

'واہ' کیا قدر ہے پاکستانیوں کی......!' ہم نے سوچا۔

فلائٹ میں ابھی تین گھنٹے باقی تھے' سو ایئر پورٹ گھومتے رہے۔ کچھ ڈالرز ایئر پورٹ پر بھی خرچ کر کے انڈونیشی معیشت کو اور مضبوط کیا۔ وقت ہوا تو جہاز میں بیٹھے اور بنکاک جا اترے۔

''تم اپنا وقت کیسے گزارو گے؟ تمہاری تو نیند بھی پوری نہیں ہوئی۔'' ہمیں اگین کی فکر تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ایئر پورٹ پر سو جائے اور کوئی اس کا سامان لے کر چمپت ہو جائے اسی لیے ہم نے اگین سے پوچھا۔

''آپ فکر نہ کریں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اپنے دوست کو فون کر دیا ہے' وہ مجھے آ کر لے جائے گا۔''

''کیا......؟'' ہمارا منہ حیرت سے پھٹ گیا۔ ''کیا تمہارے پاس بنکاک کا ویزا ہے؟ تم نے یہ بات مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی؟''

''بات دراصل یہ ہے کہ......'' وہ بولا۔ ''بھوٹان والوں کو یہ رعایت حاصل ہے کہ اگر ان کے پاس سرکاری سفارتی پاسپورٹ ہو تو انہیں ویزے کی ضرورت نہیں ہوتی اور میرے پاس سرکاری پاسپورٹ ہے۔''

'واہ رے پاکستان!' ہم نے دل میں سوچا۔ 'ہم نے اپنی حرکتوں کی وجہ سے اپنا وقار کس حد تک گرا لیا ہے کہ کچھ عرصہ پہلے تک جو قومیں ہمیں سر جھکا کے دیکھتی تھیں' ہماری عزت کرتی تھیں' آج ہم اُن کے آگے سر جھکانے کو مجبور ہیں۔ دنیا میں ہماری عزت کا جنازہ نکلتا جا رہا ہے اور کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہے۔'

ایک پوائنٹ پر آ کر اگین امیگریشن کی طرف بڑھ گیا اور ہم ٹرانزٹ میں گیٹ نمبر 8A تلاش کرنے لگے۔

بنکاک ہم 4 بجے پہنچے تھے۔ وہاں سے ہماری فلائٹ سات بیس پر تھی جو پاکستان کے وقت کے حساب سے رات پونے گیارہ بجے کراچی پہنچنا تھی۔ اُس پرواز پر جاتے ہوئے سفر کا وقت ساڑھے 4 گھنٹے تھا اور آتے وقت زمین کی حرکت کی وجہ سے ایک گھنٹہ بڑھ کر ساڑھے 5 گھنٹے کا ہو گیا تھا۔ اس فلائٹ پر اگرچہ سیٹ ہمیں ونڈو والی ملی تھی مگر اندھیرا ہونے کی وجہ سے باہر کا نظارہ مشکل تھا اور ویسے بھی آدھا جہاز خالی تھا لہٰذا ہم زیادہ تر سوتے رہے۔ فلائٹ اپنے مقررہ وقت پر کراچی پہنچی جہاں ہمارے گھر والے ہمارے استقبال کو کھڑے تھے' سو لوٹ کے بدھو گھر کو آ گئے......

☆☆......☆☆

کارِ جہاں دراز ہے

سنگلاخ دیواروں کے پیچھے سے جرم کی کوکھ میں پل کر مجرم بننے والوں کی عبرت ساماں دل سوز تحریریں، جن میں آنسوؤں کی نمی بھی ہے اور سسکتی ہوئی زندگی کے نوحے بھی

جرم کی صلیب

ڈاکٹر شاہ محمد تبریزی

آج کے حالات کی تصویر، ایک معصوم شخص کے مجرم بننے کی انوکھی داستان

نوید کو آج جیل میں گئے دوسرا دن تھا۔ اسے اچھی طرح سے یاد تھا کہ جب وہ اسّی ہزار روپے کا چیک کیش کرا کے بینک سے باہر نکلا تھا، تو اس کی بڑی بڑی آنکھوں والی، گول مٹول سی گڑیا جیسی معصوم بیٹی تین سالہ ربیعہ اس کے ساتھ تھی، پھر وہ موٹر سائیکل پر بیٹی کے ہمراہ سوار جب اپنے گھر کی جانب روانہ ہوا تھا، تو راستے میں اچانک اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے گرم گرم سلاخ اس کے پیر میں داخل کر دی ہو۔ اس نے یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کے پیر میں کیا چیز لگی ہے۔ جیسے ہی نیچے کی طرف نگاہ دوڑانے کے لیے جھکا تو اچانک اس کی موٹر سائیکل بے قابو ہو گئی اور وہ ایک گڑھے میں گر گئی۔

یہاں تک تو نوید کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس کے ساتھ یہ واقعہ بہ شکل حادثہ ہوا، لیکن اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ اسے معلوم نہیں، کیوں کہ درد کی شدت اور خون کے زیادہ بہہ جانے کے سبب اس پر یک دم نقاہت طاری ہو گئی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو اسپتال کے بستر پر پایا۔

☆......☆

درد کی شدت اب بھی برقرار تھی اور وہ تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے، کیوں ہے اور کیسے ہوا؟ وہ یہ دیکھ کر وہ اور بھی پریشان اور حیران تھا کہ اس کے بستر کے قریب دو پولیس اہلکار وردی میں ملبوس موجود تھے۔ ایک طرف ایک نرس ہاتھ میں انجکشن لیے کھڑی تھی اور ساتھ ہی ایک ڈاکٹر بھی کھڑا تھا، جو غالباً نوید کے ہوش میں آنے کا منتظر تھا، جب کہ اس کے سرہانے اس کی بیوی نعیمہ کھڑی تھی، جو شکل ہی سے مغموم و معصوم لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار تھی کہ رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

"یہ سب کیا ہے اور میں کہاں ہوں...... یہ...... یہ...... پولیس......"

نوید کی آواز یک دم اس کے گلے میں پھنس کر رہ گئی، پھر جب اس نے اپنا سیدھا پیر، سیدھا کرنا چاہا تو درد کے مارے اس کی چیخ نکل گئی۔

نرس نے فوراً آگے بڑھ کر نوید کے پیر کو پکڑ لیا اور اسے پیر سیدھا کرنے سے روک دیا اور کہا۔

"آپ کے سیدھے پیر میں گولی لگی ہے۔ جو گوشت کو چیرتی ہوئی نکل گئی ہے، لہٰذا آپ ابھی پیر کو سیدھا نہ کریں، بلکہ اسے اسی طرح لٹا کر رکھیں، ورنہ آپ کی تکلیف میں مزید اضافہ ہو گا اور یہ کہ زخم ابھی تازہ ہے۔ لہٰذا زیادہ حرکت دینے کی وجہ سے خون کا رساؤ دوبارہ شروع ہو سکتا ہے، ہم نے پٹی تو کر دی ہے، لیکن پھر بھی احتیاط کی از حد ضرورت ہے۔"

ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر درد کم کرنے اور زخم جلد بھرنے کا انجکشن لگایا اور پھر ڈاکٹر اور نرس کمرے سے باہر چلے گئے۔ اب کمرے میں نوید کی چارپائی کے قریب دو پولیس اہلکار اور اس کی بیوی رہ گئے۔

"ربیعہ کہاں ہے؟" نوید نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بے چین ہو کر پوچھا۔

ایک پولیس اہل کار نے اس کے قریب آ کر اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے گھورتے اور اپنے روایتی انداز کو اپناتے ہوئے بڑے سخت اور درشت لہجے میں کہا۔

"اوئے! جلدی بتا، تیرا دوسرا ساتھی کدھر ہے...... تو نے جو ڈکیتی کی ہے، وہ مال کدھر چھپایا ہے۔"

نوید اس اچانک لفظی حملے کے لیے قطعاً تیار نہ تھا، اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ شریف سے ڈکیت بنا دیا جائے گا۔

اس نے پولیس اہلکار کی طرف غمگین نظروں سے دیکھا اور کہا۔

"مجھے نہیں معلوم، آپ کیا کہہ رہے اور مجھے کیوں ڈکیتی کے کیس میں پھنسا رہے ہیں۔"

پولیس اہل کار نے اسپتال کو تھانہ سمجھتے ہوئے شعلہ بار نگاہوں سے نوید کی طرف دیکھا اور کسی ناگ کی طرح پھنکارتے ہوئے کہا۔

"دیکھ اوئے معصومیے! ساڈے نال مخول نہ



کریں...... سیدھے نال بتائیں...... ڈکیتی کیتی اے یا نہیں۔"

نوید نے نفی میں سر ہلایا تو پولیس اہل کار نے دانت پیستے ہوئے نوید کے گریبان کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

☆......☆

نوید کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ...... یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

اس کی شریک حیات تھی کہ صرف آنسو بہائے جا رہی تھی۔ اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ زبان گنگ اور نگاہیں جامد تھیں۔ وہ خاموشی سے ٹکٹکی باندھے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی، ایسا لگتا تھا کہ وہ پتھر کی ہو چکی ہے۔ غالباً اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اب اس کا مقدر صرف آہیں اور سسکیاں ہیں۔

☆......☆

آج چار دن بعد نوید کو اسپتال سے خارج کر دیا گیا، گو کہ زخم ابھی پوری طرح سے مندمل نہیں ہوا تھا، لیکن پولیس اسے اپنے ساتھ تھانے لے آئی ہے اور اس سے جبراً یہ بیان لینا چاہتی ہے کہ وہ ڈکیت ہے اور اس نے ایک بنگلے میں ڈکیتی کی ہے اور یہ کہ اس کے پاس سے ایک پستول بھی برآمد ہوا ہے، جس سے دو فائر بھی کیے گئے ہیں۔

پولیس اہل کار کی زبانی یہ سب کچھ سن کر نوید حیران رہ گیا اور اس کے اوسان تو یہ سن کر خطا ہو رہے ہیں کہ وہ ایک ڈاکو ہے......

حالاں کہ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ ایک عزت دار، شریف آدمی ہے، جس کی دوڑ صرف آفس سے گھر تک ہے یا پھر گھر سے بازار تک، بس......اور اگر بہت زیادہ سرگرمی دکھائی تو اپنی چہیتی اور پیاری بیٹی کو موٹر سائیکل پر بٹھا کر کسی تفریحی مقام تک چلا گیا اور پھر گھر کی طرف شام سے پہلے پہلے واپس ہو گیا۔ کیوں کہ شہر کے مخدوش حالات اور امن و امان کی بدتر صورت حال سے وہ خود بھی واقف ہے، اس لیے وہ اس طرح کا کوئی رسک نہیں لیتا، جس میں "کرے کوئی اور بھرے کوئی" کی مصداق اس کی گردن پھنسے۔ اسے یہ بھی پتا ہے کہ اس کے یا اس کی بیوی کے کوئی قریبی رشتے دار نہیں ہیں اور جو چند ایک گنے چنے دور کے قرابت دار ہیں بھی تو ان سے ان کا کوئی تعلق اور واسطہ نہیں ہے۔

نوید تو صرف یہ جانتا ہے کہ اس کا تعلق ایک شادی شدہ شخص ہونے کے ناتے صرف اس کی بیوی سے ہے، جس کی بطن سے اس کی ایک خوب صورت سی، چاند جیسی دودھیا رنگ کی، معصوم شکل بیٹی ہے۔ جس کا نام ربیعہ ہے......اور واقعۂ مذکور کے وقوع کے وقت وہ بھی اس کے ساتھ تھی۔

لیکن یہ کیا کہ میرے پاس سے پولیس نے ایک پستول بھی برآمد کر لیا ہے اور میری وہ پھول سی بچی......

آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے......نوید نے اپنے سر کو اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر رکھ لیا۔ کچھ دیر خاموش رہی، پھر نوید نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور اس نے پولیس اہل کار سے پوچھا۔

"میری بیٹی کہاں ہے؟"

پولیس اہل کار...... "ہمیں نہیں معلوم۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ ہم نے تمہیں رنگے ہاتھوں گرفتار کیا ہے۔"

نوید بولا۔ "لیکن جناب! میں نے تو کوئی جرم ہی نہیں کیا ہے۔"

یہ سن کر پولیس اہلکار نے خوف ناک لہجے میں ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اور پھر بولا۔ "ہر مجرم جب پکڑا جاتا ہے تو یہی کہتا ہے۔" اس نے نوید کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تمہاری جیب سے ایک بڑی رقم برآمد ہوئی ہے، اور ساتھ ہی ایک پستول بھی......"

نوید نے پولیس اہل کار کی طرف حیران کن نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ پیسے میرے ہیں، جو میں نے بینک سے نکلوائے تھے۔"

پولیس اہل کار نے نوید کی بات کو سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے کہا۔

"تم جھوٹ بولتے ہو، تم نے ڈکیتی کی ہے۔"

پولیس اہلکار نے قریباً چیختے ہوئے کہا۔

"بینک سے ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا، ہم نے پوری انکوائری کر لی ہے۔"

یہ سن کر نوید کو ایک دم جھٹکا سا لگا۔

"یہ کیا ہوا...... اور میرے پیسے...... وہ کیا ہوئے......اور میری بیٹی......وہ کہاں گئی......"

ایک دم کئی سوال اس کے ذہن میں آئے اور وہ کہیں دور سوچوں میں گم ہو گیا۔

پولیس اہل کار بلا تکان مسلسل یہی کہے جا رہا تھا کہ...... "ہمیں اپنے ساتھیوں کے بارے میں بتاؤ، وہ کہاں ہیں۔ ورنہ ہم تمہیں......"

وہ مسلسل دھمکی پر دھمکی دیے جا رہا تھا......

☆......☆

نوید کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کس طرح سے اپنی بے گناہی، ان فرشتوں کے سامنے ثابت کرے...... جو ہر شریف آدمی کو مجرم سمجھتے اور اسے جرائم کا بادشاہ بنانے پر تلے رہتے ہیں......

نوید اس وقت بڑا مجبور و بے بس تھا، بالکل اس شیر کی طرح جو کچھار میں بند ہو تو شیر نہیں رہتا، اور سلاخوں کے پیچھے تو شیر بھی غرانا بھول جاتا ہے۔

پولیس نے اس کے تمام کاغذات اور سیل فون بھی اپنے قبضے میں کر لیا تھا اور اس وقت تک دینے سے انکاری تھے، جب تک وہ اپنے جرم کا اقرار نہ کر لے۔

☆......☆

گو کہ پولیس نے اپنے طور پر تمام انکوائری کر لی تھی اور انہیں اب تک کوئی ایسا ثبوت نہیں ملا تھا کہ جس سے یہ ثابت ہوتا کہ نوید نے کوئی ڈکیتی کی ہے یا کسی سے لوٹ مار۔

لیکن اب اسے اپنی اَنا کا مسئلہ بنا لیا تھا اور اسے ہر حال میں اپنی ناک اوپر رکھنا تھی...... پھر یہ کہ اسے اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے بھی کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔

بے شک ایک بے گناہ انسان ان کے ہاتھوں جرم کی صلیب پر چڑھنے جا رہا تھا...... لیکن! انہیں اس سے کیا غرض کہ ناکردہ جرم کی صلیب پر کون چڑھ رہا ہے۔

یہاں دیکھنے والی بات یہ ہے کہ بے گناہوں کو اس صلیب پر کون چڑھا رہا ہے؟ وہی جو جرم کی صلیب کو توڑنے والا اور قانون کا رکھوالا ہے...... وہ جس نے مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے اور عام لوگوں کی جان و مال و عزت و آبرو کی حفاظت کا حلف اٹھایا ہے۔

☆......☆

آج پولیس نے اپنا چالان عدالت میں جمع کرا دیا ہے اور اس میں جو رپورٹ نوید کے خلاف دی گئی ہے......وہ یہ ہے کہ......

"نوید ایک ڈکیتی ہے اور یہ چھوٹی موٹی ڈکیتیاں آئے روز کرتا رہتا ہے۔ وقوعہ والے روز بھی اس نے ڈکیتی کی......اس کے زیادہ تر شکار وہ لوگ ہوتے ہیں جو بینکوں سے چیک یا اے ٹی ایم کے ذریعے رقم نکلوا کر جاتے ہیں......اس کے ساتھی بینک برانچ کے اندر اور باہر موجود ہوتے ہیں، جو ہر شخص پر نظر رکھتے ہیں، جو کیش لے کر بینک سے باہر نکلتا ہے......اس کے ساتھی اس شخص کے حلیے سے اشاروں کنایوں میں تمام صورت حال سے اسے آگاہ کرتے ہیں، حتیٰ کہ رقم کی مقدار تک بتا دیتے ہیں۔ اس کام کے لیے انہوں نے اپنے کوڈ ورڈ مختص کر رکھے ہیں...... یہ ایک دم بڑی رقم پر ہاتھ نہیں ڈالتے...... بلکہ مختلف بینکوں سے دو چار وارداتیں چھوٹی موٹی رقموں کی کر کے اپنا کوٹا پورا کر لیتے ہیں...... یہ دس بیس ہزار کی رقم لوٹنے اور مزاحمت کرنے پر گولی مارنے سے بھی دریغ نہیں کرتے...... اس حوالے سے یہ خطرناک مجرم ہے......لہٰذا اسے سخت سزا دی جائے۔

☆......☆

پولیس اہلکار نے نوید کے خلاف عدالت میں جمع کردہ چالان میں نوید کی طرف سے کوئی گواہ نہ ہونے اور نوید کو پسِ زنداں کرنے کے لیے جج سے سخت سزا کا مطالبہ کیا تھا......ساتھ ہی اس نے وہ پستول بھی جج کے سامنے پیش کیا، جس کے بارے میں پولیس نے دعویٰ کیا تھا کہ یہ پستول مجرم نوید کا ہے اور اس سے اس نے پولیس پر دو فائر بھی کیے تھے۔ ہم نے اسے پولیس مقابلے میں گرفتار کیا ہے۔ پولیس نے ملزم سے رقم برآمد کرنے کا بھی دعویٰ کیا اور ثبوت کے طور پر چالیس ہزار روپے عدالت میں جج کے روبرو پیش کر دیے۔

☆......☆

عدالت لگی ہوئی ہے، جج صاحب مسندِ عدل پر براجمان ہیں۔ ان کے دائیں بائیں اردلی چاق چوبند

کھڑے ہیں۔ ان کے سامنے نوید مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا ہے اور اس کے ہاتھ میں پولیس نے ہتھکڑی ڈالی ہوئی ہے...... گو کہ ملزم کو ہتھکڑیاں لگا کر مجرموں کی طرح پیش کرنے کی اجازت ہمارا قانون نہیں دیتا...... لیکن قانون پر عمل درآمد پولیس کرتی کب ہے...... اگر پولیس اتنی ہی فرض شناس اور قانون کی پابند ہوتی تو آج وہ نوید کی بجائے اصل مجرم کو گرفتار کر کے عدالت میں پیش کرتی۔

نوید کی بیوی بھی عدالت میں موجود ہے اور اس کی آنکھوں سے اسی طرح آنسوؤں کی دھار بہہ رہی ہے، جیسی اسپتال میں چشمۂ آب بن بہہ رہی تھی...... جب اس نے اپنی بیٹی کو نیم مُردہ حالت میں، اسپتال میں دیکھا تھا...... اور نیوروسرجن نے یہ بتایا تھا کہ موٹر سائیکل سے گرنے کی وجہ سے اس کے سر میں شدید چوٹیں آئی ہیں، جس نے اس کے دماغ کو مفلوج کر دیا ہے اور وہ کومے میں چلی گئی ہے۔

ڈاکٹر کا یہ بھی کہنا تھا کہ ہم اسے بچانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں...... لیکن چوں کہ وہ حالت کومہ میں ہے، اس لیے ہم اس بارے میں کوئی بات حتمی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ...... ہاں اگر وہ ہوش میں آجاتی ہے، تو پھر اس کا باقاعدہ علاج شروع کیا جا سکتا ہے اور اس کا بچنا بھی ممکن ہے۔

بہر حال آپ اللہ کی بارگاہ میں بچی کی صحت یابی کے لیے دعا کرتی رہیں...... شاید کوئی معجزہ ہو جائے۔
ڈاکٹر نے نعیمہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

☆......☆

نعیمہ...... نوید کی بیوی...... اور ربیعہ کی ممتا...... بیٹی اور شوہر کے مابین صدمہ و غم، دکھ و رنج و الم کی صلیب پر لٹکی ہوئی تھی۔

اس کا ایک پیر نوید کی طرف کبھی اسپتال اور کبھی تھانے میں رہا اور اب عدالت اور بچی کی طرف...... اس کے اسپتال میں ہے۔

ایک طرف وہ پولیس والوں کو دیکھتی ہے اور پھر اپنے شوہر کے چہرے کی طرف دیکھ کر افسردہ سی ہو جاتی ہے، تو دوسری طرف اسپتال میں ڈاکٹروں کی طرف دیکھتی ہے اور پھر بچی کی طرف دیکھ کر خدا کی بارگاہ اپنے دوپٹے کے پلو کو پھیلا کر یوں التجا کرتی ہے......

''یارب...... تو ہی رحیم و کریم...... تو کارساز ہے...... اس معصوم بچی کی آخر خطا کیا ہے جو اسے اتنی بڑی سزا ملی ہے......

''اے میرے رب! میری عمر بھی اس بچی کو لگا دے...... مگر اسے صحت یاب کر دے۔''

لجاجت و رقت سے پُر، آنسوؤں کی جھڑی کے ساتھ وہ اپنے رب کی بارگاہ میں دعا گو ہے کہ اس کا شوہر اور اس کی بچی جلد اس سے آملیں۔

ادھر نعیمہ جب اپنے شوہر کی طرف آتی ہے، تو اپنے رب کی بارگاہ میں یوں دعا گو ہوتی ہے۔

''اے میرے رب! تو ہی جبار و غفار و ستار ہے...... تو ہی عالم الغیب ہے...... دلوں کے نہاں رازوں کو بھی تو جانتا ہے...... یارب...... میرے شوہر کو اس ناگہانی عذاب سے چھٹکارا دلا...... اصل میں عادل و نصف تو ہے...... یہ زمین پر رہنے والے منصف بھلا کیا انصاف کریں گے۔

☆......☆

عدالت لگی ہوئی ہے...... جج صاحب مسندِ عدل پر براجمان ہیں۔

جج نے پولیس رپورٹ پڑھ کر نوید کو سنائی، تو وہ اپنے اوپر لگے الزامات کو سن کر پریشان ہو گیا، ساتھ ہی وہ حیرت کدوں کے سمندر میں کھو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ ڈکیتی کرنے اور بلا لائسنس پستول رکھنے، پھر پولیس پر دو فائر کرنے کا الزام ہے ہی جھوٹا، لیکن یہ کیا ہوا کہ...... اسی ہزار روپے، جو میں نے بینک سے نکلوائے تھے، وہ یکدم چالیس ہزار روپے میں کیسے بدل گئے...... وہ اس موقع پر حیرتوں میں گم پولیس کی ایمان داری کی داد دے رہا تھا، کہ یکدم جج صاحب کی آواز پر چونکا۔

☆......☆

جج نے نوید سے پوچھا۔
''کیا تم پر ڈکیتی کا جو الزام ہے، وہ دُرست ہے...... نیز یہ کہ تم نے ڈکیتیاں بھی کی ہیں اور تمہارے پاس سے ڈاکے میں چھینی ہوئی رقم اور ایک عدد پستول بھی

برآمد ہوا ہے، جس کے ذریعے تم ڈاکے ڈالتے ہو۔
نوید نے اس موقع پر خاموشی اختیار کی تو جج نے پھر پوچھا۔

ابھی نوید نے کچھ کہنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ ساتھ کھڑے پولیس اہلکار نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

نوید اس کے اس اشارۂ ابرو کو برابر سمجھ گیا۔

اسے پتا تھا کہ اگر اس نے اس وقت پولیس کے یاد کرائے سبق سے روگردانی کی تو اس حکم عدولی کے بعد تو اسے عدالت سے نکل کر بہر صورت واپس تھانے ہی جانا ہے اور اسے انہیں پولیس اہلکاروں کی کسٹڈی میں رہنا ہے، کیوں کہ انہوں نے اس کا ریمانڈ لیا ہوا ہے۔

لہٰذا...... اگر اس نے زبان کھولی تو یہ پولیس اہل کار، جیسا کہ وہ کہہ چکے ہیں، اسے چہرے پر چیرا لگا دیں گے...... وہ اسے تشدد کر کے ہی مار دیں گے، یا پھر کسی گینگ وار گروپ یا ٹارگٹ کلر کے حوالے کر دیں گے، جو اس کا کام تمام کر دیں گے...... پولیس اس حوالے سے ہر طرح کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تمام حربوں اور داؤ پیچ سے واقف ہے۔

اس لیے نوید نے جج کے سامنے خاموش رہنے ہی میں عافیت جانی۔

اسے پتا تھا کہ پولیس نے محض اپنی اَنا کی تسکین اور رجسٹر کا پیٹ بھرنے کے لیے اس کا انتخاب کر لیا ہے...... لہٰذا! اب اس سے مفر ممکن نہیں۔

اسے یہ بات بھی اچھی طرح سے معلوم تھی کہ اگر اس نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی، جو پولیس کے مزاج کے خلاف ہے، تو اپنی جان سے جائے گا۔ لہٰذا مناسب یہی ہے کہ تین سال کی سزا کاٹ کر عزت سے بری ہو جائے۔

☆......☆

نوید نے جج کے سوالوں کا جواب نہ دیا...... بلکہ اس نے تمام الزامات کو قبول کرتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا دی...... گویا اس نے طوعاً کرہاً اپنے ناکردہ گناہوں کا اعتراف کر لیا۔ اس طرح اب وہ ملزم سے مجرم بن چکا تھا۔

☆......☆

عدالت نے نوید کو تین برس قید اور پچاس ہزار روپے جرمانے کی سزا سنائی......
جب کہ جرمانے کی عدم ادائیگی کی صورت میں اسے مزید ایک برس سزائے قید بھگتنا ہوگی۔

☆......☆

عدالت نے اسے جیل بھیجنے کا حکم دے دیا اور نوید کو تھانے کے لاک اپ سے نکال کر سینٹرل جیل کی اونچی اونچی فصیلوں کے مابین قائم کال کوٹھری میں پہنچا دیا گیا...... جہاں اسے طرح طرح کے جرائم پیشہ افراد ملے، لیکن اسے بہت سے لوگ ایسے بھی ملے، جو اس ہی کی طرح سے بے گناہ تھے...... اور...... چھل جیت گیا، نصیب ہار گیا، کی مصداق اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹ رہے تھے...... یہ قانون کے رکھوالوں کا کمال تھا کہ جس کا کوئی جرم ہی نہیں تھا...... انہیں بھی اپنی کالی کتاب کے ذریعے...... عدالت کو جُل دے کر اپنے ساتھ شامل کر کے مجرم بنا دیا تھا۔

☆......☆

دراصل ہوا کچھ یوں تھا کہ جب نوید بینک سے رقم لے کر گھر کی طرف روانہ ہوا تو کچھ دور جانے کے بعد ملیر ندی کے کنارے سے مُڑتے ہوئے اسے ایک موٹر سائیکل پر سوار دو افراد نظر آئے، جو بڑی جلدی میں معلوم ہو رہے تھے...... وہ بڑی تیزی کے ساتھ نوید کی موٹر سائیکل سے قریب سے گزرے اور چند ہی لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہو گئے...... نوید یہ صورت حال دیکھ کر سہم کر ایک طرف کو ہو گیا اور جلدی میں ان کے چہرے بھی صحیح طور سے نہ دیکھ سکا...... گھبراہٹ میں اس نے گاڑی کی رفتار کم کرنے کے بجائے بڑھا دی......

ابھی انہیں گئے چند ہی منٹ گزرے ہوں گے، کہ اچانک نوید کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس کے سیدھے پیر میں کوئی گرم گرم سلاخ داخل ہو گئی ہے...... اس نے محسوس کیا کہ گرم گرم سیال لہو تیزی سے اس کے پیر سے نکل کر اس کے موزوں کو تر کرتا ہوا اس کے جوتے کے تلے میں جمع ہو رہا ہے...... ابھی وہ صورت حال کی نزاکت کو سمجھ بھی نہ پایا تھا کہ اس کی موٹر سائیکل ایک پتھریلے گڑھے میں گر گئی اور اس کی بیٹی ربیعہ، جو اس کے

آگے پیٹ سے لگی، اس کی کمر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے بیٹھی تھی...... ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ دور جاگری اور اس کا نرم و نازک پھول جیسا سر زمین کے ایک سخت حصے کے ساتھ جا ٹکرایا...... اس چوٹ نے اس کے نرم و نازک دماغ کو شدید طور پر متاثر کیا۔

☆......☆

جو موٹر سائیکل سوار نوید کے قریب سے تیزی سے گزرے تھے، وہ دراصل ڈکیت تھے اور ایک بینک کے اے ٹی ایم کے ذریعے رقم نکلوا کر نکلنے والے ایک شخص سے گن پوائنٹ پر رقم چھین کر فرار ہو رہے تھے کہ پولیس کی زد میں آگئے...... لیکن ٹریفک زیادہ ہونے کے سبب موٹر سائیکل سوار تو نکل گئے اور پولیس موبائل پیچھے رہ گئی۔ جب پولیس وین اس مقام تک پہنچی، جہاں نوید اپنی بچی کے ہمراہ اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا...... جو ملیر ندی قریب واقع حاجی گوٹھ سے متصل رحیم کالونی میں تھا...... تو پولیس نے پیچھے لگے موٹر سائیکل کے رجسٹریشن نمبر کو دیکھا...... جو بالکل وہی تھا...... جو مجرموں کی نمبر پلیٹ پر تھا...... یعنی مجرم موٹر سائیکل پر جعلی نمبر پلیٹ لگا کر ڈکیتی کر کے بھاگ رہے تھے...... لیکن پولیس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ...... بلا کسی تحقیق و تصدیق کے...... اور یہ دیکھے بغیر کہ اس کے آگے کوئی چھوٹی سی معصوم بچی بیٹھی ہوئی ہے...... نوید پر گولی چلادی...... جو کہ اس کے سیدھے پیر کی پنڈلی کے گوشت کو چیرتی ہوئی باہر نکل گئی......

اور پھر نوید......

☆......☆

نوید کی جیب سے جو رقم برآمد ہوئی...... اسے دیکھ کر پولیس اہل کاروں کی نیت خراب ہوگئی اور انہوں نے فوری طور پر آدھی رقم کا بٹوارہ کرلیا...... اور نصف رقم کی رپورٹ بنا کر عدالت میں پیش کردی...... نہ صرف یہ بلکہ ایک عدد پستول اپنی زنبیل سے نکال کر نوید کی ملکیت کردیا۔

☆......☆

دونوں ڈکیت جس راستے سے گزر کر اپنی پناہ گاہ میں پہنچے، وہ ملیر ندی کا وہ سنسان و ویران راستہ ہے، جس کے دونوں طرف گھنی جھاڑیوں کے درمیاں گندآب کی گزرگاہیں ہیں...... اس کے ساتھ ہی چھوٹی چھوٹی آبادیاں ہیں، جو ندی کے کافی اندر تک چلی گئی ہیں۔

ملیر ندی اس حوالے سے بھی بہت مشہور ہے کہ یہاں سے ٹنوں کی مقدار میں روزانہ ریتی بجری نکالی جاتی ہے، جو قانون کے رکھوالوں کی روزی کا بڑا ذریعہ ہے۔

بارش کے دنوں میں نصف شہر کا پانی اس ندی میں سماتا ہے۔ طغیانی سے بچنے کے لیے اس کے اطراف میں پتھروں کے بڑے بڑے پشتے تعمیر کیے گیے ہیں۔ ندی کے اندر اس کے کناروں پر قائم صنعتی اداروں کا پانی ہمہ وقت گرتا رہتا ہے، جب کہ سیوریج، یعنی نصف شہر کا گند آب بھی اس ندی کی نذر ہو جاتا ہے...... اور انہیں زہریلے، کیمیکل ملے، مضر صحت پانی سے ندی میں نہ صرف کاشت کاری کی جاتی ہے، بلکہ اس کے اطراف جانوروں کے لیے اُگائے جانے والے سبزے وچٹھے بھی لہلہاتے ہیں...... یہاں انسانوں کے لیے مضر صحت سبزیاں بھی اُگائی جاتی ہیں...... جب کہ فروٹ کے باغ بھی انہیں پانیوں سے سیراب کیے جاتے ہیں۔

ان مضر صحت سبزیوں اور پھلوں کے حوالے سے بارہا خبریں اخبارات کی زینت بھی بنتی رہتی ہیں...... مگر "ڈھاک کے تین پات" کے مصداق کوئی کارروائی نہ ہوئی...... وجہ پولیس کی روایتی بے حسی ہے۔

☆......☆

جس وقت پولیس جائے وقوعہ پر پہنچی تھی، تو نوید ہوش وحواس میں تھا...... اس کے جسم پر خراشیں تو کئی آئی تھیں...... لیکن وہ ایسی نہ تھیں کہ جسے گھائل کرنے والی کہا جاتا......

دراصل نوید خوف وہراس کا بھی شدید طور پر شکار ہوگیا، اور اس کے پیر میں لگی گولی نے اسے سخت گھائل کردیا......

لیکن اس کے باوجود پولیس نے اپنے روایتی حربوں کا استعمال کرتے ہوئے اس کی جامہ تلاشی اور پوچھ گچھ میں اس قدر وقت ضائع کردیا کہ نہ صرف نوید اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا...... بلکہ اس کی معصوم سی کلی جیسی بیٹی بھی موت کی پٹی سے جالگی۔

ٹائی ٹینک

4 اپریل 1912ء کو دنیا کا مشہور بحری جہاز ٹائی ٹینک اپنے اولین بحری سفر کے دوران ایک آئس برگ سے ٹکرا کر بحراوقیانوس میں ڈوب گیا۔ ٹائی ٹینک کا وزن 46328 ٹن اور لمبائی 882.5 فٹ تھی۔ یہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا بحری جہاز تھا اور اس کے بارے میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ "یہ کبھی نہیں ڈوب سکتا"۔ 10 اپریل 1912ء کو یہ جہاز تقریباً بائیس سو مسافروں کے ہمراہ اپنے پہلے بحری سفر پر روانہ ہوا جہاز کے کپتان کا نام ای جے اسمتھ تھا وہ ایک تجربہ کار کپتان تھا۔ اس نے کوشش کی کہ وہ بحراوقیانوس کو سب سے کم مدت میں عبور کرنے کا نیا عالمی ریکارڈ قائم کرے، چنانچہ اس نے جہاز کو انتہائی تیز رفتار سے چلانا شروع کیا اور ان انتباہی اطلاعات پر کان نہیں دھرے کہ سمندر میں آئس برگ موجود ہیں۔ 14 اپریل 1912ء کو رات 11 بج کر 40 منٹ پر ٹائی ٹینک ایک آئس برگ سے ٹکرا گیا اور اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ جہاز میں لائف بوٹس نہایت مختصر تھیں جن کی مدد سے صرف 755 افراد اپنی جان بچا سکے اور باقی مسافر جن کی تعداد 1490 سے 1635 کے درمیان بتائی جاتی ہے ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔

☆......☆

پولیس نے نوید اور اس کی بیٹی کو اسپتال پہنچایا...... لیکن اسپتال والوں نے اس کی بیٹی ربیعہ کو ایک دوسرے اسپتال میں منتقل کردیا...... جہاں دماغ کے علاج کی مکمل سہولت حاصل تھی۔

نوید اس حوالے سے کم از کم پولیس کا شکر گزار تھا کہ انہوں نے نوید کے شناختی کارڈ پر لکھے ہوئے اس کے گھر پر اپنا ایک نمائندہ بھیج کر نوید اور اس کی بیٹی کے حادثے کی اطلاع اس کی بیوی کو ضرور دے دی تھی اور وہ اس بات پر بھی پولیس کا شکر گزار تھا کہ انہوں نے اسے اور ربیعہ کو، تاخیر سے ہی سہی...... فرض شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بے ہوشی کی حالت میں اسپتال پہنچایا تھا۔

☆......☆

اب نوید پولیس کی مہربانی سے کسی کے کیے کی سزا جیل میں بھگت رہا ہے اور اس کی بیوی شوہر کے ناکردہ گناہوں کے باعث پھرکنی کی طرح کبھی جیل میں اور کبھی اسپتال کے چکر لگا رہی ہے۔

جب وہ اسپتال جاتی ہے، تو بچی کی حالت دیکھ کر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار جاری ہو جاتی ہے اور جب جیل جاتی ہے، تو شوہر کی حالت دیکھ کر آنکھوں سے چشمۂ اشک جاری ہو جاتا ہے۔

ایک طرف ممتا کی محبت ہے تو دوسری طرف شریک حیات کی جدائی کا غم......

قدرت نے عورت میں صبر کا مادہ کس قدر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے کہ وہ ہمالیہ جیسے غم کو بھی پھول جیسے جگر پر برداشت کرلیتی ہے اور غم والم کی راہ میں کلی جیسا دل فراش راہ کردیتی ہے...... یہی کچھ ایک ممتا نے اپنی بیٹی اور شوہر کی جدائی میں کیا۔

وہ صبر و رضا کا پیکر بنی ہر غم کو سہے جا رہی ہے......

نعیمہ نے دل پر پتھر رکھ کر لاکھ بار خاموشی کو توڑنے کی کوشش کی کہ کسی صورت وہ نوید کو بتادے کہ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک ربیعہ حالت کومہ میں، بستر مرگ پر پڑی ہے......

لیکن اس سے پہلے کہ زبان اس کا ساتھ دے......

اس کی آنکھوں سے سیل رواں بہ نکلتا ہے اور زبان گنگ ہو جاتی ہے۔

☆......☆



تین مرد
تین کہانیاں

سچی کہانیاں کا نیا سلسلہ
جس میں مرد ہی نہیں خواتین بھی مردوں کے اس معاشرے میں
اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات ہمارے پاس بھیج سکتی ہیں

التماس

نعمان اسحٰق

فیصل آباد سے، احساسِ کمتری کے شکار ایک بھائی کی عجب کتھا

میں ایک مرد ہوں۔ میرا نام کیا ہے، میں آپ لوگوں کو نہیں بتاؤں گا۔ یوں بھی نام جاننا ضروری نہیں، میری کہانی میری غلطیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اپنی غلطیوں کا اعتراف اور ان کا تذکرہ کرنا آسان کام نہیں، لیکن میں یہ کام کر رہا ہوں کیوں کہ میں چاہتا ہوں یہ غلطیاں کوئی اور نہ دہرائے، کوئی اور انسان (مرد کہہ لوں تو زیادہ بہتر ہے) ایسے جذبات اپنے دل میں نہ رکھے۔

میں اِس دنیا میں اکیلا نہیں آیا تھا۔ حبیبہ میرے ساتھ تھی، حبیبہ میری جڑواں بہن، جس سے میں نے نفرت اور حسد کے سوا کچھ نہ کیا۔ بچپن میں ہم دونوں کا ایک ہی مشترک کمرہ ہوا کرتا تھا۔ گلابی پینٹ والا وہ خوبصورت کمرہ، جسے میں حسد جیسے گندے جذبے سے آلودہ رکھتا تھا۔ حبیبہ شروع سے سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ امی اس کی اسی شخصیت کے سلجھاؤ کی ہر وقت تعریفیں کرتیں اور میرا دماغ خراب ہوتا جاتا۔ ہم دونوں کا اسکول اور کلاس بھی مشترک تھی۔ ہر گزرتی کلاس کے ساتھ میرے دل میں اس کے لیے نفرت کا اضافہ ہوتا گیا کیوں کہ وہ کلاس کی TOPER تھی اور میں پاس ہونے والا معمولی سا طالب علم۔ چاہے جتنا بھی پڑھ لیتا A^+ گریڈ تک میں کبھی نہ پہنچ پایا اور حبیبہ کبھی A^+ گریڈ سے نیچے نہ آئی۔

”تمہاری بہن تو پوزیشن ہولڈر ہے، تم کیوں نہیں اچھے گریڈ لے سکتے۔“ ہر استاد کا یہی فقرہ۔

”بہن کی طرح پڑھا کرو، کبھی بہن سے پوچھا ہے ٹاپر ہونے کا کیا مزہ ہے، نہیں پوچھا تو آج گھر جا کر پوچھنا۔“

”کھی کھی کھی کھی۔“ حبیبہ پونی جھلاتے ہوئے ہنس پڑتی اور میرا دل چاہتا اسی پونی سے پکڑ کر گھسیٹتا جاؤں اور کسی ویرانے میں جا کر دفن کر دوں۔ نویں دسویں جماعت میں جب ہم بچوں سے بڑوں میں تبدیل ہو رہے تھے اُس وقت کلاس کے فضول لڑکے تو ایک طرف پڑھا کو قسم کے لڑکے بھی مجھ سے دوستی کی پینگیں بڑھانے کی کوشش میں لگ گئے۔ وجہ میں حبیبہ کا بھائی ہوں اور وہ اس کچی عمر کی فنتیسی میں حبیبہ کو اپنی زندگی کا ہم سفر دیکھنے کی خواہش کرنے لگے تھے۔ اُن لڑکوں سے زیادہ مجھے حبیبہ پر غصہ آیا۔ میں تو جیسے کہیں تھا ہی نہیں۔ میرا وجود تو جیسے اِس دنیا کی غیر اہم شے تھی، اگر کہیں کچھ تھا، تو صرف حبیبہ تھی۔ وقت کروٹیں لیتا گیا اور ہم بھی

زندگی کے مدارج طے کرتے گئے۔

بہت کچھ بدلا، نہ بدلا تو میرے دل میں موجود حسد کا جذبہ۔ حبیبہ میڈیکل کالج چلی گئی اور میں سی ایس ایس کے مقابلے کا امتحان دیتا رہا اور ناکام ہوتا رہا۔ ہر سال حبیبہ گولڈ میڈل لیے گھر آتی اور میں یہ خبر لیے کہ اس سال بھی میرٹ پر نہیں آسکا یہاں تک کہ میں نے تسلیم کرلیا کہ میں سی ایس ایس کرنے کا اہل ہی نہیں ہوں۔ سی ایس ایس میں ناکامی کے بعد میرے پاس ابو کا بزنس جوائن کرنے کے علاوہ کوئی اور آپشن ہی نہیں تھا سو میں نے اسے ہی جوائن کرلیا۔

حبیبہ سے میں نے کبھی اپنی نفرت چھپانے کی کوشش نہ کی تھی۔ لیکن وہ ہمیشہ انجان بنی رہی اور یہ ظاہر کرتی جیسے کچھ نہیں جانتی، حالاں کہ گھنی بنی سب کچھ جانتی تھی۔ ذہین، خوب صورت اور ڈاکٹر لڑکیوں کے لیے بھلا رشتوں کی کیا کمی ہوتی ہے۔ ہمارے گھر میں بھی حبیبہ کے وافر رشتے آئے، لیکن میں نے ہر اچھے رشتے کو کوئی نہ کوئی جواز بنا کر امی ابو کو قائل کرلیا کہ یہ رشتہ "ہماری" حبیبہ کے لیے ٹھیک نہیں۔ اور اگر کسی رشتے کے لیے امی ابو سو فیصد راضی نظر آتے تو لڑکے والوں کی طرف اپنے گھر سے متعلق ایسی باتیں پہنچا دیتا کہ وہ لوگ دوبارہ ہمارے گھر کا رُخ کرتے وقت کانوں کو ہاتھ لگاتے۔ (آپ یقیناً یہ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ کس قسم کا نیچ بھائی ہے جو اپنی بہن کا رشتہ نہ ہونے دیتا تھا، لیکن میں اب اپنے کیے پر شرمندہ ہوں)

اور جب وقت ریت کے ذروں کی طرح ہاتھ سے پھسلنے لگا تو امی ابو نے ایک رشتے پر حامی بھر ہی لی اِس رشتے پر میں بھی خوش و مطمئن تھا۔ لڑکے نے سیدھا سادا بی اے کیا ہوا تھا، اپنا ذاتی محدود کاروبار تھا۔ شکل وصورت میں بھی گزارا تھا۔ جوانی میں ہی سر کے بالوں سے محروم تھا۔ میں حبیبہ کے لیے ایسا معمولی سا انسان ہی چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ حبیبہ نام کی بلا میری زندگی سے احساسِ کمتری کو دور لے جاتی، ثمرین وارد ہوئی، ثمرین میری خالہ زاد تھی، سی ایس ایس کے امتحان کی تیاری ہم دونوں نے ایک ہی اکیڈمی سے کی تھی۔ وہ کامیاب ہوکر سرکاری افسر بن گئی اور میں ناکام ہوکر بزنس مین۔

حبیبہ کی شادی سے ایک دن پہلے جب وہ شادی میں شریک ہونے کو آئی تو اس نے مجھ سے کہا۔ "ایک عورت ہوتے ہوئے یہ بات کہنا بہت عجیب ہے لیکن کہے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں کہ میں چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے شادی کرلو۔ کیوں کہ...... کیوں کہ میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں اتنی محبت کہ، کہ میں......" وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں، گلا رُندھ گیا تھا۔

محبت، میں اور شادی میرے چہرے پر مسکراہٹ آن ٹھہری۔ "نہیں ثمرین میں تم سے شادی نہیں کرسکتا، بلکہ میں کسی بھی کامیاب عورت سے شادی نہیں کرسکتا۔ میں ناکام انسان ہوں۔ میں کسی کامیاب عورت سے شادی کرکے ساری زندگی اس جذبے کے ساتھ نہیں گزار سکتا کہ میں اپنی بیوی سے کم تر ہوں۔ تم اپنے لیے اپنا جیسا کامیاب شخص منتخب کرنا۔"

"میں ملازمت چھوڑ دوں گی۔ ہاؤس وائف بن جاؤں گی۔"

"اس سے کیا ہوگا؟ میری ناکامی، کامیابی میں بدل جائے گی یا تمہاری کامیابی ناکامی میں، کیا تم نے سی ایس ایس ہاؤس وائف بننے کے لیے کیا تھا؟"

"میں تم سے محبت کرتی ہوں، محبت کیریئر سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔"

"ہونہہ۔" میں سر جھٹک کر اس جگہ سے چلا آیا۔

لیکن قصہ طول پکڑتا گیا اور میری اکتاہٹ بڑھتی گئی۔ اوپر سے حبیبہ کا شوہر بھی اسے بہت خوش رکھتا تھا۔ معمولی انسان کا انتخاب کرکے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پتا نہیں میرے دل میں یہ حسد کا جذبہ ختم کیوں نہ ہوتا تھا۔ میں نے اس حسد سے چھٹکارا پانے کے لیے اچھی اچھی اسلامی کتابیں بھی پڑھیں، پر فائدہ نہ ہوا۔ اور جب ثمرین کا اصرار حد سے بڑھنے لگا تو میں نے شادی کے لیے ناہید کا انتخاب کرلیا۔

ناہید ہر لحاظ سے مجھ سے کم تر تھی۔ میرے لیے موزوں تھی۔ میں اچھی زندگی گزارتا۔ احساسِ کمتری کا شکار نہ ہوتا۔

"میں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔" ثمرین کہہ رہی تھی۔

"غلط کیا۔ اب کہاں سے ملازمت ڈھونڈو گی۔ سرکاری ملازمت جیسی تو کوئی ملازمت نہیں ہوتی۔"

"میں ملازمت نہیں کروں گی، ہاؤس وائف بنوں گی، تمہاری ہاؤس وائف۔ گھر کے کام کیا کروں گی۔"

"سوری۔ میری اگلے ہفتے ناہید سے شادی ہے، تم شادی میں ضرور آنا۔"

"ایسے مت کرو، میں محبت کرتی ہوں۔ میں مرجاؤں گی۔" ثمرین رو رہی تھی۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔" جانے میرے دل پہ اس وقت کیوں اتنی سیاہی چھائی ہوئی تھی۔ اب سوچتا ہوں کاش، کاش میں اس قدر کٹھور دل نہ ہوتا۔

جس دن میری شادی تھی، گھر برقی قمقموں سے سجا تھا۔ نکاح کے بعد میں مسکراتے ہوئے مبارکبادیں وصول کررہا تھا۔ امی کو ایک فون کال آئی اور میں سن رہ گیا۔

ثمرین مرگئی تھی۔ نس کاٹنے کے بعد اس نے اپنے آپ کو کمرہ میں بند کردیا تھا۔

"میں کسی کامیاب عورت سے شادی کرکے ساری زندگی اس جذبے کے ساتھ نہیں گزار سکتا کہ میں اپنی بیوی سے کم تر ہوں تم اپنے لیے جیسا کامیاب شخص منتخب کرنا۔" یہ کیا ہوگیا تھا، ایسا تو نہیں چاہتا تھا میں۔ میں تو بس یہ چاہتا تھا کہ میں احساسِ کمتری میں مبتلا نہ ہوں۔ میرے دل میں کسی اور کے لیے حسد کا جذبہ نہ پنپے لیکن یہاں تو...... میرے پاس پچھتاوا بچا تھا۔ بہن سے نفرت اور حسد کرکے مجھے کیا ملا تھا، ایک لڑکی کی محبت کو روند کر کیا ملا تھا؟ اگر یہ دونوں عورتیں زندگی کی دوڑ میں مجھ سے آگے تھیں تو مجھے اس بات کو کھلے دل سے تسلیم کرکے زندگی گزارنی چاہیے تھی۔ اسے خدائی فیصلے سمجھ کر مطمئن رہنا چاہیے تھا۔ لیکن میں نے غلط کیا۔ بہت غلط۔ آپ سے بس اتنی التماس ہے کہ آپ ایسا مت کیجیے گا۔ شکریہ۔

☆☆......☆☆



غزل

شام غم مسکرانے لگی
پھر تیری یاد آنے لگی

فیصلہ آپ نے خود کیا
آنکھ بھی ڈبڈبانے لگی

اس نے دیکھا تھا کل غور سے
کیا دعا رنگ لانے لگی؟

اک تبسم کی سوغات ہے
زندگی مسکرانے لگی؟

کان میں کیا صبا کہہ گئی
شرم کلیوں کو آنے لگی

بڑھ گئیں دل کی بے تابیاں
دن ڈھلا رات آنے لگی

خلیل اللہ فاروقی

تمہارا بھی شکریہ

محمد تحسین زوّار

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میری عمر تیئس چوبیس سال کے درمیان تھی۔ شب و روز صرف ایک ہی دعا میں صرف ہوتے تھے۔ ثوبیہ میری چچا زاد پتہ نہیں کب میں اس کے عشق میں مبتلا ہوا۔ لیکن جب مجھے اس عشق کا ادراک ہوا۔ ثوبیہ کسی کی منگیتر ٹھہر چکی تھی۔ منگنی سے پہلے امی ابّو سے کہہ دیتا تو جھٹ رشتہ طے ہو جاتا اور ثوبیہ میری ہو جاتی لیکن اب تو کئی معاشرتی دیواریں حائل ہو گئی تھیں جن میں دعا ہی روزن نظر آتی تھی۔

جب دعائیں بے اثر ہونے لگیں اور میں نے معاشرتی دیواروں سے ٹکرانے کا سوچا تب ایک معجزہ ہوا۔ ثوبیہ کے منگیتر نے رشتہ ختم کر دیا۔ میں بے یقین سا رہا۔ ہزار بار سجدۂ شکر بجالایا۔ دعا پر بھی یقین کامل ہو گیا اور خدا سے بھی رشتہ مضبوط ہو گیا۔ اور سال بھر بعد ثوبیہ میری دلہن بنی میرے کمرے میں میرا انتظار کر رہی تھی۔

شادی کے ابتدائی دن بہت خوب صورت گزرے۔ ثوبیہ کا رویہ مجھ سے کچھ اکھڑا اکھڑا اور بے مروتی بھرا ہوتا لیکن میں نے مطلق پروانہ کی۔ میں جانتا تھا کہ میری محبت، میرا التفات ثوبیہ کو بھی میری طرف مائل کر دے گی۔ لیکن میں اسی خوش فہمی میں ہی مبتلا رہا اور شادی کو تین سال گزر گئے لیکن ثوبیہ کی نظروں میں میرے لیے کبھی محبت نہ سمائی۔ یوں تو میں ہر اچھی بری بات ماتھے پر کوئی بَل لائے بغیر برداشت کر لیتا لیکن ایک بات جس سے مجھے شدید چوٹ تھی وہ ثوبیہ کی عادت تھی۔ وہ میرے دفتر سے آنے کے وقت اکثر پڑوس میں کہیں نہ کہیں گئی ہوتی۔ کم از کم میرے دفتر سے آنے کے وقت تو اسے گھر پر ہونا چاہیے۔ کتنی بار میں نے ثوبیہ سے کہا لیکن اُس نے بات نہ ماننی تھی، نہ مانی۔

اُس دن بھی میں تھکا ہارا گھر سے لوٹا تو امی نے ہی میرے سامنے کھانا رکھا۔ استفسار پر انہوں نے بتایا کہ ”پڑوس والی راشدہ کی طبیعت خراب ہے اسی کی تیمارداری کو گئی ہے۔“

مجھے غصہ آ گیا، شدید بھوک کا احساس ہونے کے باوجود میں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد جب ثوبیہ واپس آئی تو میری اس سے اچھی خاصی جھڑپ ہو گئی۔

”تم تو آزاد عورت ہو، جب چاہا، جہاں چاہا چلی گئیں، شوہر کی رضا کی کبھی تمہیں پروا نہیں رہی۔“ یہ فقرے اور اس سے ملتے جلتے فقرے میں نے تین چار

بار دہرائے تھے۔ ثوبیہ نے بھی دوبدو جواب دیا تھا اور اس لڑائی کا نتیجہ تھا کہ رات کو میں مسہری پر ثوبیہ سے رُخ موڑے لیٹا تھا۔

میں انتظار میں رہا کہ ثوبیہ کہے گی کہ ”میں شرمندہ ہوں، آیندہ آپ کی اجازت کے بغیر کہیں نہیں جاؤں گی۔ کم از کم آپ کے دفتر کے آنے کے وقت گھر پر ہی رہوں گی۔“ لیکن ثوبیہ نے کچھ بھی نہ کہا اور اگلی صبح میں دفتر روانہ ہو گیا۔

شام کو جب میں دفتر سے لوٹا تھا تب یہی سوچ تھی بلاشبہ غلطی ثوبیہ کی ہے لیکن اگر وہ معافی نہیں مانگ رہی اور مجھے نہیں منا رہی تو مجھے ہی منانے میں پہل کر لینی چاہیے۔ میاں بیوی میں کیا میں اور کیا تو...... لیکن جب واپس گھر آیا تو ثوبیہ کو ایک بار پھر غائب پایا۔ امی نے لاعلمی کا اظہار کیا کہ ”مجھے کیا پتا کہ وہ کہاں گئی ہے۔“ ان کے جواب میں ان کی ناپسندیدگی کی واضح جھلک بھی تھی کیوں کہ ان کو بھی ثوبیہ کا یوں باہر گھومنا پسند نہیں تھا۔ میں نے بھی ان سے کہہ دیا کہ ثوبیہ کو سمجھاؤں گا۔

کھانا کھانے کے بعد میں مسہری کی پائنتی سے ٹیک لگائے ثوبیہ کا انتظار کرتا رہا۔ پاس مسہری پر ایک جید عالم کی کتاب ”طلاق اور اس کے مسائل“ کھلی پڑی تھی۔ جیسے کوئی پڑھتے پڑھتے اُٹھ کر کہیں چلا گیا ہو۔ ثوبیہ کتابوں کی شوقین تھی۔ لیکن یوں کتابیں سرِراہ کھلی پڑی رہنا اسے پسند نہیں تھا۔ اس کی بہت ساری اچھی عادتوں میں ایک اچھی عادت یہ بھی تھی کہ وہ کتابوں کی عزت کرتی تھی۔ جانے آج کیوں کتاب کھلی چھوڑ کر چلی گئی۔ لیکن کہاں چلی گئی۔ اور جب دن کا اجالا رات کے اندھیرے میں مکمل ضم ہو گیا تو میری تشویش وا ہو گئی۔

”کہاں ہو گی ثوبیہ؟ کہاں سے پتا کروں؟“ اسی شش و پنج میں تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ فون اُٹھایا تو دوسری طرف چچا تھے جو افسوس اور ملامت بھرے لہجے میں مجھ سے شکوہ کر رہے تھے کہ میں نے ثوبیہ کو طلاق دے دی ہے۔

”انعام! اگر تم نے میری بیٹی کے ساتھ یہی کچھ کرنا تھا تو شادی ہی نہ کرتے، میری بیٹی اب اپنی باقی زندگی کیسے گزارے گی۔“ میں ہکا بکا چچا کی باتیں سن رہا تھا۔

”لیکن چچا میں نے ثوبیہ کو طلاق نہیں دی، میں ثوبیہ سے بہت محبت کرتا ہوں۔ میں اسے طلاق دینے کا تصور



ہی نہیں کر سکتا۔“ ریسیور کان سے لگائے میں نے کتنی بار چچا سے کہا۔

ثوبیہ اُس وقت میکے میں تھی۔ اُس کا کہنا تھا کہ کل

کے جھگڑے میں، میں نے اُسے تین سے بھی زیادہ بار یہ کہہ دیا تھا کہ تم آزاد ہو۔ جہاں جانا چاہو جاؤ۔ کل تو اس نے نوٹس نہ لیا لیکن آج جب اس نے ''طلاق اور اس کے مسائل'' کتاب پڑھی تو اسے ادراک ہوا کہ طلاق واقع ہو چکی ہے۔ اس لیے تو وہ ماں باپ کے گھر چلی آئی۔

''لیکن میں نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا، میں نے کہا تھا کہ تم آزاد عورت ہو، جہاں جانا چاہتی ہو، چلی جاتی ہو، بالفرض اگر یہ کہہ بھی دیا کہ تم آزاد ہو تب بھی میرا مقصد طلاق نہیں تھا، ثوبیہ کو سننے میں اور مسئلہ سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ طلاق ایسے بیٹھے بٹھائے ہو جاتی ہے؟ ویسے بھی طلاق کے لیے مرد کا قول اہم ہے۔ اگر مرد کہہ رہا ہے طلاق نہیں دی تو مطلب نہیں دی، عورت کے بیان کی اہمیت نہیں۔'' میں نے کئی بار سر پٹخا، پکڑ پکڑ کے سب کو طلاق سے متعلق مسئلے پڑھائے۔ اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ کئی بار بھری محفل میں رویا۔ اگر کبھی چچا کو میں سچا اور برحق لگتا تو، ثوبیہ کا بیان انہیں دوبارہ پیچھے دھکیل دیتا۔

''ابو میں جھوٹ نہیں بول رہی، انعام مجھے طلاق دے چکا ہے اس نے واضح لفظوں میں کہا کہ تم آزاد ہو، ایک بار نہیں کئی بار کہا۔ اب اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں اس شخص کے ساتھ جا کر حرام زندگی گزاروں تو یہ صحیح نہیں۔ ایسی حرام زندگی سے تو حرام موت بہتر ہے۔ میں خودکشی کرلوں گی۔''

سال بھر میں نے بہتری کی کوشش کی، محبت کے نام پر خوب رُسوائی بٹوری، ایک ایک کو یقین دلایا کہ فسخ نکاح نہیں ہوا۔ رو رو کر آنکھیں خشک ہو گئیں لیکن فائدہ کوئی نہ ہوا۔ سال بھر بعد مجبوراً میں نے طلاق کے کاغذات پر دستخط کردیے۔ بقول چچا کے یہ کاغذی کارروائی ضروری ہے، طلاق تو پہلے ہی ہو چکی ہے۔ میں نے خدا سے بھی خوب دعائیں کی تھیں کہ وہ ہی مجھے سچا ثابت کردے لیکن......

☆......☆

وقت گزرتا رہا اور میں محبت کا غم سنبھالے پھرتا رہا۔ امی میری دوسری شادی کی خواہاں تھیں اور چار سال بعد جب وقت کا مرہم میرے زخم کافی حد تک بھر چکا تب میں نے عارفہ سے شادی کرلی۔ پھر کبھی زندگی میں ایسا بھونچال نہ آیا۔ عارفہ اچھی بیوی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے ازدواجی تعلقات اچھے ہوتے گئے، محبت کا گزر ہونے لگا۔ بچوں کی آمد نے بھی ہمیں ایک دوسرے کے اتنا قریب کردیا کہ ہم ایک دوسرے کے ہو کر رہ گئے۔ ایک جان دو قالب، یہ لفظ اب اگر میرے اور عارفہ کے لیے استعمال کیے جاتے تو کچھ ایسا غلط نہ ہوگا۔

اور اب جب میں باون سال کا ہونے والا ہوں۔ ایک دن مجھے فون آیا۔ ''انعام میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔'' فون کرنے والی ثوبیہ تھی۔

''کیوں۔'' میں پوچھنا چاہتا تھا۔ ''میں تم سے نہیں ملنا چاہتا۔'' میں کہنا چاہتا تھا۔ لیکن میں نہ پوچھ سکا اور نہ ہی کہہ سکا۔ اور دو دن بعد میں ثوبیہ کے ڈرائنگ روم میں اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

ثوبیہ آج بھی ویسی ہی خوب صورت تھی بلاشبہ بوڑھی ہو چکی تھی، لیکن خوب صورت بہر حال ویسی ہی تھی۔ یہ وہی خوب صورتی تھی جس کا میں دیوانہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن آج میرے دل میں اس کے لیے کچھ نہ تھا۔ آج یہ خوب صورتی میرے لیے ایک ڈیکوریشن پیس کی خوب صورتی سے زیادہ نہ تھی۔

''انعام کیسی زندگی گزر رہی ہے؟''

''تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتی تھیں؟''

خاموشی کے ایک لمبے وقفے کے بعد وہ گویا ہوئی۔

''میں معافی چاہتی ہوں انعام، میں تمہاری گناہ گار ہوں۔ میں تمہارے ساتھ خوش نہیں تھی۔ مجھے حنیف سے محبت تھی، حنیف تم سے شادی سے پہلے بھی میرا منگیتر تھا لیکن ہماری آپس کی رنجشوں نے منگنی ختم کردی، لیکن جب شادی کے بعد میرے دل میں حنیف کی محبت جوں کی توں برقرار رہی اور تمہارے لیے جگہ ہی نہ بنی تو میں...... میں چھپ کر حنیف سے فون پر باتیں کیا کرتی تھی۔ مجھے سمجھ نہ آتا تھا۔ میں تم سے علیحدگی چاہتی تھی۔ براہِ راست کہنے سے بھی ڈر لگتا تھا۔ تم نے مجھے طلاق نہیں دی تھی۔ میں نے جھوٹ

بولا تھا، ڈرامہ رچایا تھا۔ اور آج جب میں حنیف کے ساتھ ایک آسودہ زندگی گزار رہی ہوں تب بھی مجھے تمہارے ساتھ کی جانے والی زیادتی ہر وقت یاد آتی ہے۔ جھوٹ اور دھوکے جیسے گناہوں کا احساس مجھے...... میں گناہ گار ہوں، میں معافی چاہتی ہوں۔'' ثوبیہ رو رہی تھی۔

میں سپاٹ تاثرات لیے اسے دیکھتا رہا۔ وہ روتی رہی، روتی رہی بالآخر خود ہی چپ کر گئی۔

''ثوبیہ میں تم سے محبت کرتا تھا۔ تمہیں خوش دیکھنا میری اولین ترجیح تھی۔ تم مجھ سے ایک بار کہہ کر تو دیکھتیں، میں تمہیں طلاق دے دیتا اور اب جب اتنے سالوں بعد میرے دل میں صرف اور صرف عارفہ کی محبت بستی ہے، تمہیں یوں روتے ہوئے دیکھ کر میرا دل خوش ہو رہا ہے۔ یقین جانو یہ آنسو اُن چار سالوں کا مداوا ہرگز نہیں کر سکتے جو میں نے طلاق کے بعد بسمل کی طرح تڑپتے گزارے ہیں، تم نے غلط کیا۔ ترکِ تعلقات کے لیے غلط راستہ اپنایا، جس پر چلتے ہوئے پتا نہیں تمہارا کچھ بگڑا یا نہیں، مجھے علم نہیں، لیکن میں لہولہان ہو گیا۔'' ثوبیہ ایک بار پھر رونے لگی تھی۔

''لیکن اب اتنے سالوں بعد گڑے مُردے اُکھاڑنے کا کوئی فائدہ نہیں، میں ایک پُرسکون ازدواجی زندگی گزار رہا ہوں۔ اگلے سال اپنی بڑی بیٹی کی شادی کا ارادہ رکھتا ہوں۔ تم نے جو زیادتی کی تھی اس کے لیے میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔ تہہ دل سے معاف کرتا ہوں۔'' میں جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور جب میں دروازے تک پہنچا تھا تب پیچھے سے ثوبیہ کی آواز آئی تھی۔

''انعام۔ تمہارا شکریہ کہ تم نے مجھے معاف کردیا۔'' میں رُک گیا اور پلٹ کر ثوبیہ کو دیکھا اور کہا۔

''تمہارا بھی شکریہ'' یہ کہہ کر میں پلٹا نہیں بلکہ فوراً دروازے سے باہر نکل گیا۔ اگر میں اس بار پلٹ کر ثوبیہ کو دیکھ لیتا تو شاید سب کچھ پھر سے ہار دیتا۔ اور میں اس جیتی ہوئی بازی کو پھر سے شکست سے ہمکنار کرنا نہیں چاہتا تھا۔

☆......☆

شہری حقوق کا بل

22 نومبر 1963ء کو امریکہ کے 46 سالہ صدر جان ایف کینیڈی شہری حقوق کے بل کو متعارف کروانے کی مہم پر ٹیکساس کے شہر ڈیلاس پہنچے تھے۔ ان کی کار ایئرپورٹ سے شہر میں داخل ہوئی۔ سڑکوں کے دونوں جانب ان کا خیر مقدم کرنے والوں کا ہجوم تھا اچانک ایک چھ منزلہ عمارت سے فائرنگ شروع ہوئی۔ دو گولیاں جان ایف کینیڈی کو لگیں، ان کی بیوی جیکولین بھی ان کے ہمراہ تھیں، اگلی نشست پر ٹیکساس کے گورنر جون کونالی بیٹھے تھے، چند گولیاں اُنہیں بھی لگیں۔ دونوں کو فوراً ہی ایک قریبی اسپتال لے جایا گیا جہاں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے جان ایف کینیڈی نے دم توڑ دیا اسی دن اوسوالڈ نامی ایک شخص کو کینیڈی کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا مگر اس سے پہلے کہ مقدمہ چلتا اور قتل کی اصل وجوہات سامنے آتیں 24 نومبر 1963ء کو جب اسے پولیس ہیڈ کوارٹرز سے جیل منتقل کیا جارہا تھا، جیک روبن اسٹین نامی ایک شخص نے اسے گولی مار کر ختم کردیا۔

آج کی رات

شاہ محمد شاہ

کراچی سے ایک جعلی عامل کی زندگی کی مکروہ روداد ایک دوشیزہ کی زبانی

آج کی رات ...... زری کی زندگی کی اہم ترین رات تھی ...... کیوں کہ سفلی عملیات کے کاٹ کے ماہر بنگالی بابا نے اسے بتایا تھا کہ ...... آج کی رات ...... بس ...... آج کی رات ...... اس کی زندگی میں وہ انقلاب بپا کردے گی ...... جس کے لیے وہ گزشتہ بارہ برس سے در در کی ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ کوئی بابا ...... کوئی عامل ...... کوئی پنڈت ...... کوئی سنیاسی ...... کوئی مزار ...... کوئی دربار ...... کوئی آستانہ نہ چھوڑا، جس کے پاس وہ اپنی خالی کوکھ لے کر نہ گئی ہو۔ سب نے اسے دلاسے دیے ...... تسلی دی ...... تشفی دی ...... جس نے جو مانگا ...... زری نے حتی المقدور منہ بھر دیا، پھر بھی اس کی گود خالی ہی رہی ...... لیکن ...... آج اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ آج اس کی مراد بر آنے والی تھی ...... وہ مارے خوشی کے مورنی بنی پورے آنگن میں رقصاں تھی۔ آج اس کی خوشی دیدنی تھی، کیوں کہ آج اسے موت وحیات کی اس کش مکش سے نجات ملنے والی تھی، جس کی وجہ سے اس کی زندگی اجیرن ہوگئی تھی ...... جس نے اپنوں کا خون سپید کردیا تھا اور جس کی وجہ سے اسے نہ صرف اپنی ساس کے کوسنے اور طعنے روزانہ سننے کو ملتے تھے، بلکہ اس کی نندیں، بھاوجیں، جیٹھانیاں اور قرب وبعید کے قریباً تمام ہی رشتے دار، حتیٰ کہ پاس پڑوس اور محلے کی عورتیں بھی اسے ”منحوس“، ”کلموہی“، ”کوکھ جلی“، ”کوکھ بجھی“ اور ”بھاگ بندھی“ جیسے دل شکن القاب اور جگر چھلنی کردینے والے خطاب سے نوازتے تھے۔

☆......☆

آج کی رات ...... جب نصف سے زائد ڈھل چکی ہوگی اور آسمان رنگ برنگے ستاروں سے بھرا ہوا ہوگا ...... رنگ ونور کا سیلاب فلک پر اُمڈا ہوگا ...... دودھیا روشنی آسمان کی نیلاہٹ کو اُجال رہی ہوگی ...... ستارے خاموش ایک دوسرے کو تک رہے ہوں گے ...... کہ اچانک ایسے میں ایک تیز روشنی کا چھناکا ہوگا ...... اور مشتری کا شوخ وچنچل ستارہ اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ اُفق پر برآمد ہوگا اور اس کی پیلے رنگ کی روشنی اس قدر شوخ اور تیز ہوگی جو آنکھوں کو خیرہ کردینے والی ہوگی اور وہ دیگر ستاروں کی روشنی کو بھی ماند کردے گی ...... بس ......! یہی وہ وقت ہوگا، جب بنگالی بابا کیماڑی جیٹی کے نیچے سمندر میں واقع ہنومان جی کے مندر کے صحن میں بھرے نمکین پانی سے اشنان کریں گے اور پھر ساتھ ہی واقع اپنی نیم روشن خستہ سی کٹیا میں آکر زری کا اتارا کریں گے، جہاں وہ بابا جی کی پہلے ہی سے منتظر ہوگی، کیوں کہ بابا جی نے ہی زری پر یہ حیرت انگیز انکشاف کیا تھا کہ اس کی گود کسی حریف عورت نے بندھوا دی ہے اور اس پر سخت کالا سفلی کرایا گیا ہے۔ اس کی کاٹ صرف یہی بابا کرسکتے ہیں۔

☆......☆

شادی کے بعد جب زری کئی برس اولاد کی نعمت سے محروم رہی ...... تو پھر اس کے گھر میں لڑائی جھگڑے شروع ہوگئے اور نوبت ہاتھا پائی اور طلاق تک جا پہنچی۔ زری نے ان حالات سے تنگ آکر جی کڑا کرکے ایک فیصلہ کیا اور وہ فیصلہ تھا اولاد حاصل کرنے کا ...... پھر اس نے عاملوں، کاملوں، پیروں اور فقیروں کے دروں پر حاضری دینا شروع کی۔

خاصی تگ و دو کے بعد تین ہٹی پر واقع ایک آستانے میں بنگالی بابا سے اس کی ملاقات ہوئی، جنھوں نے اسے ایک لمبی تاریخ دی اور جیٹی کے نیچے واقع اپنی کٹیا کا پتا بتایا۔

اب وہ وقت قریب آچکا تھا ...... آج کی رات اسے نئی زندگی ملنے والی تھی ...... آج کی رات ...... بنگالی بابا اس کو نئی زندگی کی نوید دیں گے۔ اس کے بعد زری کی زندگی سے دکھوں، کلفتوں، غموں اور رنج والم کا خاتمہ ہوجائے گا ...... اور اس کی زندگی میں بہار ...... دلہن بن کر آجائے گی ...... بس آج کی رات ...... زری کٹیا میں بابا جی کی بے چینی سے منتظر ہے۔

جی ہاں! یہ وہی ستارہ مشتری ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ برسوں بعد محض چند ساعت کے لیے طلوع ہوتا ہے۔ اس وقت سارے ستارے اس کے تابع ہوتے ہیں، کیوں کہ یہ حجم میں ان سب سے بڑا اور روشنی میں زیادہ چمک دار ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کے طلوع سے ستاروں کا نحس ختم ہوجاتا ہے، کیوں کہ یہ سعد ستارہ ہے اور اس کی سعد بختی کی وجہ سے اس ساعت میں جنتر و منتر، تانتر واشلوک، جاپ وعزیمت کا جو بھی عمل کیا جائے، نہایت مہلک وکاری ہوتا ہے۔ اس ساعت میں عشق ومحبت کا تعویذ اور روٹھے محبوب کو منانے کا نسخہ بھی تیر بہ ہدف ہوتا ہے اور سوکھی گود تو ایسی ہری ہوتی ہے کہ جیسے صحرا میں بے موسم، بن پانی کے پھول نکلتے ہیں۔

اس سعد ساعت کو پانے اور نحس اثرات کو زائل کرنے کے لیے عامل، پنڈت، سنیاسی، بابا اور سنت سادھو برسوں گھور تپیا کرتے ہیں اور اس سعد ستارے کو



پاتے ہی اپنے اپنے عمل کی جاپ میں کھو جاتے ہیں۔ کیوں کہ انہیں برسوں کی محنت لمحوں میں حاصل کرنی ہوتی ہے۔

مندر، اشنان گھاٹ، شمشان گھاٹ، پرانی قبریں، گورستان، مرگھٹ، دریا کنارے اور سمندر کی لہریں ان کا مرکز ہوتی ہیں...... جہاں یہ اپنے اپنے مقصد کے حصول کے لیے تپسیا کرتے ہیں۔

زری نے بھی اس سعد ستارے کے طلوع کے لیے طویل انتظار کیا تھا، جو بارہ برس کے صبر آزما لمحات کے بعد طلوع ہوا تھا...... اور اب بنگالی بابا انتظار کی گھڑیاں ختم اور اس کی گود ہری کرنے والے تھے۔

زری کا تعلق بڑے نالے کے قریب واقع غریب کالونی کی جھونپڑ پٹی میں مقیم ایک ایسے گھرانے سے تھا، جو اپنی سفید پوشی کا بھرم قائم رکھنے میں قطعاً ناکام نظر آ رہا تھا...... اس کالونی میں رہنے والے لوگ انتہائی غریب اور مفلوک الحال تھے...... لوگ زیادہ تر مزدور پیشہ اور محنت کش تھے۔ بنیادی ضروریات زندگی سے محروم اس آبادی کی حالت مادّی ہی نہیں، بلکہ اخلاقی دولت سے بھی محروم تھی...... توہم پرستی تو اس قدر عام تھی کہ قدم قدم پر انہیں موت نظر آتی تھی۔ زیور تعلیم سے محروم بچے محلے میں بہتی گندآب کی نالیوں اور کچرے کے ڈھیر کنارے اپنا بچپن اور جوانی آوارہ گردی میں بِتا رہے تھے...... خال خال کسی گھرانے میں کچھ اخلاقی رمق باقی تھی......

زری کا خاندان بھی اسی میں سے تھا۔ معمولی تنخواہ پر زری کا باپ ایک نجی اسکول میں مالی کی حیثیت سے ملازم تھا، جب کہ گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے اس کی ماں سلائی کڑھائی کا کام کرتی تھی۔ زری نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، اس نے اپنی ماں کو کام ہی کرتے دیکھا...... لگی بندھی تنخواہ میں گزارا ازحد مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ ایسے مخدوش حالات میں جب کہ دو وقت کی روٹی کا حصول مشکل تھا، بچوں کو اسکول میں پڑھانا تو درکنار اس طرف سوچنا بھی محال تھا۔

زری کی اس سے ایک چھوٹی بہن فری تھی، جب کہ دو چھوٹے بھائی اشعل اور کمیل تھے، جو ہمہ وقت ایک دوسرے سے چھینا جھپٹی میں لگے رہتے تھے۔ قلیل آمدنی اور گھر میں جہالت کے راج کے سبب گھر کا ماحول ایک دوسرے کو کاٹ کھانے والا تھا۔ ہر وقت کی تُو تُو میں میں، روز روز کی تکرار معمول تھا...... ایسے ہی کسی کی توجہ پڑھائی لکھائی کی طرف نہ تھی اور نہ ہی اپنی حالت کو سدھارنے کا خیال کسی کو تھا۔

چوں کہ ان سب بہن بھائیوں میں زری ہی سمجھ دار اور عمر کے لحاظ سے بھی ہوشیار اور پھر تین جماعت پاس تھی، جو اس کے باپ نے دوران ملازمت اسے کرا دی تھی۔ اس لیے ہر طرح کا گھریلو دباؤ اسی کو جھیلنا پڑتا تھا...... گھر کے کام کاج، پڑوس محلے میں بہن بھائیوں کے جھگڑے نمٹانا، کمیٹی کے نلکے سے پانی بھر کر لانا اور اسی طرح کے روزمرہ کے معمولات...... پھر امّاں ابا اور بہن بھائیوں کی سخت سُست بھی سننا۔

زری گھر کے اس بے سکون اور بددل کر دینے والی ماحول سے نہ صرف بے زار ہو چکی تھی، بلکہ روز روز کی چک چک سے بھی تنگ آ چکی تھی...... زری کی ماں اس بات کو خوب سمجھتی تھی، لیکن کچھ کرنا اس کے اختیار میں نہ تھا۔

ایک روز زری کی ماں نے بڑی چاہ سے اس سے کہا۔

''اگر تو ہاں کہہ دے تو میں ابھی تیرے ہاتھ پیلے کر دوں۔''

یہ سنتے ہی زری غصے سے پیلی ہو گئی اور اس نے بڑے ناگوار انداز میں چیخ کر اپنی ماں سے کہا۔

''اماں تو تو مجھے کسی اسکول میں داخل کرا دے...... میں تو اب بھی پڑھنا چاہتی ہوں...... پھر ابھی میری عمر ہی کیا ہے؟ کیا تو بارہ برس کی عمر میں میری شادی کر دے گی۔''

زری طیش میں بولے جا رہی تھی......

''ارے امّاں! کیا تو گھاس چر گئی ہے...... کیا لڑکیاں ایسے ہی بیاہی جاتی ہیں، جیسے تو مجھے بھیڑ بکریوں کی طرح اس کلموئے، گنوار، لفنگے اور نشئی کے ہاتھوں ہانکنا چاہتی ہے۔''

زری کی ماں اس کے نشتر بھرے جملے سن کر خاموش ہو گئی، پھر کچھ دیر بعد بولی۔

''کیا تیرے لیے کوئی کوہ قاف سے شہزادہ آئے گا...... ارے! تیرا رنگ ذرا کیا اُجلا ہو گیا ہے کہ تو خود کو حُور پری سمجھنے لگی ہے......'' زری کی ماں نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔

زری بھی ماں سے پیچھے نہ رہی، ترنت جواب میں کہا۔

امّاں! میں سمجھتی نہیں ہوں، بلکہ میں ہوں...... ماں نے زری کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھا اور پیٹھ موڑ کر چل دی۔

☆......☆

رضی...... زری کی ماں کی بہن کا بیٹا تھا، جو اپنے پکے رنگ کی وجہ سے محلے بھر میں کلوا بھائی کے نام سے مشہور تھا۔ اس کا کام دھندہ تو کوئی نہ تھا...... بس کبھی کسی دوست یار کے پان سگریٹ کے تھڑے پر بیٹھ گیا تو دہاڑی لگا لی اور کبھی سبزی منڈی میں آلو پیاز کی چھنٹائی کر لی تو ایک وقت کی روٹی کا آسرا کر لیا۔

بس یہی ہوائی روزی ہی اس کا ذریعۂ معاش تھا، کوئی لگی بندھی نہ تو تنخواہ تھی، نہ ہی نوکری اور نہ ہی کوئی اور مستقل روزگار...... یہی وجہ تھی کہ اکثر دن وہ آوارہ گردی میں گزارتا تھا۔

رضی...... زری کا خالہ زاد بھائی ہونے کے باوجود اس کے لیے قابل قبول نہ تھا، کیوں کہ وہ صحبت بد کا بھی شکار تھا۔ محلے کے اوباشوں سے اس کی دوستی تھی اور اکثر وہ یار دوستوں کے ساتھ ناؤ نوش کی محفلوں میں جاتا تھا۔

☆......☆

شب و روز بدلتے رہے...... مہینے سال میں ڈھلتے رہے...... لیکن...... نہ بدلی تو زری کے گھر کی حالت اور اس کی قسمت......

وقت کی رفتار ایک دم بڑھ گئی اور دن پر لگا کر اڑنے لگے...... پتا ہی نہ چلا کہ کب سال شروع ہوا اور کب ختم ہو گیا۔ زری کے چھوٹے بہن بھائی بھی اب آپس میں لڑ بھڑ کر اٹھتی عمروں کی طرف رواں دواں تھے...... اور خود زری بھی تو اب لڑکپن کو چھوڑ کر جوانی کے سولہویں برس کی عمر کو چھو رہی تھی...... اب اس پر بھی شباب کے سائے پڑ رہے تھے اور اس کے جوبن سے کنواری کا بانکپن جھانک رہا تھا۔

اب زری بھی اپنے دبلے پتلے نازک سے سیک سلائی نما جسم کو خوش نما لباس سے سجانا چاہتی تھی۔ اس کی بھی خواہش تھی کہ کوئی اسے دیکھنے والا ہو اور اس کے حسن کی تعریف کرے۔

جب وہ اپنی آنکھوں میں لشکارا مارے، تو کوئی اس میں ڈوبنے کی خواہش کا اظہار کرے...... جب وہ اپنے ہونٹوں کو لب لعلین کالا کھا لگائے، تو کوئی اسے چومنے کی تمنا کرے...... وہ بھی کسی کو اپنے پازیبوں کی جھنکار، اپنے پائلوں کی چھن چھن، اپنے دل کی پکار اور اپنی سانسوں کی پھنکار سنانا چاہتی تھی...... اس کی بھی خواہش تھی کہ کوئی اس کی گجریلی کلائیوں کو تھامے پیار کے سُندر سپنوں کے سمندر کی اتاہ گہرائیوں تک لے جائے، تاکہ وہ بھی جذبات کی لہروں سے اٹھکھیلیاں کرے۔

☆......☆

زری جب کبھی محلے پڑوس میں کسی کی شادی ہوتے دیکھتی...... تو اس کی آنکھوں میں بھی شہنائیوں کے سُندر سپنے سجنے لگتے اور وہ بھی اپنے ہاتھوں پر مہندی کا رنگ رچا دیکھتی...... وہ اپنی ہمجولیوں کے ساتھ کھسر پھسر کرتی...... وہ ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کرتیں اور پھر کھلکھلاتیں۔

سپنے پھر سپنے ہوتے ہیں...... ماتا کے سپنوں میں لوگ اپنے ہوتے ہیں...... لیکن...... جب زری اپنے گھر کی حالت، غربت و عسرت میں ڈوبے بام و در، بہن بھائیوں کو بے ہنر، معاشی تنگی و بدحالی، والدہ کی بیماری اور والد کی تنگ دستی کو دیکھتی، تو اسے اپنے تمام خواب چکنا چُور ہوتے محسوس ہوتے۔

☆......☆

گو کہ زری دیکھنے میں دھان پان سی لڑکی تھی...... پتلی کمر، گوری گوری پتلی پتلی کلائیاں...... لمبی لمبی مخروطی انگلیاں...... گردن بالکل پتلی صراحی جیسی...... اور خود وہ سرو کی مانند لمبی، پتلے پتلے ہونٹ، بالکل گلاب کی پتیوں جیسے...... پتلی سی ناک اوپر کو اٹھی ہوئی...... آنکھوں کی پتلیاں بالکل سپید، جیسے دودھ میں دھلی ہوئی اور ٹانگیں تو ایسی ہرنی جیسی اونچی پتلی پتلی...... چلے تو ایسا لگے کہ جیسے ہرنی کلانچیں بھر رہی ہے...... قدرت اس کے تیکھے نقوش میں وہ کشش رکھی تھی کہ دیکھنے والا پہلی نظر ہٹا کر اسے دوبارہ ضرور دیکھتا تھا اور پھر دیکھتا ہی رہ جاتا تھا۔

☆......☆

زری کا باپ امیر بیگ محض نام کا امیر تھا...... غربت نے اس کا پیچھا اس طور لیا ہوا تھا کہ لاکھ جتن کے باوجود وہ اس سے پیچھا نہ چھڑا سکا اور دل ہی دل میں بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے کی حسرت لیے ایک روز ذہنی دباؤ کے سبب

دماغ کی رگ پھٹ جانے کے باعث چل بسا۔

قدرت نے امیر بیگ کو غریب ضرور بنایا تھا اور اسے غریب ہی اٹھالیا...... لیکن...... اس کی گدڑی میں جو لعل زری کی صورت رکھ دیا تھا وہ...... اپنی مثال آپ تھا۔

☆......☆

اس روز کی تکرار کے بعد اماں نے زری سے کئی دن بات نہ کی، لیکن کب تک...... آخر بیٹی...... تو بیٹی ہوتی ہے ناں۔

زری کی ماں نے ایک روز بڑے پیار سے بلا کر اپنے پاس بٹھا کر اسے سمجھایا۔

"دیکھ بیٹی......! تو اب جوان ہوگئی ہے اور زمانہ بڑا خراب ہے...... میں نڈھال بیمار رہتی ہوں...... آج اور کل کا میرا بھروسا نہیں...... تیرا باپ تو بغیر یہ سوچے سمجھے کہ اس کے پیچھے ہمارا کیا بنے گا...... روتا دھوتا چھوڑ کر ہمیں چلتا بنا......"

یہ کہتے ہوئے اماں کی آنکھوں میں آنسو آگئے...... ماں کے آنسو دیکھ کر زری کا دل بھی پگھل گیا اور وہ بھی آب دیدہ ہوگئی...... ماں نے دوپٹے کے پلو سے آنکھوں سے بہتے آنسو پونچھے اور پھر کہنا شروع کیا۔

"تیرے چھوٹے بہن بھائیوں کی تو مجھے اتنی فکر نہیں ہے، کیوں کہ یہ ابھی چھوٹے ہیں...... جب تک میری سانس ہے، انہیں مجھ سے اور مجھے ان سے آس ہے، لیکن تیرا گھر بسانا بہت ضروری ہے، کیوں کہ اب گھر میں پتھر آنے شروع ہوگئے ہیں۔ میں کمزور و لاچار، بیمار و لاغر...... میں نہ تو تیری رکھوالی کرسکتی ہوں اور نہ تیرا بوجھ اٹھا سکتی ہوں...... اس لیے کہتی ہوں کہ دیکھ اب بھی وقت ہے...... میرے پاس تجھے دینے کو کچھ بھی نہیں ہے...... اس حال میں کوئی اور تجھے کیا لے جائے گا، سب لالچ سے پُر جہیز کے بھوکے ہیں، مگر وہ میرے اپنے ہیں...... زری تو ہاں کہہ دے تو رضی کے ساتھ تیرا بیاہ کردوں...... کیوں کہ پھر وہ میرا اپنا میری بہن کا بیٹا ہے...... اپنا خون ہے۔ بیٹی اپنا مارتا بھی ہے تو سائے میں ڈالتا ہے۔ وہ جس طرح تیرا خیال رکھے گا، کوئی اور تجھے نہیں رکھ سکے گا، پھر...... کہیں اور میں رشتہ کیسے کروں...... میرے پاس تو تیرے اور میرے تن کے کپڑوں کے سوا کچھ بھی تو نہیں ہے، جب کہ میری بہن نے صرف تجھے مانگا ہے اور کچھ بھی نہیں۔"

☆......☆

زری کئی دن سے پریشان تھی۔ ماں کی پریشانی اس سے دیکھی نہیں جارہی تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے...... سوچ سوچ کر اس کا سر پھٹا جارہا تھا...... آخر ایک روز اس نے جی کڑا کر کے فیصلہ کر ہی لیا کہ کچھ بھی ہو...... ماں کا کہا مان لیا جائے اور پھر جو کچھ بھی ہو...... وہ میری قسمت۔

غریب کو ویسے بھی اپنی قسمت پر بڑا مان ہوتا ہے اور وہ ہر اچھے برے کو قسمت کا لکھا جان کر سہ جاتا ہے...... یہی کچھ زری کے ساتھ ہوا۔

☆......☆

زری کی ماں نے محلے کے چار آدمی اکٹھا کر کے ایک گلاس شربت پر اس کا ہاتھ رضی کے ہاتھ میں بڑی سادگی سے دے دیا...... نہ کوئی دھوم دھڑکا ہوا ہے نہ شہنائی بجی، نہ دولہا آیا...... دولہا آیا کا شور بلند ہوا اور نہ ہی کوئی مہندی مایوں کی رسم ہوئی...... بلکہ گھر کے جن کپڑوں میں وہ ملبوس تھی، اسی میں خاموشی سے رخصت کردی گئی۔

رخصتی کے وقت نہ تو کسی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور نہ ہی خوشی کے آثار...... بلکہ ہر شخص حیرت زدہ نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہا تھا کہ یہ کیسی شادی ہے، جس میں نہ تو کوئی شور ہے اور نہ ہنگامہ۔

☆......☆

زری رخصت ہوکر اپنی خالہ کے گھر ایک دوسرے محلے میں آچکی تھی، جہاں کہنے کو سب اس کے اپنے تھے...... اب یہی اس کا اصلی گھر تھا، جہاں اسے اپنی زندگی کا طویل حصہ بتانا تھا۔

زری کا ساتھ ملنے پر بھی رضی کی زندگی نہ بدلی تھی۔ اس کا لاأبالی پن اور بدقماشی کی روش اسی طرح برقرار تھی...... یہاں آکر اور ان کا ماحول دیکھ کر اب زری کو اپنا گھر اس سے بہتر لگنے لگا تھا، جہاں وہ اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ لڑ بھڑ کر ہی کم از کم خوشی سے رہ تو رہی تھی...... وہاں کم از کم اس کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک تو کیا جاتا تھا۔

زری کو اس بات کا شدت سے احساس ہوتا تھا کہ وہ اپنی خالہ کے گھر بیاہ کر آئی ہے، لیکن اب قسمت کا لکھا کیسے ٹلتا۔

☆......☆

شادی کے چند ماہ بعد ہی لڑائی جھگڑے شروع ہوگئے...... آئے روز کی گالم گلوچ، مار پیٹ اور بے جا الزامات سے زری تنگ آچکی تھی...... رضی کے شب و روز جوں کے توں تھے۔ آئے دن دارو پی کر آتا...... اور زری پر تشدد کرتا...... سارا سارا دن گھر میں نکھٹو بنا پڑا رہتا...... نہ کوئی کام نہ کاج، بلکہ الٹا یہ طعنے کہ تو لے کر کیا آئی ہے...... اس بات پر دونوں ماں بیٹے یک زبان تھے اور اپنے پچھلے تمام وعدے وعید بھول چکے تھے...... ان کی حالت بھی زری کے گھر کی طرح پتلی تھی...... رضی کا باپ ایک بھٹہ مزدور تھا اور مزدوری کرتے کرتے ہی چل بسا تھا...... یہی وجہ تھی زری کی خالہ نے ان کی غربت سے فائدہ اٹھا کر زری کو اس کی ماں سے مانگ لیا کہ اس کے نکھٹو بیٹے کو کوئی بھی اپنی بیٹی دینے کو تیار نہ تھا، لیکن زری کی ماں خون پر مرمٹی...... اب بیٹی کی حالت دیکھ کر وہ آٹھ آٹھ آنسو بہاتی تھی۔

☆......☆

آج زری کی شادی کو بارہواں سال لگ چکا تھا اور گزشتہ بارہ برس میں وہ اپنی ساس اور شوہر کے طعنے سُن سُن کر تھک چکی تھی...... جو اسے اولاد نہ ہونے پر نہ جانے کن کن القابات سے نوازتے تھے...... زری کی عمر اس وقت صرف اٹھائیس برس تھی...... ابھی اس کے اوپر سے جوانی کا چاند اترا نہیں تھا...... اس کی اُجلی رنگت اب بھی دیکھنے والے کی نظروں کو اُجال رہی تھی اور ان کے جذبات کو اچھال رہی تھی۔

سولہ برس کی عمر میں اس کی شادی رضی کے ساتھ ہوئی تھی اور آج بارہ برس گزر جانے کے بعد بھی وہ اس گھر کی سب سے معتوب عورت تھی...... لاکھ ڈاکٹروں کو دکھایا...... بہتیرا علاج کیا...... دوائیں کھائیں...... حکیموں اور سنیاسیوں سے رجوع کیا...... جس نے جو ٹوٹکا بتایا، وہ بھی کر ڈالا...... لیکن...... زری کی کوکھ ہری نہ ہوئی۔

☆......☆

زری اپنی جلی کوکھ لیے در در کی خاک چھان رہی تھی کہ ایک روز اس کی قسمت نے یاوری کی اور اس کی ملاقات بنگالی بابا سے ہوگئی...... سفلی کاٹ کے ماہر بنگالی بابا نے زری کو بتایا کہ اس کی کوکھ سفلی عمل کے ذریعے بند کردی گئی ہے...... اس لیے اس کو سفلی عمل کے ذریعے ہی کاٹا جائے گا۔ پھر یہ کوکھ ہری ہوگی...... انہوں نے بتایا کہ اس کے لیے اسے کچھ انتظار کرنا پڑے گا، جب سعد ستارہ طلوع ہوگا تو زری کی گود ہری ہوگی۔

☆......☆

زری نے ذہنی طور پر خود کو اس بات کے لیے تیار کرلیا تھا کہ خواہ کچھ بھی ہوجائے، وہ اولاد کے حصول کے لیے سب کچھ کر گزرے گی...... مگر اسے کیا پتا تھا کہ......

☆......☆

شام کا وقت ہے...... آج زری اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ بنگالی بابا کی کٹیا میں موجود ہے...... اسے کسی قسم کا ڈر خوف نہیں...... کیوں کہ آج اس کی گود ہری ہونے والی ہے۔

بنگالی بابا کی کٹیا کا ماحول بڑا پُراسرار ہے۔ یہ ایک خستہ حال کمرے پر مشتمل ہے، جس میں جگہ جگہ بڑے فریم آویزاں ہیں...... کچھ پر نیم برہنہ خواتین کی دھندلی تصویریں بنی ہوئی ہیں اور کچھ پر نامانوس زبان میں کچھ تحریر ہے۔ کچھ پر جانوروں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں...... ایک طرف کونے میں ایک انگیٹھی رکھی ہوئی ہے، کچھ جانداروں کی ہڈیاں ایک طرف پڑی ہوئی ہیں اور کچھ ہڈیاں دھاگے سے باندھ کر دیوار میں گڑی کیلوں سے ٹانگ دی گئی ہیں...... ایک طرف دیوار کے ساتھ کچھ بوتلیں رکھی ہوئی ہیں...... ایک چھال پر ایک میلی سی چادر بچھی ہوئی ہے...... اور ایک گاؤ تکیہ سرہانے پڑا ہے، جس پر سیاہ کپڑا چڑھا ہوا ہے۔ کچھ برتن، پلیٹیں، جگ، گلاس ایک طرف رکھا ہوا ہے...... باہر چلتی تیز ہوا اور سمندر کے شور نے ماحول کو اور بھی وحشت زدہ بنادیا ہے...... کمرے کے ایک کونے میں پیتل کا ایک چھوٹا دیا روشن ہے، اس کی ٹمٹماتی لو کمرے کی تاریکی کو دور کرنے میں قطعاً ناکام ہے۔

☆......☆

قریباً رات نصف پہر گزر چکا ہے...... زری کے دل میں طرح طرح کے وسوسے اور خیال سر اٹھا رہے ہیں...... لیکن وہ دل پر جبر کیے...... ڈری سہمی، خوف و

خوفی کے عالم میں بنگالی بابا کے انتظار میں بیٹھی ہے۔
گوکہ انتظار کی گھڑیاں طویل ہوگئی ہیں، لیکن اولاد کی آس نے اس کے پیر باندھے ہوئے ہیں...... آج اس کی گود ہری ہوجائے گی...... زری اسی خیال میں کٹیا میں رکھی اشیاء کا جائزہ لے رہی تھی کہ ایک دم زوردار جھٹکے سے کٹیا کا دروازہ کھلا اور ایک ننگ دھڑنگ، کالا بھجنگ، چہرے پر (بھبھوت) ملے، برہنہ سر، برہنہ پا، شانوں تک لمبے بال سیاہ، بڑی بڑی گھنی مونچھیں، کوتاہ مگر موٹی سیاہ گردن میں موٹے کنٹھے کی مالا پڑی ہوئی، بھنویں بالکل صفاچٹ، سیاہ چہرے پر انگارے کی مانند دو سرخ آنکھیں، ماتھے پر تازہ خون کا سرخ تلک لگا ہوا، کانوں میں نقرئی بالیاں پہنے، موٹے موٹے بھدے سیاہ ہونٹ، بھاری بھرکم جسم، توند باہر کو نکلی ہوئی، پستہ قد شخص ایک ہاتھ میں لاٹھی اور ایک میں راکھ لیے کٹیا میں داخل ہوا۔ اس کے جسم پر صرف لنگوٹ برائے نام تھی......
جن نما انسان کو اس طرح کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر زری مارے خوف کے سہم گئی۔ اس کے جسم میں جھرجھری سی آگئی۔ اس نے اٹھنا چاہا مگر اٹھ نہ سکی، بیٹھے ہی بیٹھے جھرجھراتی رہی...... اس کی ننگائی کو دیکھ کر زری کو بڑی لاج آئی...... اس نے لاکھ اپنا منہ دوسری طرف پھیرنا چاہا، مگر نہ پھیر سکی۔

☆......☆

زری نے مارے خوف کے دل ہی دل میں سوچا...... یا خدایا...... یہ کون آگیا...... ملگجے اندھیرے میں اس نے پہچاننے کی کوشش کی کچھ ہی دیر بعد اسے خیال آیا...... کہیں یہ بنگالی بابا تو نہیں...... ابھی اس نے کچھ کہنے کے لیے سوچا ہی تھا کہ ایک کرخت دار آواز کمرے میں گونجی......
''تو کون ہے ناری...... اور یہاں کیا لینے آئی ہے......'' آواز کی گونج نے کمرے کے ماحول کو اور بھی وحشت زدہ کردیا۔
زری نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا...... ''مم...... مم...... مجھے بنگالی بابا سے ملنا ہے......'' اس کی آواز اچانک حلق میں پھنسنے لگی، الفاظ بے ربط ہوگئے۔
آواز کمرے میں دوبارہ گونجی...... ''ہم ہی ہیں بنگالی بابا...... بول کیا چاہیے تجھے......'' اس وقت بابا کے لہجے میں بڑی شدت تھی، جیسے انہیں زری کا یہاں آنا ناگوار گزر رہا ہو۔
زری نے دل میں سوچا...... آج سے دس برس قبل جب میں بابا کے پاس گئی تھی، تو ان کی شکل وصورت ایسی تو نہ تھی...... لیکن...... آج دس برس بعد یہ کتنا بدل گئے ہیں کہ میں انہیں ہی نہ پہچان سکی۔
اب زری کا خوف کچھ کم ہونا شروع ہوا تو ہمت کرکے بولی......
''بابا...... دس برس قبل آپ نے مجھے کہا تھا کہ میری گود ہری کردیں گے...... لیکن اس کے لیے مجھے انتظار کرنا پڑے گا اس وقت تک...... جب تک کہ سعد ستارہ طلوع نہیں ہوجاتا...... میں آج اسی آس پر آپ کے پاس آئی ہوں کہ......'' یہ سن کر باباجی کی باچھیں کھل گئیں اور وہ جی ہی جی میں خوش ہوگئے کہ...... برسوں کی تپسیا کے بعد انہیں ناری کا قرب میسر آئے گا...... ان کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ پھیل گئی اور انہوں نے سہمی ہوئی بیٹھی زری کے جسم کا طائرانہ جائزہ لینا شروع کیا...... اس کی آنکھیں اور رنگت انہیں بھاگئی...... انہوں نے اسی کرخت لہجے میں زری سے کہا۔
''ٹھیک ہے! تیرا دھیان ضرور پورا ہوگا...... اس کے لیے تجھے کچھ دان کرنا ہوگا۔''
زری نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا...... ''مجھے کیا کرنا پڑے گا بابا......''
بابا نے قہر آلود نگاہوں سے اسے دیکھا اور کہا......
''نادان لڑکی جیسا ہم کہتے ہیں ویسا کر...... ورنہ......''
زری نے سہم کر گردن ہلائی...... باباجی نے اسے کھڑا ہونے کا حکم دیا۔
پھر انہوں نے انگیٹھی میں کنڈے کی آگ جلائی اور زری کو اس کے آگے کھڑے ہونے کو کہا...... اور خود کھڑے ہوکر آنکھیں بند کرکے کچھ منتر پڑھنے لگے...... زری مبہوت بنی ان کے ہونٹوں کو ہلتا دیکھتی رہی، لیکن جو کچھ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہے تھے...... وہ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔

☆......☆

کافی دیر بعد باباجی نے آنکھیں کھولیں اور ساتھ رکھی بوتل اٹھالی اور پھر آنکھیں بند کرکے کچھ پڑھنا شروع کردیا...... کچھ دیر بعد پھر اپنی سرخ انگارے جیسی آنکھیں کھولیں اور زری کو قریب بلا کر اس کے چہرے پر پھونک ماری، پھر ساتھ لائی ہوئی راکھ کا بھبھوت زری کے چہرے پر مل دیا، پھر باباجی رقص کرنے لگے، کچھ دیر جھولنے ناچنے کے بعد انہوں نے بوتل کھولی اور گلاس میں سیال مادہ بھر دیا...... پہلے باباجی نے اس کے دو گھونٹ بھرے اور پھر گلاس زری کی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھا دیا۔
''یہ لے ناری...... اسے ایک سانس میں پی جا......''
زری نے گلاس ہاتھ میں لیا...... منہ سے لگایا تو اس میں ایک عجیب سی ناگوار بو کا بھبکا لگتا ہوا محسوس ہوا...... اس نے پینے میں ذرا تامل کیا تو باباجی چیخے......
''کیا دیکھتی ہے نادان...... جلدی کر...... ورنہ گود ہری ہونے کا سمے نکلا جارہا ہے۔''
زری کے دماغ پر بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ...... آج کی رات...... اس کی گود ہری ہونے والی ہے...... اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ...... جھٹ گلاس منہ سے لگایا...... سانس روکی...... اور غٹاغٹ ایک ہی سانس میں گلاس خالی کردیا۔
مشروب پی کر زری کا سر بھاری بھاری سا ہوگیا۔ اسے کٹیا کی ہر شے گھومتی ہوئی محسوس ہونے لگی...... باباجی بھی اسے الٹے الٹے سے نظر آنے لگے اور وہ رفتہ رفتہ سرور کی دنیا میں کھونے لگی۔
اب گلاس پینے کی باری باباجی کی تھی...... انہوں نے بوتل سے گلاس بھرا اور دو گھونٹ اس میں سے پی کر زری کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
''یہ لے لڑکی...... اسے جلدی سے پی جا......'' اس طرح بابا نے مشروب کے کئی گلاس زری کو پلادیے...... اب زری قریباً مدہوشی کے قریب تھی...... بابا نے موقع غنیمت جانا اور بقیہ مشروب بوتل سے منہ لگا کر خود پی گئے۔

☆......☆

ہمارے معاشرے میں بنگالی بابا جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں...... سفلی کاٹ...... عملیات کے ماہر...... معشوق آپ کے قدموں میں...... نرینہ اولاد حاصل کریں۔
اس طرح کے نام نہاد عاملوں کے جھوٹے دعوؤں پر مشتمل ہینڈ بلز کی شکل میں مسافر گاڑیوں میں ان کے کارندے تقسیم کرتے اور بڑے بڑے پوسٹر دیواروں پر چسپاں کرتے نظر آتے ہیں...... ان جعلی عاملوں، پیروں اور سنیاسیوں کے اڈے ویسے تو ملک بھر میں قائم ہیں، حتیٰ کہ یہ بیرون ملک بھی شکار کرتے ہیں، اور کراچی شہر میں ان کے مخصوص ٹھکانے...... صدر، تین ہٹی اور لسبیلہ میں کثرت سے قائم ہیں...... جہاں نہ جانے کتنی زریوں کی عصمتیں یہ لوگ پامال کرتے اور کتنے ہی گھر اجاڑتے ہیں۔ سادہ لوح، اَن پڑھ اور کم اعتماد والے توہم پرست مرد وزن ان کا زیادہ تر شکار ہوتے ہیں۔

☆......☆

جب زری میں بالکل سدھ بدھ نہ رہی تو باباجی کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہوئی اور انہوں نے، اٹھا کر اسے اپنے چھال سے سجے بستر پر لٹادیا اور پھر......
جب زری کو ہوش آیا تو...... اس کی گود ہری ہوچکی تھی...... لیکن...... باباجی کٹیا سے غائب تھے...... اس کا سر اب بھی بھاری ہو رہا تھا اور جسم سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں...... انگ انگ درد سے ٹوٹ رہا تھا...... اس کی آنکھوں میں ابھی تک مشروب کا خمار باقی تھا۔
رفتہ رفتہ صورت حال زری پر واضح ہوتی چلی گئی...... کچھ دیر تک وہ کٹیا کا جائزہ لیتی رہی...... انگیٹھی میں کنڈے سلگ سلگ کر راکھ ہوچکے تھے...... باہر ہوا کی سرسراہٹ بتا رہی تھی کہ اس کی شدت باقی ہے...... دور کہیں سمندر سے اٹھتی لہروں کا شور اس کے ذہن میں سما رہا تھا۔

☆......☆

جب زری کے ہوش وحواس بحال ہوئے تو اسے فوراً ہی اپنی عصمت کے پامال ہونے کا احساس ہوا...... یکلخت اس کی ذہنی کیفیت بدل گئی اور وہ دیوانہ وار دروازہ کھول کر ساحل سمندر کی ٹھنڈی ٹھنڈی گیلی ریت پر برہنہ بدن دیوانوں کی طرح چلاتی ہوئی بھاگ کھڑی ہوئی...... بس...... آج کی رات...... بس...... آج کی رات!

☆☆......☆☆



مکھنی

ارشد علی ارشد

خیال اور حقیقت کی قید سے آزاد، ایک عجوبہ لڑکی کی داستان عجب کی نویس گری

جسے قارئین بہت شوق سے پڑھتے ہیں

خلاصہ

مکھنی ایک نہایت ذہین و سمجھ دار، اوروں سے مختلف سوچ، خیالات، نظریات اور غیبی طاقت رکھنے والی گاؤں کی ایک لڑکی ہے جو اپنے ماں باپ، دو بھائیوں اظہر اور مظہر، ایک بہن سکھاں اور محبت میں ناکام، غیر شادی شدہ پھپھو ذکیہ کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔ سکھاں کو اپنے کالج فیلو سانول سے محبت ہوگئی ہے، مکھنی محبت اور عشق کے حوالے سے باتیں کرتے ہوئے اپنی بہن سکھاں کو سفید چونے کی دیوار کو اپنی غیبی طاقت سے پردۂ اسکرین بنا کر ماضی میں مجاہدین اسلام کا ایک لشکر دکھاتی ہے:۔

محبت اور عشق کی باتیں کرتی، گتھیاں سلجھاتی اور مسلمانوں کے عظیم ماضی و اسلاف کے کارنامے بتاتی اور دکھاتی مکھنی، سکھاں سے وعدہ کرتی ہے کہ وہ سانول سے اُس کے رشتے کے سلسلے میں گھر والوں سے بات کرے گی۔ مکھنی کے بھائی اظہر کی دبئی روانگی سے پہلے شادی کردی جاتی ہے۔ مکھنی اسی دوران میں سانول کے گھر اُس سے ملنے جاتی ہے۔ ایک روز سکھاں کالج سے لوٹ رہی ہوتی ہے تو چوہدری اللہ رکھا کا بیٹا چوہدری راحیل اُسے روک کر پریشان کرتا ہے اور پھر ایک روز جب سکھاں اپنی ماں کے ساتھ جارہی ہوتی ہے تو چوہدری راحیل دوبارہ وہی حرکت کرتا ہے۔ اس دوران میں سکھاں کا باپ اس کی منگنی فاطمہ خالہ کے دیور سے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ایک روز یوں بھی ہوتا ہے کہ چوہدری اللہ رکھا، مکھنی کا راستہ روک لیتا ہے۔ مکھنی اس کو برا بھلا کہتی ہے تو وہ اسے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے لیکن مکھنی اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔ چوہدری اللہ رکھا اپنے کارندوں کے سامنے اس

بے عزتی پر مکھنی کو دھمکی دیتا ہے کہ اب میرے حجرے میں تیرا ناچ ہوگا اور پھر ایک روز چوہدری اللہ رکھا کے کارندے مکھنی کو اغوا کر کے اس کی کوٹھری کی شکل میں موجود حجرے میں پہنچا دیتے ہیں۔

چوہدری اللہ رکھا کے حجرے میں مکھنی اس کی خواہشات پوری کرنے کی بجائے موقع ملتے ہی چوہدری اللہ رکھا کی رائفل سے اسے قتل کر دیتی ہے۔ مکھنی کو چوہدری کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا جاتا ہے اور پھر سکھاں تھانے میں آ کر بتاتی ہے کہ چوہدری اللہ رکھا کے بڑے بیٹے چوہدری مشتاق نے اسے پیغام بھیجا ہے کہ اگر سکھاں کے لیے چوہدری راحیل کا رشتہ قبول ہے تو ہم مکھنی کو معافی کے بعد دیت کے قانون سے رہائی دلوا سکتے ہیں۔ اسی دوران میں لیڈی انسپکٹر شبانہ کو مکھنی سے تفتیش کے لیے بلایا جاتا ہے۔ مکھنی اُسے دیوار پر محمد بن قاسم کا نظارہ کر کے دہلا دیتی ہے اور وہ تھانے دار کے گھر تک پہنچ جاتی ہے۔ مکھنی کے معاملات سے خائف ہو کر تھانے دار اُسے لے کر گاؤں آتا ہے جہاں مکھنی کے قاتل ہونے کے گواہ اپنے بیان سے مکر جاتے ہیں۔ مکھنی تھانے دار سے رہائی حاصل کرنے کے بعد اپنے گھر آتی ہے۔

گھر آ کر اسے پتا چلتا ہے کہ اس کا ابا فالج کے باعث چارپائی سے لگ گیا ہے پھر کچھ دن بعد اس کے ابا کا انتقال ہو جاتا ہے جبکہ اس کا بھائی، باپ کی موت سے پہلے ہی دبئی چلا جاتا ہے۔ اسی دوران میں اس کی شادی بلاول سے ہو جاتی ہے۔ ایک روز مکھنی کی اماں کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ وہ بھاگم بھاگ ڈاکٹر کو بلانے جاتی ہے کہ راستے میں اسے اغوا کر لیا جاتا ہے۔ اسے چوہدری کے فارم لے جایا جاتا ہے جہاں سے اسے لاہور کی ہیرا منڈی میں بھیج دیا جاتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات انجم نامی لڑکی سے ہوتی ہے جو اپنی دکھ بھری داستان اسے سناتی ہے۔

مکھنی، انجم کو حوصلہ دیتی ہے پھر مکھنی، انجم کو اس غلیظ جگہ سے نکال کر لے جاتی ہے۔ اس کام کے لیے وہ دلاور نامی گارڈ کی مدد لیتی ہے مگر خانم کے غنڈے ان کا پیچھا کرتے ہیں۔ راستے میں فائرنگ سے دلاور مر جاتا ہے اور ان کی گاڑی میں آگ لگ جاتی ہے۔ مکھنی اور انجم دریا میں چھلانگ لگا دیتی ہیں۔

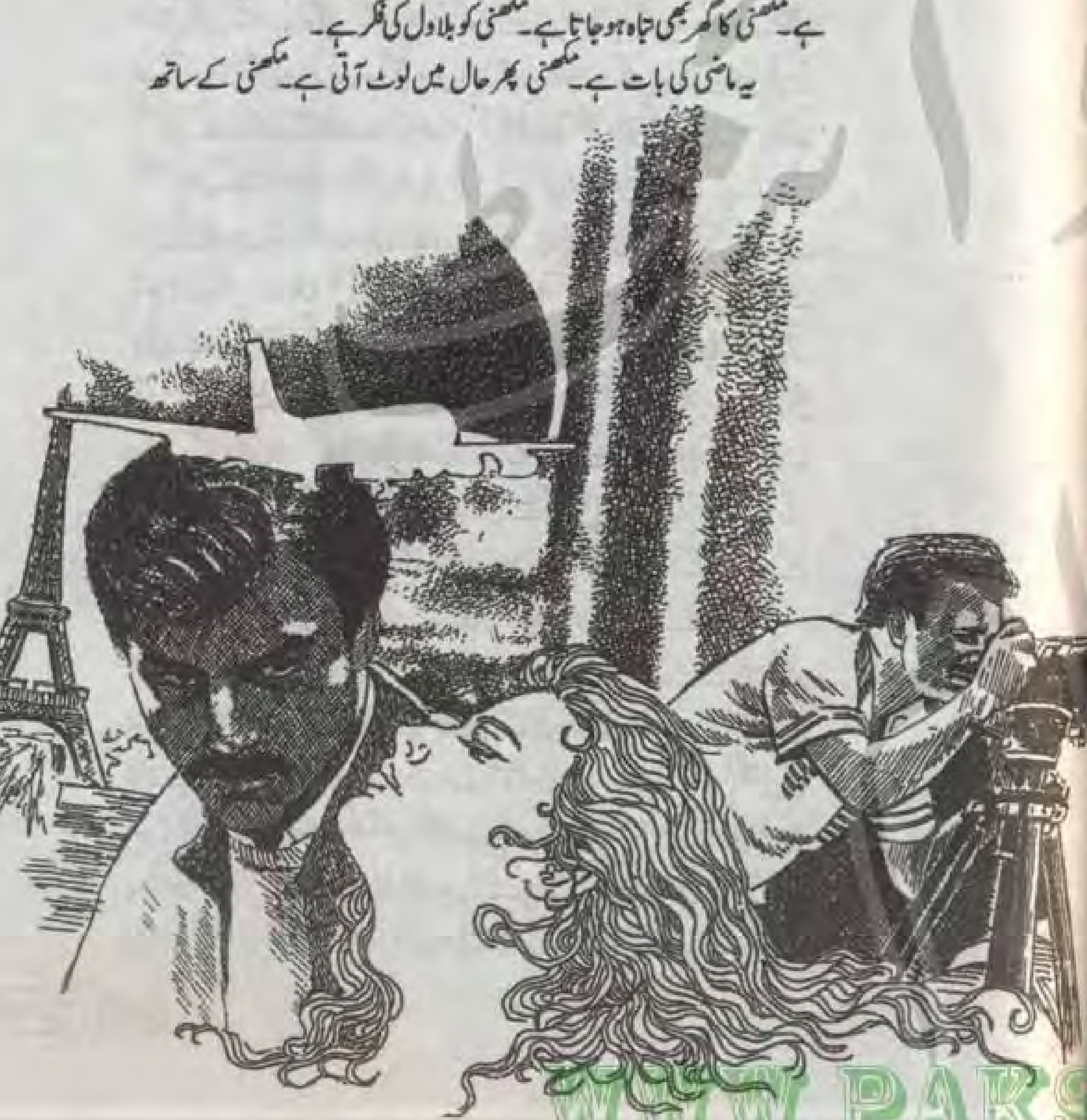
اچانک مکھنی کو علم ہوتا ہے کہ انجم دریا میں چھلانگ نہیں لگا سکی ہے لیکن اس کا انجام جاننے کا وقت نہیں تھا۔ مکھنی دریا میں کود کر اپنی جان بچا لیتی ہے۔ مکھنی گھر پہنچتی ہے تو اسے اذان کی آواز سنائی دیتی ہے جو اس کا ماموں رضا ولی دینے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اذان دے نہیں پا رہا ہے۔ اسی وقت کسی نادیدہ شخص کی مکروہ آواز سنائی دیتی ہے کہ مکھنی، تیرا ماموں اذان پوری نہیں کر پائے گا تو پہلے اپنے بچے کو تو دیکھ۔ بچے کو دیکھ کر وہ لرز جاتی ہے۔ اس کی ایک ٹانگ نہیں تھی۔ نادیدہ شخص کے کہنے پر وہ دوبارہ بچے کو دیکھتی ہے۔ اس بار اس کی دونوں ٹانگیں سلامت تھیں لیکن ایک کان کٹا ہوا تھا۔ وہ شیطانی آواز پھر اُبھرتی ہے کہ جب تک اذان پوری نہیں ہوگی، تیرے بچے کے جسم کا ایک عضو آتا اور دوسرا جاتا رہے گا۔ اذان پوری ہونے کی شرط یہ ہے کہ تُو اس آٹھ انچ چوڑے اور انتیس میٹر لمبے پائپ میں سات

بار گھس کر نکل۔ مکھنی حیرت زدہ رہ جاتی ہے لیکن جب وہ پائپ کے پاس پہنچتی ہے تو اس کا جسم بالکل سکڑ جاتا ہے۔ یوں وہ اس شیطانی نادیدہ شخص کی شرط پوری کر دیتی ہے اور بچے کی جان بچا لیتی ہے پھر وہ خود کو ایک گاڑی میں پاتی ہے جو تیزی سے دوڑ رہی ہے۔ باہر کا ماحول بہت پُرسکون تھا، نہ کوئی لڑائی نہ جھگڑا، لوگ ٹریفک قوانین کا احترام کر رہے تھے۔ مکھنی یہ سن کر حیرت زدہ رہ گئی کہ وہ پاکستان میں نہیں بلکہ ابوظہبی میں ہے۔ مکھنی کا شوہر بلاول اسے بتاتا ہے کہ ہم اس وقت ابوظہبی میں ہیں اور فی الوقت پوری امت مسلمہ کو دشمنوں سے خطرہ ہے۔ وہ ہر مسلم ملک کو نیست و نابود کر دینا چاہتے ہیں۔ مکھنی اسے تسلی دیتی ہے کہ جن ممالک کے دارالحکومتوں کا نام "الف" سے شروع ہوتا ہے انہیں اللہ بچائے گا۔

مکھنی اور بلاول نے اپنے بیٹے کا نام معاویہ رکھا ہے، معاویہ چار سال کا ہو گیا ہے لیکن باتیں بہت ذہانت کی کرتا ہے۔

مکھنی اور بلاول ابوظہبی سے پاکستان آنے کا پروگرام بناتے ہیں۔ ایئرپورٹ پر مکھنی کو زلزلے کا احساس ہوتا ہے۔ ہر چیز بری طرح ڈول رہی ہے لیکن وہ سب کچھ بلاول کو نظر نہیں آ رہا ہے۔ وہ لوگ ہوائی جہاز میں سوار ہو جاتے ہیں۔ نیچے قراقرم کی پہاڑیاں ہیں۔ مکھنی اپنی ماورائی قوتوں کے ذریعے ہوائی جہاز سے قراقرم کی پہاڑیوں پر اتر گئی۔ وہ گھوم پھر کے واپس آ جاتی ہے۔ وہ لوگ اپنے گھر پہنچ جاتے ہیں۔ اسی دوران میں سیلاب آتا ہے اور تباہی مچاتا گزر جاتا ہے۔ مکھنی کا گھر بھی تباہ ہو جاتا ہے۔ مکھنی کو بلاول کی فکر ہے۔

یہ ماضی کی بات ہے۔ مکھنی پھر حال میں لوٹ آتی ہے۔ مکھنی کے ساتھ



اکثر ایسا ہوتا ہے، کبھی وہ کہیں ہوتی ہے اور پھر غیر محسوس طریقے سے ماورائی قوت کے تحت وہاں سے کوسوں دور جا پہنچتی ہے۔ وہ اس وقت اپنے گھر میں ہے لیکن آنکھیں بند کرنے پر اسے بیت اللہ شریف نظر آ رہا ہے۔ مکھنی غیر شعوری طور پر بیت اللہ شریف کی تعمیر اور تعمیر نو پر بات کر رہی ہے۔ اس کے ساس سسر حیرت سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ مکھنی کہہ رہی ہے، دنیا تباہ ہونے والی ہے، زمین و آسمان، پہاڑ سب لرز رہے ہیں پھر اچانک مکھنی کسی ماورائی طاقت کے ہاتھوں قید ہو جاتی ہے۔ تنگ و تاریک اور حبس زدہ کمرے میں ایک نادیدہ آواز اسے دھمکیاں دے رہی ہے کہ تیرے ہاتھ پیر کاٹ دیے جائیں گے تو چلنے پھرنے کے قابل بھی نہیں رہے گی۔ مکھنی کے دونوں پاؤں کاٹ دیے جاتے ہیں لیکن یہ اس کا واہمہ ہوتا ہے، پھر اس کمرے کے باہر اسے اپنے گھر والوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں تو وہ اپنی سب تکلیفیں بھول جاتی ہے۔ اس قید خانے میں نہ کھڑکی ہے نہ دروازہ، صرف چھوٹا سا ایک رخنہ ہے۔ مکھنی اسی رخنے سے ہاتھ باہر نکالتی ہے اور اس کے بھائی مظہر اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنا دیتے ہیں اور وہ اس انگوٹھی کی برکت سے باہر آ جاتی ہے۔ استقبال کے لیے آنے والوں میں مکھنی اپنی رانی بھابی کا نام سن کر حیران رہ جاتی ہے۔ نہ جانے اس تنگ و تاریک کمرے اور مکھنی کے گھر کے درمیان کتنا فاصلہ تھا کہ وہ سیدھی اپنے کمرے میں آ نکلی۔ بلاول کہیں باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد مکھنی، معاویہ کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے لگی۔ اچانک معاویہ کہیں غائب ہو گیا۔ مکھنی گھبرا کر گھر سے باہر نکلی تو باہر گھنا اور تاریک جنگل تھا۔ مکھنی کو جنگل کی طرف بھاگتی ہوئی ایک خوب صورت لیکن بدزبان لڑکی ملی جو مکھنی کے روکنے کے باوجود نہ رکی اور ناریل توڑنے جنگل میں گھس گئی۔ اسی وقت مکھنی اس گھنے اور تاریک جنگل میں ٹرین کی آواز سن کر حیران رہ جاتی ہے۔ وہ لڑکی ٹرین کی پٹریوں میں پھنسی ہوئی ہے اور مدد کے لیے پکار رہی ہے۔ بلاول بھی وہاں آ جاتا ہے لیکن وہ دونوں مل کر لڑکی کو نہیں بچا پاتے اور لڑکی ٹرین کی زد میں آ کر کٹ جاتی ہے، پھر مکھنی خود کو اپنے گھر کے برآمدے میں پاتی ہے۔ اسے بتایا جاتا ہے کہ ابھی کچھ دیر پہلے سب کچھ تباہ ہو گیا تھا، دنیا ختم ہو گئی تھی لیکن پھر سب کچھ صحیح ہو گیا۔ مکھنی بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت سے پہلے قیامت کی نشانیاں دکھاتا ہے کہ سنبھلنا چاہو تو اب بھی سنبھل جاؤ پھر مہلت نہیں ملے گی۔ قیامت کے قریب صلۂ رحمی ترک ہو جائے گا، ظلم کی شدت ہو گی، خائن، امانت دار بن جائیں گے، آسمان سے آگ، خون یا پتھروں کی بارش ہونے لگے گی، اولاد نافرمان ہو جائے گی۔

اچانک ایک تیز آواز مکھنی کی بات کاٹ دیتی ہے اور کہتی ہے کہ آج جو کچھ ہو رہا ہے، وہ واقعی قرب قیامت کی نشانیوں کے عین مطابق ہو رہا ہے۔ منظر بدل جاتا ہے اور جنید، مکھنی سے کہتا ہے کہ جلدی آؤ، معاویہ مر رہا ہے۔ مکھنی پاگلوں کی طرح بھاگتی ہے۔ معاویہ کا جسم واقعی بے جان پڑا تھا۔ مکھنی بہت بری طرح پریشان ہو جاتی ہے۔ اچانک بلاول وہاں آتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں بڑا سا مٹی کا پیالہ ہے۔ مکھنی سمجھتی ہے کہ یہ آب حیات ہے جو بلاول، معاویہ کے لیے لایا ہے۔ مکھنی کو معلوم ہوتا ہے کہ پیالے میں آب حیات نہیں بلکہ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق گائے کا پیشاب ہے۔ وہ پیالہ غصے میں بلاول پر پھینک دیتی ہے اور کہتی ہے کہ میں تو سمجھی تھی کہ تو آب حیات لایا ہے۔ بلاول کہتا ہے کہ مکھنی تو نے ہی تو بتایا تھا کہ آب حیات کا کوئی وجود نہیں ہے۔ سب قصے کہانیاں ہیں کہ خضر علیہ السلام اس چشمے کے مالک ہیں لیکن قرآن اور حدیث سے اس قصے کی تائید نہیں ہوتی۔ جس بات کی تائید قرآن اور حدیث سے نہ ہو، وہ درست کیسے ہو سکتی ہے؟ جب قرآن سے اس کی تائید نہیں ہوتی تو میں آب حیات کہاں سے لا سکتا ہوں؟

اچانک مکھنی کو ایسا لگا جیسے پوری کائنات اس پہ آ گری ہے اور اس کا سُرمہ بن گیا ہے۔ لوگ باری باری آ کر وہ سرمہ لے جا رہے ہیں لیکن مکھنی تو سُرمہ بننے کے باوجود جوں کی توں موجود تھی۔ اسے تجسس تھا کہ آخر یہ لوگ اس سرمے کا کریں گے کیا؟ اسی تجسس میں وہ ایک اُدھیڑ عمر شخص کے پیچھے چل دی۔ وہ پراسرار شخص اچانک ایک قبرستان میں داخل ہو گیا اور جاتے جاتے مکھنی کو تاکید کر گیا کہ نماز ہرگز نہ پڑھنا۔ مکھنی کو بہت غصہ آیا کہ کیسا شخص ہے جو اسے نماز سے روک رہا ہے؟ وہ پُرسکون جگہ تھی۔ وہاں مکھنی کو نیند آ گئی۔ اس کی آنکھ کھلی تو وہی پراسرار شخص اس کے سامنے تھا، جب مکھنی کو معلوم ہوا کہ وہ چھ دن تک مسلسل سوتی رہی ہے اور خواب میں اس نے ایک عظیم الشان محل دیکھا ہے جہاں کا ماحول بہت مقدس اور پاکیزہ ہے لیکن پراسرار شخص کی مداخلت سے مکھنی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ شخص روانگی کو تیار ہوا تو مکھنی نے بھی اس کے ساتھ جانے کی ضد کی اس شخص نے مکھنی کو اس شرط پہ ساتھ رہنے کی اجازت دے دی کہ میں کچھ بھی کروں، تم کوئی سوال نہیں کرو گی۔ مکھنی اس کی شرط پر راضی ہو جاتی ہے۔ وہ دونوں روانہ ہوئے۔ ایک جگہ کچھ لوگ ایک کنواں کھود رہے تھے اس علاقے میں قحط سالی تھی۔ جب پانی نکل آیا تو وہ سب خوشی خوشی دوسروں کو اطلاع دینے چلے گئے۔ اس شخص نے ان کی کئی دن کی محنت برباد کر دی اور کنویں کو دوبارہ پاٹ دیا اور روانہ ہو گیا۔ وہ دونوں ایک جنگل میں داخل ہوئے۔ چونکہ پورے علاقے میں قحط سالی کا دور دورہ تھا اس لیے پانی نایاب تھا۔ مکھنی کو کچھ فاصلے پر ایک بوڑھا شخص نظر آیا جو پہاڑ کی جڑ سے قطرہ قطرہ ٹپکنے والے پانی سے اپنا کشکول بھر رہا تھا۔ جب کافی دیر بعد اس کے کشکول میں پانی تھوڑا بہت جمع ہوا تو اس پراسرار شخص نے غلیل کا غلہ مار کے اس کا کشکول گرا دیا۔ اس نے کئی بار یہ کیا تو مکھنی نے غصے میں اس سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن اس پراسرار شخص نے اسے خاموش کرا دیا اور بے نیازی سے ایک طرف روانہ ہو گیا۔ وہ دونوں گھوم پھر کے دوبارہ اُسی قبرستان میں پہنچ گئے۔ مکھنی کے استفسار پر اس شخص نے بتایا کہ قبرستان میں کچھ خبیث لوگ ایک لڑکی کے لیے کالا علم کر رہے تھے۔ میں نے انہیں ٹھکانے لگا دیا۔ کنویں کا پانی زہریلا تھا، اسے پی کر سب گاؤں والے مر جاتے اس لیے میں نے اسے دوبارہ بند کر دیا۔ کشکول میں بھرا جانے والا پانی بھی زہریلا تھا اس لیے میں نے پانی گرا کر اس شخص اور اس کی بیوی کی جان بچائی اور تمہیں نماز پڑھنے سے اس

لیے روکا تھا کہ وہ مکروہ اوقات تھے اور سورج غروب ہونے والا تھا، پھر مکھنی اور اس پراسرار شخص کے راستے جدا ہو گئے۔

مکھنی نے اچانک خود کو ایک لق ودق صحرا میں پایا۔ وہاں اسے کپڑے کی ایک چھوٹی سی تھیلی ملی۔ اس تھیلی میں چار الائچیاں اور تسبیح کے چار دانے تھے۔ اس نے سوچا۔ ''اس میں کوئی پیغام پوشیدہ ہے۔''

وہاں سے کچھ فاصلے پر دھواں اٹھ رہا تھا۔

مکھنی گھر پہنچی تو اس نے موقع پا کر الائچی کا ایک دانہ جنید کے گلاس میں ڈال دیا۔ مکھنی کو گلاس میں دو الفاظ لکھے نظر آئے، ''لالچ'' اور ''معاویہ۔''

پھر مکھنی کے ذہن نے ایک اور جست بھری اور وہ سلطان نورالدین زنگی کے دور میں پہنچ گئی جب صلیبی جنگیں زوروں پر تھیں۔ اسی دوران میں دو یہودی، مسلمانوں کے حلیے میں مدینہ منورہ میں داخل ہوئے اور دکھاوے کی عبادت میں مصروف ہو گئے۔ اصل میں وہ اپنے حجرے سے رسول اللہ ﷺ کے روضۂ مبارک تک ایک سرنگ کھودنا چاہ رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے خواب میں آ کر سلطان کو اس کی اطلاع دی۔ سلطان نورالدین زنگی کے بارے میں ابن اشیر لکھتا ہے کہ خلفائے راشدینؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے بعد میں نے جس شخص کو انتہائی متقی اور پرہیزگار پایا، وہ نورالدین زنگی ہے۔ وہ ایک متقی انسان تھا۔ اس نے ایشیائے کوچک پر حملہ کیا اور کئی شہر فتح کر لیے۔ سلطان ابھی اس مہم میں مصروف تھا کہ اس کی دہشت اردگرد کے علاقوں میں گردش کرنے لگی۔

(اور اب آگے پڑھیے۔)

اربل، فلاط شام، مصر اور قونیہ کا امیر تسلیم کر لیا گیا۔ سلطان نے ملک شام کے بڑے بڑے شہروں میں مساجد، شفاخانے اور سرائیں جگہ جگہ تعمیر کرائی تھیں۔ سلطان نے صلاح الدین ایوبی کو مصر کا گورنر مقرر کیا تھا۔ اور دوسری صلیبی جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ بلکہ سلطان کا مقصدِ حیات ہی صلیبی جنگوں کو روکنا تھا، صلاح الدین ایوبی نے صلیبی فتوحات کی جتنی بھی عمارتیں کھڑی کیں، اس کی بنیادیں سلطان نورالدین زنگی نے فراہم کر دی تھی۔

ایک روز نورالدین زنگی کو خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت ہوئی۔

''آہ۔'' میرے منہ سے ٹھنڈی سانس نکل گئی۔ کیسے حکمران تھے سوتے تھے تو رسول اللہ ﷺ کا دیدار پا لیتے تھے۔ آج کے حکمران کو تو سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص تک یاد ہیں، دیدار کیا خاک ہوگا۔

خواب میں رسول اللہ ﷺ نے سلطان کو یہودیوں کی کھودی جانے والی سرنگ کے بارے میں بتایا۔ سلطان بہت پریشان ہوئے، دو دن پریشانی میں گزر گئے مگر سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کیا جائے۔

تیسری رات پھر رسول اللہ ﷺ خواب میں آئے اور شدت سے عمل کا تقاضہ کیا۔

سلطان بیدار ہوتے ہی مدینہ منورہ جا پہنچے۔ ہر چیز کا از خود باریک بینی سے مشاہدہ کیا مگر مدینہ شہر کی ہر چیز نارمل تھی۔ سلطان کچھ سمجھ نہ پایا۔ مگر اگلی بار جب خواب میں آنحضرت ﷺ تشریف لائے تو سلطان کو یہودیوں کی شکلیں ذہن نشین کرا دیں۔

سلطان نے دوسرے دن مدینہ والوں کی دعوت کا اہتمام کیا۔ اس دعوت میں شہر کے تمام لوگوں کو سختی سے شرکت کرنے کا حکم دیا گیا۔ شہر بھر کے لوگ آتے رہے اور دعوت کھانے لگتے۔ مگر دعوت میں شیطان صفت یہودی نہ آئے۔ وہ اپنی عبادت و ریاضت میں مصروف رہے۔

جب دعوت میں دو صورتوں والے وہ اشخاص دکھائی نہ دیے جن کے بارے میں سلطان کو بتایا گیا تھا تو سلطان نورالدین زنگی نے منتظمین سے پوچھا۔ ''شہر میں کوئی ایسا شخص ہے جو اس دعوت میں شریک نہ ہوا ہو۔'' ایک اہلکار نے کہا۔

''آقا! دو افراد کے علاوہ پورا مدینہ شہر دعوت کھا چکا ہے۔''

''دو افراد! وہ دو افراد کون ہیں اور کیوں نہیں آئے؟'' سلطان نے پوچھا۔

''آقا! وہ دن رات عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔ مدینہ کے نواح میں ان کا حجرہ ہے۔ وہ دعوت میں اس لیے شریک نہیں ہوتے کہ مبادا ذکرِ الٰہی میں فرق آ جائے۔'' اہل کار نے جواب دیا۔

یہ سن کر سلطان نے بے اختیار کہا۔ ''سبحان اللہ! ایسے لوگوں کی کیا شان ہے، جو دن رات عبادت اور ذکرِ الٰہی میں مگن رہتے ہیں۔ ہم خود ان کا کھانا لے کر ان کے حجرے میں حاضری دیں گے، اور ان کی زیارت کریں گے۔''

سلطان نورالدین زنگی خود ان کی کٹیا کی طرف چل پڑے ان کے ساتھ ملازمین کھانے کے خوان اٹھائے ہوئے تھے۔

کٹیا والے یہودی پہرے دار نے دور سے دیکھا۔ ان کے حجرے کی طرف ایک چھوٹا سا قافلہ چلا آ رہا ہے۔ اس نے بھاگ کر اپنے ساتھی کو اطلاع دی جو سرنگ میں مصروف تھا۔ وہ بھی اوپر آ گیا۔

سلطان نورالدین زنگی وہاں پہنچا تو دیکھتے ہی انہیں پہچان گیا۔ یہ وہی شکلیں تھیں جو انہیں خواب میں دکھائی دی تھیں۔ سلطان کے حکم پر دونوں کافروں کی مشکیں کسوا دی گئیں، دیکھنے والی ہر آنکھ میں حیرانی تھی، ہر شخص سناٹے میں تھا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ جن زاہد و عابد لوگوں کے لیے سلطان خود کھانا لے کر آیا، جو دن رات عبادت میں مشغول رہتے ہیں ان کی شکلیں کیوں کسوا دی گئیں، مگر جب سلطان کے حکم پر ان کا مصلیٰ اٹھا کر دیکھا گیا تو لوگوں کے منہ کھلے رہ گئے۔ جس مصلے پر وہ سجدے کرتے تھے اس کے نیچے سرنگ کا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ یہودیوں نے سارا ماجرا سلطان کے سامنے سنایا اور



اعترافِ جرم کیا۔

سلطان نورالدین زنگی نے سیسہ پگھلوا کر ان کے حلق میں اُنڈیل دیا۔ اس طرح روضہ اطہر ﷺ تک پہنچنے والے یہودی کافر کیفرِ کردار تک پہنچ گئے۔ سلطان کو آنے والے دور میں ایسی سازش کے پیش آنے کا خطرہ لاحق ہوا۔ اس کی پیش بندی کے لیے روضہ اقدس ﷺ کے گرد سات دھاتوں کی دیوار تعمیر کردی گئی۔ یہ دیوار آج بھی ویسی کی ویسی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ سلطان نورالدین زنگی کے درجات بلند فرمائے۔

میں نے طویل سانس لے کر سوچا۔ ظاہر سے کچھ ہونے والا نہیں ہے، ہمیں اپنا باطن صاف وشفاف رکھنا ہوگا۔ تبھی ہم کامل مومن بناسکتے ہیں لیکن میری سوچ سے بلاول اتفاق کرتا ہے، نہ معاویہ۔ میں نے آنکھ کو زور زور سے جھپکا کر دیکھا۔ میری آنکھ کا شیشہ ابھی تک برقرار تھا۔ اس کی چبھن پہلے سے سوا ہوگئی تھی۔

تھیلی میں تین موتی جگمگا رہے تھے۔ ایک تسبیح کا دانہ اور ایک الائچی ابھی باقی تھی۔ معاویہ بھی مل نہیں رہا تھا۔ شاید کہیں نشانِ حیدر کی تقریب منعقد ہو رہی ہو، اور وہ اپنا نشانِ حیدر وصول کرنے چلا گیا ہو۔ مگر میرے بغیر وہ کیسے جاسکتا ہے۔

☆......☆

رمی کی لکڑی آگ جلانے میں پائیدار اور انتہائی بہترین سمجھی جاتی ہے۔ رمی کو لگنے والی آگ دیر تک جلتی رہتی ہے، اور اس کے انگارے کئی کئی گھنٹے تپتے رہتے ہیں۔ سلور کی چار بڑی کڑاہیاں انگاروں سے بھری پڑی تھیں، یہ رمی کے انگارے تھے اور اس قدر طاقت سے تپ رہے تھے کہ کئی میٹر دور تک ان کی تپش کو محسوس کیا جارہا تھا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو تقریباً تیس کے قریب لوگ موجود تھے۔ تمام لوگ انگاروں سے پندرہ بیس میٹر دور کھڑے ہوئے باتیں کررہے تھے۔

ہمیں دیکھتے ہی ان کی ٹولیاں پھیل کر ایک مجمع کی شکل اختیار کرگئی۔ میں بلاول کے ہمراہ جیسے ہی ان کے قریب پہنچی لوگوں نے ہمیں اپنے حصار میں لے لیا۔ ایک بڑا دائرہ بنایا گیا جس کے بیچ میں ہم کھڑے ہوئے تھے۔ بلاول نے بلند آواز میں ان کی الجھن کا سبب دریافت کیا۔

جواب میں کوتاہ قد اور دبلے جسم کا ایک بوڑھا شخص بولا۔ ”ہمیں کچھ عرصہ سے ایک پریشانی لاحق ہے، اسے رفع کرنے کے لیے منتہٰی کو زحمت دی ہے۔“

اپنا نام اس کے منہ سے سن کر میں چونکے بنا نہ رہ سکی۔ میں نے دیکھا دبلے پتلے شخص کے سر اور داڑھی کے سارے بال سفید تھے۔ اس کی بات ابھی ختم بھی نہیں ہوئی کہ مجمع سے اس جیسا ایک اور شخص بولا۔ ”اگر ہمیں اس پریشانی سے نجات نہ ملی تو ہم سب تباہ برباد ہوجائیں گے۔“ اس کی پیروی میں چند مزید آوازیں اُبھریں، ”ہماری بیوی، بچے بھوکے مرجائیں گے، ہمارے گھروں میں فاقے پڑجائیں گے۔“

میں نے ہاتھ بلند کرکے انہیں خاموش رہنے کی تلقین کی اور پوچھا۔ ”ماجرا کیا ہے؟ پہلے ہمیں پریشانی کا پس منظر بتاؤ، مگر آپ میں سے کوئی ایک شخص بولے، باقی خاموش رہیں۔ یاد رکھو تمہارے پاس صرف دس منٹ ہیں، پھر ہم چلے جائیں گے۔“

یہ سن کر وہی بوڑھا تیزی سے بولنے لگا جس نے بات کی ابتدا کی تھی۔ اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ ان سب کا تعلق مذہبی گاؤں جلال آباد سے ہے، جلال آباد چترال کا ایک خوب صورت علاقہ ہے۔ جلال آباد میں تیس سے چالیس گھر آباد ہیں۔ گھروں کا فاصلہ زیادہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ رقبے کے لحاظ سے جلال آباد کافی بڑا گاؤں ہے، چوں کہ یہ سارا علاقہ نشیب وفراز کا علاقہ تھا اس لیے ایک گھر ڈھلوان پر تھا تو دوسرا اونچائی پر اور تیسرا میدان میں، علاقہ خوب صورت، قدرتی رنگ برنگ پھولوں سے بھرپور تھا۔ جلال آباد کے تمام لوگوں کا ذریعہ معاش ان کے چھوٹے چھوٹے پھلوں کے باغات ہیں۔ ہر خاندان کے گھر کے اردگرد ایک چھوٹا سا باغ ہے جس کا پھل وہ قریبی شہر کی منڈی میں جاکر فروخت کرتے تھے، زرخیز مٹی اور روح کو معطر کردینے والی ہوائیں تھیں۔ انہیں اچھا خاصا پھل مل رہا تھا۔ مگر چند سال سے وہ یہ محسوس کررہے

تھے کہ باغات میں پھل کم پیدا ہورہا ہے۔ ابتداء میں یہ بات معمولی لگی لیکن رفتہ رفتہ پیداوار کی کمی کا احساس ہر شخص کو ہونے لگا۔

ہر سال گزشتہ سال کی نسبت پیداوار میں واضح کمی ہونے لگی، اس سال تو ان پر ایسا عذاب اُترا کہ صرف ایک حصہ ملا باقی تین حصے ایک زہریلے کیڑے کی نظر ہوگئے۔ ہم لوگوں نے اپنے تئیں بھاگ دوڑ کرکے دیکھ لی۔ زرعی ماہرین کو بلایا۔ ادویات کے چھڑکاؤ کے ساتھ ساتھ تمام احتیاطی تدابیر اپنائی گئیں مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

اب باغات کے درخت سوکھنا شروع ہوگئے ہیں، ایک ہفتہ قبل ہماری بستی میں کچھ لوگ اپنا اسباب اٹھائے داخل ہوئے۔ بستی کو پنج گانہ نماز ادا کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ وہ اچھے کاموں اور خوش اخلاقی کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ بستی کے اکثر لوگ بے نمازی ہیں بلکہ بہت سوں کو تو نماز پڑھنا آتی بھی نہیں۔

پوری بستی میں ایک ہی خستہ حال مسجد ہے جس میں بہ مشکل چار پانچ آدمی نماز پڑھنے جاتے ہیں۔ جو لوگ باہر سے آئے تھے انہوں نے ہی مسجد کی صفائی ستھرائی کی اور بستی کا جو بھی فرد ملا انہیں نماز، کلمہ سکھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ صرف تین دن کے لیے آئے تھے، تین دنوں بعد وہ اگلی بستی کی طرف کوچ کرگئے، بستی کے لوگ ان سے بے حد متاثر تھے۔ اس لیے انہیں اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔

ان میں سے ایک نے کہا تین بڑی سلور کی کڑاہائیاں لاؤ، ان میں رمی کی لکڑی کے انگارے جلاؤ، جیسے ہی انگارے بجھیں گے، آپ لوگوں کا مسئلہ حل ہوجائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ سوچا تھا، چند گھنٹوں میں انگارے بجھ جائیں گے۔ مگر تین دن مسلسل انگارے جلتے رہے اور نہ بجھے، ہم پریشان ہوگئے۔ اور دو بندوں کو اگلی بستی روانہ کیا، جس آدمی نے انگاروں کے لیے کہا تھا، اسے سارا ماجرا سنایا۔ جواب میں اس نے ایک واقعہ سنادیا۔ بوڑھا شخص روانی سے بولے جارہا تھا، میں اس کے الفاظ اور انداز پر حیران تھی۔ بظاہر وہ اَن پڑھ شخص نظر آتا تھا۔

میں نے کہا ”وہ واقعہ سناؤ جو آپ لوگوں کو سنایا گیا ہے۔“

ایک آدمی کے پیچھے شیر بھاگ رہا تھا، قریب کوئی درخت نہیں تھا جس پر چڑھ کر جان بچائی جاسکتی۔ بھاگتے ہوئے اسے ایک کنواں دکھائی دیا، اس نے کنویں میں چھلانگ لگانے کا فیصلہ کیا۔ مگر نیچے جھانکا تو کنویں میں پانی کے اوپر کالا ناگ تیرتا ہوا نظر آیا۔ وہ تذبذب میں گھر گیا۔ پیچھے شیر تھا اور کنویں میں کالا ناگ! آگے پیچھے موت نظر آنے لگی۔ معاً اسے کنویں کی دیوار پر سبز گھانس اُگی ہوئی نظر آئی۔ اس نے سوچا اگر گھانس کو پکڑ کر لٹک جاؤں تو تو شیر اور ناگ سے بچ جاؤں گا۔ جب شیر چلا جائے گا تو اُوپر نکل جاؤں گا۔ لہٰذا گھانس کو پکڑ کر بیچ میں لٹک گیا۔ مگر کچھ دیر میں اس نے دیکھا دو کالے اور سفید چوہے اس گھانس کو کترنے لگے ہیں جس کے ساتھ وہ لٹکا ہوا ہے۔ وہ پریشان ہوگیا، پریشانی میں اس نے کسی دوسرے سہارے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا تو قریب ہی شہد کی مکھیوں کا چھتہ نظر آیا۔ جس پر مکھیاں نہیں تھیں مگر چھتہ شہد سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے گھانس ایک ہاتھ سے پکڑی اور دوسرے ہاتھ سے شہد چکھا کہ اس کی لذت کو دیکھا جائے۔ شہد انتہائی مزیدار اور لذیز تھا۔ لہٰذا وہ سب کچھ بھول کر شہد چاٹنے لگا۔ اب سوچیں اس کا انجام کیا ہونے والا ہے۔

جس دن اس کو سمجھ گئے انگارے بھی بجھ جائیں گے اور تمہارے سارے مسائل بھی حل ہوجائیں گے۔

”آج دس دن ہوگئے ہیں۔“ دوسرا آدمی بولا۔ ”ہمیں نہ ہی واقعہ سمجھ میں آیا، نہ ہی انگارے بجھے اور نہ ہی ہمارا مسئلہ حل ہوا۔ ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں یہی باغات ہمارا ذریعہ معاش ہے، اگر باغات سوکھ گئے تو ہمارے گھروں میں فاقے پڑجائیں گے۔“ وہ سب مل کر رونے لگے۔ نہ جانے انسان کو خود سے زیادہ بچوں کا خیال کیوں رہتا ہے؟

میں نے بلاول کو اور بلاول نے مجھے دیکھا، اس کا سنایا ہوا واقعہ تو میں سمجھ گئی تھی، امام غزالیؒ نے یہ بات دنیا کے بارے میں فرمائی تھی۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ”کوئلے کی کڑھائیاں یہاں ہیں؟“

وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر مجھے دیکھتے ہوئے انگاروں کے پاس لے گئے۔ انگاروں کی تپش اس قدر شدید تھی کہ کئی میٹر دور ہی سے پسینے میں شرابور ہوئے جا رہے تھے۔ ہاتھ پاؤں اور چہرے کی جلد ایسے تپنے لگی تھی جیسے انہیں گرم سلاخوں سے داغا جا رہا ہے، میں نے مڑ کر بستی والوں کو دیکھا وہ مجھ سے کافی پیچھے کھڑے رہ گئے تھے۔

''سب لوگ ایک بار سورۂ فاتحہ اور تین بار سورۂ اخلاص پڑھیں۔'' میں نے بلند آواز میں لوگوں سے کہا اور ساتھ ہی آنکھیں بند کر کے خود بھی پڑھنا شروع کر دیا۔

آخری بار سورۂ اخلاص پڑھنے کے بعد میں نے ایک شخص کو اشارے سے قریب بلایا۔ وہ قریب آنے سے ڈر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف و ہراس کے آثار دیکھ کر میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''ڈرو مت، یہاں آؤ۔ کڑھائیوں کے انگاروں کو ہاتھوں میں لے کر مسل دو۔ انشاء اللہ کچھ نہیں ہوگا۔''

''نن۔ نہیں...... میں ایسا نہیں کر سکتا۔'' اس کے بڑھتے ہوئے قدم تھم گئے اور خوف سے چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا۔

''کیوں نہیں کر سکتے؟ کیا تم نے سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص نہیں پڑھی؟''

''نہیں پڑھی......'' وہ مارے خوف کے تھر تھر کانپنے لگا تھا۔

''کیوں نہیں پڑھی؟'' میں نے غصّے سے کہا۔ ''چلو ابھی پڑھ لو۔''

''مم۔ مجھے دونوں سورتیں یاد نہیں۔''

اس کی بات سن کر میرا غصہ مزید بڑھ گیا۔ ''اسی لیے تم لوگوں کا یہ حال ہے، جو واقعہ تم لوگوں نے مجھے سنایا، وہ دنیا کے بارے میں امام غزالیؒ کی مثال ہے، انسان کے پیچھے ملک الموت شیر کی مانند لگا ہوا ہے۔ قبر کا عذاب اس سانپ کی صورت ہے جو پانی پر تیرتا دکھائی دیا، انسان کے انتظار میں ہے۔ کالا اور سفید چوہا دن اور رات ہیں اور گھانس انسانی زندگی۔ دن اور رات گھانس کو کتر رہے ہیں، شہد کا چھتہ دنیا کی لذتیں ہیں جن سے لطف اندوز ہو کر حضرت انسان قبر کا عذاب بھی بھول گیا اور موت کو بھی پسِ پشت ڈال دیا جس نے بھی آپ کو یہ مثال واقعے کی صورت سنائی ہے، اس کا واحد مقصد یہ ہے کہ آپ لوگ اپنا مقصدِ حیات پہچانو۔ جب مقصد حیات پہچان لوگے تو کوئی پریشانی نہ رہے گی۔ میں نہیں جانتی، اس مجلس میں کتنے لوگوں کو سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص یاد نہیں۔ ہیں۔ اگر... اگر...'' میں نے اگر پر زور دے کر بات آگے بڑھائی۔ ''اگر اللہ تعالیٰ پر آپ لوگوں کا بھروسا پختہ ہوتا تو سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص پڑھ کر بلا تامل انگاروں میں اُتر جاتے۔''

میں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ دل ہی دل میں پڑھی اور انگاروں کی کڑاہی میں اُتر گئی، میں نے پاؤں سے جلتے ہوئے انگاروں کو کوٹ کوٹ کر سُرمہ بنا دیا۔ تینوں کڑھائیوں میں کوئلوں کی بجائے اب ٹھنڈی راکھ پڑی ہوئی تھی، لوگوں نے خوشی سے بھنگڑے ڈالنا شروع کر دیے۔

میں نے دیکھا ان میں سے چند لوگ میرے قدموں میں گرے اور میرے پاؤں پر پیشانیاں رگڑنے لگے۔ میرا جی چاہا کہ ان کی گردنیں اُڑا دوں، بدعقیدہ لوگ، جس سر کو رب کائنات کے سامنے جھکنا چاہیے اسے کہاں جھکا رہے ہیں۔

میں نے انہیں ٹھوکر ماری اور چیخ کر کہا۔ ''اُٹھ جاؤ بد بخت انسانو!'' پتا نہیں میرے لہجے میں ایسی کون سی کڑواہٹ تھی کہ وہ کانپتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے پھر میں نے سب کو جمع کیا اور انہیں ایمانِ مفصل سنایا۔ ''میں ایمان لایا اللہ پر اور اس کے سب فرشتوں پر اور اس کی سب کتابوں پر اور اس کے سب رسولوں پر اور آخرت کے دن پر اور اچھی بُری تقدیر پر کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر۔ اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔ جب سمجھ جاؤ تو پھر ایمان مفصل یاد کرنا۔''

''میں ایمان لایا اللہ پر جیسا کہ وہ اپنے ناموں اور اپنی صفتوں کے ساتھ ہے اور میں نے قبول کیا اس کے سارے

احکامات کا زبان سے اقرار کرتا ہوں اور دل سے تصدیق کرتا ہوں۔''

میں نے گفتگو کے آخری جملے پر بلاول کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا اور بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔ اسے روتا دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی، میں نے اس کے قریب جا کر اس کے سینے پر ہلکا سا ہاتھ مارا۔

''بلاول اب میری آنکھ کا شیشہ ضرور ٹوٹے گا، بہت شکریہ بلاول! میرا اللہ تجھ پر مہربان ہو، اور یقیناً ہوگا، کیوں کہ بلاول وہ غفور و رحیم ہے۔''

میں نے تھیلی میں جھانک کر دیکھا، اوہ۔ ابھی تک ایک الائچی بھی باقی تھی اور تسبیح کا دانہ بھی......! اور معاویہ؟ میری روح کانپ اُٹھی۔ میرا بچہ ابھی تک گم ہے، میں نے آخری گلاس میں الائچی ڈالی تھی تو دو بلبلے اُٹھے تھے، ایک پر لالچ اور دوسرے پر معاویہ لکھا تھا۔ اس کا مطلب ہے تین چیزیں دفع ہو چکی ہیں، ایک باقی ہے۔ جس کے جانے کے بعد ہی معاویہ مل سکتا ہے۔

☆......☆

ابو کے سامنے امی کھانا رکھ ہی تھیں، ابو چار پائی کے وسط میں بیٹھے تھے اور کھانے کے برتن ان کے سامنے رکھے تھے، مگر ابو کھڑے ہو گئے۔ میں حیران تھی، ابو کو کھانا چاہیے تھا، یہ کہاں چلے؟

میں بھاگ کر اُن کے قریب پہنچی۔

''ارے ملھنی۔ تجھے کیا ہوا، بھاگ کیوں رہی ہے۔ اور تیرا سانس کیوں پھولا ہوا ہے؟ میں نے کئی بار منع کیا ہے اسے دیواروں سے چھلانگ مت لگایا کر۔ انہوں نے سخت لہجہ اپناتے ہوئے کہا۔ تو دیوار سے یوں چھلانگیں لگا رہی تھی جیسے بچے تالاب میں چھلانگ لگاتے ہیں۔''

''اب دیکھ سانس ایسے چڑھی ہوئی ہے جیسے دمے کی مریضہ ہے۔'' امّی نے کہا۔

''امی میں تو، ابو کے لیے بھاگ کر آئی ہوں۔ یہ کھانا چھوڑ کر کہیں جانے کے چکر میں ہیں۔''

''ایسا کیا......؟'' امی نے حیرت سے ابو کو دیکھا۔ وہ جوتے پہن رہے تھے۔ ''آپ کہاں چل دیے۔ کھانا کھا کر جائیں۔ ٹھنڈا ہو جائے گا۔''

ابو جوتے کے تسمے باندھتے رہے۔

''لیکن پتا تو چلے آپ کہاں چل دیے؟'' ہمیشہ سے خاموش رہنے والی امی آج کافی جارحانہ موڈ میں تھیں۔

''ایک ضروری میٹنگ میں جانا ہے۔ میں نے وقت دیکھا ہی نہیں، اگر نہ پہنچا تو بزنس میں بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔''

''ابو کھانا کھا لیں۔ کھانا کھا کر جائیں گے تو نقصان نہیں ہوگا۔ اگر یوں ہی چلے گئے تو نقصان ضرور ہوگا۔''

''کھانا بعد میں بھی کھایا جا سکتا ہے، لیکن یہ میٹنگ بعد میں نہیں ہو سکتی۔ میرے نہ پہنچنے کی صورت میں ٹینڈر ہاتھ سے نکل سکتا ہے۔''

ابو عجلت میں بولے۔ میں نے جھٹ سے الائچی پانی کے گلاس میں ڈالی اور بولی۔ ''اچھا ابو پانی تو پیتے جائیں۔ جب آپ مینارِ پاکستان پر چڑھیں گے تو پیاس نہیں لگے گی؟''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔ سنا ہے آج کل مینارِ پاکستان کی سیڑھیاں ختم کر دی گئی ہیں اور لوگوں کو باہر سے لٹک کر چھپکلی کی طرح چڑھنا پڑتا ہے۔ لاؤ پانی پی لوں...... میں سب سے پہلے چڑھوں گا۔'' ابو نے فوراً گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔ اور غٹا غٹ سارا پانی پی گئے۔

اچانک میرے ہاتھ کو جھٹکے لگنے لگے، میں نے تھیلی میں جھانکا سارے دانے جگنو بن گئے تھے، چاروں جگنو اُڑنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ میں نے تھیلی کا منہ کھولا اور انہیں آزاد کر دیا۔ چمکتے دمکتے چار جگنو دیکھتے ہی دیکھتے فضا میں

اُٹھے اور غائب ہوگئے۔ میں جیسے ہی پلٹی معاویہ کو بیرونی دروازے سے داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ مارے خوشی کے میرے دل میں دھماکے سے ہونے لگے۔ دھک، دھک، دھک......

یہ دل بھی عجیب ہے، کوئی غم ہو تو بے طرح دوڑتا ہے اور خوشی ہو تب بھی دھڑکنیں بے قابو ہو جاتی ہیں۔ میں نے دل کو زور سے مٹھی میں دبانے کی کوشش کی، "اپنی حد میں رہ، حد سے تجاوز کرنے والی مخلوق کو مٹا دیا جاتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ معاویہ کو گلے لگانے سے پہلے تیرا سارا خون نچوڑ لیا جائے۔" میری خوشی کی انتہا نہ تھی۔

معاویہ نے جیسے ہی مجھے دیکھا دیوانہ وار میری طرف بھاگا۔ میں نے زمین پر بیٹھ کر اس کے لیے بانہیں وا کردیں۔ معاویہ بھاگتا ہوا میری بانہوں میں سما گیا۔ پھر ہم دونوں ایک دوسرے کو دیوانوں کی طرح چومنے لگے۔ میرا لختِ جگر۔ کتنے دنوں سے غائب تھا۔ میرے جگر کا ٹکڑا معاویہ مجھے سر سے لے کر پاؤں تک چوم رہا تھا۔ دیر تلک ہم اس دیوانگی کی کیفیت میں کھوئے رہے۔ میرے چہرے پر سفر کی دھول اَٹی ہوئی تھی۔ مگر ماں کو چومتے وقت اس کا چہرہ نہیں دیکھا جاتا۔ معاویہ مجھے مسلسل چوم رہا تھا۔

مجھے کچھ ہوش آیا تو احساس ہوا کہ تمام گھر والے میرے گرد دائرے میں کھڑے ہیں۔ "مکھنی تُو جیت گئی ہے۔ تجھے تیرا معاویہ مل گیا ہے۔ ہم تو سمجھے تھے اب یہ کبھی نہیں ملے گا۔ مگر تیری سچی لگن نے اسے لوٹا دیا ہے۔"

"میری پیاری امی!" معاویہ نے میری پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

"آپ نے مجھے نئی زندگی بخشی ہے۔" معاویہ نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا۔

میں نے اس کے ہونٹوں پر انگلی جما دی۔ "نہ میرے بیٹے نہ! انسان کسی کو زندگی نہیں بخش سکتا۔ انسان تو بے بس، لاچار اور مجبور ہے۔ زندگی لینے اور دینے والا اللہ رب العزت ہے۔ اس کا شکر ادا کر، آج رات میں چھت پر جا کر اس کی عبادت کروں گی۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہو۔ مگر میں جہاں قید تھا، وہاں مجھے بہت تکلیف پہنچائی جارہی تھی۔" تکلیف کا نام سن کر میں دہل کر رہ گئی۔

"امی! انہوں نے کہا تھا، چار جگنو لے کر آؤ تو تمہیں آزاد کردیں گے۔ ورنہ تیرا گلہ کاٹ کر تیرے جسم کا سارا خون شہ رگ کاٹ کر پی جائیں گے۔ امی انہیں چار چمکتے دمکتے جگنو مل گئے تو وہ مجھے چھوڑتے ہوئے کہنے لگے، جا تیری ماں نے تیرا کام کردیا ہے۔"

"ایک قصائی کی ماں نے اس کا کام یوں کردیا تھا کہ اسے موسیٰ علیہ السلام کا جنت کا ساتھی بنادیا۔" میں نے سوچا۔

"امی! ماں جو چاہے کرسکتی ہے نا؟"

"معاویہ۔ میرے بچے! تو کتنی بڑی بڑی باتیں کرنے لگا ہے۔ تو ابھی بہت چھوٹا ہے۔ اتنی بڑی بڑی باتیں نہ کیا کر۔"

"قد تو آپ کا بھی بہت چھوٹا ہے امی۔ مگر آپ تو باتیں ہی نہیں کام بھی بڑے بڑے کرتی ہیں۔" معاویہ نے کہا۔

"معاویہ تو واقعی بڑا ہوگیا ہے۔" اس نے ہنس کر کہا۔

☆......☆

"لاہور میں مٹی کی بہت سی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں ہیں۔ ان میں ایک ویران ڈھیری بھی ہے۔ اس پر برسوں سے خودرو جھاڑیاں اور گھاس پھوس اُگ آئی ہے۔ یہاں کسی نے صفائی ستھرائی نہیں کی۔ تُو جا اسے غور سے دیکھ پھر اس کی صفائی کر۔ جب صاف ہوجائے تو مینارِ پاکستان چلے آنا۔ اس کا میدان وسیع و عریض ہے۔ وہاں ہری بھری گھانس ہے۔ تجھے پتا ہے مینارِ پاکستان کیا ہے؟"

"نہیں۔" معاویہ نے کہا۔ "آپ بتائیں۔"

"ٹھیک ہے۔ جا پہلے مٹی کی ڈھیری صاف کر کے آ۔ پھر بتاؤں گی۔"

"آپ نے کہا تھا کہ مٹی کی ڈھیری لاہور میں ہے۔"

"ہاں وہ تو ہے پھر؟" میں نے جواب دیا۔

"میں اتنی جلدی لاہور سے کیسے واپس آسکتا ہوں؟" معاویہ نے تشویش سے کہا۔

"دل میں جذبہ ہو تو فاصلے مٹ جاتے ہیں۔ تم کوشش تو کرو۔ تب تک میں سمیرا کی چٹیا بنا دیتی ہوں۔"

"مکھنی، تم بھی کمال کرتی ہو، میں بچی تھوڑی ہوں جو میری چٹیا بناؤ گی۔"

"بچی ہو نہیں مگر بچیوں جیسی ہو۔ چلو یہاں بیٹھو، تمہارے بالوں کی مینڈھیاں گوندھ دوں۔"

"ارے ارے...... مکھنی!" اس نے کچھ ہلنا چاہا۔ میں نے سمیرا کو بازو سے پکڑ کر نیچے بٹھا دیا۔ وہ احتجاج کرتی رہ گئی مگر میں نے اس کے سارے بال کھول دیے۔

"اُف کیا ہے مکھنی؟" وہ جھنجلا گئی، مگر جیسے ہی میری انگلیاں بالوں میں متحرک ہوئیں سکون سے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ چند منٹوں میں وہ ایسی سوئی کہ خراٹے پورے کمرے میں گونجنے لگے۔

میں نے سر کے بال اکٹھے کر کے دونوں ہاتھوں میں سختی سے دبوچے اور پوری قوت سے اس کے بالوں کو کھینچا تو سارے بال پودے کی طرح جڑ سے اُکھڑ گئے۔ بالوں کو بیڈ پر احتیاط سے ایک طرف رکھنے کے بعد میں سمیرا کی طرف متوجہ ہوئی، وہ سکون کی نیند سو رہی تھی۔ اس کی طرف سے مطمئن ہوکر میں بالوں کو اٹھا کر واش روم میں گھس گئی۔ سارے بالوں کو جڑ تک اچھی طرح سے دھویا۔ بالوں کی جڑوں سے اتنا میل کچیل نکلا کہ واش بیسن بھر گیا۔

"سمیرا تیرے دماغ میں کتنا میل بھرا ہوا ہے۔"

میں نے سوچتے ہوئے بالوں کو ہیئر ڈرائیر سے اچھی طرح ڈرائی کیا۔ اس کے بال پہلے ہی ریشمی تھے مگر اب ان کی چمک دیدنی ہوگئی۔ اچھی طرح خشک کرنے کے بعد میں نے بالوں کو دوبارہ اس کے سر پر لگا دیا۔

پھر سمیرا کو زور سے سر پر ضرب لگائی، سمیرا بوکھلا کر اُٹھ بیٹھی، اُٹھتے ہی اس نے شرمندگی سے کہا۔ "سوری مکھنی! میری آنکھ لگ گئی تھی، تمہیں تو پتا ہی ہے نیند مجھ پر کیسے سوار رہتی ہے اِدھر فرصت کے چند لمحات میسر ہوئے، اُدھر آنکھیں نیند سے بند ہوئیں۔"

"کوئی بات نہیں سمیرا! میں اب نکلتی ہوں۔ سُنا ہے باہر مداری آئے ہوئے ہیں، دیکھوں تو وہ لوگ کیا کیا جادو کرتے ہیں۔"

"مکھنی میں بھی ساتھ چلوں؟" سمیرا اُچھل کر کھڑی ہوئی۔

"تو ڈر جائے گی سمیرا۔ مداری بڑے ڈراؤنے کرتب دکھاتے ہیں۔ گالوں میں گوچ کر کے گرم سلاخ ڈالتے ہیں اور دوسری طرف سے نکال لیتے ہیں۔ ناک میں انگلی ڈال کر آنکھ سے باہر نکالتے ہیں۔ حلق میں ہاتھ ڈالتے ہیں اور وہیں چھوڑ آتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"کس کے حلق میں؟ اپنے یا دوسروں کے؟" سمیرا سہم کر بولی۔

"حلق اپنا ہو یا دوسروں کا کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"مکھنی فرق پڑتا ہے۔" سمیرا کے گول چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔ وہ بڑی بڑی آنکھوں کو مٹکاتے ہوئے بولی۔ "میرے گلے میں ہاتھ جائے گا تو تکلیف مجھے ہوگی۔ اور تمہارے حلق میں جائے گا تو تمہیں۔"

"ایسا نہیں ہوتا پگلی! ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو یوں مضبوط کرتا ہے جیسے ایک اینٹ دوسری اینٹ کو مضبوط کرتی ہے۔ کرۂ ارض کے سارے مسلمان ایک جسم کی طرح ہیں۔ جسم کے کسی ایک حصے میں تکلیف ہو تو پورا جسم تکلیف محسوس کرتا ہے۔"

"یہ تمہارا کہنا ہے مکھنی! میں اسے نہیں مانتی۔" سمیرا نے بے پروائی سے شانے اُچکاتے ہوئے جواب دیا۔ "میں نے اسی لیے اس کے میلے بال جڑ سے دھوئے ہیں۔ بنیاد مضبوط ہو تو عمارت بھی مضبوط کھڑی ہوتی ہے۔ بالوں کی جڑیں

دماغ میں گڑی ہوتی ہیں، یقیناً دھلائی کا اچھا اثر پڑے گا۔ سمیرا کی بنیاد میل کچیل سے صاف ہوگئی تھی، رفتہ رفتہ سارا جسم ڈھل جائے گا۔"

میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے سمیرا جب مان جاؤ گی تو چلی آنا مداری دکھا دوں گی، تب تک گھر سے باہر مت نکلنا۔ حیا والی عورتیں بغیر پردے کے باہر نہیں جایا کرتیں۔" میں باہر نکل آئی۔ عقب سے سمیرا کا بلند قہقہہ میرے کانوں میں گونجا۔ مجھے پتا ہے وہ میری آخری بات پر ہنسی ہوگی۔ سمیرا اسکرٹ، جینز اور ٹی شرٹ پہننے والی لڑکی ہے اسکارف پردہ شلوار قمیص کو گئے وقتوں کا لباس سمجھتی ہے۔ بے چاری دل کی اندھی لڑکی ہے ہمیشہ آنکھوں سے دیکھتی اور دماغ سے سوچتی ہے، کبھی دل سے نہ دیکھا نہ سوچا۔

"ملکھنی! یہاں آؤ لان میں، جلدی آؤ ناں پلیز، دوڑ کے آؤ!" بلاول جب بولنے پر آتا ہے تو رکتا ہی نہیں۔

میں شیشے کے سامنے کھڑی آنکھ کا شیشہ دیکھ رہی تھی، مگر شاید ابھی تک میری آنکھ کا شیشہ نہیں ٹوٹا تھا۔

"ملکھنی!" بلاول نے چلا کر پھر مجھے پکارا۔

"ارے آ رہی ہوں۔ ذرا سانس تو لے۔" میں پھولوں کی اونچی باڑ سے چھلانگ لگا کر لان میں پہنچ گئی۔

بلاول کرسی پر نیم دراز پھل دار درختوں کی جانب دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی دھیمی آواز میں بولا۔ "دبے پاؤں آؤ۔"

"عجیب آدمی ہو۔ پہلے چلا چلا کر پکار رہے تھے اب یوں بول رہے ہو جیسے قریب ہی کوئی نومولود بچہ سویا ہوا ہے۔"

لان میں ایک طرف خوبانی، مالٹا، آلوچے اور ناشپاتی کے درخت لگے ہوئے تھے، مالٹے کے درخت تو اس قدر پھل دیتے کہ ہم محلے میں بھی تقسیم کرایا کرتے۔ مگر آلوچہ، خوبانی اور ناشپاتی کم پھل دینے والے درخت تھے۔ اور من موجی بھی، دل نے چاہا تو کچھ پھل دے دیئے نہ چاہا تو پورا موسم گزر گیا مگر ہمارے منہ میں ایک دانہ بھی نہ آیا۔

بلاول جہاں بیٹھا تھا وہاں مسحور کن خوشبو پھیلی ہوئی تھی، میں نے لمبی سانس لے کر پھلوں پر پودوں کی ملی جلی خوشبو کو پھیپھڑوں میں پہنچایا۔ میرے پھیپھڑے ایسی مسحور کن خوشبو پر بڑے شاد ہوتے ہیں، میں نے زور کی سانس کھینچی تو خوشی سے اُچھل پڑے۔ جس طرح مینڈک پانی میں ڈبکیاں لگاتا ہے۔ وہ بھی خوشی سے ڈبکیاں لگانے لگے۔ نہ جانے اندر انہیں تالاب جتنا پانی کیسے میسر آ جاتا ہے؟

"کیا ہے بلاول...... کیوں چلا رہے ہو؟" میں نے اس کے سامنے کرسی سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

میرے انداز مخاطب پر اس کے ماتھے پر بل پڑے مگر فوراً مٹ گئے۔ "ملکھنی! میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ کبوتر ایک بے وقوف پرندہ ہے۔ وہ دیکھو کبوتر کی بے وقوفی کی زندہ مثال۔" بلاول نے درختوں کی طرف اشارہ کیا۔ ہری بھری گھاس پر ایک کبوتری آنکھیں بند کیے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس سے چند میٹر دور بلی اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی۔ بلاول نے کہا "ملکھنی! میں کافی دیر سے انہیں دیکھ رہا ہوں، خوبانی کے درخت سے کبوتری زمین پر اُتری، پودوں کی کیاریوں سے بلی نے اسے تاڑ لیا بلی دبے قدموں آگے بڑھنے لگی، حتیٰ کہ کبوتری سے صرف چار پانچ میٹر دور رہ گئی۔ اس لمحے کبوتری نے اسے دیکھ لیا۔ کبوتری کے پر ہیں، اور بلی کے چار پیر، بلی چار پیروں کے باوجود اُڑ نہیں سکتی۔ کبوتری کو چاہیے تھا کہ وہ پھر کر کے اُڑ جاتی اور بلی اسے حسرت بھری نگاہ سے دیکھتی رہ جاتی، مگر بے وقوف کبوتری! اس نے بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ بلاول کہتے ہوئے بلند قہقہہ لگایا۔ ہاہاہا۔ اس کا منہ آسمان کی طرف اٹھا۔

"زہر لگتا ہے جب کوئی یوں بے ڈھنگے انداز میں ہنستا ہے۔" میں نے تلخی سے سوچا مگر بلاول کو بات مکمل کرنے دی۔

کبوتری سمجھتی ہے آنکھیں بند کر لینے سے حقیقت بدل جاتی ہے، میں نے بلاول کی پیٹھ پر زور سے مکا مارا۔

وہ درد سے بلبلا اُٹھا۔ "اُف ملکھنی، جلاد کی بیٹی ہے تُو؟ تیرا ہاتھ اتنا بھاری ہے جیسے ہاتھی نے میری پیٹھ پر پاؤں رکھ دیا ہو۔"

"بلاول تُو کبوتر کو بے وقوف سمجھتا ہے مگر میں کچھ اور سمجھتی ہوں۔"

"تیری منطق تو ازل سے نرالی رہی ہے، لیکن ضروری نہیں کہ جو تُو سمجھے وہی سب سمجھیں۔" بلاول نے ہنس کر کہا۔

"اچھا موت اور زندگی کا کھیل دیکھو۔" بلی دبے پاؤں کبوتری کی طرف بڑھنے لگی۔ کبوتری کی آنکھیں ہنوز بند تھیں۔

اچانک بلی کے عین سامنے اوپر سے پکا ہوا آلو بخارا گرا۔ آلو بخارا جیسے ہی زمین سے ٹکرایا اس کا کچومر نکل گیا۔ کچھ آلو بخارے کے گرنے کا عمل تھا اور کچھ اس کے چھینٹے بلی کی آنکھوں میں زور سے پڑے۔ بلی بُری طرح بدکی اور گھبرا کر ایسی بھاگی کہ پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ آناً فاناً عقبی دیوار پھلانگ کر وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

میرا جی چاہا میں بھی بلاول کی طرح بلند آواز میں قہقہہ لگاؤں، مگر اس طرح مجھے اپنی پیٹھ پر اس گینڈے کا ہاتھ سہنا پڑے گا۔ کبوتری نے آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر دیکھا پھر گھاس پر چند چونچیں ماریں اور پھر سے اُڑ گئی۔ میں نے بلاول کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ "کیا سمجھے؟"

اس نے شانے اُچکائے اور بے پروائی سے بولا۔ "کچھ نہیں۔ اس میں سمجھنے کی کون سی بات ہے؟" بلاول جھنجلا کر بولا۔

"اسی لیے تو پچھلے حادثات میں تیری عقل اور ناک پچک گئی تھی۔ بلاول تُو ذہین ہونے کے باوجود اپنے ذہن کو تکلیف نہیں دیتا۔ اگر کسی کے پاس علم ہے مگر اس سے دوسروں کو فائدہ نہ پہنچے تو دنیا میں اس سے بڑا جاہل کوئی نہیں، اور اگر کسی کے پاس ذہانت ہے مگر وہ اس سے کام نہ لے تو دنیا میں اس سے بڑا بے وقوف کوئی نہیں۔ تم کبوتر کو بے وقوف پرندہ سمجھتے ہو اور میں اس سے توحید کا سبق سیکھتی ہوں۔ کبوتر اللہ پر یقین کو پختہ بناتا ہے۔ بلی کو دیکھ کر پر ہونے کے باوجود موت کے خوف سے اُڑان نہیں بھرتا۔ بلی کے سامنے ڈٹ جاتا ہے، اور وہ آنکھیں بند کر کے اسے چیلنج کرتا ہے، ہمت ہے تو آ مجھے مار! مارنے والے سے بچانے والا بہت بڑا اور طاقت ور ہے، اور جب وہ بچانے پر آئے تو گلے سڑے آلو بخارے کے ایک چھینٹے سے کبوتری کو بچا لیتا ہے۔"

"کبھی کبھی دل تجھ پہ اعتبار کرنے کو آمادہ ہو جاتا ہے، ملکھنی تیری باتیں ایسی پُر یقین اور قابلِ اعتبار ہوتی ہیں کہ دل چاہتا ہے تیری زبان چوم لوں، مگر تیرے دانتوں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ جب کاٹتے ہیں تو اندر تک دھنس جاتے ہیں۔" بلاول نے مسکین سی صورت بنا کر کہا۔

بلاول کی بات پر میں ہنس پڑی، میری ہنسی میں وہ بھی شامل ہوگیا۔

انسان پیدائشی طور پر بے علم پیدا ہوتا ہے، رفتہ رفتہ ہی سیکھتا ہے اور علم کی مختلف منزلیں طے کرتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنے نبی رسول ﷺ اور پیغمبر لوگوں کی طرف مبعوث نہ فرماتا تو شاید انسان اور جانور میں صرف زبان کا فرق رہ جاتا۔ باقی ان میں تفریق نہیں کی جا سکتی، اللہ تعالیٰ کے انبیائے کرام نے ہمیں علم کی دولت سے مالا مال کیا۔ ہمیں عالم، مفتی، ڈاکٹر، پروفیسر، سائنس دان، انجینئر اور دانش ور بنایا۔ انسان کو زندگی کا ضابطۂ حیات سکھایا، اچھی معاشرت دی اور سماج کے اصول و قوائد وضع کیے، رشتوں میں تمیز کرائی اور ان میں توازن رکھا، اور انسان کو اعلیٰ اخلاق کا درس دیا، انسان کی ابتدا نا سمجھی میں ہوتی ہے اور انتہا بھی کم و بیش اسی کیفیت میں ہوتی ہے۔ جس طرح بچے ہمیں سیکھنے کے بہت سے مواقع فراہم کرتے ہیں، اسی طرح بوڑھے بھی ہمارے لیے درس گاہ کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے اس سفر سے جو انہوں نے زندگی کے عمیق سمندر میں ڈوب کر طے کیا ہوتا ہے، ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

ابو کی بھی ایسی ہی مثال تھی، کبھی ذہین ترین دماغ کے مالک لگتے، اور کبھی بالکل بچوں کی طرح معصوم اور نا سمجھ لیکن مجموعی طور پر مجھے ان پر ترس آتا ہے، کیوں کہ بے چارے کی دل کی آنکھ بند ہے، بلاول، ارشاد، امی، جنید، سمیرا اور گھر کے دوسرے افراد کی طرح ابو بھی صرف انہی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ کبھی دل کی آنکھ کھولنے کی تکلیف ہی

نہیں کی۔

☆......☆

اب وہ میری کلائی پکڑے، بچوں کی طرح اس طرح بھاگ رہے تھے جیسے انہیں بھی جھولا جھولنا ہے اور جھولے والے کے پاس رش بڑھ جانے کا خدشہ ہے، میں ابو کے ساتھ بہ دل نخواستہ کھنچی چلی جا رہی تھی۔

''ابو آرام سے چلیں نا! اگر آپ کو بھی جھولا جھولنا ہے؟ تو میرے پاس اس کے ٹکٹ موجود ہیں۔'' میں نے ٹھنک کر کہا۔

''جھولا نہیں جھولنا پگلی! کل میں ٹہلتے ہوئے اس طرف آ نکلا تھا، یہاں کچھ انوکھے مناظر دیکھے تو سوچا تمہیں بھی دکھا لاؤں۔''

میں انہیں سمجھ نہیں پایا، ''شاید تم سمجھ جاؤ۔''

ابو کے توجہ دلانے پر میں نے غور کیا۔ دائیں، بائیں آگے پیچھے، ہر طرف پراسرار خاموشی کی چادر تنی ہوئی تھی، ویران اور اجڑی اجڑی سی حالت تھی۔ درختوں کے پتے جھڑے ہوئے، گھاس پھوس، جڑی بوٹیاں اور فصلیں سوکھی سڑی ہوئی، بوسیدہ مکان اور عمارتیں ویران پرانے کھنڈروں میں تبدیل شدہ! بنجر زمین جس پر جگہ جگہ بڑے بڑے شگاف اور دراڑیں پڑی ہوئی تھیں، جہاں زمین ہموار اور سیدھی تھی وہاں بھی راستوں کے پتھروں کے باعث چلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔

چلتے ہوئے ابو ایک غار میں اتر گئے، غار نہیں بلکہ اُسے سُرنگ کہیں تو بہتر ہے۔ غار تو پہاڑوں میں ہوتے ہیں، یہ تو زمین کے سینے پر ایک بڑا شگاف تھا، جیسے سُرنگ کا دروازہ ہوتا ہے، جیسے تہ خانے کا راستہ ہوتا ہے۔

ہم نیچے اُتر گئے، ابو نے میرا ہاتھ مزید مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ اُترنے کے بعد ابو کے اندر اضطراب بھر گیا تھا، چہرے کے آثار میں بھی واضح تبدیلی آ چکی تھی۔

''ابو یہاں ایسا کیا ہے کہ آپ کی باڈی لینگویج ہی ایک دم بدل گئی ہے؟''

''دیکھو گی تو تم بھی بدل جاؤ گی۔'' زمین کے اندر جہاں ہم نیچے اُترے تھے وہاں پانی کی ایک بوند بھی نہیں تھی مگر نیچے بہت پانی تھا لیکن گندہ اور بدبودار! جیسے گٹر کے مین ہول کا ڈھکن کھول دیا گیا ہو۔ پھر وہ چونک کر بولے۔ ''مکھنی! تمہیں بدبو نہیں آتی، ایسے چل رہی ہو جیسے چمن میں صبح کے وقت چہل قدمی کر رہی ہو۔'' ابو کی بات پر میں زیرِ لب مسکرا دی۔

''بدبو مجھے بھی محسوس ہو رہی ہے ابو، مگر بدبو کے بعد آنے والی خوشبو کی ہوا بدبو کو زائل کر دیتی ہے۔''

''تو کیا آگے خوشبو ملنے والی ہے؟'' ابو کے لہجے میں بچوں ایسی خوشی تھی۔

''ابو کل آپ یہاں آئے تھے، آپ کے لیے آگے خوشبو ہے یا نہیں۔ مجھے نہیں پتا۔ البتہ مجھے خوشبو کی نوید مل رہی ہے۔''

''مکھنی! تم اتنی خود غرض ہو کہ اپنے لیے خوشبوئیں کشید کرتی ہو، اور دوسروں کا دھیان نہیں رہتا، چاہے وہ بدبو سے مر ہی جائے۔''

''ابو میں نے آج تک آپ لوگوں کے لیے جتنے بھی جتن کیے ہیں، ان کا مقصد ہی آپ لوگوں کے لیے اُجالوں اور خوشبوؤں کا حصول ہے۔ مجھے پتا ہے بھٹکے ہوئے مسافر کو جب تک سیدھا راستہ نہ ملے وہ منزل تک نہیں پہنچ پاتا۔ آپ قطعی فکر نہ کریں، آپ چاہیں یا نہ چاہیں میں آپ کو انشاء اللہ اتنی خوشیاں دوں گی کہ آپ سے سنبھالے نہیں سنبھلیں گی۔''

ابو نے میری پیشانی چوم لی۔ ''اوہ مکھنی! تم کتنی پیاری ہو۔ تبھی تو تمہیں یہاں لایا ہوں۔ مجھے یہاں بڑا خوف آتا ہے، اُدھر دیکھو، آدم خور انسانی گوشت کیسے چبا چبا کر کھا رہا ہے۔''

میں نے ابو کے اشارے پر اس طرف دیکھا، ایک شخص کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، اس کے سامنے ٹیبل رکھی تھی جس پر کلائیوں تک کٹے ہوئے انسانی ہاتھ، اور ٹخنوں تک کٹے ہوئے پاؤں رکھے ہوئے تھے، اور وہ انہیں گاجر مولی کی طرح کُرچ کُرچ کر کے کھا رہا تھا۔ وہ آدم خور نہیں عام انسان تھا، اس کے چہرے پر کرب کے سارے آثار نمایاں تھے، جو انسانی گوشت کھانے سے عام انسان محسوس کر سکتا ہے۔

ابو پیٹ پر ہاتھ رکھ کر دوہرے ہو گئے۔ ''مم...... مکھنی! مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ مجھے ابکائی آ رہی ہے۔''

''نہیں ابو یہاں اُلٹی نہ کرنا سارے قالین کا ستیاناس ہو جائے گا۔ چلیے آگے چلتے ہیں۔''

چلتے ہوئے ابو بولے۔ ''مکھنی کیا یہاں انسانی گوشت ارزاں نرخ پر دستیاب ہے جو آدم خور وافر مقدار میں کھا رہا ہے؟''

''ارزاں نرخ نہیں ابو، بالکل مفت!'' میں نے جواب دیا۔

پھر ابو حیرت کے مارے خاموش ہو گئے، کیوں کہ اگلا منظر پچھلے منظر سے زیادہ بھیانک تھا۔ اس منظر میں ایک آدمی کا پیٹ مسجد کے گنبد سے بھی بڑا تھا، اتنا بڑا پیٹ از خود ایک اذیت ناک اور کرب انگیز ہے۔ پیٹ میں بڑے بڑے سانپ بھی پھن پھیلائے کھڑے تھے۔ سانپ اتنے خوفناک اور دہشت ناک تھے کہ دیکھنے والی آنکھ حواس باختہ ہو رہی تھی، اور خوف کے مارے کپکپاہٹ طاری ہو رہی تھی، یہ سانپ اس آدمی کو اندر سے ڈس رہے تھے، جب بھی کوئی سانپ اسے ڈستا تو اس کی چیخیں ساتویں آسمان کو چھونے لگتیں، ابو نے آنکھیں بند کر لیں۔

''کیا بات ہے ابو، آپ نے آنکھیں کیوں بند کر لیں؟''

''مکھنی! تم تو بڑے دل والی ہو، مجھ سے یہ سب نہیں دیکھا جاتا۔ میں خوف سے کہیں مر ہی نہ جاؤں؟''

''خوف مجھے بھی محسوس ہوتا ہے ابو، بس مجھے اندھیرے کے بعد روشنی کی کرن نظر آتی ہے، کرن میرے اندر اندھیرے کو غالب نہیں آنے دیتی۔ ''ابو!'' میں نے آواز دی۔

ان کی آنکھیں بند اور چہرے پر خوف کے آثار نمایاں تھے۔ وہ آنکھیں بند کیے کیے ہی بولے۔ ''کیا ہے مکھنی؟''

''ابو میں آپ کو روشنی کی کرن تھمانا چاہتی ہوں، آپ نے ایک بار پکڑ لی تو ہمیشہ روشنی میں رہنا چاہیں گے۔''

''سچ مکھنی!'' ابو نے خوشی سے آنکھیں کھول دیں اور بچوں کی طرح بولنے لگے۔ ''مکھنی! گھر والوں کو بھی ساتھ لے لو۔ جب روشنیوں کا سفر ہو تو اپنوں کا ساتھ ہونا ضروری ہوتا ہے۔''

''ہاں ابو، گھر والے ساتھ ہوں گے نہیں بلکہ ساتھ ہیں، پیچھے دیکھیں۔''

ابو نے فوراً گھوم کر مجھے دیکھا۔ بلاول سمیت تمام گھر والے موجود تھے۔

''تو چلیں مکھنی! روشنیوں کے سفر کا آغاز کریں۔'' ابو کے لہجے میں ہنوز بچوں ایسی بے قراری اور تجسس موجود تھا۔

''ابو روشنیوں کے سفر سے قبل میں آپ کو ایک وادی کی سیر کراؤں گی۔''

''وادی کی سیر؟''

''ہاں وادی کی سیر لیکن آپ لوگ اس وادی میں ابھی داخل نہیں ہو سکتے۔''

''مکھنی! جب ہم وادی میں داخل ہی نہیں ہو سکتے تو اس کی سیر کیسے کریں گے؟'' بلاول نے حیرت سے پوچھا۔

میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''میں سناؤں گی، بتاؤں گی اور آپ لوگ تصور میں اس کی سیر کریں گے۔ آپ کا تصور آپ کو وہاں پہنچا دے گا۔ ہاں جب روشنیوں کے سفر کا آغاز ہو گا، تو اس کی منزل ویسی ہی وادی ہو گی۔''

''تب ٹھیک ہے۔'' وہ سب خوشی سے بولے۔ کیا ہم اس بدبودار اور ڈراؤنی جگہ سے باہر نکل جائیں۔

☆......☆

''ہاں چلو، گھر کے صحن میں درختوں کے نیچے چارپائیاں بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں۔''

میرا اتنا کہنا تھا کہ گھر والے دھڑا دھڑ کمروں سے چارپائیاں باہر نکالنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے صحن چارپائیوں سے

بھر گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے بارات آنے والی ہے۔

''بولونا! مٹھنی، اب خاموش کیوں ہو؟''

''ہم طوبیٰ سے شروع کرتے ہیں۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔ ''وہ اس وادی کا ایک ایسا درخت ہے، جس کے سائے تلے کوئی گھڑ سوار سو سال تک بھی چلتا رہے تو سایہ ختم نہ ہوگا۔''

''اگر سایہ اتنا طویل و عریض ہے تو درخت کتنا بڑا ہوگا؟'' ابو سے رہا نہ گیا اور وہ ابتدا ہی میں بول پڑے۔

میں نے نرمی سے کہا۔ ''ابو! یہاں صرف سننے کی اجازت ہے، بولنے کی نہیں۔ آپ لوگ بولنے پہ آ گئے تو تصور کیسے کریں گے؟'' ارتکاز کیسے حاصل ہوگا۔''

''ابو مٹھنی ٹھیک کہہ رہی۔ پلیز، آپ خاموش رہیے نا!'' جنید نے فوراً تیز لہجے میں کہا۔

جنید کو ہمیشہ سے یہ زعم رہا ہے کہ ابو دوسرے گھر والوں کی نسبت اس کی زیادہ سنتے اور مانتے ہیں، اس گمان نے اسے بہت حد تک مغرور بنا رکھا ہے۔ اس لیے اس کی گردن تنی رہتی ہے، وہ جانتا ہی نہیں تنی ہوئی گردن اللہ کو پسند نہیں۔

میں واپس اپنے موضوع پر آتے ہوئے بولی۔

''طوبیٰ ایک ایسا درخت ہے جس کی تر و تازگی کھلے ہوئے خوشبودار چمن کی طرح ہے، اس کے پتوں کی خوب صورتی ناقابلِ بیان ہے، بہترین، نرم ملائم پتے، اس کے خوشے عنبرین جیسے نہیں بلکہ حقیقتاً عنبرین ہیں۔ کنکر یاقوت ہیں اور مٹی کافور ہے، اس کا گارا مشک ہے، یہ مثالیں یا استعارے نہیں ہیں، بلکہ حقیقت میں ایسا ہی ہے، وادی کا یہ درخت جس کی جڑ سے نہریں بہتی ہیں۔''

میں نے بھری ہوئی چارپائیوں پر نگاہ ڈالی جس پر نگاہ گئی اسے کھویا کھویا سا پایا۔ مجھے اندرونی طور پر بے حد خوشی ہوئی، یقیناً تصور میں وہ وادی دیکھ رہے تھے۔

''جڑ میں دیکھیے، کیسی کیسی نہریں بہہ رہی ہیں۔ دودھ کی نہر، شہد کی نہر اور یہ دیکھیے شراب کی نہر! اس درخت کے نیچے کچھ لوگوں کی مجلس سجے گی، ایک مخلوق ان محفل والوں کو لینے آئے گی، ان کے پاس اونٹنیاں ہیں، ان کی زنجیریں سونے کی ہیں، ان لوگوں کے چہرے چراغ جیسے روشن اور چمکدار ہیں، بال ریشم کی طرح نرم و ملائم! اب میں اس وادی کا ایک پھل بتاؤں؟''

میں نے پوچھ کر غلطی کی تھی۔ وہاں میرے سوال پر دھیان کسے تھا، وہ تو تصور میں کہیں اور ہی پہنچ گئے تھے۔ مجھے اپنے احمقانہ سوال پر شرمندگی کا احساس ہوا۔

میں نے بات جاری رکھی۔ ''وادی میں پیدا ہونے والی کھجور کا سائز بارہ ہاتھ ہے، یعنی ہمارے کمرے کے شہتیر سے بھی بڑا۔''

''تو اسے کھایا کیسے جائے گا۔'' یہ آواز نہ جانے کس کی تھی میں پہچان نہ پائی۔

''وادی کے باسی کھائیں گے اور کون؟ جس وادی کی کھجور کا سائز اتنا بڑا ہے، تو اس کے باسیوں کا قد کیسا ہوگا؟''

''ان کا قد ایک سو تیس فٹ ہے، یہ کھجور کو ایک طرف سے کھاتے ہیں تو کھجور کا ذائقہ پاتے ہیں، دوسری طرف سے کھاتے ہیں تو انگور کا ذائقہ ملتا ہے، ہے نا انوکھی وادی کی انوکھی باتیں؟''

''ہاں! بے شک ہے تو انتہائی انوکھی وادی۔ اس انوکھی وادی کی کچھ مزید انوکھی باتیں بتاؤ۔'' بلاول نے کہا۔ اس کے لہجے میں بلا کا تجسس تھا۔

''اس وادی کو دو حصوں میں دیکھو۔ اوپر کا حصہ اور نیچے کا حصہ، اوپر کے حصے میں ٹھنڈے میٹھے چشمے بہتے ہوئے گزرتے ہیں، نیچے والے حصے میں انتہائی بلند لہریں ہیں، وہ دریا بھی ناقابلِ بیان حد تک بڑے ہیں جن سے یہ لہریں اٹھ رہی ہیں۔ ان میں تیرتی کشتیاں بھی ایسی ہیں کہ ایک سرے سے دیکھو تو دوسرا سرا نظر نہ آئے۔ جب ان پر سوار بیٹھیں گے تو سمندر سے مچھلیاں نکلیں گی، کہیں گی۔ ''السلام علیکم! مجھے کھاؤ گے؟'' سوار جواب دیتا ہے۔ ''اوپر تو آؤ، سمندر سے نکلو

اور ہمارے پاس کشتی میں آؤ۔''

مچھلی حکم کی بجا آوری میں کشتی میں اچھل آتی ہے۔

''کباب کھانے کو جی چاہتا ہے۔'' ایک کشتی سوار بولا۔

مچھلی اپنا شانہ ہلاتی ہے۔ بہترین انداز میں تلا ہوا، خوشبودار، مہکتا ہوا، گرم گرم کباب ان کے سامنے موجود ہے۔

''کیا اس وادی میں آنا چاہو گے؟''

اس بار سب نے آنکھیں کھول دیں، اور اُٹھ کر میرے گرد آ دھمکے، بلکہ کسی نے میرا ہاتھ تھام لیا، کسی نے بازو کسی نے دامن۔ ''ہاں مٹھنی ہاں، پلیز! ہمیں اس وادی میں لے چلو۔ ہم ہمیشہ تمہارے احسان مند رہیں گے۔ مٹھنی پلیز......''

''ٹھیک ہے، میں لے چلتی ہوں مگر اس سے پہلے آپ سب کو ایک کام کرنا ہوگا۔''

''کون سا کام مٹھنی! اس وادی میں جانے کے لیے ہم ایک نہیں، ایک سو کام کرنے کو تیار ہیں۔''

ان کا اشتیاق جوش و خروش اور بے چینی دیکھ کر مجھے ڈھارس بندھی کہ شاید میرا بتایا ہوا کام کر ہی گزرے۔

جب میں نے انہیں بتایا کہ انہیں کیا کرنا ہوگا۔ تو سب کے سب گھر والوں نے اچانک ایک جھٹکے سے مجھے چھوڑ دیا۔

وہ حیرت میں ڈوبے مجھے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے اچانک میرے سر پہ سینگ نکل آئے ہوں۔

''کیا بکواس کر رہی ہو مٹھنی؟'' ابو نے گرج دار لہجے میں کہا۔ ایک دم ان سب کے تیور بدل گئے تھے۔

''مٹھنی! اگر پھر تم نے ایسی بکواس کی تو میں تمہاری گردن اُڑا دوں گا۔'' اس بار بلاول نے غصے میں ڈوب کر کہا۔

جنید بھی دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے بولا۔ ''میں تو کہتا ہوں اسے زمین میں زندہ درگور کر دیتے ہیں۔ اگر آج اس نے یہ بات کہی ہے تو کل پھر ایسا کرے گی۔ اور ممکن ہے کہ گھر کے کسی فرد کو اپنے رنگ میں رنگ بھی لے۔''

''مٹھنی ہم تمہیں پہلی اور آخری وارننگ دیتے ہیں، پھر کبھی یہ بات زبان پہ مت لانا ورنہ اپنی بربادی کی ذمے دار تم خود ہوگی، ہم تمہارا مقام اور مرتبہ بھول جائیں گے، ہمیں تمہاری وادی میں نہیں جانا۔ نہ ہمیں روشنیوں کا سفر طے کرنا ہے، ہم اندھیروں کے مسافر ہیں اور ہمیں انہی اندھیروں میں سکون اور راحت ملتی ہے۔'' ابو نے گرج کر کہا، ان کا غصہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

''عجیب لوگ ہیں یہ۔'' میں نے تلخی سے سوچا، میں ان کی بھلائی سوچ رہی ہوں، اور یہ خود اپنے دشمن بنے ہوئے ہیں، مجھے ان کے رویے سے بہت صدمہ پہنچا، دُکھ کی لہریں میرے وجود میں اُبلنے لگیں، خود کو کسی گہرے ذہنی صدمے سے بچانے کے لیے میں گھر سے باہر نکل آئی۔

گھر بھی عجیب و غریب جگہ بنا رکھا ہے۔ دور دور تک نہ کوئی دوسرا گھر نظر آتا ہے، نہ انسان جس سے بات کر کے دل بہلایا جائے۔ صحرا تپتی دھوپ اور اُڑتی ریت سے کیا بات کرنی۔ ریت کے ذرّات کو حالِ دل سناؤں بھی تو کیا فائدہ؟ میں نے ریت کو مٹھی میں بھرا تو وہ مٹھی میں سے نیچے خود بہ خود سرکنے لگی۔ میں نے پوری طاقت صرف کر دی مگر ریت کو تھام نہ سکی اور وہ دھیرے دھیرے میری مٹھی سے نکل گئی۔ ریت بھی زندگی کی طرح ہے، اسے روکنے کے چاہے جتنے جتن کرو، دھیرے دھیرے ختم ہو ہی جاتی ہے۔

میں نے محسوس کیا میرا دل بہت زور زور سے دھک دھک کر رہا ہے، میں نے فوراً آنکھوں کو ہاتھ لگایا، پلکوں کو اوپر کر کے انگلیاں اندر تک دھنسا دیں کہ ممکن ہے شیشہ ٹوٹنے والا ہو، مگر ایسا نہیں تھا، پھر دل کی دھڑکن اتنی بے قابو کیوں ہے؟ ایسا کیوں لگ رہا ہے جیسے میرا دل پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا؟ کیا معاویہ کو نشانِ حیدر مل گیا ہے؟ ایک سوال بجلی کی طرح ذہن میں کوندا، ہوسکتا ہے ابھی صرف اعلان ہوا ہو، کہیں بہت بڑی عالی شان تقریب کا انعقاد کیا جا رہا ہو۔ معاویہ پہلا زندہ نوجوان ہوگا جو یہ اعزاز پائے گا۔ اعزاز میں ایک اور اعزاز، میرا قابلِ فخر بیٹا بھی ان دس شہداء میں شامل ہو جائے گا جو نشانِ حیدر کا اعزاز پا چکے ہیں۔

میں نے دل کی دھڑکنوں پر غور کرنا شروع کر دیا، یہ اتنے زور سے دھڑک رہا تھا جیسے مجنوں کا دل لیلیٰ کو دیکھ کر دھڑکا

کرتا تھا۔

قیس بھی واقعی مجنوں تھا کہ اس کے کتے کو چوم رہا تھا، کسی نے دیکھ کر کہا۔ ''اے مجنوں! کیا کر رہے ہو؟ کتے کو کیوں چوم رہے ہو؟''

جواب دیا۔ ''کتے کو اس لیے چوم رہا ہوں کہ لیلیٰ کے دیار سے ہو کر آیا ہے۔''

لیلیٰ کے دیار سے ایک کبوتر اُڑتا ہوا آیا جسے مجنوں نے پکڑ لیا، اور کبوتر سے کہا۔ ''مجھے احوالِ لیلیٰ سُنا مگر لمبی تمہید باندھ کر سنانا تاکہ میں دیر تک سُنتا رہوں۔''

ایک عرصہ تک میں یہ ہی سمجھتی رہی کہ لیلیٰ ایک حسین عورت ہوگی۔ بعد میں مجھے پتا چلا لیلیٰ تو عربی میں رات کو کہتے ہیں، وہ رات کی طرح کالی عورت تھی، اس زمانے میں بھی مجھ جیسے کچھ لوگ موجود تھے۔ کسی نے سوچا، دیکھوں تو سہی لیلیٰ کیسی حور پری ہے، جس کے پیچھے قیس، مجنوں بنا پھرتا ہے۔

اس نے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ لیلیٰ کالی عورت تھی عام عورت سے بھی کم صورت، اس نے کہا۔ ''اِز دگر خوباں تو افزوں نیستی'' (اے خاتون! کیا بات ہے تو دوسری عورتوں سے بڑھی ہوئی تو نہیں ہے؟)

لیلیٰ نے جواب دیا۔ ''گفت خاموش چوں تو مجنوں نیستی۔''

(تُو چپ ہو جا کیوں کہ تو تو مجنوں نہیں ہے)

مجنوں کے باپ نے ایک مرتبہ اس سے کہا۔ ''قیس تیرے اور لیلیٰ کے تعلق کے سبب میری بڑی بدنامی ہو رہی ہے۔ آ...... ہم بیت اللہ شریف چلتے ہیں، تو وہاں جا کر اس عمل سے توبہ کر لینا۔''

جب وہ مقامِ ابراہیم پر پہنچ گیا تو باپ نے کہا۔ ''قیس! توبہ کر اور اللہ سے دُعا مانگ۔ لیلیٰ کی محبت سے توبہ کر لے۔'' مجنوں نے باپ کی طرف دیکھا اور دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔ ''اے اللہ میں سب گناہوں سے توبہ کرتا ہوں لیکن لیلیٰ کی محبت سے توبہ نہیں کرتا۔''

''عشق تو لافانی ذات سے کرنا چاہیے جو بے مثال بے نظیر اور بے دلیل ہے۔''

''خیر مجھے کیا میں فضول میں ان کے بارے میں سوچ رہی، اب تو نہ لیلیٰ رہی نہ مجنوں۔ اب تک تو ان کی ہڈیاں بھی گل سڑ گئی ہوں گی۔ مجھے تو اپنی فکر کرنی چاہیے کہ میرا ابھی یہ حشر ہونا ہے۔''

تیز دھوپ کی وجہ سے ریت آگ پر رکھے ہوئے توے کی طرح تپ رہی تھی، عجلت میں، میں ننگے پاؤں باہر نکل آئی تھی۔ مجھے گھر جانا چاہیے۔ دل کی دھڑکن بھی معمول پر آ چکی ہے۔ اب گھر جانے میں کیا قباحت ہے، معاویہ کا پتا بھی چل جائے گا اور میں چپل بھی پہن لوں گی۔ گرم ریت پاؤں کے تلوے جلانے لگی تھی، میں نے گھر کی طرف قدم بڑھائے مگر پھر روک لیے۔ میں نے چونک کر دیکھا، گھر والے ڈنڈے اور لوہے کے سریے اٹھائے میری طرف بھاگ رہے تھے، میں حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔

''ملکھنی...... ملکھنی!'' بلاول نے کہا۔ وہ ان سے کچھ پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ وہ زور زور سے ہاتھ ہلا کر مجھے متوجہ کر رہا تھا۔ ''ملکھنی، بھاگ جاؤ۔ یہ لوگ تمہیں قتل کرنے کا منصوبہ بنا چکے ہیں...... ملکھنی بھاگ جاؤ۔ معاویہ میرے پاس ہے، اس کی فکر مت کرو۔'' بلاول کی چیختی چلاتی آواز سن کر میں چونک پڑی۔

گھر والوں کے ہاتھوں میں ڈنڈوں اور کلہاڑیوں کی وجہ سے میرے ذہن پر ہتھوڑے سے برسنے لگے۔ مجھے ان کے تیور باور کروا رہے تھے، ملکھنی تیرے حق میں بھاگ جانا بہتر ہے، ورنہ ان کے موٹے موٹے ڈنڈے تیری کھوپڑی کو تربوز کی طرح توڑ کر رکھ دیں گے۔

مجھے اب بھاگنا ہے، اگر میں نہ بھاگی تو میری روح جسم سے بھاگ جائے گی، میرے گھر والے میرے دشمن بن چکے ہیں، معاویہ کی طرح اب میں بھی ان کی آنکھ کی چبھن بن گئی ہوں۔

میں بھی انہیں کانٹے کی طرح چبھنے لگی ہوں۔ وہ مجھے قتل کرنے کے درپے ہیں مگر میں انہیں اتنا بھگاؤں گی کہ ان کے

سانس اکھڑ جائیں گے، ان کے پھیپھڑے مزید سانس اگلنے سے انکار کر دیں گے اور جب یہ مرنے لگیں گے تو اپنے اس عمل پر بری طرح پچھتائیں گے۔

میں بھاگنے لگی، میں نے جان بوجھ کر رفتار اتنی رکھی کہ ہمارا درمیانی فاصلہ بہ تدریج کم ہونے لگا۔ گھر والے جوش و خروش میں بڑھے چلے آ رہے تھے۔

جنید کہہ رہا تھا۔ ''پہلا ڈنڈا میں ماروں گا، میں اس کا سر پھوڑ دوں گا اور اس کے اُلٹے دماغ کو اپنی مٹھیوں سے آٹے کی طرح گوندھ کر رکھ دوں گا۔''

میں نے انتہائی سختی سے ہونٹ بھینچ لیے اور دل میں کہا۔ ''جنید تو خود اسی حسرت میں مر جائے گا۔''

وہ جیسے ہی میرے قریب پہنچے میں نے یک دم رفتار بڑھا دی، جیسے گاڑی کو اچانک فل ایکسی لیٹر دے دیا جاتا ہے، اب درمیانی فاصلہ پھر بڑھنے لگا۔

جب یہ فاصلہ تیس چالیس میٹر تک جا پہنچا تو ایک بار پھر میں نے رفتار کم کر دی، فاصلہ پھر کم ہونے لگا، لیکن مجھے پکڑنا ان کی حسرت بن گیا تھا۔ جیسے ہی میرے قریب پہنچے میری رفتار بڑھ جاتی اور وہ بہت پیچھے رہ جاتے۔

اس آنکھ مچولی میں پتہ نہیں کتنا عرصہ گزر گیا۔

اب وہ نڈھال ہونے لگے، اور بری طرح ہانپتے ہوئے ایک ایک کر گرنے لگے، ہانپتے، کانپتے اور لرزتے ہوئے وہ کم ہونے لگے، حتیٰ کہ اس دوڑ میں صرف جنید رہ گیا، وہ جوشِ جنوں میں ابھی تک بھاگ رہا تھا، مگر مجھے چھو لینا اس کے بس سے باہر تھا، وہ صرف اپنی اندرونی کدورت کی تقویت کے لیے دوڑ لگائے ہوئے تھا، مگر بالآخر وہ بھی ڈھیر ہو گیا۔

میں اس کے پاس رک گئی، سانس اس کے سینے میں نہیں سما رہا تھا۔ اوندھے منہ گرنے کی وجہ سے اس کا چہرہ ریت میں دھنس گیا تھا، جب وہ زور کی سانس لیتا تو ریت اُڑ کر اس کی ناک میں گھس جاتی، اس کی آنکھوں اور ناک سے پانی بہہ رہا تھا، جب ناک سے پانی بہتا ہے تو بڑی شرمندگی ہوتی ہے۔

جنید کے چہرے پر کرب و اذیت اور شرمندگی کے سارے آثار منجمد تھے، میں اس کے پاس انتہائی سکون سے بیٹھ گئی اور اپنے ہونٹوں کو اس کے کانوں کے قریب لے جا کر کہا۔

''جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے سوال کریں تو آپ کہہ دیں کہ میں بہت ہی قریب ہوں۔ ہر پکارنے والے کی پکار کو جب کبھی وہ مجھے پکارے قبول کرتا ہوں اس لیے لوگوں کو بھی چاہیے کہ وہ میری بات مان لیا کریں اور مجھ پر ایمان رکھیں یہی ان کی بھلائی کا باعث ہے۔'' (البقرہ، 186)

میں نے اپنی بات ختم کی تو جنید بولا۔ ''ملکھنی...... ملکھنی۔ تُو...... تُو جیت گئی...... میں ہار گیا ہوں۔'' جنید بالکل نڈھال ہو گیا تھا۔ اس کا سارا جوش و خروش صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا اور شکست کے آثار اس کے چہرے سے چھلکنے لگے تھے۔

میں نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر اس کا گرد آلود چہرہ صاف کیا۔ وہ ابھی تک ہانپ رہا تھا۔ میں نے اس کے بالوں میں محبت سے انگلیاں پھیریں اور چہرہ سہلایا۔ مجھے آج پہلی بار اس کے چہرے پر عجیب سی چمک دکھائی دے رہی تھی، میں نے اپنائیت سے پکارا۔ ''جنید تو مجھے بھائیوں جیسا عزیز ہے، میں تجھے شکست کے آخری جھٹکوں میں فتح کا جھنڈا تھماؤں؟''

''آں...... آں، ہاں...... ہاں۔'' اس بار وہ بچوں کی طرح تیز تیز سر ہلانے لگا۔

''جنید میرے بھائی وہ کر لو جو میں نے گھر کے صحن میں کہا تھا۔ یقین کر و طوبیٰ کے درخت میں سجنے والی مجلس میں بٹھا دوں گی۔ تیری شادی ایسی لڑکی سے کراؤں گی جو اپنے ایک جلوے میں ستر لاکھ ادائیں دکھائے گی۔''

''سچ ملکھنی؟'' جنید نے خوشی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''ہاں میرے بھائی! بالکل سچ۔'' میں نے اس کی پیشانی سے بال ہٹا کر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”ملکھنی لے“ جنید نے آنکھیں سکون سے بند کرلیں۔ ”میرا اسرار ادرد ختم ہوگیا ہے۔ جو تم نے کہا تھا وہ سب میں کرنے پر رضامند ہوں۔ ملکھنی! ملکھنی تم جیسا چاہتی ہے میں ویسا ہی کروں گا۔“ جنید نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی، جنید کی ہاں سے مجھے تسکین ملی تھی۔ اب گھر والوں کے مان جانے میں دیر نہیں لگے گی۔

یہ میری خام خیالی تھی، عقب سے اٹھنے والا شور سن کر میں چونک کر مڑی۔ ”وہ رہی، پکڑو اسے، جانے نہ پائے؟“ ابو نے کہا۔

”اُف میرے اللہ۔ کیسے پاگل لوگ ہیں۔ لگتا ہے پھر اُٹھ گئے ہیں اور گر گر اٹھنے والے بڑے خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔“

میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب جنید کی طرح انہیں بھی نڈھال کر کے چھوڑوں گی۔ میں پھر بھاگ پڑی، بھاگتے ہوئے مجھے جنید کا خیال آیا تو مڑ کر دیکھا، بلاول جو سب سے پیچھے تھا جنید کے پاس رُک گیا تھا۔ باقی گھر والے سابقہ جنون کے ساتھ میری طرف بھاگ رہے تھے، اس مرتبہ میں نے انہیں ناکوں چنے چبوانے کا تہیہ کرلیا۔

ہماری آنکھ مچولی پھر سے شروع ہوگئی، میں حیران تھی کہ امی، ابو میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی کہ وہ تھک نہیں رہے۔ اس بار مجھے پتا ہی نہیں چلا اور میں ایک مصروف شاہراہ پر نکل گئی۔ گاڑیوں، رکشا، موٹر سائیکلوں اور لوگوں کی بھیڑ سے بچتی بچاتی میں آگے ہی آگے بھاگی چلی جارہی تھی، اچانک میرے قدم رک گئے۔ آگے پل تھا اور پل سے کچھ فاصلے پر آگے جاکر ٹریفک بری طرح جام تھا، ٹریفک کے ازدحام سے گزرنا محال لگ رہا تھا، پل بھر سانس لینے کو میں رُک گئی تھی۔ گرل تھام کر رُک گئی تھی۔

”میرے دشمنوں کا کیا حال ہے؟“ یہ سوچ کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا مگر مجھے دیر ہوگئی تھی، ایک نیزا اُڑتا ہوا میری جانب بڑھ رہا تھا، میں نیزے سے بچاؤ کی کوئی تدبیر نہ کرسکی اور وہ میری آنکھ میں آ کر کُھب گیا۔

چھنک۔ میری آنکھوں کا شیشہ ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ درد کی تیز لہر میرے بدن کو چیرتی ہوئی گزر گئی۔ میں نے آنکھیں سختی سے بند کرلیں، کیوں کہ زخمی آنکھ سے خون کے چشمے سے پھوٹ پڑے تھے۔ ایسا بے پناہ خون تھا کہ مجھے لگ رہا تھا لمحوں میں ساری گاڑیاں خون میں ڈوب جائیں گی۔ شیشہ ٹوٹنے کے جھٹکے سے میں سنبھل نہ پائی اور لڑکھڑا کر سمندر میں گرنے لگی۔ مجھے آخری احساس یہ ہوا تھا کہ میں بہت زوردار چھپاکے کے ساتھ پانی سے ٹکرائی تھی۔

☆......☆

میرا جسم کسی پھوڑے کی طرح درد کررہا تھا۔ اور شدید اذیت کا احساس ہورہا تھا، غنودگی اور نقاہت رہ رہ کر مجھ پر حملہ آور ہورہی تھی۔ آنکھیں کھول کر کچھ دیکھنا میرے لیے محال ہورہا تھا۔ پورے بدن میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں، ذہن کسی ایک خیال پہ یکسو نہیں ہو پارہا تھا۔ ذہنی دباؤ اور منتشر خیالات کے درمیان میں نے پوری قوت سے آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن کوئی واضح چیز نظر نہیں آئی۔ البتہ سر کے درد اور چکروں میں شدت سے اضافہ ہوگیا، میں نے بے اختیار دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔ سانسوں کا اتار چڑھاؤ بھی بہت تکلیف دہ تھا، حلق بے حد خشک اور کھردرا ہوگیا تھا۔

”پا...... پانی!“ اچانک ہی مجھے شدید پیاس کا احساس ہوا۔ مجھے اپنے اِرد گرد حرکت کا احساس ہوا۔ میرے سر کے نیچے ایک بازو آیا۔ جس نے زور لگا کے مجھے اوپر کی جانب اٹھایا۔ پھر میرے ہونٹوں سے کچھ ٹکرایا۔

”پانی“ میرے اندر احساس جاگا۔

میں غٹا غٹ پانی پینے لگی، شاید عجلت میں پانی گرا بھی تھا، مجھے اپنا گریبان بھیگتا ہوا محسوس ہوا، ایک گلاس ختم ہوا تو میں نے مزید کا تقاضا کیا، جلد ہی دوسرا گلاس میرے ہونٹوں سے آلگا۔ اس بار بھی میں نے جلدی جلدی سارا پانی حلق میں اتار لیا۔ پانی جسم میں گیا تو میں نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ پھر چند نامانوس آوازوں کے نامانوس الفاظ میرے کانوں سے ٹکرائے۔

میرے بھاری پپوٹے اوپر اٹھے تو ایک دھندلی سی شکل مجھے نظر آئی، جو میرے چہرے کے قریب تھی۔ چند لمحوں بعد مجھے اپنے سینے پر کسی چیز کے ٹکرانے کا احساس ہوا۔ پھر کلائی پر دو انگلیاں رکھی گئیں، میرا دماغ مفلوج تھا، کسی اور کو تو کیا میں تو خود کو نہیں پہچان پارہی تھی۔ میرے اندر سوالات کی بوچھاڑ تھی، مگر کسی ایک کا بھی واضح مفہوم سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

جن انگلیوں نے میری کلائی تھامی تھی، تھوڑی دیر بعد چھوڑ دی، سینے سے چھوٹی سی جو چیز ٹکرائی تھی، وہ بھی ہٹالی گئی، میں نے آنکھیں پھر سے بند کرلیں، کیوں کہ کھلی آنکھوں سے بھی میں کچھ دیکھ نہ پائی۔

چند لمحے یوں ہی خاموش گزر گئے۔ پھر مجھے بائیں بازو پر سوئی چبھنے کا احساس ہوا۔ درد کے ہلکے سے احساس کے چند منٹوں بعد میری غنودگی گہری ہونے لگی میں ایک بار پھر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگئی۔ دوبارہ سو کر اٹھی تو پہلے کی نسبت ذہن زیادہ پُرسکون تھا۔ آنکھوں کا خمار چھٹ گیا تھا اور سر کا بوجھ بھی تقریباً نہ ہونے کے برابر تھا۔ دل کی دھڑکن بھی معمول کے مطابق تھی، اپنے وجود کے صحیح سلامت ہونے کا احساس جاگا تو میں نے جھٹ سے آنکھیں کھول کر ارد گرد کا جائزہ لیا۔

سنگل بیڈ پر گداز گدا اور ریشم جیسا نرم و ملائم و چمکدار کمبل! سونے کا بستر انتہائی آرام دہ تھا، چھوٹے سے کمرے میں آنکھوں کو چکا چوند کردینے والے انتہائی بیش قیمت شو پیس سجے تھے، دیواروں پر ہلکا آسمانی رنگ کا پینٹ تھا اور ان پر بہت خوب صورت مناظر کی پینٹنگز آویزاں تھیں۔ واحد کھڑکی پر انتہائی دبیز، خوب صورت اور قیمتی پردہ تھا۔ وہاں انتہائی اعلیٰ معیار اور جدید ڈیزائن کا ایک صوفہ سیٹ اور دو تین کرسیاں بھی تھیں، فرش پہ انتہائی بیش قیمت اور اعلیٰ ٹائلز تھے۔

نہ جانے یہ کونسی دنیا کا خوبصورت کمرا ہے۔ دماغ پہ پڑنے والا ابتدائی بوجھ اب بہت حد تک ہلکا ہوچکا تھا۔ اس لیے لمحہ بہ لمحہ سوچوں کی آمد جاری تھی، لیکن اپنی ذات کے حوالے سے میرے پاس کسی بھی سوچ کا جواب نہیں تھا۔ اگر اس خوب صورت کمرے میں اگربتیوں کی تیز خوشبو نہ ہوتی تو میں بہت حد تک بہتر سوچ سکتی تھی اور شاید اس جگہ کا کچھ بھید بھی پالیتی لیکن اگربتی کی تیز خوشبو مجھے شروع ہی سے ناپسند رہی ہے اور میری پرسکون سوچوں میں اگربتیوں کی تیز خوشبو واحد چیز تھی جو خلل ڈال رہی تھی۔

کچھ دیر بعد دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی، میری نظریں غیر ارادی طور پر دروازے کی طرف اُٹھ گئیں۔

پھر دروازہ آہستگی سے کھلا اور کمرے میں دراز قد، کسرتی جسم والا ایک وجیہہ نوجوان داخل ہوا۔ داڑھی مونچھوں سے صاف چہرہ دمک رہا تھا۔ اس نے خوب صورت بالوں میں مانگ نکال رکھی تھی۔ آنکھوں پر باریک فریم کا چھوٹے شیشوں والا چشمہ تھا، سیاہ پینٹ اور سفید بے داغ شرٹ اس پر بہت جچ رہی تھی۔ پیروں میں قیمتی سیاہ چمک دار جوتے تھے۔ وہ اندر داخل ہوا تو اس کے پیچھے ادھیڑ عمر کی باوقار سی ایک خاتون بھی تھیں، پھر مجھے خاتون کے عقب میں ایک خوب صورت نوجوان لڑکی بھی نظر آئی اس نے جینز اور جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے پیچھے منی اسکرٹ اور ٹی شرٹ میں ملبوس ایک اور لڑکی تھی۔ پھر مزید افراد کی آمد ہوئی اور آہستہ آہستہ کمرا تقریباً بھر گیا۔ میں حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی وہ لوگ تعداد میں تقریباً اٹھارہ بیس رہے ہوں گے۔ مگر نظم و ضبط ایسا کہ کسی کے منہ سے ہلکی سی آواز نہیں نکلی۔ وہ ایک ایک کر کے خاموشی سے اندر داخل ہوئے اور ایک قطار میں میرے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوگئے۔

اتنے زیادہ افراد کی موجودگی کے باوجود کمرے میں پراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میرے لیے وہ سبھی اجنبی تھے۔ ان کی حرکات و سکنات میرے لیے ناقابلِ فہم تھیں، ان سب کی آنکھیں بند تھیں اور وہ گویا غلاموں کی طرح میرے سامنے کھڑے تھے۔

”یہ کیا ہورہا ہے؟“ میں خود سے پوچھ رہی تھی مگر سوال کا جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔

دس پندرہ منٹ وہ اسی حالت میں رہے، پھر آنکھیں کھولنے کے بعد ایک ایک کر کے وہ آگے بڑھے اور میرے پاؤں چھوتے ہوئے کمرے سے نکلنے لگے۔

(اس حیرت اور اسرار بھرے ناقابلِ فراموش سلسلے کی اگلی کڑی آئندہ ماہ پڑھیے)

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کردینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا' اسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا پھر صورتِ حال یہ ہوگئی ہے کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہ ہرحال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات بہ راہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا' اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور بہ راہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی' قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات ٹوکن منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں' وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)......مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کی بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)......منی آرڈر/بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)......اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' 110' آدم آرکیڈ' شہید ملت روڈ۔ کراچی۔

□ عذرا۔ حیدرآباد۔

○ محترم جناب بابا صاحب، السلام وعلیکم! آپ کی خدمت میں اپنے مسائل لے کر حاضر ہوئی ہوں امید کرتی ہوں کہ آپ کوئی حل ضرور نکالیں گے، میرا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ میری عمر 30 سال ہوچکی ہے ہم پانچ بہنیں ہیں جو تینوں جوان ہیں، ہم سب کے رشتے بہت آتے ہیں لیکن ہمارے والدین خاطر خواہ توجہ نہیں دیتے۔ ابو کا خیال ہے کہ پہلے ان کی بہن کی (یعنی میری پھپو) کی شادی ہو جن کی عمر 38 کے قریب ہے۔ اس چکر میں ہماری عمریں بھی زیادہ ہوچکی ہیں پھپو کی وجہ سے ابو ہماری طرف وہ توجہ نہیں دے پاتے، ہمارے حالات مالی طور پر مستحکم نہیں۔ ابو کو کام چھوڑے کافی عرصہ ہوچکا ہے۔ اب وہ کام کا صرف سوچتے ہیں پر ہمت نہیں کرپاتے۔ بھائی بھی زیادہ خرچہ نہیں دیتے اور بھائی چھوٹے ہیں آپ سے التجا ہے کہ آپ کوئی ایسا حل بتائیں کہ ہماری شادی کے مسائل حل ہوجائیں اور ابو کے کام کا مسئلہ بھی حل ہوجائے اور بھائی خرچہ زیادہ دیں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔

☆ بیٹی عذرا! نماز فجر اور عشا کے بعد 33-33 بار الحمد شریف پڑھو اور دعا کرو مدت ایک ماہ ہے۔

□ صائمہ نذر علوی۔ کراچی۔

○ السلام علیکم! بابا جی! پہلی بار لکھ رہی ہوں امید ہے آپ اس ماہ میں جواب دیں گے۔ میرے والد سبزی کی دوکان لگاتے ہیں جبکہ والدہ فیکٹری میں کام کرتی ہیں ہم چھ بہن، بھائی ہیں تین بھائی اور تین بہنیں! گھر میں اتفاق بالکل نہیں ایک بھائی اور ایک بہن شادی شدہ ہیں بھائی لاہور اور بھابھی اپنی امی کے گھر ملتان میں رہتی ہیں میں بی اے میں داخلہ لینا چاہتی ہوں۔ میرے گھر پر رہنے والا کوئی نہیں امی چاہتی ہیں میں آگے نہ پڑھوں میری اور مجھ سے بڑی بہن جو کہ ٹیوٹر کر رہی ہے ہم دونوں کی شادی ہوجائے۔ میری والدہ اکثر بیمار رہتی ہیں میں چاہتی ہوں وہ کام چھوڑ دیں اور ہم بہنیں اپنا بوجھ خود اٹھائیں۔ مجھ سے بڑی قریبی ہاسپٹل میں نرسنگ بھی کرتی ہے میں بینک میں یا کسی ایئر لائن میں ایئر ہوسٹس بننا چاہتی ہوں۔ میری عمر انیس سال ہے میں اپنی جسامت اور خاص طور پر قد سے دس سال کی بچی لگتی ہوں۔ خون کی کمی ہونے سے اور بھی زیادہ کمزور لگتی ہوں وزن زیادہ نہیں اٹھا سکتی تھوڑا سا اٹھالوں تو کمر درد ہوجاتا ہے۔ میری والدہ ہماری شادی کے لیے فکر مند ہیں۔ میں مردوں کو دیکھوں تو کچھ ہونے لگتا ہے کہ ان کا یا اپنا سر پھاڑ دوں لیکن ایک ہے جو مجھے روتے، ہنستے، خوشی، غم، اٹھتے، سوتے آنکھوں میں سمایا رہتا ہے میں نے اسے دیکھا ہے لیکن اس نے مجھے نہیں۔ وہ پروفیشنل انسان ہے، امیر بھی ہے، کہاں رہتا ہے؟ نہ جان نہ پہچان کوئی رابطہ نہیں کچھ خاص نہیں جانتی اُس کے بارے میں۔ بس چاہتی ہوں اگر کوئی لائف پارٹنر بنے تو صرف وہی ورنہ کوئی نہیں۔ اُس کا کہیں رشتہ تک نہیں ہوا، میں غریب والدین اور شریف گھر کی لڑکی ہوں جو عزت کو سب کچھ مانتے ہیں بس وہ میری زندگی میں آئے اور سب کی رضا مندی اور جائز طریقے سے مجھے لے جائے۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ بس وہ انسان چاہیے، زندگی کی شروعات خوش گوار ہو اور یہ سفر آخری دم تک یوں ہی چلتا رہے۔ اگر آپ میرا یہ کام کردیں کہ مجھے بی اے کے داخلے کے ساتھ ساتھ ان دونوں جگہوں میں سے کہیں جاب مل جائے، میری امی کام چھوڑ دیں اور میری زندگی میں وہی انسان جسے میں چاہتی ہوں جہاں پر بھی ہے مجھے اپنا ہمسفر بنالے تو ساری زندگی آپ کی احسان مند رہوں گی کوئی ایسا مضبوط وظیفہ بتائیں کہ جو کم وقت میں یہ سب ہوجائے۔ اس سے پہلے کہ میرے گھر والے مجھے کسی اور کا بنادیں اور میں اسے وہ خوشی نہ دے پاؤں جو اپنے چاہنے والے کو دے سکتی ہوں اور ہاں اس انسان کا نام سلمان ہے والدہ کا نام سلمٰی ہے بس وہ جہاں بھی ہے مجھے ڈھونڈے۔ بغیر کسی ہنگامے کے مجھے اپنا بنالے۔

☆ بیٹی صائمہ! زندگی ہر انسان کو صرف ایک بار ہی ملتی ہے لہٰذا اسے بہت اچھے انداز میں جینا چاہیے...... خواب دیکھنا بُرا نہیں مگر خوابوں میں حقیقت کا رنگ بھرنا انسان کے اپنے ہاتھ میں ہونا چاہیے...... اپنی تعلیم پر توجہ دو۔ نماز کی پابندی رکھو۔ درود شریف بہت پڑھو۔ نماز فجر، ظہر اور عشا کے بعد 3-3 تسبیح ''یا اللہ'' کی پڑھو اور دعا کرو مدت 41 دن ہے۔

□ کنول۔ کراچی۔

☆ بیٹی کنول! میں مانتا ہوں کہ تمہارے شوہر نے اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کیں مگر تم ماں ہو اور اپنی اولاد کی اچھی تربیت کی ذمے دار بھی ہو۔ غلط راستے پر چلنے والوں کا انجام بھی خطرناک ہی ہوتا ہے۔ بچیوں پر توجہ دو۔ غیر ضروری لوگوں سے کوئی تعلق نہ رکھو۔ تمہاری چھوٹی سی غلطی تمہیں اولاد کی نظروں میں گرادے گی اور تم اللہ کے سامنے بھی شرمندہ ہو جاؤ گی۔ باوضو رہنے کی عادت ڈالو، نماز کی سختی سے پابندی کرو تاکہ شیطان تم سے دور رہے۔ بعد نماز عشا قرآن مجید کی تلاوت کرو ترجمہ کے ساتھ اور اسے اپنی عادت میں شامل کرلو تو ہمیشہ مطمئن رہو گی۔

□ ماریہ۔ سڈنی۔

☆ بیٹی ماریہ! تمہاری خواہش کے مطابق تمہارا خط شائع نہیں کیا جارہا ہے، جو حالات تم نے لکھے ہیں اگر اس میں ایک فی صد بھی سچائی ہے تو تمہارا اپنے شوہر سے علیحدہ ہو جانا بہتر ہے۔ ایک فیصد سچائی سے مراد یہ نہیں کہ تم نے غلط بیانی کی ہے بلکہ میرے حساب سے تم نے بہت صبر کیا ہے۔ اس شخص کو بہت وقت دے دیا۔ لہٰذا اب مزید وقت اور زندگی ضائع مت کرو۔ یہ انسان بد سے بدتر ہی ہوتا جائے گا سنبھلنے کی کوئی امید نہیں۔ اللہ تمہیں نیک اور صحت مند اولاد عطا فرمائے۔ زچگی سے فارغ ہو کر مجھ سے پھر رابطہ کرنا ابھی مناسب ہوگا مجھ سے تعویذ منگوالو۔ طریقہ کار سچی کہانیاں کے دفتر فون کرکے معلوم کرلو، حالات سخت ہوں گے مگر تباہی اور بربادی سے محفوظ رہو گی۔ غلطی کرکے سنبھال لینا عقلمندی ہے۔ ایک غلط فیصلے کے بعد دوسرا پھر تیسرا غلط فیصلہ زندگی تباہ کردیتا ہے۔ اللہ پر بھروسا رکھو الحمد شریف کثرت سے پڑھو۔ معاملات اللہ کے سپرد کرکے مطمئن ہو جاؤ۔ جس ذات نے تمہیں بُرے شخص سے بچایا ہے وہ آئندہ بھی کرم کرے گی۔

□ صائمہ۔ خوشاب۔

☆ بیٹی صائمہ! خوش رہو۔ کوشش جاری رکھو کامیابی ضرور ملے گی۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو ہر نماز کے بعد سورۂ ناس، سورۂ فلق اور آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر دم کرلیا کرو۔ حسب استطاعت صدقہ خیرات ضرور دو۔ میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ جلد از جلد مجھ سے تعویذ منگوالو محفوظ ہو جاؤ گی۔

□ رشیدہ۔ مانسہرہ۔

○ پیارے باباجی! السلام علیکم! میری نند جس کی عمر تقریباً 35 سال ہے۔ وہ شادی شدہ اور ایک بچے کی ماں ہے، جب صبح وہ سو کر اٹھتی ہے تو بستر سے اٹھا نہیں جاتا۔ اُس کا وزن زیادہ ہے اور روز بہ روز بڑھتا ہی جارہا ہے۔ پیٹ اور کولہوں کا حصہ بہت زیادہ موٹا ہے۔ میری نند بے چاری بہت پریشان ہے۔ اُس نے مجھ سے کہا ہے کہ میں آپ کو لکھ کر بھیجوں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں اُس کے جسم میں چربی بہت ہے۔ میری نند اپنے موٹاپے کی وجہ سے بہت مشکل محسوس کررہی ہے۔ باباجی! آپ میری نند کے لیے دُعا کریں اور دوا بھی ضرور بتائیں تاکہ اللہ تعالیٰ اسے شفا عطا فرمائے۔

☆ بیٹی رشیدہ! اللہ تمہاری نند کو مکمل صحت عطا فرمائے۔ اس کے جسم میں درد بھی وزن کی زیادتی کی وجہ سے ہے۔ مناسب ہوگا غذا متوازن لے اور یا شافعی کا ورد بہ کثرت کرے۔ انشاء اللہ، مکمل افاقہ ہوگا۔ آئندہ خط جوابی لفافے کے ہمراہ لکھنا تاکہ تفصیل بتائی جاسکے۔

□ اکبر خان۔ میانوالی۔

○ باباجی! السلام علیکم! میرے بہت سے مسائل ہیں جو میں بیان نہیں کرسکتا لیکن اِن میں دو بہت اہم مسائل ہیں جو آپ سے بیان کررہا ہوں۔ اِن کا جواب علیحدہ علیحدہ دیجیے گا۔ پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ میں اللہ کے فضل وکرم سے حافظِ قرآن ہوں لیکن میں صحیح رَوانی کے ساتھ نہیں پڑھ سکتا۔ باباجی! میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میں ملازمت کے سلسلے میں میانوالی آیا ہوا ہوں لیکن رہنے کے لیے کسی مناسب جگہ کا بندوبست نہیں ہو رہا ہے۔ کبھی کسی جاننے والے کے گھر سو جاتا ہوں، کبھی اسٹیشن پر۔ میں یہ ملازمت چھوڑنا بھی نہیں چاہتا۔ اِس کے لیے مجھی کوئی وظیفہ بتادیں۔ آپ استخارہ کرکے بتائیں کہ میرے لیے جگہ کا بندوبست ہو جائے گا کہ نہیں؟ میں آپ کے جواب کا انتظار کروں گا۔

☆ بیٹے اکبر! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی کے ساتھ روزانہ سورۂ یٰسین کی باآوازِ بلند تلاوت کیا کرو۔ والدہ سے بھی کہو اللہ سے دُعا کیا کریں کہ وہ تمہارے لیے کسی معقول جگہ کا بندوبست کردے۔ تمہارے دونوں مسائل انشاء اللہ، حل ہو جائیں گے۔

□ صائمہ احمد۔ گوجرانوالہ۔

○ باباجی! آداب! میں کافی عرصے بعد آپ کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہو رہی ہوں۔ باباجی! اَب سے پانچ سال پہلے میرے شوہر نے قرض لے کر چھوٹا سا ایک پرنٹنگ پریس لگایا تھا۔ ایک سال تک تو کاروبار چلا مگر اُس کے بعد سے مشین بالکل بند پڑی ہے۔ گھر میں بہت پریشانی ہے۔ آپ کے وظیفے کی برکت سے میرے شوہر کو بنک سے لون ملا اور انہوں نے جگہ کرائے پر لے کر دوبارہ مشین سیٹ کرلی مگر ابھی تک کام شروع نہیں ہوا۔ کوئی نہ کوئی رکاوٹ آجاتی ہے۔ میں بہت پریشانی میں آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ شوہر الگ پریشان ہیں۔ گھر میں ہر وقت لڑائی جھگڑا رہتا ہے۔ براہِ مہربانی آپ استخارہ کرکے بتائیں کہ شوہر کا یہ کام ٹھیک ہے اور کسی نے کچھ کروایا تو نہیں ہے؟ کیونکہ ہمارے گھر میں بہت سکون اور محبت تھی مگر دو، تین سال سے پتا نہیں کیا ہوگیا؟ براہِ مہربانی نومبر کے شمارے میں مجھے جواب دے دیں کہ گھر اور کاروبار میں برکت ہو اور قرض جیسی لعنت سے نجات مل جائے۔ میرے شوہر بہت پریشان ہیں۔ بچے الگ خاموش رہتے ہیں۔ میرے شوہر کے کاروبار میں برکت کے لیے خصوصی دُعا کروائیں۔

☆ بیٹی صائمہ! اللہ تمہارے مالی مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی کے ساتھ وظیفہ جاری رکھو اور مدت پوری ہونے پر وظیفہ ترک مت کیا کرو بلکہ جاری رکھتے ہوئے مجھے مطلع کیا کرو۔ کچھ نہ کچھ رقم ضرور خیرات کیا کرو۔ اللہ ضرور اپنا کرم فرمائے گا۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ حاکم خان۔ چکوال۔

○ پیارے بابا جان! السلام علیکم! میرا نام حاکم خان ہے۔ بابا جان! عرصۂ دراز سے میں ایک لڑکی سے محبت کرتا ہوں لیکن بابا جان! وہ میری کسی بات کا جواب نہیں دیتی۔ جب بھی بولتا ہوں تو گھر کے اندر بھاگ جاتی ہے۔ بابا جان! ''سچی کہانیاں'' میں آپ کا کالم پڑھا تو سوچا کہ اِس سلسلے میں آپ سے رہنمائی حاصل کی جائے۔ بابا جان! پلیز، میری مدد فرمائیں اور استخارہ کرکے مجھے بتائیں کہ یہ کام میرے لیے نقصان دہ ہے یا فائدہ مند؟ اُس کے بعد میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا اور اللہ آپ کو صحت اور تندرستی کے ساتھ اپنی حفظ واَمان میں رکھے اور آپ اِسی طرح لوگوں کے مسئلے حل کرتے ہیں۔

☆ بیٹے حاکم......! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ بیٹے......! اگر واقعی تم اس بچی سے مخلص ہو تو اپنے والدین کو اس کے گھر بھیج دو، یہی سب سے بہتر طریقہ ہے۔

□ رابعہ اکرام۔ کراچی۔

☆ بیٹی! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف کثرت سے پڑھا کرو۔ تمہارے شوہر درست کہتے ہیں مگر بیٹی! والدین بہت قیمتی سرمایہ ہیں۔ تم اُن سے ملنے ضرور جایا کرو، چاہے کھڑے کھڑے ہی جاؤ۔ شوہر کو ساتھ مت لے جاؤ۔ بیٹی! والدین کی خبر گیری کرنا تمہارا فرض ہے۔ بھائی یا بھائی کے رویے کی وجہ سے جانا ترک مت کرو تاکہ زندگی میں تمہیں ہمیشہ اطمینانِ قلب رہے۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 71-71 بار سورۃ فاتحہ پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ رضوانہ تالپور۔ نواب شاہ۔

☆ بیٹی رضوانہ! بڑا دُکھ اور افسوس ہوتا ہے جب مسلمان گھروں کے افراد الٹے سیدھے عملیات کروانے والوں کے پاس جاتے ہیں۔ یہ ایمان کی شدید کمزوری ہے اور یاد رکھو اللہ کے ہاں بھی اِس کی شدید پکڑ ہے۔ پریشانی، خوشی، بیماری، صحت سب خدا کی طرف سے ہے۔ خوشی میں شاکر رہنا اور پریشانی میں صابر رہنا ہی ایک مومن کا فرض ہے۔ اللہ سے گڑگڑا کر اپنے غلط اعمال کی معافی مانگو۔ حسب استطاعت صدقہ خیرات نکالو اور ہر نماز کے بعد الحمد شریف، چاروں قُل اور آیت

الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر ضرور دَم کیا کرو۔ مجھے ایک ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کرو۔

□ سعدیہ احسن۔ اسلام آباد۔

☆ بیٹی سعدیہ! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہ کثرت پڑھو۔ میرا مقصد تمہیں پریشان کرنا نہیں ہے مگر بیٹی! کچھ باتوں کا جاننا بہت ضروری ہے۔ بیٹی! میرے اندازے کے مطابق تمہارے گھر پر اثرات ہیں جو تم لوگوں کو کافی پریشان کر سکتے ہیں اور تمہاری خوشیوں میں رکاوٹ بھی ڈال سکتے ہیں لہٰذا بہتر یہی ہوگا کہ جلد از جلد دونوں مسئلوں کے لیے مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ جب تک تعویذ تیار نہیں ہوتے، روز بعد نمازِ عشاء ایک بار سورۃ جن ضرور پڑھو۔ خط جوابی لفافے کے ہمراہ لکھو۔

□ نورین الٰہی۔ لاہور۔

☆ بیٹی نورین! تم نے ایک خط میں کئی مسئلے لکھ دیے ہیں۔ بہرحال اپنی بہن سے کہو شادی کے لیے بعد نمازِ فجر ایک بار سورۃ اُحزاب پڑھیں۔ رزق میں برکت کے لیے بعد نمازِ مغرب ایک بار سورۃ واقعہ پڑھنا بہت بابرکت ہے۔ جہاں تک بھائی کا تعلق ہے تو بھابی سے کہو، نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ رحمٰن پڑھ کر پانی پہ دَم کر کے شوہر کو پلا دیں۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔ مدت 41 دن ہے۔

□ ناصرہ۔ سیالکوٹ۔

☆ بیٹی ناصرہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بعد نمازِ فجر ایک بار سورۃ مزمّل پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔ بیٹی! تمہارے خواب نشاندہی کرتے ہیں کہ کوئی بہت قریبی شخص تم لوگوں کو پریشان کر کے خوش ہوتا ہے۔ خوب صدقہ خیرات کیا کرو۔ چلتے پھرتے گھر کے سارے افراد یَارَحمٰن کا وِرد کریں۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

□ زینت مراد۔ سانگھڑ۔

☆ بیٹی زینت! اللہ تمہیں مکمل شفا عطا فرمائے۔ دل میں وہم مت لاؤ۔ کچھ نہ کچھ رقم اپنے اوپر سے ضرور صدقہ کرو۔ جہاں تک بچے کا تعلق ہے تو تم لوگ معاملات میں خاموشی رکھو۔ کوئی فیصلہ بھی جلد بازی میں مت کرنا۔ مجھے 21 روز بعد صورتِ حال سے آگاہ کرو۔

□ ثمرہ۔ کراچی۔

☆ بیٹی ثمرہ! نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ مائدہ پڑھو اور دُعا کرو۔ یہی عمل بعد نمازِ عشاء کرو۔ مدت 41 دن ہے۔ انشاء اللہ ضرور حالات میں مثبت تبدیلی آئے گی۔ ناغے کے دن شمار کر کے بعد میں پورے ضرور کرنا۔

□ ثروت۔ صادق آباد۔

☆ بیٹی ثروت! اللہ پر بھروسا رکھو۔ وظیفہ کرنے سے تبدیلی تو آئی ہے اور یہی مثبت تبدیلی ہے۔ انشاء اللہ جلد کرم ہوگا۔ والدہ کی صحت اور تندرستی کے لیے دُعا گو رہو۔ بے شک ماں دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ وظیفہ مزید ایک ماہ جاری رکھو۔ ہاں، نماز کی پابندی بہت ضروری ہے۔

□ رضا علی۔ جہلم۔

☆ بیٹے رضا! تمہیں براہِ راست بھی جواب دیا ہے اور رسالے کے ذریعے بھی جواب دے رہا ہوں۔ یقیناً تمہارے حالات بہت تکلیف دہ ہیں۔ ماں باپ کے سامنے اولاد دم توڑ دے، صرف اس لیے کہ علاج نہ ہو سکے کہ پیسا نہ ہو، بہت تکلیف دہ بات ہے۔ جہاں لوگ روزانہ ہزاروں روپے ضائع کر دیتے ہیں، وہاں ایسے بھی لوگ ہیں جو اولاد کا علاج ہی نہیں کروا سکتے۔ بہرحال بیٹے! دنیا میں ابھی اچھے لوگ باقی ہیں۔ تم اللہ سے مدد مانگتے رہو۔ بیٹے! مجھ سے جو بھی ہو سکا، وہ ضرور کروں گا۔ بس اللہ کی ذات سے کبھی مایوس مت ہونا۔

□ نسیمہ۔ گجرات۔

☆ بیٹی نسیمہ! حالات اتنے بہتر نہیں جتنے تم سمجھ رہی ہو۔ بہتر یہی ہوگا کہ پہلی فرصت میں مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ تفصیل کے لیے جوابی لفافہ ضرور اِرسال کرنا۔

□ ام فروا۔ شیخوپورہ۔

○ بابا جی! السلام علیکم! میرا نام ام فروا ہے۔ میری والدہ کا نام حوا ہے اور میری عمر 18 سال ہے۔ بابا جی! دو سال سے مجھے نزلے کی شکایت ہے۔ میں نے ناک کی ہڈی کا آپریشن بھی کروایا اور اَب ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ الرجی ہو گئی ہے اور نزلہ کبھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ بابا جی! مہربانی فرما کر مجھے اس کا کوئی حل بتائیے، میں بہت پریشان ہوں۔ بابا جی! میں نے نزلے کی وجہ سے پڑھائی بھی چھوڑ دی ہے اور صرف قرآنِ پاک پڑھ رہی ہوں۔ پلیز بابا جی! مجھے آنے والے شمارے میں جواب دے دیں۔ تاعمر آپ کی احسان مند رہوں گی۔

☆ بیٹی ام فروا! اللہ تمہیں مکمل شفا دے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ روزانہ رات کو سونے سے قبل ایک بڑے برتن میں کھولتا ہوا پانی لو اور اُس میں بہت سا نمک ملا کر بھاپ لو۔ یہ عمل 8-7 منٹ روز کرو۔ نہار منہ ادرک کے لمبے لمبے ٹکڑے نمک کے ساتھ توے پر بھون لو اور یہ 4-3 ٹکڑے بسم اللہ پڑھ کر کھا لو۔ انشاء اللہ افاقہ ہوگا۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔

□ محمد علی۔ کوئٹہ۔

○ پیارے بابا جی! السلامُ علیکم! آپ جیسے اچھے لوگوں کا سایہ اللہ پاک ہمارے سروں پر بہت دیر تک قائم رکھے۔ بابا جی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں پڑھائی میں بہت کمزور ہوں۔ مجھے کوئی آسان وظیفہ دیں کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکوں۔ پیارے بابا! میرے لیے دُعا کرنا۔

☆ بیٹے محمد علی......! اللہ تمہیں کامیابی عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 7-7 تسبیح رَبِّ زِدنی علماً کی پڑھو اور دُعا کرو۔ نہار منہ چھے سات بادام ضرور کھایا کرو۔ مدت 41 روز ہے۔

□ علی مراد۔ نواب شاہ۔

○ بابا جی! السلامُ علیکم! میرا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، وہ یہ کہ میری بس ایک بیٹی کے سوا کوئی اولاد نہیں۔ میں پڑھا لکھا نہیں ہوں اور یہ خط میں کسی دوسرے سے لکھوا رہا ہوں جب سنا کہ آپ ”سچی کہانیاں“ میں لوگوں کے مسئلے حل کرتے ہیں تو سوچا، میں بھی اپنا مسئلہ آپ کو بتا دوں۔ میری شادی کو بہت عرصہ ہو چکا ہے۔ آپ ہم پر احسان کر کے تعویذ دیں کہ بیٹا ہو جائے اور ہمیں یہ بھی بتائیں کہ آپ سے تعویذ کیسے حاصل کریں؟ ہمیں تو آپ کا ایڈریس بھی معلوم نہیں۔ بس آپ اپنے کرم سے ہمیں کوئی آسان وظیفہ بتائیں اور ایک تعویذ بھی دیں کہ ہمارا مسئلہ حل ہو جائے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ میں آپ کو ہمیشہ دُعائیں دیتا رہوں گا۔

☆ بیٹے علی مراد......! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ بیٹیاں تو اللہ کی رحمت ہوتی ہیں۔ ان سے بےزاری کا اظہار کبھی مت کرنا۔ تم مجھے جوابی لفافے پر واضح پتا لکھ کر خط اِرسال کرو تاکہ میں تمہیں تعویذ لینے کا طریقہ بتا سکوں۔ خط میں اپنا نام مع والدہ اور بیوی کا بھی مکمل نام لکھنا۔

□ شبانہ۔ ٹنڈو الہ یار۔

○ پیارے بابا جی! السلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور زندگی دے۔ بابا جی! آپ جس طرح دکھی انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں، اس کا اجر تو آپ کو اللہ تعالیٰ ہی دے گا۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے پتے میں پتھری ہے۔ ہومیوپیتھک علاج کروا رہی ہوں۔ میں آپریشن نہیں کروانا چاہتی۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ آپ کوئی ایسا وِرد یا وظیفہ دیں جس کو پڑھنے سے بغیر آپریشن کے پتھری ریزہ ریزہ ہو کر پتے سے نکل جائے۔ وظیفہ وغیرہ کتنے دن پڑھنا ہے اور کتنی مرتبہ، سارا تفصیل سے لکھ دیں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔ بابا جی! میری ایک کزن کا بھی یہی مسئلہ ہے۔ وہ بھی آپریشن کروانا نہیں چاہتی۔ اُس کے لیے بھی کوئی وظیفہ بتا دیں کہ بغیر آپریشن کے پتے سے پتھری نکل جائے۔ ساری عمر آپ کو دُعائیں دیں گے۔

☆ بیٹی شبانہ! اللہ تمہیں مکمل شفا عطا فرمائے۔ تم فضول میں خوف زدہ ہو۔ فی زمانہ سائنس نے بہت ترقی کر لی ہے۔ پتے کا آپریشن تو الٹرا ریز کے ذریعے بھی ہو جاتا ہے۔ تم نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہ کثرت پڑھو۔ دن میں جس وقت سہولت ہو، ہزار بار یَاشَافِیُ پڑھ کر پانی کی بڑی بوتل پر دَم کرو اور پھر یہ پانی دن بھر پیتی رہو۔ دن بھر میں کم از کم دس گلاس پانی پینا ضروری ہے۔ یہ عمل 14 دن کرو پھر مجھے حالات سے مطلع کرو۔ اپنی کزن سے کہو، وہ بھی یہی عمل کرے۔ انشاء اللہ آپریشن کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

□ عبدالرحیم۔ ڈی جی خان۔

○ محترم بابا جی! السلامُ علیکم! میں نے آپ کا بہت

نام سنا ہے۔ باباجی! جس طرح آپ انسانیت کی خدمت کرتے ہیں' اس کا اجر اللہ آپ کو دونوں جہاں میں دے۔ باباجی! ہم بھی آج ایک مسئلہ لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ وہ مسئلہ میرے کزن کا ہے۔ باباجی! کچھ عرصے پہلے اُس نے کاروبار شروع کیا جو بہت اچھا چل رہا تھا مگر اَب بالکل نہیں چل رہا۔ وہ بہت پریشان ہے کیونکہ اُس کا سارا سرمایہ اس کاروبار میں لگا ہوا ہے۔ باباجی! آپ ہمیں ایسا وظیفہ دیں جس کے کرنے سے کاروبار بہت ترقی کرے۔ ہم آپ کو تمام عمر دُعائیں دیں گے۔ آپ نے اس سلسلے میں ایک بہن ساجدہ کو جو وظیفہ دیا تھا' میں وہ وظیفہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ وظیفہ کرنے کی بھی اجازت دیں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی' شکریہ۔ اللہ حافظ! اگر کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف فرمائیں۔

☆ بیٹے عبدالرحیم......! وظیفے کی اجازت ہے' بس خیال رہے کہ کوئی نماز قضا نہ ہو۔ وظیفہ مکمل ہونے پر کچھ رقم ضرور خیرات کر دینا۔

□ زینت گل۔ پشاور۔

o باباجی! آداب! باباجی! میں اپنے دیور کی شادی اپنی بہن سے کرنا چاہتی ہوں۔ استخارہ کر کے بتائیں کہ یہ رشتہ ان دونوں کے حق میں کیسا رہے گا؟ اُن کی اَزدواجی زندگی کیسی گزرے گی اور اُن کی شادی کا میری زندگی پر کوئی منفی اَثر تو نہیں پڑے گا؟

☆ بیٹی زینت......! استخارہ حق میں ہے۔ تمہاری زندگی پر کوئی منفی اَثر نہیں پڑے گا۔ ویسے تو عالم الغیب اللہ تعالیٰ ہے لیکن اس سے ہمیشہ بہتری کی امید رکھنا چاہیے۔ جب تک تم یہ نہیں سوچو گی کہ تم نے اپنی بہن پر احسان کیا ہے اور اُسے احسان کا بدلہ دینا چاہیے۔ کسی سے کوئی امید مت رکھنا۔ سب خیر رہے گی۔

□ شہناز۔ جام شورو۔

o محترم باباجی! السلام علیکم! سدا خوش رہیں! میرا مسئلہ یہ ہے کہ تقریباً ایک سال پہلے میری شادی ہوئی تھی لیکن شوہر پتا نہیں کس مزاج کا ہے کہ میں اُسے سمجھ نہیں سکی۔ میں تو اُس سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہوں اور وہ مجھ میں ذرا بھی دلچسپی نہیں لیتا' نہ ہی خود سے کوئی بات کرتا ہے۔ میں بات کروں تو جواب دے گا ورنہ نہیں۔ جیب خرچ کے نام پر ایک روپیا نہیں دیتا۔ میری ضرورت میری امی پوری کرتی ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ شوہر بھی مجھ سے محبت کرے' میری ہر بات مانے اور میرے بغیر ایک منٹ نہ رہے۔ اَب میں پانچ مہینے سے اپنے میکے میں ہوں لیکن وہ فون تک نہیں کرتا۔ ملنا تو بہت دور کی بات ہے' بہن طعنے دیتی ہے کہ پتا نہیں' کب اپنے گھر جائے گی؟ باباجی! میں بہت بے زار ہوں' خودکشی حرام نہ ہوتی تو اَب تک کر چکی ہوتی۔ پیارے باباجی! کوئی ایسا عمل بتائیں کہ شوہر میرے بغیر رہ نہ سکے اور اپنی غلطی تسلیم کر کے مجھے لے جائے۔

☆ بیٹی شہناز......! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد 3 تسبیح سورۃ النّاس کی پڑھ کر اپنے اوپر دَم کر لیا کرو۔ شوہر سے ضرورت کے تحت بات کرو مگر اپنے فرائض خوش اُسلوبی سے پورے کرو۔ تمہیں خود اپنے سُسرال چلے جانا چاہیے۔ اپنے شوہر کو بلوا لو اور اپنے گھر چلی جاؤ۔ ساتھ رہو گی' خیال کرو گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا ورنہ شوہر کو تمہارے بغیر رہنے کی عادت ہو جائے گی۔ بیٹی......! سمجھداری سے چلو' گھر بنانا بہت مشکل ہے اور ٹوٹنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگتا۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔

□ نائلہ علی۔ کراچی۔

o باباجان! میرا مسئلہ حل کر دیں' میں آپ کی بہت شکرگزار رہوں گی۔ میری شادی کو 8 سال ہو چکے ہیں اور اَب تک اولاد سے محروم ہوں۔ لوگوں کے رویے اَب مجھے بہت دُکھ دیتے ہیں۔ آپ نے میری نند کو تعویذ دیا تھا' اُن کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی۔ اَب پھر انہوں نے آپ سے تعویذ منگوایا ہے۔ باباجی! پلیز' مجھے بھی تعویذ تیار کر دیں تا کہ میری بھی اولاد ہو سکے۔ یہ آپ کا مجھ پر احسان ہوگا۔ مجھے طریقہ کار سب پتا ہے مگر میری نند نے کہا کہ آپ ہر ایک کو تعویذ نہیں دیتے لہٰذا پہلے اجازت لے لو۔ باباجی! میں بھی آپ کی بیٹی ہوں' میری بھی مشکل حل کر دیں تا کہ میں اپنے سُسرال میں خوش وخرم رہ سکوں۔

☆ بیٹی نائلہ......! اللہ سے مدد مانگو' وہ ضرور تمہاری دُعا قبول فرمائے گا۔ میں تعویذ تیار کر دوں گا' بس خیال

رکھنا' تعویذ استعمال کرنے کا بھی خاص طریقہ ہے۔ اس پر عمل لازمی ہے۔ انشاء اللہ' کلام الٰہی کی برکت سے ضرور کرم ہوگا۔ خط میں اپنے مکمل کوائف اِرسال کرنا۔

□ زینت بیگم۔ کھاریاں۔

o باباجی! میں بہت بدنصیب عورت ہوں۔ پہلی شادی بھی اپنی مرضی سے کی اور ایک بچے کے بعد طلاق ہوگئی۔ گھر میں بھائی بھابی کا رویہ بہت خراب تھا اس لیے میں نے دوبارہ اپنی مرضی سے دوسری شادی کر لی۔ میرے دوسرے شوہر کے پہلے سے دو بچے تھے۔ وہ خاصے دولت مند ہیں اور اُن کی پہلی بیوی اُن کی کزن بھی ہیں۔ شروع میں تو سب ٹھیک رہا لیکن اَب اُن کا رویہ مجھ سے بہت خراب ہو رہا ہے۔ میرے بیٹے کو تو بالکل بھی برداشت نہیں کرتے۔ میرے دو بچے اُن سے بھی ہیں' اُن کو بھی وہ پیار نہیں ملتا جو اُن کا حق ہے۔ ساری توجہ پہلی اولاد کی طرف ہے۔ میں کچھ بولتی ہوں تو لڑنے لگتے ہیں' بہت برا بھلا کہتے ہیں۔ باباجی! میں بہت غریب گھر سے ہوں' پلٹ کر واپس بھی نہیں جا سکتی۔ اَب تو تین بچوں کا ساتھ ہے۔ باباجی! میں چاہتی ہوں' میرے شوہر ہم لوگوں سے محبت کریں اور کم از کم ایک گھر ہی میرے نام کر دیں۔ ان کی تو بہت جائیداد ہے' مجھے کم از کم ایک آسرا ہی ہو جائے۔ باباجی! آپ نے بہت سے لوگوں کے مسائل حل کیے ہیں' میرا مسئلہ بھی حل کر دیں' میں اور میرے بچے بھی آپ کو دُعائیں دیں گے۔

☆ بیٹی زینت! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بعض اوقات انسان ایک کے بعد ایک غلطیاں کرتا چلا جاتا ہے۔ بہرحال جو ہوا' سو ہوا' اَب تم نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین پڑھو اور دُعا کرو۔ خیال رہے' جہاں جہاں لفظ ''یٰسین'' آئے' وہاں رک کر 7 بار سورۃ فاتحہ پڑھو پھر دُعا کرو۔ بقیہ معاملات میں خاموشی رکھو۔ اللہ سب بہتر کرے گا۔ تجھے 41 دن بعد مطلع کرو۔

□ ارسلان احمد۔ سکھر۔

o باباجی! میں اکثر آپ سے رابطے میں رہتا ہوں۔ مسئلہ وہی ہے میری بیوی کی نافرمانی! اَب تو دو بچے بھی ہو چکے ہیں مگر وہ کسی طور بھی نباہ کرنے کو تیار نہیں۔ آپ مجھے جیسے جیسے سمجھاتے رہے' میں ویسے ہی چلتا رہا' ہر ہر طرح سمجھانے کی کوشش کی مگر بے فائدہ۔ وہ اَب بھی اپنی ضد پر قائم ہے کہ مجھے تمہارے ساتھ نہیں رہنا اور بچے بھی تم ہی رکھو۔ باباجی! اَب بتائیں' میں ان حالات میں کیا کروں؟ گھر والوں کے سامنے بہت شرمندگی ہوتی ہے اور اَب تو یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ جن بچوں کی خاطر یہ سب برداشت کر رہا ہوں' وہی اِن حالات میں بہت سہمے ہوئے رہتے ہیں۔ اُن کے چہرے پیلے ہیں اور بچوں والی کوئی شرارت اُن میں نہیں۔ باباجی! میں نے ہمیشہ آپ سے مدد چاہی' آپ نے جیسے کہا' ویسے ہی کیا' اَب بتایئے' کیا کروں کہ اَب تو میرے اعصاب بھی جواب دے رہے ہیں۔

☆ بیٹے ارسلان! تم نے اپنی جانب سے مکمل کوشش کر لی' اَب مناسب یہی ہے کہ اپنی بیوی کو فارغ کر دو۔ زندگی ایک بار ہی ملتی ہے' اس کو تباہ مت کرو' پرسکون ذہن کے ساتھ بچوں کی تربیت کرو۔ دنیا میں اچھے لوگ بھی ہیں جو کسی کی اولاد کو اپنی اولاد سے بڑھ کر چاہتے ہیں۔ تم نے ہر طرح سمجھا کر دیکھ لیا' نرمی سے بھی اور سختی سے بھی لہٰذا اَب تم پر کوئی اخلاقی بوجھ نہیں۔ ایسا ہوتا ہے کہ دو لوگ اکثر ساتھ نہیں چل پاتے تو عزت سے الگ ہو جانا ہی بہتر ہے۔ اُس کا حق مہر اَدا کر دو۔ جو زیور اُس کو دے چکے ہو' واپس مت لو۔ عزت کے ساتھ معاملے کو نمٹا دو' بس اَب یہی بہتر ہے۔ یَاقَھَّارُ کا بہت وِرد کیا کرو۔ اللہ تم پر اپنا کرم ضرور فرمائے گا۔

□ نسرین۔ کراچی۔

☆ بیٹی نسرین! تمہارا مسئلہ قابلِ اشاعت نہیں۔ بہ کثرت توبہ استغفار پڑھو اور بہتر ہوگا' مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ کلامِ الٰہی کی موجودگی میں شیطان قریب نہیں آتا۔

□ محمد اکرام۔ گجرات۔

o باباجان! مجھے میرے ایک دوست نے آپ کا بتا دیا۔ آپ کے کہنے پر ایک خاتون نے اُس کی بہت مدد کی اور اَب وہ اپنا چھوٹا سا کاروبار کر رہا ہے۔ باباجان! کیا وہ خاتون میرے لیے کچھ نہیں کر سکتیں؟ میں بھی بہت پریشان ہوں' ایسا نہیں ہے کہ محنت نہیں کرتا' محنت بہت

کرتا ہوں مگر بابا جان! آپ جانتے ہیں کہ مہنگائی نے کمر توڑ دی ہے پھر حق دار کو حق بھی نہیں ملتا۔ انتہائی غریب گھر کا ہوں لہٰذا کہیں کوئی سنوائی نہیں۔ میری عمر اِس وقت 35 سال ہے۔ 3 بہنیں ہیں اور بوڑھی والدہ۔ مجھ سے بڑے بھائی کا پچھلے دنوں انتقال ہوگیا۔ میری ماں اس کے غم میں رو رو کر تقریباً اندھی ہوگئی۔ بابا جان! کوئی ایسا وظیفہ دیں کہ ہمارے حالات اِس قابل تو ہوں کہ پیٹ بھر کر کھا سکیں' تن ڈھانپ سکیں۔ اللہ آپ کو اِس کا اُجر دے گا۔

☆ بیٹے اکرام! اللہ تمہیں حوصلہ دے۔ بے شک دنیا میں بہت اچھے اچھے لوگ بھی ہیں اور انہی کے دَم سے دنیا چل بھی رہی ہے۔ میری وہ بیٹی بھی ہمیشہ سب کے کام آتی ہے۔ دُعا کرو کہ وہ خود خیریت سے ہو کیونکہ بہت عرصے سے میرا رابطہ بھی نہیں ہے۔ بیٹے......! بہنوں سے کہو بعد نمازِ فجر ایک بار سورۃ آلِ عمران ضرور پڑھیں۔ اللہ سے دُعا کریں' وہ ضرور غیب سے کوئی سبب پیدا کرے گا۔ مدت 41 دن ہے۔

□ نازیہ خٹک۔ کوئٹہ۔

☆ بیٹی نازیہ! تم مجھے براہِ راست خط لکھو۔ تمہارا مسئلہ قابلِ اشاعت نہیں۔ درست تو یہ ہوگا کہ اپنی والدہ سے بات کرو اور اُن کو سچائی سے آگاہ کردو۔ بہت سے مسائل سے بچ جاؤ گی۔

□ نصر اللہ خان۔ کوہاٹ۔

o بابا جی! میری بہن نے آپ سے تعویذ منگوایا تھا۔ اللہ کا احسان ہے' اُس کا مسئلہ حل ہوگیا مگر پچھلے مہینے سے اُس کے دونوں پاؤں اَکڑ گئے ہیں۔ اس کی شادی کی تاریخ قریب آرہی ہے مگر اِس پریشانی نے ہمیں بہت تنگ کیا ہے۔ بہن نے مجھے بتایا کہ پہلے تعویذ کے بعد دوسرا تعویذ بھی لینا ضروری تھا جو اُس نے نہیں لیا۔ کہیں یہ اُس کی وجہ سے تو نہیں؟ بابا جی! آپ مجھے تعویذ تیار کردیں' میں ہدیہ اِرسال کردوں گا۔

☆ بیٹے نصر اللہ......! ہر کام کا ایک خاص طریقہ ہے' میں ہر مسئلے میں دو تعویذ نہیں دیتا۔ جہاں ضرورت ہوتی ہے' وہاں دیتا ہوں۔ تمہاری بہن نے میری بات نہیں مانی۔ ظاہر ہے' جب علاج نامکمل ہوگا تو تکلیف پھر پلٹ آئے گی۔ انسان اپنا مقصد پانے کے بعد اللہ کا شکر اَدا کرنا ہی بھول جاتا ہے۔ بہن سے کہو اللہ سے معافی مانگے۔ بے شک وہ معاف کرنے والا ہے۔ تعویذ میں تیار کردوں گا۔

□ ریاض احمد۔ چارسدہ۔

o بابا جان! اللہ آپ کو لمبی عمر عطا فرمائے۔ میں بہت مشکل کا شکار ہوں۔ 6 ماہ قبل میری والدہ کا انتقال ہوگیا۔ والد صاحب نابینا ہیں۔ ہم دو ہی بہن بھائی ہیں۔ بہن شادی شدہ ہے اور وہ اسلام آباد میں رہتی ہے۔ میرے لیے بہت مشکل ہو رہی ہے کہ نوکری پر جاؤں یا والد صاحب کو سنبھالوں؟ وہ بھی کچھ ضدی طبیعت کے ہیں۔ گھر سے باہر نکل جاتے ہیں اور اِسی لیے اکثر گر پڑتے ہیں اور چوٹ لگ جاتی ہے۔ بابا جان! لوگ کہتے ہیں کہ مجھے شادی کرلینی چاہیے تاکہ گھر بار سنبھالنے والا کوئی تو ہو مگر میں ڈرتا ہوں کہ پتا نہیں آنے والی انہیں برداشت بھی کرے گی یا نہیں؟ بتائیے میں کیا کروں؟

☆ بیٹے ریاض! تمہارے گھر کو بے شک ایک ذمے دار عورت کی ضرورت ہے۔ اپنے جاننے والوں ہی میں سے کوئی سمجھدار اور ذمے دار لڑکی دیکھ کر شادی کرلو۔ یہ درست ہے کہ عورت ہی گھر کے معاملات کو سنبھال سکتی ہے۔ وہم دل میں مت لاؤ۔ ظاہر ہے' جو لڑکی بھی تمہارے گھر میں آئے گی' وہ باپ کی محبت اور حیثیت سے واقف ہوگی۔ اللہ سے دُعا کیا کرو کہ وہ تم پر رحم فرمائے۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ سباء ضرور پڑھو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ رانی بشریٰ۔ نوشہرہ۔

o بابا جی! میں نے رسالے میں پڑھا ہے کہ آپ اولاد کے لیے تعویذ دیتے ہیں۔ میری شادی کو بھی 4 سال ہوگئے ہیں۔ یہ میرے شوہر کی دوسری شادی ہے۔ پہلی بیوی سے بھی کوئی اولاد نہیں۔ بابا جی! میں بہت پریشان رہتی ہوں۔ میری چھوٹی بہن کی شادی مجھ سے دو سال بعد ہوئی ہے اور اس کے دو بچے ہیں۔ بابا جی! میں ہر وقت روتی رہتی ہوں۔ میری ساس مجھے دھمکیاں دیتی ہیں کہ اگر تمہارے ہاں بچہ نہ ہوا تو میں اپنے بیٹے کی تیسری شادی کروا دوں گی۔ پلیز بابا جی! میری مدد کریں۔

☆ بیٹی بشریٰ......! اللہ پر بھروسا رکھو اور سب سے پہلے تو مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے اور تمہارے شوہر نے اپنا میڈیکل چیک اپ کرالیا ہے' اس کی رپورٹ کیا ہے؟ تم مجھے اپنے مکمل کوائف ارسال کرو۔ میں تعویذ تیار کردوں گا۔ اپنے شوہر اور اس کی والدہ کا نام ضرور تحریر کرنا۔ رونے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہمت رکھو اور اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کردو۔ بہت خوش رہو گی۔

□ محمد حسن' سیالکوٹ۔

☆ بیٹے حسن! اللہ تمہیں کامیابی عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی کی عادت ڈالو۔ جب تمہیں احساس ہے کہ تم اپنی تعلیم پر مکمل توجہ نہیں دے رہے ہو تو بیٹا! شدید محنت کرو' باقی سارے معاملات زندگی کے ساتھ چلتے ہی رہتے ہیں مگر جو وقت تعلیم کے لیے ہے' اگر وہ گزر جائے تو بہت نقصان ہو جاتا ہے۔ تم نمازِ فجر کے بعد ننگے پاؤں گھاس پر چہل قدمی کرو اور بکثرت سُبحان اللّٰہ کا وِرد کرو۔ رات کو سونے سے قبل 6-5 بادام اور 4-3 دکنی سفید مرچ بھگو دو اور نہار منہ کھالو۔ خوب دل لگا کر پڑھو' ضرور کامیابی نصیب ہوگی۔ مدت 41 دن ہے۔

□ عصمت۔ راولپنڈی۔

o محترم بابا جی! السلامُ علیکم! میرا بیٹا جس کی عمر 5 سال ہے' اکثر بیمار رہتا ہے جس کی وجہ سے بہت کمزور ہوگیا ہے۔ آپ سے پوچھنا تھا' اگر نام کا مسئلہ ہے تو آپ دیکھ کر بتائیں۔ کوئی اور مسئلہ ہے تو بھی بتائیں؟ بیٹے کا نام دانیال ہے اور یہ نام دادی نے رکھا ہے۔

☆ بیٹی عصمت! اللہ تمہیں اولاد کی خوشیاں دکھائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹے کے لیے مجھ سے تعویذ منگوالو۔ بچوں کو اکثر نظر لگ جاتی ہے۔ نام درست ہے۔ حسبِ استطاعت صدقہ' خیرات ضرور دیا کرو۔

□ محمد فیصل' لاہور۔

☆ بیٹے فیصل! استخارہ حق میں ہے۔ بیٹی نسیم کو مطلع کردیا گیا ہے' وہ خود تم سے رابطہ کرے گی۔

□ رُقیہ۔ بہاولپور۔

o محترم بابا جی! السلام علیکم! بہت امید سے میں آپ کو یہ خط لکھ رہی ہوں۔ ہماری شادی کو 5 سال ہونے والے ہیں۔ شادی سے پہلے میرے شوہر کا اپنا کام تھا' بہت اچھے حالات تھے۔ شادی کو سال بھی نہیں گزرا' ہمارے حالات خراب ہونا شروع ہوگئے' سارا کام ختم ہوگیا۔ اب میرے شوہر کو کام نہیں ملتا اور اگر کہیں ملتا بھی ہے تو دو تین مہینے سے زیادہ نہیں رہتا۔ میرے شوہر اور میں ہر وقت بیمار رہتے ہیں۔ ہم کرائے کے مکان میں رہتے ہیں۔ اب مالک مکان نے مکان خالی کرنے کو کہا ہے' ہمارے پاس اتنے روپے نہیں ہوتے کہ مہنگا مکان لے لیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دُعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہماری مشکلوں کو آسان کردے۔ آپ اپنے علم کی روشنی میں پتا کیجیے کہ ہمارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ بہت سی جگہوں سے علاج کروایا لیکن کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔ آپ کچھ ایسا کیجیے کہ میرے شوہر کا کام اچھا ہوجائے اور اُن کی طبیعت ٹھیک ہوجائے۔ ہم آپ کے شکر گزار رہیں گے۔

☆ بیٹی رُقیہ......!

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا

اول و آخر دُرود شریف پھر مندرجہ بالا آیت 99 بار پڑھو۔ ہر نماز کے بعد اللہ سے مدد مانگتی رہو' ضرور کرم ہوگا۔ مدت 2 ماہ ہے۔

□ روحیلہ' فیصل آباد۔

o بابا صاحب! السلام علیکم! میرے شوہر کے روزگار کا مسئلہ ہے' بہت ہاتھ پاؤں مارنے پر دن میں 2 چار سو روپے کا کام ملتا ہے۔ بابا! سونے میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو وہ مٹی ہو رہا ہے۔ بابا صاحب! آپ صاحبِ علم ہیں' آپ ہمارا جائزہ لیں' ہم کہاں غلطی پر ہیں جو اللہ تعالیٰ ہم سے اتنے ناراض ہیں؟ بابا صاحب! ہمیں کیا صدقہ دینا چاہیے اور کب کرنا ہے؟ دُعا کریں کہ ہمارے حالات اچھے ہوجائیں۔

☆ بیٹی روحیلہ! اللہ تمہاری مشکلات حل فرمائے۔ زندگی میں نشیب و فراز آتے ہی رہتے ہیں' ان سے مت گھبرانا۔ نماز پابندی سے پڑھو اور عشاء کے بعد ایک بار

سورۃ واقعہ ضرور پڑھو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ بنٹی۔ کراچی۔

o باباجی! السلام علیکم! پہلی بار اپنے مسئلے کے حل کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔ امید ہے مایوس نہیں کریں گے اور مجھے بھی مسئلے کے حل کے لیے وظیفہ دیں گے۔ میری عمر بائیس برس ہے میں جس ماحول میں رہتی ہوں وہاں پر چھوٹی سی بات بھی بڑا مسئلہ ہوتی ہے۔ باباجی! میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے وظیفہ دیں۔ میری شادی کسی اچھی جگہ کسی اچھے خاندان کسی اچھے اور سلجھے ہوئے شریف شخص سے ہو جائے اور وہ رشتہ میرے لیے بابرکت ثابت ہو اور میرے حق میں بہتر ثابت ہو۔ امید ہے آپ مجھے کوئی پُراثر وظیفہ دیں گے اور میرا کام جلد سے جلد ہو جائے گا۔ میں آپ کو بہت دُعائیں دوں گی۔

☆ بنٹی!

رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاکْتُبْنَا مَعَ الشّٰھِدِیْن

نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 7-7 تسبیح پڑھو اول و آخر دُرود شریف پھر حاجت بیان کرو۔ خیال رہے دورانِ وظیفہ نماز قضا نہ ہو اور حسد، غیبت اور دروغ گوئی سے بچنا۔ اس وظیفے کی عام اجازت ہے۔ مدت 3 ماہ ہے۔

□ ا۔ع۔ لانڈھی۔

☆ عزیزم! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ نماز فجر کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین پڑھو اور دعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔

□ دعا۔ کراچی۔

☆ بٹی دعا! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ معاملات میں بالکل خاموشی رکھو۔ شوہر سے کوئی شکوہ مت کرو۔ اپنی ذمے داریاں پوری کرو اور بس۔ روزانہ جب چاول ابالو تو وہ پانی نتھارنے کی بجائے ایک برتن میں نکال لو اور دن میں کم از کم دو بار ایک ایک کپ یہ پانی پی لو۔ چلتے پھرتے یَاشَافِیُ بہت پڑھا کرو۔ مدت 3 ماہ ہے۔

□ سلمٰی۔ فیصل آباد۔

o پیارے باباجان! السلام علیکم! میرا بھائی جس کی عمر ابھی سترہ سال ہے وہ چھوٹا سا تھا جب سے وہ دکان پر کام کرنا شروع ہو گیا تھا۔ میرے ابو اس کو بہت مارتے تھے پھر وہ گھر سے بھاگ جاتا تھا۔ پہلے تو ہمارے ننھیال چلا جاتا تھا لیکن اب بھی کبھی کہیں تو کبھی کہیں چلا جاتا ہے اور اپنی عمر سے بڑے بڑے دوست بنائے ہوئے ہیں اور وہ اچھے بھی نہیں ہیں اور اس کو بھی برے کاموں پر لگاتے ہیں۔ باباجی! آپ کوئی ایسا وظیفہ بتایئے جس سے وہ اپنی دکان پر توجہ سے کام کرے اور برے دوستوں کی صحبت سے دور رہے اور ماں باپ کا فرماں بردار بیٹا بن جائے۔ باباجان! بہت پرامید ہو کر خط لکھ رہی ہوں اس کا جواب ضرور دیجیے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ڈھیروں خوشیاں عطا فرمائے۔ خدا تعالیٰ آپ کو اِس کا اجر عطا فرمائے۔

☆ بٹی سلمٰی! اللہ تمہارے بھائی کو عقل سمجھ عطا فرمائے۔ والدہ سے کہو فجر کے بعد سورۃ یٰسین پانی پر دم کر کے بیٹے کو پلائیں۔ مدت 2 ماہ ہے۔

□ سندس۔ کراچی۔

☆ بٹی سندس......! استخارہ تمہارے حق میں ہے۔

□ نائمہ۔ مقام نامعلوم۔

☆ بٹی......! اب جو حالات ہیں ان میں مناسب ہے مجھے براہِ راست خط لکھو جوابی لفافے کے ہمراہ تاکہ تعویذ کے بارے میں تفصیل بتا سکوں۔

□ الیاس۔ لاہور۔

☆ بیٹے الیاس! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ جب انسان کو اپنی غلطیوں کا احساس ہو جائے تو اس کو آئندہ زندگی میں بہت احتیاط کرنی چاہیے۔ کوئی انسان بھی مکمل نہیں کوئی نہ کوئی کمی سب میں ہوتی ہے مگر اس کمی پر قابو پانا ہی بہتر ہوتا ہے۔ تم سب سے پہلے نماز کی عادت ڈالو۔ ہر وقت باوضو رہو۔ صبح سویرے اٹھ کر ہلکی پھلکی ورزش کرو۔ اچھے دوست بنانا چاہتے ہو تو کتابوں سے دوستی کرو۔ انسان انسان کے کام ضرور آتا ہے مگر دوست وہ صرف اپنا ہوتا ہے۔ چلتے پھرتے توبہ استغفار پڑھا کرو۔ مدت 3 ماہ ہے۔

□ محمد اویس۔ نوشہرہ کینٹ۔

☆ بیٹے اویس......! اللہ تمہیں کامیابی عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ ہر نماز کے بعد 3 تسبیح یَامَالِکُ کی پڑھو اور دعا کرو۔ بیٹے! ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا مشکلات اور مسائل سے کبھی مت گھبرانا اور نہ ان سے فرار کی کوشش کرنا بلکہ ان کا ہمت سے سامنا کرنا ہی اصل کامیابی ہے۔ مدت 3 ماہ ہے۔

□ راحیلہ۔ حیدرآباد۔

o باباجی! مسئلہ یہ ہے کہ ہم تین لوگوں کی دور کی نظر کمزور ہے۔ میرا اور بھائی کا 4 نمبر اور کزن کا 5 نمبر ہے۔ باباجی! ہم لڑکیاں چشمہ لگا لیتی ہیں اور لینس بھی اور بھائی صرف چشمہ ہی لگاتے ہیں۔ چلیں ان پر تو اچھا بھی لگتا ہے لیکن ہم لڑکیاں ہیں چشمے آئے دن ٹوٹتے رہتے ہیں جس میں کافی پیسے لگ جاتے ہیں اور لینز بھی پریشان کرتے ہیں اور پھر باباجی! نظر مسلسل کمزور ہو رہی ہے جس سے ہم بہت پریشان ہیں۔ باباجی! ہم دونوں لڑکیاں ہر نماز کے بعد یَانُورُ پڑھ کر بھی دم کرتی ہیں اور کرتے ہوئے بھی ایک دو سال ہو گئے ہیں۔ باباجی! کوئی ایسا وظیفہ بتا دیں جس سے نظر بالکل ٹھیک ہو جائے۔ برائے مہربانی باباجی! مایوس نہ کیجیے گا اور باباجی! مجھے اپنی دعاؤں میں ہمیشہ یاد رکھا کریں۔

☆ بٹی راحیلہ! بینائی تیز کرنے کا بہت سہل طریقہ بتا رہا ہوں۔ گاجر کا عرق نکال کر اس میں سونف بھگو دو پھر مکمل رس جذب ہونے کے بعد کاغذ پر پھیلا کر خشک کر لو۔ خشک ہونے کے بعد پھر گاجر کے مزید عرق میں بھگو دو اور جذب ہونے پر خشک کر لو۔ اب ایک صاف بوتل لو اس میں یہ سونف، مصری اور ناریل ملا کر رکھ لو۔ دن میں 3 بار آدھا آدھا چائے کا چمچہ کھاؤ بسم اللہ پڑھ کر۔ بہت فائدہ ہوگا۔ یہ عمل کوئی بھی کر سکتا ہے۔

□ اریج۔ اسلام آباد۔

☆ بٹی اریج! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے اور تمہیں مکمل شفا عطا فرمائے۔ اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی کوشش کرو۔ خالی دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے۔ نماز پابندی سے ادا کیا کرو۔ روزانہ رات کو بعد نماز عشاء ایک بار سورۃ جن ضرور پڑھو اور اپنے اوپر دم کرو۔ رات کو سونے سے قبل ایک گلاس گرم دودھ ضرور پیا کرو افاقہ ہوگا۔ مدت 41 دن ہے۔

□ آسیہ۔ نواب شاہ۔

o محترم باباجی! سدا خوش رہیں! السلام علیکم! باباجی! میں نے پہلے آپ کو خط لکھا تھا کہ مجھے ایک نجومی نے کہا تھا کہ تمہارے شوہر تمہیں چھوڑ دیں گے اور دوسری شادی کر لیں گے حالانکہ میرے شوہر بے حد پیار کرنے والے اور بہت اچھے ہیں۔ باباجی! ویسے تو میرے دل کو یقین ہے کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا لیکن کبھی کبھی پھر بے سکونی ہو جاتی ہے اور دل بہت پریشان ہو جاتا ہے۔ باباجی! آپ میرے لیے خصوصی دعا فرمائیں کہ میری ازدواجی زندگی بے حد خوشگوار، آرام دہ اور پرسکون گزرے اور اس میں کسی قسم کا کوئی کرائسس نہ آئے اور کوئی مختصر سا وظیفہ بھی دیں اور رزق میں برکت کے لیے بھی کوئی وظیفہ دیں۔

☆ بٹی آسیہ! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ بے فکر رہو۔ نماز بہت پڑھا کرو۔ صدقہ خیرات کرو۔ رزق میں برکت کے لیے سورۃ واقعہ ضرور پڑھو۔ مدت 41 روز ہے۔

□ فوزیہ۔ حیدرآباد۔

☆ بٹی......! میں تمہیں یہی نصیحت کروں گا کہ اس سے پہلے کہ تمہاری بہن ڈپریشن کا شکار ہو مجھ سے اس کے لیے تعویذ منگوا لو۔ اس طرح کے مسائل انسان کو زندگی سے بھی دور لے جاتے ہیں۔

□ سعدیہ۔ ٹنڈو جام۔

☆ بٹی! اللہ تمہیں ڈھیروں خوشیاں عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ بٹی! میں نے بارہا یہ بتایا کہ ڈاک کے نظام میں گڑبڑ کی وجہ سے خط اِدھر اُدھر ہو جاتے ہیں۔ جو خطوط مجھ تک پہنچتے ہیں ان کے جواب میں ضرور دیتا ہوں۔ تمہارے لیے میں نے خصوصی دعا کی تھی۔ وظیفہ نہیں دوں گا۔ ابھی مزید کچھ عرصے تک تم صرف نماز کی پابندی رکھو۔ ہر وقت باوضو رہو اور بکثرت یَاحَفِیظُ کا ورد کیا کرو۔ اللہ تعالیٰ سب خیر کرے گا۔ مدت ایک ماہ ہے۔

☆......☆



رات، سردی، چاند اور وہ......؟

سردی میں کپکپاتا مجھے دیکھتا رہا
وقتِ وداع جیسے وہ کچھ سوچتا رہا
دِل جل رہا تھا اُس کا مگر آنکھ نم بھی تھی
ہونٹوں پہ لفظ ناچتے تھے، بات کم بھی تھی
وہ چاہتا تھا روک لے، جانے نہ دے مجھے
کرسی سے اپنا پرس اُٹھانے نہ دے مجھے
سردی میں یوں کھڑا مجھے اچھا بہت لگا
اپنی نظر سے میرا بدن تولتا رہا
مجھ سے زمین تو کیا کہ فلک بولتا رہا
کون و مکاں کے بندِ قبا کھولتا رہا
گھر آ کے سوچتی رہی، کتنا عجیب تھا!!
میں سو رہی تھی تنہا مگر وہ قریب تھا!!

بشریٰ رحمن

عبوری وصال

ایک نقطۂ اتصال نے
ہمیں ایک دوسرے سے گزار دیا ہے
تم مجھ میں ہو کر نکل گئے ہو
اور
میں تم میں ہو کر
دونوں ہجر کی دھوپ میں جھلتے رہتے
برف کی آگ میں پگھلتے رہتے
تو کتنا اچھا تھا

سائرہ غلام نبی

ایک قطعہ

وہی لہریں پلٹ آتی ہیں، کنکر لوٹ آتے ہیں
وہی پتھر سمیٹے شام کو گھر لوٹ آتے ہیں
بس اِک آواز ہے، کھینچے لیے جاتی ہے جو دل کو
بس اِک دیوار ہے، ہم جس کو چھو کر لوٹ آتے ہیں

سلیم فاروقی

غزل

تیری چاہتوں کا مجھ کو اگر اعتبار ہوتا
میری زندگی کا حاصل تیرا انتظار ہوتا
تیرے لوٹ کے آنے کی امید تب میں رکھتی
تیرے دل کی دھڑکنوں میں جو میرا پیار ہوتا
تو بھنورہ صفت پنچھی تھا کلی کلی پہ شیدا
تو کاش صرف میرے ہی دل کا قرار ہوتا
یہ محبتوں کی بازی میں کب کی جیت لیتی
میرے گلے میں تیری جو وفا کا ہار ہوتا
میں نے تو جان و دل سے چاہا تھا صرف تم کو
تو بھی تو اس طرح سے میرا طلب گار ہوتا
میری وفا کو لوٹا دل توڑا اپنی راہ لی
تیرا یقیں دوبارہ کیسے جانِ بہار ہوتا

رضوانہ کوثر

ایک نظم

کتاب شیلف میں رہے یا ہاتھوں میں
اپنی عمر سے زیادہ تو نہیں جی پاتی
نیند اس وصال کو بستر تلک محدود کیا کرنا
کیوں ناں نیند اس وصال کو
شیلف میں سجا کر
کتاب کو بستر تلک لے آیا جائے
اک دوسرے کو رٹا جائے
اور حفظ کر لیا جائے

سعدیہ بلوچ

نظم (تم بن)

تُو جو نہیں ہے تو
آج بھی
آنکھوں میں ویرانی ہے
کہ ہر سُو گھور اندھیرا ہے
ہونٹوں پہ خاک جمی ہے
غم کی چادر اوڑھ رکھی ہے
دل بھی درد سے بوجھل ہے
تنہائی کی دھوپ میں دیکھو
یادوں کی جو برف جمی تھی
لمحہ لمحہ پگھل رہی ہے
دل کی بستی ننگل رہی ہے
جگنو بن کے خواب ادھورے
میری پلکوں کے سائے میں
آن کھڑے ہیں
کتنے ارمانوں کے لاشے
بے گور و بے کفن پڑے ہیں

حمشیلہ لطیف

غزل

لے جائے نہ سب کچھ کہیں سیلاب بہا کر
طوفانِ بلاخیز میں تُو رب سے دعا کر
پل میں ہوئے مسمار وہ دیوار کی صورت
رکھے تھے کئی خواب جو آنکھوں میں سجا کر
وہ لوٹ کے آتے ہوئے رستہ نہیں بھولے
رکھتا ہوں سرِ طاق چراغوں کو جلا کر
حسرت ہے سجاؤں تو تمہیں ہاتھوں سے میں اپنے
دیکھوں گا کسی روز دلہن تم کو بنا کر
اُس شخص سے نے تو وفا کی بھی نہیں تھی
رکھتا ہے مجھے آج بھی پلکوں پہ بٹھا کر
اس دردِ محبت کو جدا خود سے کروں کیوں
پالا ہے اِسے خونِ جگر اپنا پلا کر
بن کر بھی دلہن غیر کی تکتی رہی مجھ کو
پلکوں کو گرا کر، کبھی پلکوں کو اٹھا کر
اُس شخص کی آنکھوں میں محبت نہیں دیکھی
پایا ہے جسے اپنا سبھی کچھ ہی لٹا کر
پیچھا نہیں چھوڑا ہے ہوائے شبِ غم نے
”دیکھا ہے کئی بار چراغوں کو بجھا کر“
آنسوں کی طرح سوزؔ رکھا ہے مجھے ساتھ
نظروں میں بسا کر کبھی نظروں سے گرا کر

محمد سلیم سوز

ایک قطعہ

جس شخص کا کردار منور نہیں دیکھا
اس شخص میں اخلاص کا جوہر نہیں دیکھا
کیا اس سے کسی بات کی ہم کرتے گزارش
اک بار بھی جس نے مجھے ہنس کر نہیں دیکھا

عامر ثانی

ممی

ڈاکٹر سید ارسلان

بے حس رشتوں نے اُسے ایک نئے
رشتے سے تعلق جوڑنے پر مجبور کر دیا تھا

سردی سے اس کے دانت بری طرح بج رہے تھے، یہ کہنا سراسر غلط ہوگا کہ اس کی بتیسی بج رہی تھی۔ اس کے دہانے میں پورے بتیس دانت تھے ہی کب، اور ہوتے بھی کیوں؟ بتیسی تو جوانی میں مکمل ہوتی ہے اور اس کی جوانی ابھی کافی مسافت پر تھی۔ آٹھ برس کی عمر میں مسوڑھے جتنے بھی دانت رکھتے ہیں اس وقت وہ سب کے سب کٹکٹا رہے تھے، یخ ہواؤں کا مقابلہ کرتے کرتے ناک اور آنکھیں مسلسل پانی بہا رہی تھیں۔ پیٹ میں الگ بھوک کی شدت سے دھن ہو رہی تھی، سوکھی آنتوں میں گرہیں پڑ رہی تھیں۔ سڑکوں پر لوگوں کی پھینکی ہوئی اشیا بکثرت مل جاتی ہیں جن سے شکم پری کی جا سکے لیکن یہ اس کی بدنصیبی کہ مسلسل برسنے والی موسلا دھار بارش نے کیچڑ اور غلاظت کے علاوہ سڑکوں پر کچھ باقی نہ چھوڑا تھا۔ سردی، بھوک اور اوپر سے بارش، اس کا نحیف و ناتواں بدن اتنی بلاؤں کا مقابلہ کرنے کی سکت کہاں رکھتا تھا مگر مجبوری تھی، کوئی ایسا ٹھکانہ ڈھونڈنے کی سعئی پیہم نے اس کی ٹانگوں کو تقریباً معذور کر دیا تھا جو اس کے ننھے سے جسم کا بارش سے بچاؤ کرنے کے ساتھ ساتھ سرد ہواؤں کا پہرے دار بن سکے، جو اسے ٹھنڈے ٹھنڈے کچوکے لگا رہی تھیں۔ وہ نیم جاں ہوتا چلا جا رہا تھا۔ پتا نہیں کتنے میل کا سفر اس نے طے کر لیا تھا، کتنی سڑکوں کی پیمائش کر ڈالی تھی محض ایک سائبان کی تلاش میں۔

اس نے دونوں ہاتھ اپنی بغلوں میں دے دیے اور انہیں حرارت پہنچانے کی کوشش کرنے لگا۔ ناکام ہو کر اس نے ہاتھ کھینچ لیے اور زور زور سے رگڑ کر گرم کرنے چاہے مگر اب ہاتھوں میں زور ہی کہاں رہ گیا تھا۔ پیٹ خالی ہو اور ہاتھوں میں زور ہو، یہ کیسے ممکن ہے؟ بے بسی کا شدت سے حملہ ہوا، ایسے موقع پر آنسو نکل آتے ہیں مگر اس کے آنسو تو پہلے ہی خشک ہو چکے تھے، کہاں سے نکلتے؟ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، جھک کر فٹ پاتھ کا جائزہ لیا کہ شاید کوئی سوکھا ٹکڑا، سڑا ہوا پھل اس کے مقدر کا مل جائے۔ آخر مایوس ہو کر سیدھا کھڑا ہو گیا، بارش سب کچھ ہڑپ کر چکی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں بارش کو گالی دی اور اپنے آپ کو سمیٹ کر اکڑوں بیٹھ گیا کہ شاید سردی سے بچاؤ ہو سکے۔

فٹ پاتھ کے نزدیک ہی ایک کار آ کے رکی۔ کار کا مالک نیچے اترا اور ایک بڑا سا کپڑا تان کر خود کو بارش سے بچاتا ہوا اپنے گھر کی طرف چلا۔ اس نے سوچا، کار والے سے یہ کپڑا چھین کر بھاگ جائے اور اس بڑے کپڑے میں خود کو اچھی طرح لپیٹ کر سردی کا منہ چڑائے۔ وہ اٹھا مگر سردی اور کمزوری نے اس کی چستی اور پھرتی چھین لی تھی۔ جب تک دبے قدموں سے وہ کار کے قریب پہنچا، کار والا اندر مکان میں داخل ہو چکا تھا۔ اس نے نامرادی سے گردن جھٹکی اور کار سے ٹیک لگا لی، اچانک مسرت سے اس کی چیخ نکل گئی۔ کار کا انجن گرم تھا، وہ بونٹ پر لیٹ گیا۔ سردی سے کسی حد تک نجات مل گئی تھی۔ ایک مشکل آسان ہوئی تو دوسرے مسئلے نے سر اٹھایا۔ بھوک سے پیٹ میں بل پڑے جا رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے پیٹ میں تیز ہری مرچیں بھر دی تھیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کار والا جس گھر میں گیا تھا اس کی کھڑکیوں سے روشنی نظر آ رہی تھی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے دروازے پر پہنچ کر اطلاعی گھنٹی بجا دی۔

"کون ہے بھئی؟" کسی نے دروازہ کھولے بغیر دور سے پوچھا۔ ایسے ظالم موسم میں باہر نکلنے سے مالکِ مکان گریزاں تھا۔

"میرا نام سلو ہے۔" اس نے باہر کھڑے کھڑے پوری طاقت سے چیخ کر اپنا نام بتایا۔

"کون سلو؟" اندر سے آنے والی آواز میں اجنبیت تھی پھر اس نے دریافت کیا۔ "کیا کام ہے، کیوں آئے ہو؟"

"کام کوئی بھی نہیں ہے، مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔ صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ مجھے سردی بھی بہت لگ رہی ہے۔"

"دفع ہو جاؤ......" اندر سے ابھرنے والی آواز میں تجسس کی جگہ غصے نے لے لی تھی۔ "یہ کوئی وقت ہے بھیک مانگنے کا؟ خبردار جو اب گھنٹی بجائی۔ چلو بھاگو یہاں سے۔" اس کے



بعد اندر سے بڑبڑانے کی آواز آئی جسے سلو سن تو سکا لیکن سمجھنے سے قاصر رہا۔

وہ نامراد واپس آیا اور کار کے بونٹ پر لیٹ گیا مگر اسے فوراً ہی اچھل کر کھڑا ہونا پڑا۔ اتنی دیر میں کار کا بونٹ برف کی سل بن چکا تھا۔ اُس نے حسرت سے مکان کی روشن کھڑکیوں کو دیکھا اور پھر چل پڑا۔

☆......☆......☆

اس کے لیے یہ ساری کٹھنائیاں نئی ضرور تھیں مگر خلافِ توقع نہیں تھیں۔ جن دگرگوں حالات میں اس نے اپنی زندگی کے آٹھ سال گزارے تھے، وہ ایسے ہی

تھے کہ ان سے گزرنے کے بعد موسم اور زمانے کا یہ ظلم و جور اس کے لیے تکلیف دہ تو تھا لیکن حیرت کا باعث نہیں تھا۔ وہ مظلوم کا مظلوم ہی تھا' ظلم کرنے والے بدل گئے تھے۔ اس وقت موسم قہرمان تھا تو اس سے پیشتر تائی اذیت کے نت نئے طریقے آزما چکی تھی۔

کچھ لوگ بدبختی کے کفن میں لپٹ کر مرتے ہیں۔ سلو سیاہ بختی کے پوتڑوں میں پیدا ہوا تھا۔ اسے جنم دینے کے دوران ہی ماں نے رختِ سفر باندھ لیا تھا اور جنم دے کر دنیا سے رخصتی پائی تھی۔ بیٹے کو ایک نظر دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ آج کل کے جدید اور سائنسی دور میں بھی سلو کو دائی کے ہاتھوں دنیا میں آنا پڑا تھا کیونکہ اس کے باپ نے جو کچھ کمایا تھا' چرس کے دھوئیں میں جلا کر اڑا دیا تھا چنانچہ سلو کی پیدائش کے وقت دائی کو دینے کے لیے بھی پیسے نہیں تھے' ادھار کرنا پڑا تھا۔ رقم نہ تھی، لہٰذا آخر وقت میں دائی کے جواب دینے کے باوجود شرافت اپنی بیوی کو اسپتال نہ لے جا سکا' کیسے لے کر جاتا' وہ غریب پیدل نہیں چل سکتی تھی اور ٹیکسی کا کرایہ شرافت کی جیب میں نہ تھا۔ مفلسی کی پیداوار تھا چنانچہ سلو نے بھوک سے بلک کر اپنی ماں کو کھا لیا اور کیا کرتا؟

یہ سارے طعنے تشنے اس کی تائی اٹھتے بیٹھتے اسے دیتی تھی۔ سلو چپ چاپ سننے پر مجبور تھا۔ پٹائی ہوتی تھی تو خاموشی سے پٹتا رہتا تھا' گالیاں پڑتی تھیں تو برداشت کرتا تھا' روٹی کی خاطر سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے اور روٹی تائی دیتی تھی۔ اس کا باپ شرافت' سلو کو تائی کے پاس چھوڑ کر بے فکر ہو گیا تھا۔ اب اس پر ایک چرس کی ذمے داری تھی جسے وہ بخیر و خوبی پورا کر رہا تھا۔ کبھی کبھار وہ گھر آتا تو سلو "ابا! ابا!" کر کے اس سے لپٹتا مگر جس دل پر چرس کے دھوئیں کی دبیز تہیں چڑھ چکی ہوں، وہاں سے امنگیں کیا خاک پھوٹتیں۔

تائی شرافت کے سامنے بھی بلاتکلف سلو کو دھن دیتی۔ شروع شروع میں سلو نے بلبلا کر اپنے باپ کو دیکھا، آنکھوں ہی آنکھوں میں مدد کی درخواست کی لیکن شرافت اپنی جگہ سے نہیں اٹھا، کس برتے پر اٹھتا، کس گھمنڈ میں تائی کا ہاتھ روکتا۔ بزدلی اور بے بسی سے اٹھ کر گھر سے نکل جاتا۔ اس کے بعد سلو نے شرافت سے لپٹنا چھوڑ دیا تھا، اس سے آنکھوں ہی آنکھوں میں مدد کی درخواست بھی کرنا چھوڑ دیا تھا۔

تایا تائی کے گھر پہلے ہی بچوں کی بہتات تھی، سال پورا نہیں ہوتا تھا کہ گھر کی آبادی میں ایک فرد کا اضافہ ہو جاتا۔ تائی کو اپنے گیارہ اتنے نہیں کھلتے تھے جتنا ایک اکیلا سلو...... اور ٹھیک بھی تھا، اپنے کیوں بار محسوس ہوں، پرایا کیوں نہ کھلے جو خوامخواہ، بلامعاوضہ تائی کے سر منڈھ دیا گیا تھا۔ غربت اور بچوں کی فوج نے پہلے ہی تائی کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ سلو نے اور جلتی پر تیل کا کام کیا مگر تائی کی ذات کا سارا لاوا سلو ہی کے لیے مختص تھا۔ جوں جوں بچے بڑے ہو رہے تھے' ضروریات بڑھ رہی تھیں، تائی کو سلو کا بوجھ زیادہ لگنے لگا تھا۔ شرافت کبھی آتا، کبھی نہیں آتا اور آتا بھی تو کیا، خالی ہاتھ آنا بھی کوئی آنا ہوتا ہے۔

سلو کا جی چاہتا کہ وہ بھی تائی کے بچوں کی طرح ممی کہے۔ اسے یہ لفظ بہت اچھا لگتا تھا۔ ایک روز اس نے تائی کو ممی کہا تو تائی نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔

"خبردار، جو تُو نے مجھے ممی کہا۔ تیری ممی کو تو تیرے باپ کی کاہلی نے کھا لیا' اب تُو مجھے کھا رہا ہے۔" پھر مختلف اقساط میں ماں کے مرنے کی داستان سیاق و سباق کے ساتھ تائی نے اسے مختلف مواقع پر سنائی۔ یہ مواقع اس کی پٹائی کے ہوتے تھے۔

"تیری ماں بھی بدقسمت تھی' تجھے دودھ پلائے بغیر ہی مر گئی۔" تائی نے ایک بار اپنے نومولود کو دودھ پلاتے ہوئے کہا۔ "تُو بھی کیسا ناشدنی ہے۔ چل دور ہٹ یہاں سے، کیا گھور گھور کے میرے بچے کو نظر لگا رہا ہے۔ تیرا تو کنبہ ہی بدنصیبوں کا ہے، باپ دنیا سے نرالا، اولاد رلتی پھر رہی ہے، اُسے اپنے نشے سے فرصت نہیں، بیوی کو بھی چرس کی بھینٹ چڑھا گیا اسے عقل نہ آئی اور تجھے یہاں ڈال دیا۔ ہمارے نصیب پہلے ہی پھوٹے ہوئے ہیں تُو اور انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر رہا ہے۔ سال ہوتا نہیں کہ گود بھر جاتی ہے، آمدنی وہی کی وہی۔" اس کے بعد تائی سلو کو کوسنے لگی اور سلو وہاں سے ہٹ گیا۔

آج تایا کی پوری تنخواہ کوئی جیب کترا لے اڑا تھا۔ تائی پہلے تو حواس باختہ رہ گئی پھر رفتہ رفتہ حواس قابو میں آئے تو غصہ بھی شباب پر آ گیا اور یہ شباب سلو پر پھٹا، جیب کترا دستیاب نہ تھا، اس کے حصے کے کوسنے سلو کو سننے پڑے اور اس کے بعد تو اسے معمولی بات پر گھر سے نکال دیا گیا اور تائی نے کہہ دیا کہ اب اگر اسے سلو کی شکل نظر آئی تو وہ سلو کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔ پٹ ٹٹ کر سلو گھر سے نکل پڑا اور اب کسی چھپر کی تلاش میں واہی تباہی پھر رہا تھا۔ ستر لاکھ کی آبادی کے شہر میں آٹھ سالہ سلو کے لیے کوئی سائبان نہ تھا۔

ناک کی پھننگ سُن ہو چکی تھی۔ اس نے ہونٹوں کی چونچ بنا کر اس کا رُخ ناک کی طرف کیا اور زور سے پھونک ماری لیکن سردی اس کے رگ و پے میں اچھی طرح حلول کر گئی تھی اس لیے بھاپ بھی ٹھنڈی نکلی۔ ہاتھ الگ برف کے ٹکڑے معلوم ہو رہے تھے، دونوں ہتھیلیاں اس نے آپس میں اتنی رگڑیں کہ سوزش ہونے لگی۔ سردی پر کوئی پیش نہ گئی تو اس نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بند کر کے ان میں زور زور سے پھونکیں مارنے کا سلسلہ شروع کر دیا مگر لاحاصل، پھونکوں میں ذرا بھی حدت نہیں تھی۔ اس کے پاس اور کوئی چارہ کار نہیں رہا تھا سوائے اس کے کہ وہ دوڑنا شروع کر دے۔ وہ بھاگنے لگا' لڑکھڑاتی کمزور ٹانگیں اس کے عزم کا ساتھ دینے سے قاصر تھیں لیکن اُسے بھاگنا تھا' سردی سے بچاؤ کی خاطر، اپنی بقا کے واسطے، وہ دوڑتا رہا۔

اچانک وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا مکان تھا، مکان کیا، کھنڈر تھا، ایسے شکستہ در و دیوار میں کوئی انسان نہیں رہ سکتا تھا' بھوت پریت ہی بسیرا کر سکتے تھے اور سلو کی دشمنی بھوت پریت سے نہیں' انسان سے تھی جو اس کی ننھی سی جان لینے کے درپے تھا۔

سب سے پہلے اُس نے چھت کو دیکھا' فی الحال سب سے زیادہ اہمیت چھت کی تھی جو بارش کے چھوٹے چھوٹے بموں سے نجات دلا سکے۔ چھت موجود تھی گو کہ اس کا دو تہائی حصہ ٹوٹ پھوٹ کر جھڑ چکا تھا پھر بھی بقایا ایک تہائی اتنا تھا کہ سلو کا سائبان بن سکتا تھا۔ گری پڑی دیواروں، برائے نام چھت اور ملبے کا ڈھیر، یہ ایک کمرے کا مکان سلو کو کسی شاہ کے قصر سے زیادہ پُرشکوہ لگا۔

وہ تیزی سے اندر داخل ہوا، بدبو کے ناگوار بھبکوں نے اس کا پُرجوش استقبال کیا۔ اُس نے ناک سکیڑی مگر یہ وقت نخرے دکھانے کا نہیں تھا، جان بچانے کا تھا، لہٰذا ماتھے پر ابھر آنے والی سلوٹیں فوراً لاپتا ہو گئیں۔ وہ آگے بڑھا اور چھت کے بچے کھچے حصے کے نیچے آ گیا لیکن بے بسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو اور غصے سے پھلجھڑیاں بھی چھوٹنے لگیں۔ یہاں ایک گیم گائے براجمان تھی۔ سوراخوں سے پُر کھنڈر نما مکان کی دیوار سے برابر والے مکان کی روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔ وہ اپنی پناہ گاہ کو اس روشنی میں بخوبی دیکھ سکتا تھا۔

"ہش......" سلو نے گائے کو ہشکارا۔ آج کل کے تو انسان، انسان کی مجبور زبان نہیں سمجھتے، وہ تو جانور تھی۔

"ہش، ہش، ہش......" سلو نے پوری کوشش کی کہ گائے اس کا مدعا سمجھ جائے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی بیٹھی رہی، ناگفتہ بہ حالات اور بے درد ماحول میں کون کسی کی مجبوری سمجھتا ہے۔ سلو کو غصہ آ گیا۔ اس نے پوری قوت سے ایک زوردار لات گائے کے پہلو میں رسید کر دی۔ گائے اٹھ کھڑی ہوئی اور سلو کو گھورنے لگی' گائے کی آنکھوں میں بہت سے پیغام تھے۔ سلو نے غور سے اس کی طبیعت جانچنے کی کوشش کی مگر گائے کا انداز جارحانہ نہ تھا۔ وہ ایک ٹک سلو کو دیکھے جا رہی تھی۔ پتا نہیں، اس کی آنکھوں میں کیا تھا، سلو کھڑے کھڑے موم کی طرح پگھلنے لگا۔ گائے آہستہ آہستہ اپنی دم لہرا رہی تھی اور اس کی نگاہوں کا محور مستقل سلو تھا۔ سلو کا دل دُکھنے لگا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ گائے سے مخاطب ہوا۔ "انسانوں کے اس چڑیا گھر میں میرے لیے کوئی پنجرہ خالی نہیں ہے تو تمہیں کون جگہ دے گا؟" یکایک بھوک سے اس کے پیٹ میں ٹیس اٹھی۔ خالی پیٹ کی چبھن چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ مسکن مل گیا مگر روٹی ناپید تھی اور نصیب ہونے کا کوئی امکان بھی نہ تھا۔ اس نے بنظرِ غائر گائے کا جائزہ لیا اور اس کی ساری پریشانی دور ہو گئی، وہ مطمئن ہو گیا۔ گائے نے بھی اس کی طمانیت کا اندازہ لگا لیا تھا، اس کی دُم زور زور سے ہلنے لگی۔ سلو نے محبت سے گائے کی کمر پر ہاتھ پھیرا۔

''اس وقت تم نے مجھے بڑا سہارا دیا ہے، جگہ کم ہے پھر بھی ہم دونوں گزارہ کر سکتے ہیں۔'' اس نے گائے کے منہ سے منہ ملا کر کہا۔ گائے اپنی لیس دار زبان نکال کر سلو کی گردن چاٹنے لگی جیسے اپنی رضامندی کا اظہار کر رہی ہو۔

''سر چھپانے کی جگہ تم نے مجھے مہیا کی ہے، بھوک کا مسئلہ بھی تمہی کو حل کرنا پڑے گا۔'' سلو نے گائے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو گائے اسے اور شدت سے چاٹنے لگی۔ اب اس کی دُم اور تیزی سے بل کھا رہی تھی۔

''تمہارا بہت بہت شکریہ۔'' سلو نے گائے کی تھوتھنی چوم کر خوشی سے کہا اور گائے کے نیچے کمر کے بل لیٹ کر اپنی بھوک مٹانے لگا۔

پیٹ بھرنے کے بعد جب وہ کھڑا ہوا تو آسودگی نے اس کے انگ انگ میں مسرت کے جال پھیلا دیے تھے۔ وہ بری طرح گائے کو پیار کر رہا تھا، اس کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو بہہ رہے تھے۔ ''مجھے معاف کر دو مہربان ماں! مجھ سے غلطی ہو گئی ہے ممی۔'' وہ گائے کا وہ پہلو سہلاتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا جہاں کچھ دیر پہلے اس نے لات ماری تھی۔ گائے پہلے تو اس کی دیوانگی پر حیرت سے اسے تکتی رہی پھر اس نے اپنے بیٹے کو معاف کر دیا۔ جابجا پھیلے ہوئے گوبر کے ڈھیر سلو کے آرام میں مزاحم نہیں ہوئے۔ وہ ان بدبوؤں سے بے بہرہ گائے سے لپٹ کر لیٹ گیا۔ اس کے بازو گائے کے چوڑے چکلے بدن کے گرد حمائل تھے اور اس کا چہرہ گائے کے پیٹ سے مس ہو رہا تھا۔

مائیں اپنی اولاد کے سارے دکھ دور کر دیتی ہیں۔ سلو کی ممی نے بھی اس کی تمام مشکلات دور کر دی تھیں۔ گائے کی آغوش میں جب وہ سویا تو سردی کا احساس فنا ہو چکا تھا۔ آٹھ سال کی ساری کلفتیں دور ہو گئی تھیں۔ نئے سلو نے جنم لیا تھا جس کی ماں ایک گائے تھی۔ ماں وہی تو نہیں ہوتی جس کے پیٹ سے جنم لیا جائے۔ اسے بھی تو ماں کہتے ہیں جو مہربان بادل کی طرح اولاد کی سوکھی کھیتیوں پر برس جائے، سارا غبار، سارے رنج دھو ڈالے' کونپلوں کے پھوٹنے میں معاون و مددگار ہو۔ سلو بھی نئی کونپل بن کر پھوٹ رہا تھا جس کی جڑیں ایک گائے کے وجود میں تھیں۔

دن اگرچہ جوہڑ کے گندے پانی کی طرح ٹھہر گیا تھا مگر رات خوشگوار جھونکا بن کر سبک رفتاری سے گزر گئی۔ سلو کی آنکھ گائے کے کسمسانے اور ڈکرانے کی آواز سن کر کھلی۔ دن نکل آیا تھا، اس نے کسل مندی سے اپنے پپوٹے کھولے۔ وہ گائے سے پیوستہ پڑا تھا اور گائے اٹھنا چاہ رہی تھی۔ وہ جمائیاں لیتا ہوا بیدار ہو گیا۔

سلو کو ہٹتے ہی گائے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ شاید سلو کے جاگنے کی منتظر تھی۔ سلو بے ساختہ گائے سے لپٹ گیا۔ ''تم نہ ہوتیں تو میں مر جاتا۔ بھوک سے نہ مرتا تو سردی مار دیتی۔'' وہ گائے کو احسان مندی سے دیکھ رہا تھا۔ گائے نے آواز نکالی۔ سلو تڑپ کر رہ گیا۔ کاش، وہ گائے کی زبان سمجھ سکتا، پتا نہیں، وہ کیا کہہ رہی ہے؟ اس نے گائے کی گردن میں اپنی بانہوں کا ہار ڈال دیا۔

''تم کیسی ممی ہو؟ مجھے اپنی زبان نہیں سمجھا سکتیں؟ خبر نہیں' تم کیا کہہ رہی ہو؟ میری زبان نہیں بول سکتیں تو مجھے اپنی زبان سکھا دو؟'' جواب میں گائے کچھ نہ بولی بلکہ اس نے چاروں طرف اپنا سر گھما دیا۔ سلو نے الگ ہو کر ایک انگڑائی لی۔ گائے نے دیوار کے نقب زدہ حصے کی طرف پیش قدمی کی، وہ باہر نکل رہی تھی۔

''ارے! کہاں چلیں؟'' سلو نے لپک کر راستہ روک لیا۔ گائے اسے حیران ہو کر دیکھ رہی تھی پھر وہ سب کچھ سمجھ گئی اور ٹوٹی ہوئی دیوار کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔

''اپنے بیٹے کو بھوکا چھوڑ جاؤ گی ممی؟'' سلو نے شکایتی لہجے میں کہا۔ گائے کو باہر نکلتا دیکھ کر اس کے پیٹ میں نعرے بلند ہونا شروع ہو گئے تھے لیکن گائے، سلو کی تنبیہ سے قبل ہی دیوار کے سائے میں جا کھڑی ہوئی تھی جیسے مائیں' بچے کو دودھ پلاتے وقت دنیا سے چھپاتی ہیں اور آڑے لگتی ہیں کہ کہیں نظر نہ لگ جائے۔

سلو ناشتا کر کے زمین سے اٹھا اور ڈکار لیتا ہوا بولا۔ ''مجھے پتا ہے ممی' اب تم اپنا پیٹ بھرنے جاؤ گی۔ سڑکوں سڑکوں پھرو گی اور کوڑا کرکٹ چرو گی۔ جاؤ' خدا حافظ! اللہ تمہیں کسی قصائی کی نظر بد سے محفوظ رکھے۔'' گائے آہستہ آہستہ باہر نکل گئی جیسے سلو کی دعا پر آمین کہہ رہی ہو۔

ممی کے جانے کے بعد سلو نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ گوبر کے ڈھیر دیکھ کر اسے کچھ اچھا نہیں لگا۔ رات اسی گندگی پر اسے پُرسکون نیند آئی تھی، اب یہی غلاظت بری لگ رہی تھی۔ وقت وقت کی بات ہے۔ بے یار و مددگار تھا تو تعفن کا ڈھیر بھی عطریات کا کارخانہ لگ رہا تھا اور اب وہ ایک ممی کا بیٹا ہو گیا تھا۔ خالی پیٹ میں دودھ پڑ گیا تھا اور سر پر چھت میسر آ گئی تھی تو ناگواری کے تاثرات خود بخود اُگ آئے تھے۔ اس نے اپنی رہائش گاہ کی صفائی کرنا شروع کر دی۔ گوبر کے ڈھیر اٹھا اٹھا کر ایک گوشے میں ڈالنے لگا۔ صفائی کرتے کرتے دوپہر ہو گئی مگر وہ کام میں جتا رہا۔ اگرچہ جگہ بہت مختصر تھی اور اس عرصے میں صفائی ہو جانا چاہیے تھی لیکن سلو کا بس نہیں چلتا تھا کہ ہر شے کو آئینے سے زیادہ روشن کر دے، آخر وہ تھک گیا۔ اب بھوک کا غلبہ شروع ہو گیا تھا۔ صبح کا پیا ہوا دودھ محنت کرنے کی وجہ سے جلد ہی ہضم ہو گیا تھا۔ وہ لیٹ گیا اور ممی کا انتظار کرنے لگا۔ بدن کو سکون ملا اور ہوا لگی تو سردی محسوس ہونے لگی۔ سلو نے اپنا لباس غور سے دیکھا، وہ اسے بے انتہا بوسیدہ اور ناکارہ لگا۔ فطری بات ہے، بنیادی ضروریات پوری ہو چکی تھیں لہٰذا ثانوی الٹے تلٹے سر ابھار رہے تھے۔ رات کو بیک وقت تین مسائل درپیش تھے' پیٹ' چھت اور ٹھنڈ۔

پیٹ اور چھت کا مرحلہ قدرت نے طے کرا دیا تھا، اب صرف تن ڈھانپنے کا سوال باقی تھا۔ سلو گردن نیچی کر کے اپنا تنقیدی نظروں سے جائزہ لینے لگا۔ بوسیدہ لباس اسے بالکل نہیں جچ رہا تھا' چیکٹ کپڑے کسی چوہے کی کھال سے مشابہ تھے اور چوہے کی یہ کھال بھی سلامت نہ تھی، دہائی دے رہی تھی، ٹھنڈی ہوا جابجا بنے ہوئے سوراخوں سے بلاتکلف حملہ آور ہو جاتی تھی۔

دوپہر ہو گئی تھی۔ سلو کے پیٹ میں گڑگڑ ہو رہی تھی۔ وہ ممی کی راہ تک رہا تھا اور ممی خدا جانے' کہاں آوارہ گردی کر رہی تھی؟ ننگے فرش پر لیٹے لیٹے سلو کی کمر دُکھنے لگی۔ وہ پہلو بدلتا رہا اور آخرکار سو گیا۔ اس کی آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی مگر ممی ہنوز لاپتا تھی۔ اس کا شکم چیخ چیخ کر فریادیں کر رہا تھا۔

سلو کے پاس کوئی علاج نہ تھا وہ مسیحا غائب تھا جو خالی پیٹ سے اٹھنے والی فریادوں کو خاموش کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

''کہاں رہ گئی تھیں تم ممی؟'' گائے شام ڈھلے گھر میں داخل ہوئی تو سلو بے تابی سے اس کی طرف بڑھا۔ ''کیا دوپہر کو تم نہیں آ سکتیں؟'' سلو نے گائے کی کمر رگڑتے ہوئے کہا۔ ''شاید یہ تمہاری عادت ہی ہو اور میری زبان تم نہیں سمجھ سکتیں، مشکل تو خوب سمجھتی ہو نا؟'' سلو اپنا پیٹ بھرنے کے لیے کمر کس چکا تھا۔ گائے اس کا مقصد سمجھ کر دیوار کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

''تم بہت سمجھ دار ہو ممی، کاش، تم مجھ سے باتیں کر سکتیں۔'' سلو کی آنکھیں بھر آئیں اور آواز گلوگیر ہو گئی۔ حلق میں نمکین ذائقے نے اس کی اشتہا بڑھا دی، وہ جلدی جلدی دودھ پینے لگا۔

سلو کی زندگی کے اچھے دن آ چکے تھے۔ صبح کے ناشتے کا انتظام ممی کے سپرد تھا۔ دوپہر کا کھانا وہ مانگ تانگ کر کھا لیتا تھا۔ اس نے باقاعدہ بھیک مانگنے کا پیشہ اپنا لیا تھا۔ یہ واحد روزگار ہے جس کے لیے نہ کوئی قابلیت درکار ہے نہ خاطر خواہ تجربہ، عمر کی بھی کوئی قید نہیں۔ جتنی چھوٹی ہو، سودمند اور جتنی بڑی ہو، اتنا ہی اچھا، ویسے بھی لباس کا مسئلہ حل کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ سلو کو آسان سب سے یہی لگا کہ بھیک مانگنے لگے، اس کے علاوہ پیسا کمانے کی کوئی صورت نہیں تھی اور نہ ہی سلو کی عمر کسی اور کام کی متحمل ہو سکتی تھی۔

''بابو صاحب! اللہ کے نام پر۔'' اس نے ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص کا دامن تھام لیا اور چہرے پر پیشہ ورانہ بے کسی اور لاچاری پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔

''چلو چھوڑو۔'' وہ آدمی لاپروائی سے آگے بڑھ گیا۔ ''جہاں جاؤ' یہ منکر نکیر پہنچ جاتے ہیں۔'' بھکاریوں سے بےزار بڑبڑاہٹ ابھری۔

''ہونہہ......'' سلو منہ ٹیڑھا کر کے جاتے ہوئے بابو صاحب کو گھورنے لگا۔ ''سوٹ تو چڑھا لیتے ہیں لنڈے سے خرید کر۔ اللہ کے نام پر دینے کو کچھ نہیں ہوتا؟'' وہ کچھ آگے بھی کہنا چاہتا تھا لیکن ایک نوجوان کو آتا دیکھ کر اٹینشن ہو گیا۔

"صاحب جی! اللہ کے نام پر روپیہ دیتے جاؤ۔" نوجوان رک گیا۔

"سنو! ادھر آؤ۔" اس نے سلو کو پاس بلایا۔ سلو سمجھ گیا کہ وار کارگر ثابت ہوا ہے مگر نتیجہ اس کے برعکس نکلا، وہ قریب پہنچا، تو نوجوان نے پوچھ گچھ شروع کر دی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" اس نے پیار سے پوچھا۔

"سلو......!" سلو نے پورے جبڑے پھیلا کر مسکی شکل بنالی۔

"اصلی نام پوچھ رہا ہوں، پورا نام؟"

"میرا نام تو سلو ہی ہے جی۔"

"چلو جانے دو، یہ بتاؤ، تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟" نوجوان دردمند دل کا مالک تھا۔

"پتا نہیں صاحب۔" سلو نے تیزی سے کہا پھر فوراً ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے نوجوان کو ممی کی بابت تو بتایا ہی نہیں تھا۔

"اوہ......" نوجوان نے تاسف سے سر ہلایا۔ "کب سے یہ دھندا کر رہے ہو؟ میرا مطلب ہے کب سے بھیک مانگ رہے ہو؟"

سلو کو اکتاہٹ ہو رہی تھی۔ "تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں صاحب، کچھ دینا ہو تو دو ورنہ اپنے رستے جاؤ۔" اس نے تنگ آ کر کہا لیکن نوجوان پر کوئی اثر نہ ہوا، اس کے سوالات جاری رہے۔

"تم بھیک کیوں مانگتے ہو؟"

"اس لیے کہ مجھے کوئی اور کام نہیں آتا۔" سلو نے جل کر جواب دیا۔

"اگر تم چاہو تو بغیر بھیک مانگے تمہاری ضروریات پوری ہو سکتی ہیں۔" نوجوان نے اسے سمجھایا۔

"وہ کیسے؟" سلو بجھ گیا۔

"میں تمہیں یتیم خانے میں داخل کروا سکتا ہوں، وہاں تمہیں کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔"

"یتیم خانہ، وہ کیا ہوتا ہے؟"

"وہاں بہت سارے بچے ہوتے ہیں تمہارے برابر، تم سے بڑے، تم سے چھوٹے۔" نوجوان لالچ دینے لگا۔

"اچھا۔" سلو کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ "چلو پھر۔" وہاں کپڑے تو ملتے ہیں نا؟"

"ہاں، ہاں، سب کچھ ملتا ہے، روٹی، کپڑے، بستر۔" نوجوان اس کی انگلی پکڑ کر چل پڑا۔

☆......☆......☆

یتیم خانے کا بستر ننگے فرش سے کہیں زیادہ آرام دہ تھا، اس کے باوجود سلو کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ عادت کے مطابق اس نے برابر سوئے ہوئے لڑکے سے لپٹنا چاہا، وہ بدک کر علیحدہ ہو گیا اور سلو کو مغلظات بھی سنائیں۔ سلو کی بے چینی سوا ہو گئی تھی۔ وہ مانوس لمس نہیں مل رہا تھا جس کا وہ گزشتہ چند راتوں سے عادی ہو گیا تھا، بُری طرح یاد آ رہی تھی۔ وہ گرمی سلو کو رہ رہ کر تڑپا رہی تھی جو ممی کے کھردرے جسم میں پوشیدہ تھی۔ سلو بے کلی سے پہلو بدلتا رہا۔

رات کا نہ معلوم کون سا پہر تھا جب سلو کی برداشت نے شدت سے احتجاج کر ڈالا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دبے پاؤں باہر نکل آیا۔ سارا عالم سو رہا تھا، بس سلو جاگ رہا تھا۔

اپنی پناہ گاہ میں سلو واپس پہنچا تو ممی بھی جاگ رہی تھی۔ سلو دیوانہ وار ممی سے چمٹ گیا۔ ممی نے آوازیں نکالیں، وہ بھی شاید سلو کی غیر حاضری کے بارے میں بازپرس کر رہی تھی۔ سلو اس سے لپٹا تو ممی نے اپنے کھر زور زور سے زمین پر مارنے شروع کر دیے۔ یہ اس کا گلہ کرنے کا انداز تھا۔

"مجھے معاف کر دو ممی!" سلو رونے لگا۔ "مجھے کیا پتا تھا کہ وہ آدمی مجھے کہاں لے جا کر بند کر دے گا۔ اب میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ مجھے تمہارے بغیر نیند نہیں آتی۔ تم بھی مجھے چھوڑ کر کبھی مت جانا۔" جواب میں گائے زور سے ڈکرائی جیسے سلو کی تائید کر رہی ہو۔ سلو پرسکون ہو گیا۔ گائے نے بھی سلو کے معافی مانگنے کے بعد اپنے کھر مارنا بند کر دیے تھے۔

☆......☆......☆

شام کو ممی گھر آئی تو اس کے ساتھ ایک مٹیالے رنگ کا بیل بھی تھا، ہڈیوں کا ڈھانچہ اور شاید اس کی ناتوانی ہی اس کی جان کا صدقہ بن گئی تھی اور وہ قصاب کے بے رحم ہاتھوں کے چنگل میں نہیں پھنسا تھا۔

"یہ کسے اپنے ساتھ لے آئی ہو ممی؟" سلو نے بیل کو ناگواری سے دیکھا۔ ممی نے کوئی جواب نہیں دیا اور گردن جھکالی۔

"ہوں تو اب تم اکیلی نہیں رہیں۔" سلو غصیلے سے بیل کے نزدیک آ گیا اور اسے خوں خوار نظروں سے گھورنے لگا۔ بیل کی پچھلی ٹانگ پر گہرا زخم تھا اور اس میں پیپ بہہ رہی تھی، لاتعداد چپکی مکھیاں بھی زخم کے مندمل نہ ہونے کی وجہ تھیں۔ سلو نے بیل کو مارنے کے لیے اپنا پاؤں اٹھایا۔ اپنی ممی میں کسی قسم کی شرکت اسے قبول نہ تھی۔ اس سے پیشتر کہ سلو کی لات بیل کے پڑتی، اس کی نگاہ ممی پر پڑی۔ ممی سلو کو اپنی موٹی موٹی آنکھیں گاڑے گھور رہی تھی' ان آنکھوں میں پتا نہیں کیا کچھ تھا، بہت کچھ تھا جس نے سلو کو اپنا پاؤں دوبارہ زمین پر جمانے پر مجبور کردیا تھا۔ اس نے یکبارگی آگے بڑھ کر بیل کی پشت پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ ممی نے خوشی کے اظہار کے طور پر آواز نکالی۔ "شکریہ ممی۔" سلو کی آواز میں ایک نیا عزم تھا۔ "تم بہت اچھی ہو، مجھے ایک ابا بھی لا دیا۔" سلو نے کپڑے کا ٹکڑا اٹھا کر ابا کا زخم صاف کرنے کی کوشش کی۔ بیل نے زوردار جھرجھری لی تو سلو کا ہاتھ رک گیا۔

"شاید تمہیں تکلیف ہو رہی ہے؟" اس نے چیتھڑا دور اچھالتے ہوئے کہا۔ "افسوس کہ میں تمہارا علاج نہیں کرسکتا اور یہ بھی نہیں جانتا کہ تمہاری مدد کیسے کروں؟"

ممی' سلو اور اس کے ابا کو ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں ممنونیت کی جھلک تھی۔ خاندان مکمل ہونے پر سلو کو تازگی اور فرحت کا احساس ہو رہا تھا۔ اب اس کی زندگی میں کوئی سقم نہ رہا تھا، ساری خالی جگہیں پر ہو گئی تھیں۔

تھوڑی دیر تک تینوں ساتھ رہے۔ سلو، اپنے ابا سے باتیں کرتا رہا، ایسی باتیں جن کا جواب اسے موصول نہ ہوسکتا تھا پھر بھی وہ ممی اور ابا کی حرکات و سکنات سے جواب کا اندازہ لگا کر گفتگو کو طول دیتا رہا۔ ممی بہت مسرور تھی، بار بار زمین پر کھر مار رہی تھی اور دم لہرا رہی تھی فتح مند پرچم کی طرح۔

اس کے بعد بیل وہاں سے چلا گیا، سلو نے روکا بھی نہیں کیونکہ ان کی قیام گاہ مختصر ہونے کی بناء پر مکمل خاندان کو جگہ فراہم نہیں کرسکتی تھی۔

یہ ایک معمول بن گیا تھا، شام کو ممی آتی تو بیل اسے چھوڑنے آتا۔ تینوں بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے پھر ابا واپس چلے جاتے جیسے اکثر بچوں کے ابا آتے ہیں، ملتے ہیں، وقت گزارتے ہیں اور دبئی یا مسقط واپس چلے جاتے ہیں۔

☆......☆......☆

کچھ دن سے سلو کو اپنے ناشتے کے لیے ڈبل روٹی اور چائے پر گزارہ کرنا پڑ رہا تھا۔ ممی نے اچانک دودھ دینا بند کردیا تھا۔ سلو کی محدود عقل اس تبدیلی کی تہہ تک نہ پہنچ سکی۔

"آج میں تمہارے لیے بستر لایا ہوں۔" سلو نے موٹا سا روئی کا گدا ممی کی جگہ پر بچھاتے ہوئے کہا۔ اس کے پاس اتنے پیسے جمع ہوگئے تھے کہ اپنی ممی کو بساط کے مطابق آسائش پہنچا سکے۔ "اب تم اس پر بیٹھا کروگی۔"

ممی نے پہلے گدے کو پھر سلو کو دیکھا۔ "بیٹھ جاؤ نا۔" سلو نے اصرار کیا اور ممی کو بٹھانے لگا اور ممی گدے پر بیٹھ گئی۔ صبح کو سلو نے دیکھا کہ گدا ممی کے گوبر سے آلودہ ہوچکا ہے۔ وہ مسکرایا۔ "کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ میں اسے دھولوں گا۔" گدا دھوتے وقت اس کی پیشانی پر کوئی لکیر نہیں تھی' وہ گنگنا رہا تھا۔ ایسی اولاد تو انسانوں کے نصیب میں نہیں ہوتی جیسی ایک گائے کے مقدر میں قدرت نے لکھ دی تھی۔

ایک روز وہ تین سے چار ہوگئے۔ سلو کی آنکھ کھلی تو اس نے ممی کے پہلو میں ایک ننھے منے نرم اور ملائم بچھڑے کو پایا۔

"ارے، یہ کیا!" وہ خوشی اور حیرت سے چلایا۔ ممی تفاخر سے اپنی تخلیق کو چاٹ رہی تھی۔ سلو لپک کر آگے بڑھا اور اس نے ننھے بچھڑے کو گود میں بھر لیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ بچھڑے کو بانہوں میں اٹھا کر ناچے، کوشش بھی کی مگر اس میں اتنی طاقت نہیں تھی چنانچہ وہیں بیٹھ کر اپنے بھائی کو سہلانے لگا۔

ممی نے دودھ دینا شروع کردیا تھا لیکن سلو دانستہ شیر خواری سے گریز کرتا تھا۔ وہ اپنے ننھے بھائی کا حق

نہیں مارنا چاہتا تھا۔ چھوٹے بھائی کو گرم رکھنے کے لیے اس نے ایک کمبل بھی خرید لیا تھا اور روز شام کو بچھڑے پر ڈال کر اسے کس کر رسی سے باندھ دیتا تھا۔ وہ سوتیلا تھا لیکن سلو کے دل میں بال برابر رنجش پیدا نہیں ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ اس سے پہلے نہ سگا تھا نہ سوتیلا کہ دونوں میں تمیز ہوسکتی، وہ بس بھائی تھا۔ دوسری نسل سے تھا مگر بھائی تھا، مختلف مخلوق تھا مگر بھائی تھا۔

"تم مجھ سے بہت چھوٹے ہو مگر پھر بھی بڑے لگتے ہو۔" سلو نے بچھڑے کے قد آور جسم کو محبت سے مسلتے ہوئے شکوہ کیا۔ "تمہیں چھوٹا ہونا چاہیے تھا تاکہ میں تمہیں گود میں اٹھا سکوں اور سیر کرا سکوں۔" بچھڑا سلو کو چاٹنے لگا۔ سلو فرط مسرت سے بے قابو ہوگیا۔ بچھڑے کے پے در پے بوسے سلو کے رگ و پے میں لرزہ طاری کیے دے رہے تھے۔ اس کی آنکھیں مند گئیں۔

☆......☆......☆

سلو اپنی قسمت پر بے حد نازاں تھا اور اس کا ثبوت وہ خود تھا۔ چہرے پر رونق آ گئی تھی، دبلی پتلی پچکی ٹانگیں صحت مند ہوگئی تھیں، رنگت میں اب وہ لاوارثی یکسر نہیں تھی جو سلو کی خاص پہچان ہوا کرتی تھی۔

شام کو جب وہ چاروں مل بیٹھتے تو فضا بھی ان پر رشک کرتی۔ سلو قدرت کا شکر گزار تھا، کہاں وہ پرانا تنہا سلو اور کہاں یہ سلو، مکمل خاندان کا ایک اہم فرد' ایک مضبوط ستون' ہر ستون مضبوط ہوتا ہے لیکن اس کی بنیادوں سے سیمنٹ نکال لیا جائے یا خلا باقی رہنے دیا جائے تو پھر وہ ستون، ستون نہیں رہتا، سیمنٹ اور بجری کا گرا ہوا تو وہ بن جاتا ہے۔ سلو بھی تو پہلے ایک گرا ہوا تو وہ تھا' بھربھری مٹی کا ڈھیر، بے بنیاد اور اب ممی نے سیمنٹ، ابا نے بجری اور بھائی نے ریت بن کر اس کے اعتماد کی بلند و بالا عمارت کھڑی کردی تھی۔

انہیں آتے رات ہوگئی تھی۔ جب وہ گھر پہنچے تو گنتی میں کم ہوچکے تھے، تین میں سے دو رہ گئے تھے۔ سلو بچھڑے کو ان کے درمیان نہ پا کر پریشان ہوگیا۔

"بھائی کہاں ہے میرا؟" اس نے دونوں کی طرف منہ کرکے سوال کیا۔ "بولو نا۔" وہ باری باری دونوں کے نزدیک جا کر چیخا۔ ممی چپ چاپ کھڑی کھر سے زمین پر کھر مار رہی تھی۔ بیل گردن جھکائے کھڑا تھا۔ سلو نے باہر نکل کر اِدھر اُدھر دیکھا، بچھڑے کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ وہ واپس اندر آیا تو اس نے دیکھا، ممی، بچھڑے کا کمبل سونگھ رہی تھی، وہ وہیں بیٹھ گئی اور کمبل چاٹنے لگی۔ سلو نے دیکھا، ممی کی آنکھوں میں آنسو تھے، وہ بے قراری سے بچھڑے کے کمبل کو چاٹ رہی تھی اور اس سے اپنا منہ رگڑ رہی تھی۔ بیل شرمندہ شرمندہ سا کھڑا تھا۔

ممی کی تڑپ سلو سے دیکھی نہ جاتی تھی، وہ اپنا آپ بے دردی سے رگڑ رہی تھی اور اس کمبل کو جو سلو، بچھڑے کو اڑھا دیتا تھا، مسلسل چاٹنے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے پرنالے سست رفتاری سے بہہ رہے تھے۔

رات دیر تک بچھڑے کے انتظار میں ناکام رہنے کے بعد سلو کو اس نتیجے پر پہنچنے میں کوئی دیر نہ لگی کہ اس کا اکلوتا بھائی کسی قصائی کے بے رحم ہاتھوں میں جا چکا ہے۔ چھریاں کب یہ دیکھتی ہیں کہ کون اکلوتا ہے اور کون دکلوتا، ان کا کام تو کاٹنا ہوتا ہے۔

یتیم خانے میں گزاری ہوئی نامکمل رات کے بعد یہ دوسری رات تھی کہ سلو کو دکھ نے سونے نہیں دیا۔ وہ ممی سے لپٹا آنسو بہا رہا تھا۔ بھائی بری طرح یاد آ رہا تھا۔ ممی نے کمبل چھوڑ کر اپنی بھاری گردن سلو کی کمر پر رکھ دی اور زور لگا کر اسے خود سے پیوست کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ ممی اپنی بچی کھچی پونجی کی حفاظت کرنا چاہ رہی تھی۔ اسے اپنے دل میں محفوظ کر رہی تھی۔ ممی کی زبان سلو کی گدی چاٹ رہی تھی، سرور انگیز لمس بھی سلو کی نیند واپس لانے میں ناکام رہا، وہ روتا رہا، سلو ڈبل روٹی لانے کے لیے بستر سے اٹھا۔ ممی کی آواز نے اس کے باہر نکلتے ہوئے قدم پکڑ لیے۔ اس نے مڑ کر دیکھا، ممی اسی کو دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں بہت سے سوالیہ نشان تیر رہے تھے۔ سلو واپس آیا۔ ممی پھر ڈکرائی۔

"کیا بات ہے، کیوں رو رہی ہو؟ میں ناشتے کے لیے ڈبل روٹی اور چائے لینے جا رہا ہوں۔" سلو ممی کی زبان کچھ کچھ سمجھنے لگا تھا۔ ممی نے زور سے گردن ہلا دی۔ سلو اس کے پاس بیٹھ گیا۔ گائے نے اسے چاٹنا شروع کردیا۔

"تو تم نے مجھے اس لیے بلایا تھا۔" سلو کھلکھلا کر

ہنس پڑا مگر دوسرے ہی لمحے استعجاب کا سمندر اس کے چہرے پر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ممی اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی اور اس نے ٹانگوں سے سلو کو اپنے زیرِ سایہ سرکانا شروع کر دیا تھا جیسے اس پر چھا جانا چاہتی ہو۔ سلو سب کچھ سمجھ گیا۔

''ٹھیک ہے ممی۔'' اس نے نیچے سے پکار کر کہا۔ ''میں سمجھ گیا ہوں، ناشتے کی ذمے داری پھر سے تم نے سنبھال لی ہے، بے فکر رہو، اب میں ڈبل روٹی چائے لینے نہیں جاؤں گا۔'' جواب میں گائے کی پیار بھری ڈکراہٹ ابھری اور سلو جلدی جلدی ناشتا کرنے لگا۔

بچھڑے کے لاپتا ہونے کے بعد سے سلو نے نوٹ کیا کہ اب ممی میں وہ شگفتگی باقی نہیں رہی تھی۔ اولاد کا صدمہ اسے مرجھا گیا تھا' اس پر اداسی طاری رہتی تھی' بے نام سی ایک افسردگی ہمہ وقت اس پر مسلط رہتی تھی۔

''ابا، تم ممی کو ہنساتے کیوں نہیں؟ تمہیں نظر نہیں آتا کہ اب ممی پہلے جیسی نہیں رہی؟'' سلو نے بیل کی پیٹھ پر نیم دراز ہو کر تادیبی لہجے میں کہا۔ بیل گردن گھما کر اپنی زبان سلو کے گال پر پھیرنے لگا۔

''اگر مجھے تمہاری زبان آتی تو میں تمہیں ہر وقت لطیفے سناتا رہتا اور ممی کو کبھی غمگین نہ ہونے دیتا۔''

ممی اپنی اگلی ٹانگیں زمین پر پھیلا کر ان پر منہ رکھے خلا میں گھور رہی تھی۔

''مجھے بھی اپنے بھائی کے گم ہو جانے کا غم ہے۔'' سلو ملول ہو گیا۔ ''لیکن کیا کریں، مجھے دیکھو، میں بھی صبر کر رہا ہوں۔ تم اتنی بڑی ہو کر، ممی ہو کر برداشت نہیں کر سکتیں؟'' ممی کا جمود نہیں ٹوٹا۔

''تم بھی تو ساتھ گئے تھے اس دن۔ تمہارے سامنے وہ کھو گیا اور تم کھڑے دیکھتے رہے؟ کچھ نہ ہو سکا تم سے؟'' سلو پلٹ کر بیل کی کمر پر سوار ہو گیا۔

''تمہارا اتنا بڑا بدن کس کام کا ابا؟ اپنے بیٹے کی حفاظت بھی نہ ہوئی؟'' وہ بیل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوالات کی بوچھاڑ کر رہا تھا۔ بیل نے سر جھکا لیا۔

''ناراض مت ہونا ابا' تم لوگ بھی خفا ہو گئے مجھ سے تو میں کہاں جاؤں گا؟'' سلو بیل سے لپٹ کر معافی کا خواستگار تھا۔ اس کے ابا نے دوبارہ خوش ہو کر اپنی ریگ مال زبان سے سلو کو گھسنا شروع کر دیا۔

☆......☆......☆

وقت کی تہ در تہ چڑھتی ہوئی پٹیاں زخموں کو مندمل نہیں کرتیں تو ڈھانپ ضرور لیتی ہیں مگر ممی کے زخم پر انگور نہیں آ رہا تھا، بیٹے کی تاابدی جدائی نے غم واندوہ کے جو جالے اس پر تان دیے تھے، انہیں وقت کے کانٹے بھی کھسوٹنے میں ناکام ہو رہے تھے۔ ہاں، یہ ضرور ہوا تھا کہ اب ممی کی تمام تر مادرانہ شفقتیں سلو کی ذات پر مرتکز ہو کر رہ گئی تھیں۔ محبت کا تو ایک گنا چنا کوٹا ہوتا ہے، جتنے امیدوار ہوتے ہیں، اسی حساب سے یہ راشن بٹ جاتا ہے۔ اب ممتا کی ساری مقدار کا وارث سلو رہ گیا تھا۔ سلو خود بھی جانتا تھا کہ بچھڑے کے غائب ہونے کے بعد سے اس کے لیے ممی کی محبت میں بے اندازہ وارفتگی آ گئی تھی۔ وہ خود بھی اپنے لاڈ پیار کے ذریعے ممی کو خوش رکھنے کی کاوش میں ہمہ تن مصروف ہو گیا تھا۔ سلو کا ابا بھی ممی کا دل لبھانے کے لیے اپنا زیادہ وقت ان کے سنگ گزارتا تھا اور رات گئے اپنے گھر واپس ہوتا تھا۔ اس کے باوجود ممی کی افسردگی میں کمی نہیں آئی تھی۔ اولاد کے زخم اتنے کاری ہوتے ہیں کہ اس کے عوض ساری کائنات کی محبتیں بھی ہیچ ہوتی ہیں اور یہ کمی کبھی پوری نہیں ہوتی۔

☆......☆......☆

سلو کو آئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ خلافِ معمول اب تک نہ ممی لوٹی تھی نہ ابا کا کوئی پتا تھا۔ پہلے تو سلو خوش ہوا کہ ممی کا دل پھر سے زندہ ہو گیا ہے اور وہ زندگی کی دلچسپیوں میں پھر گئی ہے۔ ابھی تک واپس نہ آنے کا سبب یہی ہو سکتا تھا کہ ممی ابھی تک سیر سپاٹے میں مشغول ہے۔

شام ڈھل گئی اور رات بھی دھیرے دھیرے سیاہ ہونے لگی تو سلو کے ذہن میں وسوسے جاگنے لگے۔ اتنا وقت تو ممی کو کبھی نہیں لگا تھا۔ وہ انتظار کرتا رہا۔

رات کی مسافت آدھی طے ہونے والی تھی لیکن ممی کا کوئی پتا نہ تھا۔ سلو کے دل میں اٹھنے والے خدشے اپنا رنگ گہرا کرتے جا رہے تھے۔ وہ دعائیں مانگ رہا تھا کہ ممی ہر بلا' ہر خطرے سے محفوظ رہے۔ نیند کا تو سوال ہی کیا' سلو کی بھوک بھی اڑ رہی تھی۔ وہ بار بار دروازے کی طرف دیکھتا پھر اس کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ جاتیں اور وہ ممی کے لیے دعائیں مانگنے لگتا۔

اس کا دل اتھل پتھل ہو رہا تھا۔ سلو خود پر بھی قابو پانے کی تمام حدود پھلانگ گیا اور آخر ممی کی تلاش میں باہر نکل آیا۔

سڑکیں سلو کے قدموں تلے سرکی جا رہی تھیں۔ وہ پاگلوں کی طرح ہر سمت دوڑ رہا تھا۔ مشرق' مغرب' شمال' جنوب' چھوٹی سڑک شاہراہ' تنگ گلیاں' حبس زدہ کوچے کوئی گوشہ اس کے قدموں کی دسترس سے دور نہ رہا اور بالآخر اس نے اپنی ممی کو ڈھونڈ لیا۔

ممی ایک بہت چوڑی سڑک پر پڑی کسی سنگ دل اور شقی القلب ٹرک ڈرائیور کی لاپروائی کا ماتم کر رہی تھی' اس کے نوحے میں کوئی صدا نہیں تھی۔

سلو دیوانہ وار ممی کے بکھرے ہوئے وجود کے پاس پہنچا۔ دو قدم کے فاصلے پر سلو کا ابا پژمردہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں، کشادہ چہرہ قبرستان کی سی ویرانی سے مزین تھا۔

سلو کی ٹانگیں بے جان ہو گئیں، وہ دو زانو ممی کے مردہ تن کے آگے جھک گیا۔ ممی کے چاروں طرف سڑک خون میں نہائی ہوئی تھی اور لہو کی سیاہ پپڑیاں جابجا جمی ہوئی تھیں۔ سلو سکتے کے عالم میں ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ ممی کی کھلی آنکھیں آسمان کو گھور رہی تھیں۔ سکوت کے لمحے زیادہ طویل نہیں تھے۔ سلو دھاڑیں مار مار کر رو پڑا، وہ آسمان دیکھ دیکھ کر فریادیں کر رہا تھا۔ ممی کے بے روح جسم سے لپٹا پلٹیاں کھا رہا تھا۔

''تم بھی مجھے چھوڑ گئیں ممی؟'' وہ چلایا۔ خاصی دیر تک ہچکیاں بندھی رہیں اور وہ کچھ نہ بول سکا۔ ''مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی لیکن تم ممی ہو، میری ممی ہو اسی لیے مجھ سے دور چلی گئیں۔'' وہ دیوانہ وار ممی سے شکایتیں کر رہا تھا۔ اسے پُرسہ دینے والا اتنے بڑے شہر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کی کل متاع کسی ظالم کی شقاوت کی نذر ہو گئی تھی لیکن اس کی ڈھارس باندھنے کے لیے کسی منہ میں زبان نہ تھی، کندھے پر رکھنے کے لیے کوئی ہاتھ نہ تھا۔

روتے روتے اس کے آنسو خشک ہو گئے۔ سب کے آنسو آخرکار سوکھ جاتے ہیں۔ وہ جانے کے لیے اٹھا' اس سے اٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اچانک ہی اس کی نظر ابا پر پڑی۔ بیل کی آنکھوں میں چیپڑ آ گئے تھے۔ پتا نہیں ممی کب مری تھی اور وہ کب سے اشک باری کر رہا تھا۔ سلو نے منہ پھیر لیا اور گھر کی طرف مرے مرے قدم بڑھا دیے۔

دروازے میں داخل ہوا ہی چاہتا تھا کہ اسے اپنی گردن پر وہی مانوس سانسیں محسوس ہوئیں۔ وہ رکا اور اس نے پلٹ کر دیکھا، بیل اس سے جڑا ہوا کھڑا تھا۔ سلو کو متوجہ دیکھ کر اس نے دھیمی سی آواز نکالی جیسے کہہ رہا ہو۔ ''کیا ہم دونوں مل جل کر یہ دکھ نہیں بانٹ سکتے؟ ہمارا یہ غم تو مشترکہ ہے۔''

سلو اسے گھورتا رہا پھر اس کے چہرے پر وحشت نے بسیرا کر لیا اور وہ پوری قوت سے دھاڑا۔

''چلے جاؤ یہاں سے' تم بالکل ویسے ہی ہو جیسا میرا پہلے والا ابا تھا، کمزور، کاہل۔ ابا ایسے نہیں ہوتے' دفع ہو جاؤ۔''

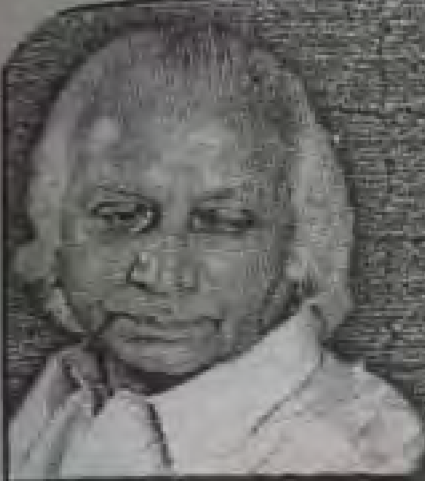
بیل کی آنکھوں میں حیرانی آ گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر سلو کے ہاتھ چاٹنے چاہے تو سلو نے اس کے منہ پر زوردار طمانچہ رسید کر دیا۔ ''جاؤ چلے جاؤ یہاں سے۔ تم میرے ابا نہیں ہو۔ مجھ سے سب کچھ چھن گیا اور تم بت بنے رہے؟ ممی تمہارے سامنے مر گئی اور تم تماشا دیکھتے رہے؟ تم اسے بچا نہیں سکتے تھے؟ بولو' جواب دو۔ میں نے ایسے ابا کسی کے نہیں دیکھے جو اپنی اولاد کے دکھ دور نہ کر سکیں۔ تمہارے ہوتے ہوئے میں لٹ گیا۔ بتاؤ، تمہارا چوڑا چکلا جسم کس کام کا؟ کیا ابا ایسے ہوتے ہیں؟ بولو' بتاؤ؟'' سلو دیوانہ وار بیل پر لاتیں برسا رہا تھا، گھونسے مار رہا تھا۔ اس کے آنسو ممی کی لاش پر اتنی روانی سے نہیں بہے تھے جیسے اب بہہ رہے تھے۔

بیل ہکا بکا کھڑا بدلے ہوئے سلو کو دیکھ رہا تھا۔ ''میرا دنیا میں کوئی نہیں رہا۔ سب ختم ہو گئے۔ تم ابا تھے مگر ویسے ہی نکلے جیسا پہلا ابا تھا۔ مجھے ایسا بزدل نہیں چاہیے۔ میں لاوارث ہوں، یتیم ہوں، کوئی نہیں ہے میرا۔''

اس نے نفرت سے بیل کو دیکھا اور حقارت سے زمین پر تھوک دیا۔ اب وہ اپنی بے ترتیب سانسیں درست کر رہا تھا، اس کے بعد وہ تیزی سے ایک طرف چل پڑا۔ اس کے پاؤں یتیم خانے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

☆☆......☆☆

بازگشت



مصلحت

ادارۂ اقوامِ متحدہ کا قیام اس لیے عمل میں آیا تھا کہ عالمی مسائل کے علاوہ مختلف ممالک کے مابین اختلافات وتنازعات افہام وتفہیم کے ذریعے پرامن طور پر حل کیے جا سکیں اور جنگ و جارحیت کو روکا جاسکے۔ بنیادی انسانی حقوق کی پائمالی کا سدباب بھی اس ادارے کے اغراض ومقاصد میں شامل تھا اور ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ادارہ اپنے قیام کے مقاصد کے لیے، بہت کچھ کرتا رہا ہے اور کر رہا ہے لیکن بعض عالمی مسائل کے سلسلے میں اس کا رویہ شکوک وشبہات کا حامل دکھائی دیتا ہے بلکہ اس ادارے کے بعض بڑے ارکان کے کردار پر تو دہرے معیار کا لیبل بھی لگایا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر عراق اور کویت کے مسئلے کو لے لیجیے۔ اقوامِ متحدہ، بالخصوص امریکا نے کویت کے خلاف عراق کی جارحیت کو ختم کرنے کے اقدامات میں جو تیزی دکھائی، وہ نہ تو مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے دکھائی دیتی ہے، نہ بوسنیا کے مسلمانوں کا قتل عام روکنے کی کوششوں میں نظر آتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اقوامِ متحدہ اور امریکا، کشمیر میں انسانی حقوق کی پائمالی بند کرنے کے لیے بھارت پر دباؤ کیوں نہیں ڈالتے کہ وہ مسئلہ کشمیر کو اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے مطابق حل کرے؟

یہ حقیقت اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ بھارت ایک طرف تو امن وآشتی کا پرچار کرتا ہے اور دوسری طرف اپنی اقلیتوں کے قتل عام پر کوئی عار، کوئی شرمندگی محسوس نہیں کرتا۔ وہ ایک طرف تو سیکولرازم کا نعرہ لگاتا ہے اور دوسری طرف سکھوں کے گوردوارہ امرتسر پر دھاوا بولنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا۔ اس کی پانچ لاکھ پر مشتمل فوج کشمیریوں پر زندگی حرام کر دیتی ہے تو بھی اسے کوئی عار محسوس نہیں ہوتی اور بابری مسجد منہدم کی جاتی ہے تو وہاں بھارتی پولیس محض تماشائی بنی رہتی ہے۔ آخر اس ظلم اور دھاندلی پر اقوامِ متحدہ اور امریکا تیز عملی اقدامات کیوں نہیں کرتے؟ ''مصلحت'' شاید اسی کو کہتے ہیں۔

قارئینِ کرام! سہام مرزا (مرحوم) نے مذکورہ اداریہ ماہنامہ ''دوشیزہ'' کے لیے دسمبر 1993ء میں تحریر کیا تھا۔ ذرا غور کریں، کیا یہ اداریہ موجودہ صورتِ حال کا عکاس نہیں؟